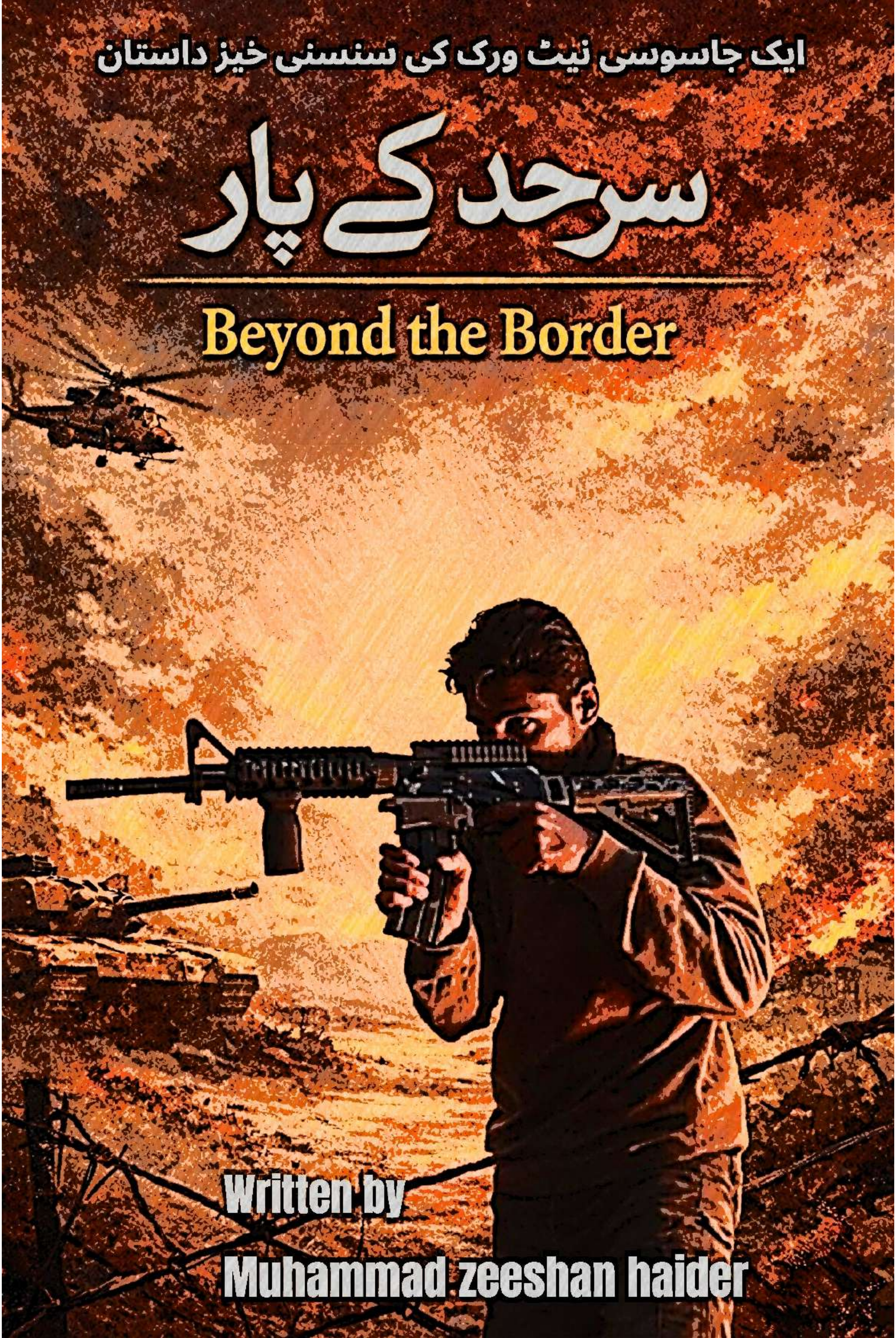
ایک جاسوسی نیٹ ورک کی سنسنی خیز داستان

سرحد کے پار

Beyond the Border



Written by

Muhammad zeeshan haider

فہرستِ ابواب

پیش لفظ

کچھ کہانیاں لکھنے کے لیے نہیں، بلکہ جینے کے لیے ہوتی ہیں۔
سرحد کے پار محض چند الفاظ کا مجموعہ نہیں یہ ان راستوں کی دھول ہے، ان راتوں کی تنہائی ہے، اور ان دھڑکنوں کا حساب ہے جو میں نے حبِ وطن کے جذبے میں سرحدوں کے اس پار گزاری ہیں۔
وزیر آباد کے ایک زنگ آلود گودام سے شروع ہونے والا یہ سفر، تہران کے پُرہجوم بازاروں اور مشہد کی پُراسرار گلیوں سے ہوتا ہوا، جب لاہور کے ایک سیف ہاؤس میں تھمتا ہے — تو پیچھے ایک ایسی حقیقت چھوڑ جاتا ہے جسے دنیا "جاسوسی" کہتی ہے، مگر میرے لیے یہ ایمان کا حصہ تھا۔
اس کتاب میں آپ کو وہ چہرے ملیں گے جو انسانی حقوق کے نام پر دشمن کی بساط بچھاتے ہیں۔ وہ قلم ملیں گے جو صحافت کے لبادے میں زہر اگلتے ہیں۔ اور وہ گمنام سائے بھی ملیں گے جو خاموشی سے ان تمام سازشوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔
میں نے اس سفر میں بلوچستان کی تپتی ریت پر اپنا لہو دیکھا اور ایران کی سرد ہواؤں میں اپنی سانسوں کو اکھڑتے پایا لیکن میرا مقصد ان عناصر کو بے نقاب کرنا تھا جو ہمارے گھر کی بنیادوں کو اندر سے کھوکھلا کر رہے تھے۔
یہ کتاب ان تمام گمنام ہیروز کے نام ہے جن کی قبروں پر کوئی کتبہ نہیں ہوتا، جن کا تذکرہ اخباروں کی شہ سرخیوں میں نہیں آتا — لیکن جن کا پہرا ہماری پُرسکون نیندوں کا ضامن ہے۔ وہ لوگ جنہیں نہ شہرت چاہیے، نہ صلہ — بس وطن کی سلامتی۔
میں نے اپنی بساط کے مطابق سچائی کو کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔ اب یہ فیصلہ آپ کا ہے — آپ ان سرحدوں کے پار پھیلے ہوئے جال کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اور اس کے بعد کیا کرتے ہیں۔
میرا اجر صلے کی تمنا میں نہیں، بلکہ اس اطمینان میں ہے کہ امانت حقداروں تک پہنچ چکی ہے۔

اے پاک سرزمین! میں نے تیری خاطر اپنا نام تک بھلا دیا۔

پہلا باب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اخبار کی خبر

وزیرآباد میرے لیے گھر نہیں تھا،یہ محض ایک قیام گاہ تھی——ایسی جگہ جہاں آدمی زیادہ دیر نہیں ٹھہرتااور کم باتیں کرتا ہے۔میں گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔سامنے میز،میز پر چائے کا کپ،اور اس کے نیچے دبا ہوا آج کا اخبار۔
کھڑکی کے باہرلوہے کے کارخانے کی بھٹی جل رہی تھی،دھواں اوپر اٹھتا اور بغیر نشان چھوڑے بکھر جاتا۔
میں نے اخبار کا پہلا صفحہ نہیں دیکھا۔وہ خبریں عوام کے لیے ہوتی ہیں،میرے لیے نہیں۔
اصل خبر ہمیشہ اندر کے صفحے پر ہوتی ہے——جہاں الفاظ چھوٹےاور مطلب بڑا ہوتا ہے۔تیسرے صفحے کے نچلے حصے میں ایک خبر میری نظرپر رک گئی۔
''بلوچستان کے غیر رسمی راستوں سےایران میں بیرونی خفیہ نیٹ ورکس کی نقل و حرکت——ذرائع خاموش''
میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیااور موبائل اٹھایا۔ایک نمبر تھاجو میں نے خود محفوظ نہیں کیا تھا،مگر یاد تھا۔یہ وہ رابطہ تھاجو خبر پڑھ کر نہیں،خبر سمجھ کر کیا جاتا ہے۔رِنگ جانے میں کچھ لمحے لگے۔
پھر آواز آئی:''اتنے عرصے بعد یاد آیا؟''میں نے کہا:''آج خبر نے مجبور کر دیا ہے۔''وہ ہلکا سا ہنسا۔''خبر یا نیت؟''میں نے کھڑکی سے باہر گلی کو دیکھا۔''دونوں ایک ہی دن جاگے ہیں۔''چند لمحے خاموشی رہی۔
پھر اس نے کہا:''وزیرآباد میں ہو؟''''ہاں۔''''تو کہیں مت جانا۔
آج تمھیں جانا نہیں،بلایا جائے گا۔''فون بند ہو گیا۔شام تک میں نے خود کو مصروف رکھا اب شام ڈھلنے لگی تو کمرے کی خاموشی بھاری ہو گئی۔شام سات بجے دوبارہ فون آیا۔اور اسنے کہا''اب تم نکل سکتے ہوپرانا گودام،ریلوے لائن کے ساتھ۔''میں نے پوچھا:''کس حوالے سے؟''جواب ایک لفظ کا تھا:''ایران۔''فون بند ہوا تو کمرہ پہلے سے زیادہ خاموش ہو گیا۔ایسی خاموشی جس میں دیواریں بھی سننے لگتی ہیں۔میں نے جیکٹ اٹھائی۔جیب میں موبائل رکھا،
دوسری جیب میں نوٹ بک——وہی نوٹ بک جس میں میں نام نہیں،اشارے لکھتا ہوں۔
گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلا تو وزیرآباد کی شام اپنی اصل صورت میں تھی۔بازار بند ہونے کو تھا،چائے کے کھوکھے روشن تھےاور لوگ اپنی اپنی فکر کے ساتھ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔
میں کسی کا حصہ نہیں تھا۔نہ اس شہر کا،نہ اس وقت کا۔سڑک کنارے ایک رکشہ رکا۔ڈرائیور نے مجھے نہیں دیکھا،
میں نے اسے آواز دی۔''ریلوے لائن جانا ہے۔پرانا گودام۔''اس نے ایک لمحہ آئینے میں مجھے دیکھا۔ایسے جیسے تول رہا ہوکہ سوال کرے یا خاموش رہے۔پھر بولا:''ٹھیک ہے بیٹھیں۔''رکشہ چل پڑا۔انجن کی آواز میرے خیالوں کو کاٹتی رہی۔
راستے میں میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔یہ وہی شہر تھاجہاں لوگ دن گزارنے آتے ہیں——اور کچھ لوگ کہانیاں

اٹھانے۔

ہر موڑ پر دل کہہ رہا تھا: یہ صرف خبر نہیں، یہ دروازہ ہے۔ ریلوے لائن کے قریب رکشہ آہستہ ہو گیا۔

ڈرائیور نے خود کہا: ''آگے رکنا ہے؟'' میں نے کہا ''یہیں۔'' پھر کرایہ دیا اور اتر گیا۔ اس نے پیسے گنے بغیر رکھ لیے۔

شاید اسے اندازہ تھا کہ آج سوال کرنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔ گودام دور سے ہی پہچانا جا سکتا تھا۔ زنگ آلود دروازہ، ٹوٹا ہوا بورڈ، اور اندر ہلکی سی پیلی روشنی۔ میں نے قدم آہستہ کیے۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو نمی اور تیل کی بو ایک ساتھ محسوس ہوئی۔ کمرے کے بیچ لکڑی کی میز تھی۔ اس کے پیچھے

ایک شخص بیٹھا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا۔ ہم نے ہاتھ ملایا۔ ایسی ملاقاتوں میں سلام دعا آنکھوں سے ہوتی ہے۔

اس نے بس اتنا کہا: ''بیٹھو۔'' میں بیٹھ گیا۔ لکڑی کی کرسی چرچرا اٹھی — جیسے اسے بھی معلوم ہو کہ یہاں وزن جسم کا نہیں فیصلوں کا ہوتا ہے۔ وہ بولا: ''ایران اس وقت صرف ایک ملک نہیں۔ یہ آئینہ ہے — جس میں ہر طاقت اپنا عکس دیکھنا چاہتی ہے۔'' میں نے نوٹ بک کھول لی۔ اسنے کہا ''وہاں بہت سے لوگ

حقوقِ انسانی کا نام لے کر دوسروں کے مفادات نبھاتے ہیں۔ کوئی خود کو محقق کہتا ہے، کوئی میڈیا نمائندہ — اور کچھ خاموشی سے انٹیلیجنس کے کام کرتے ہیں۔''

اس نے ایک فائل میز پر رکھی۔ بند۔ ''یہ نام نہیں، کردار ہیں۔ اور کردار ہر سرحد پار کر لیتے ہیں۔

''میں نے پوچھا: ''مجھ سے کیا چاہیے؟ وہ بولتا رہا: ''ایران کے اندر کچھ نیٹ ورکس مدد کے نام پر نفرت پھیلا رہے ہیں۔ کچھ صحافی بن کر کہانیاں تراشتے ہیں — اور کچھ اسرائیلی مفادات کے لیے خاموش راستے بناتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''اور میں؟''

اس نے ہلکا سا سانس لیا۔ کہ تم تہران جاؤ۔ صحافی بن کر نہیں — صحافی رہ کر۔

میں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ''فرق باریک ہے۔''

وہ سنجیدہ رہا۔ اور پھر بولا'' بارڈر بلوچستان سے کراس کرو گے۔ غیر رسمی۔ اگر مسئلہ بنا تو ہم تمہیں نہیں جانتے۔''

''میں نے مسکرا کر کہا'' مجھے کسی بیک اپ کی ضرورت بھی نہیں پھر میں نے پوچھا:

''تو میرا کام صحافت ہے، لیکن اصل میں؟'' اس نے میری طرف دیکھا، آنکھوں میں شدت، اور بولا: ''صحافی کے موڈ میں جاؤ، باتیں کرو، تصاویر دیکھو، سوال پوچھو، لیکن بیچ میں تمہیں یہ رپوٹ فائل سنبھالنی ہوگی۔ تمہیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے۔ کوئی بھی چھوٹی سی غلطی، کی تو نتائج تمہارے ہاتھ میں نہیں رہیں گے۔ سمجھ گئے؟'' میں نے سر ہلایا اور کہا میں خود دیکھوں گا کہ کس طرح اور کونسے راستے جانا ہے میں اپنی سمت اور طریقہ کار خود تعین کروں گا۔''

اس نے مسکرا کر کہا: ''اور یہ جو بلوچستان کا راستہ ہے، وہ آسان نہیں تمہیں پہاڑی راستوں سے جانا ہے۔ کوئی ہنگامی صورت میں رکاوٹ آئے تو تمہیں اپنی سوچ، اپنی مہارت اور اپنے رابطے استعمال کرنے ہوں گے۔'' اگر تم ہمارے بتائے ہوئے راستے سے جاؤ گے تو شاید زیادہ آسانی ہوگی، مگر وہاں بھی خطرہ ہے۔

اور اگر اپنے طریقے سے کسی متبادل راستے پر گئے،
تو وہ فیصلہ تمہاری ذمہ داری ہو گی۔ میں نے پوچھا:''اور اگر وہ لوگ پہچان گئے؟''وہ ہلکا سا ہنسا، مگر ہنسی میں کوئی خوشی نہیں تھی:''پہچانیں گے تو؟ پھر شاید یہ آخری گفتگو ہو ہماری مگر تمہاری معلومات
وہیں سے نکلیں گی جہاں سب کچھ چھپتا ہے۔ تمہیں ان کے درمیان گھلنا ہے، لیکن کبھی بھی مکمل طور پر نظر نہ آنا۔''
میں نے فائل دوبارہ دیکھ کر کہا:''تو یہ سب کچھ... میرے ہاتھ میں ہے؟''اس نے فائل میری طرف بڑھائی، اور ہاتھ ہٹا کر کہا:''اب یہ تمہارا کام ہے۔
ہم دونوں کا تعلق یہاں ختم ہوتا ہے۔ وزیرآباد کی شام، یہ گودام، یہ راز—سب تمہارے ساتھ۔ بس یاد رکھو، یہ صحافی کا روپ تمہیں بچائے گا،اور حقیقت کے دروازے تک پہنچائے گا۔''اور اب یہ بتاؤ سفر کب شروع کرو گے
میں نے کہا: ابھی وہ چونکا۔''ابھی؟''میں نے کہا''ہاں ابھی۔
کیونکہ جو سفر سوچ کر یا گھر جا کر کیا جائے وہ اکثر ادھورا رہ جاتا ہے۔''اس نے فائل بند کی۔''تو پھر خوش آمدید، سرحد کے پار۔''ہماری بات چیت ختم ہوئی۔ پھر آخری سلام کیا، آخری ہاتھ ملایا—میں نے نوٹ بک جیب میں رکھی، جیکٹ اوڑھی، اور گودام سے باہر نکلا اور واپس گیسٹ ہاؤس آگیا۔

دوسرا باب ------ سفرِ بے نام

نہ کوئی ٹیم، نہ کوئی نام، نہ کوئی شناخت—صرف ایک ارادہ۔ یہ کوئی مشن آرڈر نہیں تھا، نہ کسی ادارے کی ہدایت۔ یہ وہ جنگ تھی جو آدمی خود اپنے اندر شروع کرتا ہے، اور اکثر اکیلی ہی لڑنی پڑتی ہے۔ میں جانتا تھا اگر میں رکا، تو یہ کہانی وہیں مر جائے گی جہاں سے شروع ہوئی ہے کچھ فیصلے لکھنے سے پہلے سوچ مانگتے ہیں۔
میں جانتا تھا میرا مقصد واضح ہے—ایران پہنچنا۔ سوال صرف یہ تھا: کس بھیس میں؟ کس ہجوم کے ساتھ؟ کس خاموشی میں؟ سب سے پہلا خیال جہاز کا آیا۔ یہ سب سے آسان راستہ تھا۔ ٹکٹ لو، بورڈنگ کرو، اور چند گھنٹوں میں دوسری زمین۔ مگر یہی آسانی اصل مسئلہ تھی۔ جہاز سوال نہیں پوچھتا، لیکن نظام پوچھتا ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟ کیوں جا رہے ہو؟ کتنے دن واپسی کب؟ یہ وہ سوال ہوتے ہیں جن کا ایک ہی جواب بار بار نہیں دیا جا سکتا۔ اور پھر ایک اور بات تھی—جہاز میں ہر حرکت ریکارڈ ہوتی ہے۔ ہر نشست، ہر وقت، ہر چہرہ۔ میں جانتا تھا میرا جانا اتنا سیدھا نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اسی سوچ میں ایک خیال آہستہ سے ابھرا۔ زائرین۔ وہ لوگ جو ہر سال نکلتے ہیں، لوٹ آتے ہیں، اور انکے نام کسی فائل میں درج نہیں ہوتے۔ میں نے خود سے کہا: شاید یہی راستہ مجھے وہاں تک لے جائے جہاں میرا کام ہے۔ فیصلہ اسی رات ہو گیا۔ اگلی صبح میں وزیر آباد میں نہیں تھا۔ میں گجرانوالہ کی طرف نکل چکا تھا۔ گجرانوالہ میرا شہر نہیں تھا، مگر یہاں حرکت زیادہ تھی۔ فضا میں نمی تھی، ہلکی سی گرد، اور لوگوں کے چہروں پر ایک مخصوص جلدی۔ پہلے دن میں صرف دیکھتا رہا۔ کہاں لوگ رکتے ہیں، کہاں بات کرتے ہیں، اور کہاں خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہ وزیر آباد کی طرح خاموش نہیں تھا۔ یہاں شہر بولتا ہے۔ بینروں سے، پوسٹروں سے، اور امام بارگاہوں کے باہر لگے چھوٹے چھوٹے اسٹالوں سے۔

میں نے پہلا پڑاؤ۔شیر انوالہ باغ کے قریب کیا۔وہاں ایک پرانی امام بارگاہ ہے،
جس کے باہر ہر سال زائرین کے قافلوں کے پوسٹر لگتے ہیں۔
ایک پوسٹر پر میری نظر رک گئی مشہد مقدس —— براستہ کوئٹہ زائرین کی مکمل سہولت قافلہ ہر پندرہ دن بعد میں نے پوسٹر کو غور سے دیکھا۔فون نمبر یاد کیا، لیکن کال نہیں کی۔کیونکہ ایسی جگہوں پر فون کم، سامنے بیٹھ کر بات زیادہ ہوتی ہے۔
پھر امام بارگاہ کے اندر داخل ہوا۔اندر قالین بچھے تھے، کونے میں دو تین لوگ تسبیح پڑھ رہے تھے،
اور ایک طرف دو آدمی آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے۔
میں نے ایک بزرگ سے پوچھا:
''زائرین کے قافلے کا دفتر کہاں ہے؟''انہوں نے مجھے دیکھا، میرے چہرے کو نہیں —— میرے ارادے کو۔
پھر آہستہ سے بولے:''باہر گلی میں دوسری دوکان۔نیلی شٹر والی۔''میں نے انکا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے نیلی شٹر والی دوکان میں آ گیا دوکان چھوٹی تھی۔سامنے شیشے کے پیچھے کربلا اور مشہد کی تصویریں، اور دیوار پر پرانے پاسپورٹس کی فوٹو کاپیاں۔میں اندر داخل ہوا۔ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا، چالیس کے قریب عمر، داڑھی تراشی ہوئی، آنکھیں بہت زیادہ دیکھ چکی تھیں۔اس نے سر اٹھا کر کہا:''جی؟''میں نے کہا:''ایران جانا ہے۔
زائرین کے ساتھ۔''اس نے فوراً سوال نہیں کیا۔بس پوچھا:
''پہلی دفعہ؟''''ہاں۔''وہ کرسی سے ذرا آگے ہوا۔اب بات شروع ہو چکی تھی۔اس نے کہا:
''دیکھیں بھائی، ہم قافلے میں لے کر جاتے ہیں۔سب کچھ ہمارے ذمے۔بس آپ کو ہمارے طریقے پر چلنا ہوگا۔''میں نے کہا:''تفصیل؟''وہ مسکرایا یہ وہ مسکراہٹ تھی جو صرف ٹریول ایجنسی والوں کے پاس ہوتی ہے۔''پہلے پیسے۔پھر کاغذات۔پھر قافلہ۔''میں خاموش رہا۔وہ خود بولتا گیا:
''60000 روپے لگیں گے۔اس میں سفر، رہائش، اور بارڈر کراسنگ شامل ہے۔''میں نے پوچھا:''کاغذات میں؟''
اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا:''اصل پاسپورٹ —— کم از کم چھ ماہ ویلیڈ چار تصویریں
شناختی کارڈ کی کاپی اور ایک ضامن کا نمبر''میں نے پوچھا:
''ویزہ؟''وہ ہنسا:''زائرین کو ویزہ ہم لگوا دیتے ہیں۔
آپ کو لائن میں نہیں لگنا پڑتا۔''میں نے پوچھا:''سفر کیسے ہوگا؟''اب وہ پوری طرح کھل چکا تھا۔''بسوں میں گجرانوالہ سے کوئٹہ۔وہاں ایک دن رکاؤ۔پھر تفتان بارڈر۔چیکنگ ہوتی ہے، لیکن قافلے میں ہو تو آسانی ہو جاتی ہے۔''
میں نے پوچھا:''کتنے لوگ ہوتے ہیں؟''''پچاس سے ساٹھ عورتیں، بوڑھے، بچے۔اسی لیے کوئی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتا۔''میں نے آہستہ سے کہا:''اور اگر کوئی مسئلہ ہو؟''وہ سنجیدہ ہو گیا۔

’’بھائی، قافلے میں الگ سوچنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جو کہا جائے، وہی کرنا ہوتا ہے پھر مزید ان سے تھوڑی بات چیت ہوئی او پھر میں واپس اگیا۔ آٹھ دن گزر گئے تھے گجرانوالہ میں دن لمبے نہیں ہوتے، بس باتیں لمبی ہو جاتی ہیں۔
میں ہر صبح کسی نئی امام بارگاہ کے بارے معلومات لیتا اور ہر شام کسی نہ کسی ٹریول ایجنسی کے سامنے بیٹھا ہوتا۔ پھر دسویں دن میں نے خود کو ایک اور دکان میں پایا۔
یہ دکان پہلے والی سے بڑی تھی۔ دیوار پر بڑے بڑے بینر، میں اندر داخل ہوا۔ سامنے بیٹھا شخص پچپن کے قریب عمر کا تھا، چہرے پر عبادت اور کاروبار دونوں کے نشان تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا: ’’مجھے مکمل طریقہ کار جاننا ہے۔ میں جلدی میں نہیں ہوں۔ ‘‘وہ مسکرایا۔
’’جو جلدی میں آتے ہیں وہ اکثر راستے میں رہ جاتے ہیں۔ ‘‘
پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ’’دیکھو، قافلہ پچپن بندوں کا ہوتا ہے۔ ہر بندے کی لسٹ بنتی ہے۔ نام، پاسپورٹ نمبر، گھر کا پتہ، اور ایک قریبی رشتہ دار کا فون نمبر۔ ‘‘میں نے پوچھا: ’’یہ لسٹ کہاں جاتی ہے؟‘‘
اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ پھر کہا: ’’بارڈر والوں تک۔ اور آگے بھی۔ ‘‘یہی وہ جملہ تھا جس نے میرے اندر ایک دروازہ بند کر دیا۔ وہ مزید بتاتا گیا: ’’ہم کوئٹہ میں دو دن رکتے ہیں۔ وہاں زائرین کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ پھر بسیں بدلتی ہیں۔
پاسپورٹ عارضی طور پر ہمارے پاس جمع رہتے ہیں۔ ‘‘
میں نے چونک کر پوچھا: ’’پاسپورٹ کیوں؟‘‘اس نے عام لہجے میں کہا: ’’ڈسپلن کے لیے۔
کوئی بھاگ نہ جائے۔ ‘‘میں نے سر ہلایا، لیکن اندر میرے قدم رک چکے تھے۔ کیونکہ جس نے اپنا پاسپورٹ چھوڑ دیا وہ اپنی شناخت بھی چھوڑ دیتا ہے۔ ایک اور زائر جو پاس بیٹھا تھا بات میں کود پڑا:
’’بھائی، ہم تو ہر سال جاتے ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ‘‘میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
وہ سچ بول رہا تھا۔ لیکن وہ وہ سچ تھا جو صرف واپس آنے والوں کا ہوتا ہے۔ میں نے اگلے دن ایک اور ایجنسی کا رخ کیا۔
یہاں بات اور صاف تھی۔
ایجنسی والا بولا: ’’آپ مشہد جائیں گے، پانچ دن رکیں گے،
دو دن اصفہان، اور پھر واپس۔ ‘‘میں نے پوچھا: ’’اگر واپس نہ آنا چاہوں تو؟‘‘اس نے ہنسی روک لی اور کہا ’’تو پھر آپ ہمارے بندے نہیں۔ ‘‘بس۔ یہی حقیقت تھی۔ قافلے صرف جانے کے لیے نہیں ہوتے، واپس لانے کے لیے ہوتے ہیں۔
اور میں جانتا تھا میرا سفر واپسی کے وعدے پر نہیں تھا۔ میں زائر بن کر جا سکتا تھا، لیکن زائر رہ کر نہیں۔
میرا مقصد حرم کی حاضری نہیں، راستوں کی پڑتال تھا۔
اور ان راستوں پر قافلے کے ساتھ اکیلا نہیں چلا جا سکتا۔
ایک اور مسئلہ تھا جو میں سب سے چھپا رہا تھا: شناخت۔ ہر ایجنسی کچھ نہ کچھ اپنے پاس رکھتی ہے—کاپی، نمبر، یا پاسپورٹ۔ یہ ان کی حفاظت ہوتی ہے، لیکن میرے لیے یہ خطرہ تھا۔ کیونکہ اگر کہیں بھی میں الگ ہوا، تو یہی شناخت

میرا تعاقب بن سکتی تھی۔
بارہویں دن کی رات میں گجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کی چھت پر کھڑا تھا۔
نیچے شہر جاگ رہا تھا۔اوپر آسمان خاموش تھا۔میں نے خود سے کہا:''قافلہ محفوظ ہے،
مگر پابند۔اور میں پابندی کے لیے نہیں نکلا۔''اسی لمحے
میرے ذہن میں ایک اور راستہ ابھرا۔وہ راستہ جو نقشوں میں نہیں ہوتا،خبروں میں دب جاتا ہے،اور فیصلوں میں آخری آپشن ہوتا ہے جسے بلوچستان کہتے ہیں میں جانتا تھاوہاں قافلے نہیں ہوتے،بس فیصلے ہوتے ہیں۔اور جب میں نے گوادر پورٹ سمندر کے بارے میں سوچا—تو مجھے احساس ہوا:ہوائی جہاز نہیں،بس نہیں،
قافلہ نہیں—اب پانی کیونکہ سمندر کوئی لسٹ نہیں مانگتاسمندر کا خیال اچانک نہیں آیا تھا—یہ وہ خیال تھاجو تب آتا ہے جب ہر سیدھا راستہ اپنی قیمت مانگنے لگے۔ہوائی جہاز سوال کرتا ہے۔بس فہرست مانگتی ہے۔قافلہ واپسی کا وعدہ لیتا ہے۔مگر پانی—نہ نام پوچھتا ہے،نہ فائل،نہ ضمانت۔سمندر کسی چیک پوسٹ پر نہیں رکتا،کسی رجسٹر میں درج نہیں ہوتا،اور کسی واپسی کی تاریخ پر اصرار نہیں کرتا۔وہ صرف ایک چیز دیکھتا ہے:ہمت۔میں جانتا تھا یہ راستہ آسان نہیں،یہاں موجیں سوال نہیں کرتیں،فیصلہ کرتی ہیں۔یہاں آدمی زائر نہیں ہوتا،مسافر بھی نہیں—یہاں آدمی صرف ارادہ بن جاتا ہے۔
گجرانوالہ میں میں نے وہ رات کسی منصوبے کے ساتھ نہیں گزاری۔یہ محض ایک وقفہ تھا—
جہاں آدمی سوتا نہیں،بس آنکھیں بند کر کے سوچ کو آہستہ کرتا ہے۔
میں نے پہلے ہی جعفر ایکسپریس کا شیڈول چیک کیا ہوا تھا—گاڑی شام پانچ بجے
لاہور جنکشن سے روانہ ہوتی تھی۔میں نے بلوچستان ٹرین کے ذریعے ہی جانا تھااگر میں اسی رات لاہور چلا جاتا
تو پورا دن غیر ضروری بھاگ دوڑ میں گزر جاتا،اور میں جانتا تھا کہ مجھے اگلے دن
ذہنی طور پر بالکل صاف ہونا ہے۔اسی لیے میں نے رات گجرانوالہ ہی میں گزارنے کا سوچا۔چھوٹے سے ہوٹل کا کمرہ کھڑکی کے ساتھ لگا پنکھا،دیوار پر پرانا کیلنڈر،اور بستر کے پاس رکھا بیگ—جو اب خالی نہیں تھا،فیصلوں سے بھرا ہوا تھا۔
رات زیادہ لمبی نہیں تھی۔یا شاید میں نے اسے لمبا ہونے نہیں دیا۔فجر کی اذان سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی۔
وضو کیا،دو رکعت سنت پھر فرض ادا کیے
اور پہلی بار دل میں یہ بات واضح تھی کہ اب پیچھے کچھ نہیں رہ گیا نماز کے بعد ہوٹل سے نکل کر میں سیدھا گجرانوالہ بس اسٹینڈ کی طرف گیا۔صبح کی ہوا میں ہلکی سی ٹھنڈک تھی،اور بس اسٹینڈ اپنی مخصوص حالت میں جاگ رہا تھا۔چائے والے کے برتن بج رہے تھے،کنڈیکٹر آوازیں لگا رہے تھے،اور لوگ اپنے اپنے وقت کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔میں نے اسٹینڈ کے ایک کونے میں ہلکا سا ناشتہ کیا—ایک انڈا،ایک پراٹھا،اور چائے کا کپ۔ناشتے کے بعد میں ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

''لاہور؟''کاؤنٹر والے نے پوچھا۔
میں نے کہا''ہاں۔''پھر اسنے کہا''فوری نکل رہی ہے۔اچھی گاڑی ہے۔''میں نے کرایہ دیا—زیادہ نہیں،کم بھی نہیں اور پھر گاڑی میں بیٹھ گیا پانچ منٹ بعد گاڑی چل پڑی۔ گجرانوالہ پیچھے رہ گیااور لاہور آگے آتا گیا۔راستے میں کھیت، چھوٹے قصبے،اور وہ سڑک جو ہر روز ہزاروں فیصلے اٹھا کر شہر تک پہنچاتی ہے۔دو گھنٹے بعد میں لاہور میں تھا۔لاہور پہنچ کر میں سیدھا کہیں نہیں رکا۔پہلے شہر کو دیکھا—اس رفتار کو،اس بے نیازی کو جس میں آدمی گم ہو سکتا ہے۔۔کچھ چیزیں ایسی تھیں۔جو راستے میں نہیں ملتیں،اور کچھ تیاری ایسی جو صرف لاہور جیسے شہر میں ممکن ہوتی ہے۔ضروری سامان لینا تھا۔ایسا سامان جو نہ فہرست میں لکھا جاتا ہے نہ سوال میں آتا ہے۔میں انارکلی بازار کی طرف گیا۔یہ وہ جگہ ہے جہاں ہر چیز عام لگتی ہےاور اسی لیے کوئی چیز نمایاں نہیں ہوتی۔ تنگ گلیاں،اوپر لٹکتے بلب،اور دکانوں کے شیشوں میں اپنا عکس بکھرا ہوا۔میں نے چند چیزیں لیں:ایک سادہ جیکٹ،ایک اضافی موبائل چارجر،دو جوڑے موزے،ایک چھوٹی سی ٹارچ، خریداری کے دوران میں کسی سے زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔لاہور میں خاموش رہنا بھی ایک ہنر ہے۔ پھر میں شالمی مارکیٹ گیا۔
وہاں سے کچھ سامان، خریدا بس وہ سب جو ایک عام مسافر کے پاس ہو سکتا ہے۔خریداری کے بعد میں نے خود کو شہر سے الگ کیا۔لاہور میں رکنے کا وقت نہیں تھا،یہاں صرف تیاری ہونی تھی۔دوپہر ڈھلتے ہی میں لاہور جنکشن کی طرف روانہ ہوا۔ تقریباً تین بجے میں اسٹیشن پر تھا۔یہ اسٹیشن نہیں تھا،یہ ایک پورا شہر تھاجو دن میں دو باراپنی جگہ بدلتا ہے۔اندر داخل ہوتے ہی اعلانات کی آوازیں ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی تھیں۔
کبھی کراچی، کبھی پشاور، کبھی کوئٹہ۔لوگ آرہے تھے،لوگ جارہے تھے۔کوئی ہاتھ میں بیگ لیے جلدی میں تھا،کوئی کندھے پر بستر باندھے آہستہ چل رہا تھا۔
ایک طرف خاندان بیٹھا تھا—سامان بکھرا ہوا،بچے فرش پر لیٹے،اور عورتیں وقت کا اندازہ لگاتی آنکھوں سے بار بار گھڑی دیکھ رہی تھیں۔دوسری طرف اکیلا مسافر تھا—جس کے پاس سامان کم اور خاموشی زیادہ تھی۔میں ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔لائن لمبی نہیں تھی،مگر سست تھی۔میرے آگے کھڑا شخص بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا—شاید ڈر تھاکہ گاڑی چھوٹ نہ جائے۔جب میری باری آئی تو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے شخص نے سر اٹھا کر پوچھا:
''کہاں جانا ہے؟''میں نے بس اتنا کہا: ''کوئٹہ۔''اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''جعفر ایکسپریس؟''
''ہاں۔''اس نے دوبارہ پوچھا: ''اکانومی یا بزنس؟''میں نے اردگرد دیکھا۔شور، بھیڑ،اور انتظار کی تھکن۔ پھر کہا: ''بزنس کلاس۔''وہ ٹکٹ نکالتے ہوئے بولا: ''شام ساڑھے پانچ بجے نکلے گی۔ پلیٹ فارم نمبر دو۔ سفر لمبا ہے۔''میں نے ٹکٹ لیا،قیمت زیادہ تھی مگر وقت اور سکون اس سے زیادہ قیمتی تھے۔ٹکٹ جیب میں رکھااور پلیٹ فارم کی طرف چل دیا۔وہاں منظر اور گہرا تھا۔چائے والے کی آواز: ''گرم چائے... گرم چائے...''ساموسوں کی خوشبو،اور انجن سے اٹھتی ہلکی سی تیل کی باس۔۔میں نے دیکھاایک آدمی اپنے بیگ جھولی میں دبائے بیٹھا تھاجیسے ڈر ہو کہ کوئی لے نہ جائے۔ایک بوڑھا تسبیح پڑھ رہا تھا،اور ساتھ بیٹھا لڑکا بار بار موبائل دیکھ رہا تھامیں بھی وہیں بیٹھ گیااور پھر شروع ہواانتظار۔دو گھنٹے ایسے گزرے

جیسے کوئی خود کو آہستہ آہستہ پیچھے چھوڑ رہا ہو۔لوگ آتے رہے، جاتے رہے۔میں بیٹھا رہا۔نہ کسی سے بات، نہ کسی کو پہچان۔پلیٹ فارم پر ہر وقت ٹرینیں آتی جاتی رہتی ہیں— شمال سے آنے والی ایک مسافر ٹرین جو پہلے سے ائی کھڑی تھی، روانہ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جنوب کی جانب سے ایک اور لوکل ٹرین بھی آئی، لوگوں نے سامان اتارا کچھ نئے مسافر سوار ہوئے اور تھوڑی دیر بعد پھر وہ بھی چل پڑی، ہر ٹرین کے ساتھ شہر کی زندگی اور روزمرہ کی مصروفیت محسوس ہوتی رہی،اسی دوران، عصر کی اذان ہونے لگی۔میں نے فوراً پلیٹ فارم پر ہی اپنا وضو کیا،اور چار رکعت نماز فرض ادا کی۔
ہوا میں شہر کی روزمرہ کی خوشبو، اور لوگ اپنے معمولات میں مصروف، لیکن میں اپنے اندر ایک سکون محسوس کر رہا تھا۔
پھر شام کے قریب پلیٹ فارم پر حرکت بڑھی اور تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا: ''جعفر ایکسپریس کوئٹہ کے لیے پلیٹ فارم نمبر دو پر ارہی ہے۔'' انجن کی آواز دور سے سنائی دی۔ٹرین تقریباً ہمیشہ وقت پر نہیں چلتی، اور آج بھی معمول کے مطابق لیٹ تھی جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر رک گئی،لوگ اترنے لگے، کچھ چڑھنے لگے،ہر کوئی اپنی رفتار میں، اپنی دنیا میں۔
مسافر، ہاتھ میں بیگ لیے کچھ سر کے اوپر،بس خاموشی کے ساتھ اپنا راستہ بناتے جا رہے تھے۔میں بھی خاموشی سے لوگوں کو دیکھتا رہا— پلیٹ فارم پر پولیس بھائی کھڑے تھے،چہرے سنجیدہ، ہاتھ میں نوٹ بکیں،ہر ایک مسافر کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ٹی ٹی بھی ساتھ چل رہے تھے، ٹکٹ چیک کر رہے تھے،اور کبھی کبھار مسافر کو تھوڑا سا جھنجھوڑ کر سوال کرتے تھے:
''یہ ٹکٹ کہاں سے؟ کون سا اسٹیشن؟'' اندر، صفائی والے جھاڑو لیے،ہر ڈبے کے فرش کو صاف کر رہے تھے،پانی کے ٹینک بھی بھرے جا رہے تھے۔ہر ڈبے میں پانی کہاں سے بھرا جاتا، کیسے بھرا جاتا— یہ عمل اتنا معمول کا تھا کہ کوئی نہیں دیکھتا، کوئی نہیں پوچھتا۔رُکنا، دیر سے نکلنا،پلیٹ فارم کی ہلچل،اور سوال نہ کرنے والا نظام۔یہاں پوچھنے والا کوئی نہیں،نہ ہی کوئی جواب مانگتا،بس سب چلتا رہتا ہے، جیسے سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہو۔ہے، ٹرین لیٹ تھی، لیکن کوئی سوال کرنے والا نہیں تھا— نہ پلیٹ فارم پر، نہ پولیس، نہ ٹی ٹی۔کسی نے نہیں پوچھا کہ ٹرین کیوں لیٹ ہے،اور بیچارے مجبور لوگ بھی— ان کے پاس سوال کرنے کا وقت ہی کہاں؟میں بھی خیر، کیا کر سکتا تھا؟یہ تو سارا سسٹم ہی ایسا ہے۔ٹرین تقریباً 40 منٹ کے لیے رکی رہی انجن کی سیٹی دوبارہ بجی میں پہلے ہی بزنس کلاس میں اپنا سامان رکھ چکا تھا،میرا ڈبہ نمبر 5، کیبن نمبر B3، تھا سیٹ آرام دہ، اور ڈبے کی خاموشی میرے لیے درست ماحول بنا رہی تھی۔
ٹرین حرکت میں آئی پلیٹ فارم پیچھے ہٹنے لگا،چہرے دھندلے ہوتے گئے،
اور لاہور شہر اپنے شور کے ساتھ پیچھے رہ گیا ٹرین کی ہر حرکت، ہر دھچکا،پاکستانی ریلوے کے مزاج کی عکاسی کر رہا تھا مغرب کی نماز ٹرین کے اندر ہی ادا کی کیبن میں ہم چار لوگ تھے— چار مسافر،جن میں سے دو مجھے پتہ تھا کہ وہ، کوئٹہ جانے والے ہیں،اور ایک مسافر نے جیکب آباد جانا تھا ابتداء میں خاموشی تھی،ہر کوئی اپنے سفر کی سوچ میں گم۔پھر آہستہ آہستہ معمول کی باتیں شروع ہو گئیں— کب سے سفر پر روانہ ہوئے،کون سا شہر خوبصورت لگا،اور کہاں کھانے کا انتظام بہتر تھا وغیرہ وغیرہ''آپ لوگ اکثر کوئٹہ جاتے رہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا، تو ایک مسافر ہنس کر بولا: ''ہاں، تقریباً ہر سال۔ لیکن ہر سال کچھ نیا لگتا ہے ہم تین بلوچستان کے مسافر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے، چند مختصر تبصرے کرتے، کبھی سیاست پر، کبھی فوج پر تو کبھی غریب عوام پر اور پھر سب نے آرام دہ انداز میں بیٹھنا اختیار کیا۔ ملتان اسٹیشن ٹرین کچھ دیر کے لیے رکی — کچھ منٹوں کا ٹھہراؤ،
جو بڑے شہروں کی طرح لمبا نہیں ہوتا، میں نے ٹرین سے باہر قدم نکالا
، یہاں میں نے عشاء کی نماز ادا کی — فرش پر، اسٹیشن کی خاموشی میں،
چند مسافر، کچھ دور چند رکشے، کچھ روشنی کے بلب اور رات کی ٹھنڈی ہوا جو ہر زائر کو بلاتی ہو۔ پھر میں واپس آیا، کیبن میں بیٹھا، اور ٹرین پھر سے چل پڑی — ملتان کی کشیدگی اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے۔ اب کھڑکی کے باہر رات کی زمین چلتی جا رہی تھی، اور اندر چار لوگ اپنے اپنے راستے کے بارے میں سوچ رہے تھے — کچھ خاموش، کچھ اداس، کچھ امید میں۔
صبح کا آغاز ہوا تو کیبن میں ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا، ناشتہ کر لینا چاہیے تاکہ دن کے سفر کے لیے توانائی ہو۔ ڈائننگ کارڈ کی طرف بڑھا، اور خود ہی ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ گیا۔ ٹکٹ دکھائی، اور حسب معمول ناشتہ منگوایا:
ناشتہ کرتے ہوئے باہر کے مناظر دیکھتا رہا — کھیت، شہر کے دھندلے سائے، اور چھوٹے اسٹیشن جہاں لوگ اترتے اور نئے مسافر چڑھتے تھے۔ کھانے کے بعد، ڈائننگ کارڈ سے واپس کیبن میں آیا، سارا سامان ترتیب دیا، اور پھر بیٹھ گیا۔
ٹرین کی ہلکی جھٹکیاں اور انجن کی گڑگڑاہٹ یہ بتا رہی تھی کہ سفر جاری ہے۔ مسافر اسٹیشنوں سے اترتے، اور کچھ نئے مسافر چڑھتے، ٹکٹ چیکنگ جاری تھی، صفائی والے ڈبوں میں پانی اور سامان چیک کر رہے تھے، لیکن کوئی بھی زیادہ سوال نہیں کر رہا تھا — یہ ہمارا سسٹم ہے، خاموشی میں چلنے والا، جہاں سب مجبور لوگ بس سفر کرتے رہتے ہیں۔ سفر اسی طرح گزر رہا تھا، کبھی چھوٹے اسٹیشن، کبھی لمبے اسٹیشن، اور میں اکیلا، خاموشی سے لوگوں کو دیکھتا رہا آخر کار، کئی گھنٹوں کے بعد، ٹرین ٹپ ٹپ کی رفتار کے ساتھ شام سات بجے کے قریب کوئٹہ پہنچی۔ کھڑکی سے باہر دیکھ کر محسوس ہوا کہ شہر کا منظر بالکل مختلف ہے —
سٹیشن پر ماحول دھندلا سا تھا، لیکن زندگی کی گہما گہمی اپنی جگہ برقرار تھی — پلیٹ فارم پر چھوٹے چھوٹے اسٹال، چائے کے ڈبے، اور کھانے پینے کی دکانیں۔ یہ شہر خاموش بھی تھا اور شور بھرا بھی —
جہاں ہر آدمی اپنی منزل کے لیے کچھ نہ کچھ کر رہا تھا،
اور میں اکیلا، اپنے ارادے کے ساتھ، سٹیشن کے اس ماحول میں قدم رکھ رہا تھا، یہ جانتے ہوئے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے میری اگلی منزل شروع ہوگی: کوئٹہ پہنچ کر میں نے سیدھا اسٹیشن کے قریب ایک سادہ سے ہوٹل کا رخ کیا۔ تھکن پورے جسم میں اتر چکی تھی، اس لیے سب سے پہلے ٹھہرنے کی جگہ ضروری تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر میں نے عام مسافروں والے انداز میں بات شروع کی۔ ''ہاں بھائی جی، ایک رات رہنا ہے، کمرہ مل جائے گا؟'' سامنے بیٹھا شخص، جس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ برسوں سے مسافروں سے یہی سوال سن رہا ہے، ذرا غور سے مجھے دیکھ کر بولا: ''اکیلا ہو یا ساتھ کوئی ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''اکیلا ہوں، بس آرام کرنا ہے، صبح آگے نکلنا ہے۔''اس نے رجسٹر اپنی طرف کھینچا، چند سوال کیے — کہ کہاں سے آئے، کہاں جانا ہے — بالکل ویسے ہی جیسے یہاں کے ہوٹلوں میں معمول ہوتا ہے۔ پھر اس نے ریٹ بتایا۔ میں نے ہلکی سی بحث کی، جیسے ہر مسافر کرتا ہے: ''یار، ذرا کم کر لو، ایک ہی رات تو ہے۔''وہ مسکرا کر بولا: ''چلو ٹھیک ہے، تم مسافر لگتے ہو، اتنے میں لے لو۔''بات طے ہوئی، پیسے دیے گئے، اور مجھے کمرے کی چابی تھما دی گئی۔ کمرے میں آیا تو بیگ ایک طرف رکھا، جوتے اتارے، اور بستر پر بیٹھ کر ایک لمبی سانس لی۔ ہر چیز ترتیب سے رکھی — کپڑے، بیگ، کاغذات — جیسے ذہن کو بھی ترتیب دے رہا ہوں۔ اس کے بعد میں نے ہوٹل ہی سے کھانا منگوایا۔ سادہ سا کھانا تھا، مگر سفر کی تھکن میں وہی کسی نعمت سے کم نہیں لگتا۔ کھانا کھا چکا تھا، کمرے میں خاموشی تھی، میں ذرا ریلیکس ہونے ہی لگا تھا کہ اچانک دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

دروازہ کھولا تو سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ انداز سے لگ رہا تھا کہ ہوٹل والوں میں سے ہی ہے۔ اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا: ''بھائی، ایک بات تھی...''میں نے پوچھا: ''جی، کیا ہوا؟''وہ بولا: ''اصل میں آج کمرے سارے فل ہو گئے ہیں، تو میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں آپ کے کمرے میں رات گزار سکتا ہوں؟''یہ سن کر میں چونکا۔ میں نے صاف اور سیدھا جواب دیا: ''نہیں یار، یہ ممکن نہیں۔ میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔''وہ ذرا آگے بڑھا اور بات بڑھانے لگا: ''دیکھیں، بات یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک ہی چارپائی ہوتی ہے۔ پہلے ابو گھر چلے جاتے تھے تو میں ہوٹل میں اکیلا سو جاتا تھا، لیکن آج ابو بھی ہوٹل میں ہی رک گئے ہیں۔ اس وجہ سے میرے پاس جگہ نہیں بچی، تو اگر آپ اجازت دیں...''میں نے اسے غور سے دیکھا اور پوچھا: ''تمہارا اپنا کمرہ نہیں ہے؟ تم کہاں رہتے ہو عام دنوں میں؟''وہ بولا اُسی کمرے میں جہاں ابو ارام کر رہے ہیں اب میری آواز میں سختی آ گئی: ''نہیں، میں اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ میرا کمرہ ہے، اور میں اکیلا رہوں گا۔''اس نے ایک لمحہ مزید کوشش کی، لیکن جب میں نے دوبارہ غصے میں منع کیا تو وہ خاموشی سے پلٹا اور چلا گیا۔

میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایک اجنبی شہر، رات کا وقت، اور ایسا واقعہ — خوف آ جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ میں جسمانی طور پر بھی خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا؛ میں نے کبھی کراٹے، تائیکوانڈو یا کسی مارشل آرٹ کی باقاعدہ تربیت نہیں لی تھی۔ ہاں، ہتھیار چلانا مجھے اچھی طرح آتا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت میرے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا، کمرے کا جائزہ لیا، دروازہ دوبارہ چیک کیا، اور پھر خاموشی میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ ''اب آگے کیا کرنا ہے؟ یہاں کیسے کام شروع کرنا ہے؟ کس پر اعتماد کرنا ہے اور کس پر نہیں؟''اسی سوچ میں رات گزری۔ اگلے دن میں نے کوئٹہ کو سمجھنا شروع کیا۔ گلیاں، لوگ، بازار، ہوٹل، رکشے — سب کچھ غور سے دیکھا۔ میں نے جلدی میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ دو، تین دن میں نے یہی کیا: شہر کو پڑھا، ماحول کو محسوس کیا، اور اپنے ذہن میں اگلے مرحلے کا خاکہ بنایا۔

اسی دوران، مجھے یہ فکر رہتی تھی کہ اگلے مرحلے کے لیے مجھے ایسے لوگ چاہیے ہوں جو مجھے بارڈر کی طرف لے جائیں۔ لیکن اعتبار کے قابل بندوں کا پتا لگانا آسان نہیں تھا۔ تیسرے دن، ایک سادہ سے چائے خانے میں، میری نظر ایک شخص

پر ٹھہر گئی۔ قد درمیانہ، داڑھی تراشی ہوئی، آنکھیں حد سے زیادہ چوکنی۔ وہ پٹھان تھا— یہ اس کے لہجے اور نشست سے صاف ظاہر تھا۔

میں نے معمول کی بات سے گفتگو شروع کی: ''چائے اچھی ہے یہاں کی۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا پھر اس نے پوچھا: ''پہلی دفعہ آئے ہو؟'' میں نے سر ہلایا: ''ہاں، ذرا کوئٹہ کی سیر کرنے آیا ہوں۔'' اس نے چائے کی چسکی لی اور سادہ لہجے میں بولا ''کوئٹہ میں تو بس بازار ہیں، ہنڈی، قلعہ، وہی سب

میں نے بھی کہہ دیا ہاں یہ سب کچھ میں نے دیکھ لیا باتوں باتوں میں، میں نے پوچھا: ''بھائی، اگر مجھے بارڈر کی طرف جانا ہو، ، تو وہاں کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟'' وہ ہنس کر بولا: ''ارے بھائی، بارڈر؟ وہاں کیا کرنے جانا چاہتے ہو؟ میں نے آرام سے کہا: ''بس ویسے ہی، دیکھنے کے لیے۔ ، وہاں کا ماحول کیسا ہے، کچھ یادگار جگہیں دیکھنا وہ ذرا غور سے مجھے دیکھ کر بولا: ''اچھا... ٹھیک ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بارڈر والے علاقے تھوڑے حساس ہیں۔ لیکن اگر تم نے صحیح لوگوں سے رابطہ کرنا ہو، تو نوشکی جانا بہتر ہے وہاں ایک بڑا ڈیرا ہے— ڈیرا خان بہادر۔ وہاں کے لوگ سب سمجھدار ہیں، تمہیں آگے کا راستہ بتا دیں گے۔ میں نے ہلکی ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا: ''لیکن وہ علاقے خطرناک نہیں ہیں؟ میں پنجابی ہوں، لوگ کیسے دیکھیں گے؟'' اس نے آرام سے جواب دیا: ''پنجابی ہونے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر تم ان سے کہو، تو تمہیں گاڑی، راستہ اور رہائش بھی دیں گے لیکن بس تمہیں یہ یاد رکھنا ہے کہ سنبھل کے رہو، اور اپنے بارے میں واضح بتاو— کہ تم صرف سیر کرنے آئے ہو۔'' میں نے پھر پوچھا: ''وہ ڈیرا شہر کے مرکز سے کتنی دور ہے؟ اس نے بتایا:

''نوشکی کے جنوب میں تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہاں کے لوگ سخت مگر قابل اعتماد ہیں۔ تمہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا۔ راستہ سیدھا ہے، اگر تم چاہو تو گاڑی لے سکتے ہو، اور اگر پیدل آنا چاہو تو بھی لوگ تمہیں بتا دیں گے۔'' اسی گفتگو کے بعد میں نے ذہنی طور پر فیصلہ کیا کہ اب نوشکی کے لیے روانہ ہونا ہے۔

یہ سب میں نے باتوں باتوں میں جان لیا، اور اپنے اندر اعتماد پیدا کیا کہ راستے کے بارے میں مجھے مکمل معلومات ہیں۔

ہوٹل سے نکل کر میں نے سب سے پہلے اڈے کی طرف رخ کیا۔ وہاں کا ماحول روزمرہ کے مسافروں اور ٹرک ڈرائیوروں سے بھرا ہوا تھا— ہر طرف شور، لوگ رکشے اور چھوٹی گاڑیاں تلاش کر رہے تھے، کچھ سامان باندھ رہے تھے، اور کچھ بسوں کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے خود کو عام مسافر کی طرح پیش کیا اور پوچھا: ''بھائی، نوشکی کے لیے کون سی گاڑی جا رہی ہے؟'' ایک مقامی شخص نے غور سے مجھے دیکھا اور بولا: ''نوشکی؟ اچھا، بس یہاں سے نکلتی ہے میں نے پوچھا:

''کتنی دیر لگتی ہے اور کہاں اترنا ہوگا؟'' اس نے بتایا: ''تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا اسٹاپ ہے وہاں اتر جانا میں گاڑی میں سوار ہو گیا تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کے بعد، میں نوشکی پہنچ گیا۔

گاڑی نوشکی کے اڈے پر پہنچی تو یہاں اتر کر میں نے اپنا بیگ سنبھالا اور اڈے کے چھوٹے سے اسٹاپ کا جائزہ لیا۔ اڈے کے آس پاس چھوٹی دکانیں تھیں، کچھ چائے کے اسٹال اور کچھ کھانے پینے کی جگہیں، لیکن زیادہ رش نہیں تھا۔ میں نے

چند لمحے وہاں رک کر ماحول کو محسوس کیا—لوگ دوستانہ لگ رہے تھے، مگر اپنی روزمرہ کی مصروفیت میں مصروف تھے۔
نوشکی کے اڈے پر اتر کر، میں نے اگلی گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ مقامی شخص نے مجھے ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا جو ڈیرہ خان بہادر کے لیے روانہ ہونے والی تھی۔ یہ گاڑی نسبتاً چھوٹی تھی، لیکن راستے کے لیے بہتر اور محفوظ لگ رہی تھی۔ میں نے بیگ اٹھایا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی کے اندر، ڈرائیور نے آرام سے بتایا کہ راستہ تھوڑا لمبا ہے، لیکن محفوظ اور اکثر مقامی لوگ اسی راستے سے ڈیرہ خان بہادر جاتے ہیں۔ راستے میں خشک زمین، چھوٹے گاؤں، پہاڑی کنارے اور مقامی لوگ نظر آ رہے تھے۔ کچھ لوگ اونٹ کی ٹولی کے ساتھ جا رہے تھے، اور کچھ روزمرہ کے کام میں مصروف تھے۔ ڈیرا خان بہادر پہنچ کر، مجھے لوگ حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کچھ چرواہے اپنی روزمرہ کی مصروفیت میں تھے، مگر جیسے ہی میں گاڑی سے اترا، سب کی توجہ میری طرف مرکوز ہو گئی۔ میں نے فوراً اپنا موقف واضح کیا، مگر اس بار درخشانی بلوچی زبان میں سلام کیا تاکہ مقامی لوگ سمجھیں اور میرا مقصد صاف ہو: ''سلام علیکم، تئ حال چون اِنت توں سراں ہے؟''
(السلام علیکم، کیا حال ہے؟ اپ سر آنکھوں پر) کچھ لوگ فوراً سمجھ گئے اور مسکرا کر جواب دیا: ''وعلیکم السلام !توں سراں ہے
میں نے پھر بلوچی میں کہا: ''من سراں تفریح آ ہے، (گھومنے پھرنے آیا ہوں)۔ زیادہ بلوچی ناہیں آتی، مگر کوشش کر رہا ہوں اس پر بزرگ نے خوشی سے جواب دیا: ''چلو خوش آمدید! توں ہمارے مہمان آ ہے، فکر نہ کر۔'' چند لوگ میری بات سمجھ گئے، کچھ لوگوں کو سمجھ نہیں آئی۔ میں نے اشاروں اور جسمانی انداز سے اپنی بات واضح کی کہ میں مہمان ہوں، خوش قسمتی سے کچھ لوگوں کو اردو بھی آتی تھی، جس سے بات چیت آسان ہو گئی۔ لوگوں کی نظروں میں حیرت اور دلچسپی تھی۔ کچھ نے پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو۔ میں نے تھوڑا ہچکچاتے ہوئے درخشانی بلوچی لہجے میں جواب دیا:
''من پنجاب آ ہے، من پنجابی آں۔'' (میں پنجاب سے آیا ہوں، میں پنجابی ہوں) یہ سن کر وہاں کے لوگ مسکرائے اور کہا:
''، کوئی مسئلہ ناہیں، توں ہمارے بھائی آ ہے۔''
میں نے ان کی اس مہمان نوازی پر دل سے سکون محسوس کیا اور سمجھ گیا کہ یہاں لوگ واقعی مہمانوں کے ساتھ عزت اور دلچسپی سے پیش آتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ نوشکی اور ڈیرا خان بہادر میں کچھ چیزیں مشہور ہیں—بلوچوں کی ہاتھ سے بنی ٹوپیاں، اونٹ کی شالیں، اور وہ خاص چائے جو صرف یہاں کے چائے خانے میں ملتی ہے۔
میں نے وہاں ڈیرے کے لوگوں سے بات چیت کی، تو پھر وہ مجھے مختلف جگہ لے گئے—بازار، چھوٹی دکانیں، ہر جگہ، لوگوں کی آنکھوں میں دلچسپی، اور بول چال میں مہمان نوازی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد، میں نے مقامی چائے

خانے کا رخ کیا۔ چائے خانے کے اندر، دھوپ کی روشنی میں مٹی کی خوشبو، چائے کی خوشبو کے ساتھ مل کر ایک منفرد ماحول بنا رہی تھی۔ میں نے سلام پیش کیا اور کہا: ”توڑا پھتھیں کھاؤ، سر تفریح کے لیے آیا ہوں“ (یعنی: آپ کھائیں، میں سیر کے لیے آیا ہوں) چائے خانے کے لوگ پہلے حیران ہوئے، لیکن پھر اپنی ثقافتی مہمان نوازی کا انداز دکھایا۔
مجھے بلوچی چائے پیش کی گئی، جو کافی کڑک اور خوشبودار تھی۔ بلوچستان کی ان سنگلاخ وادیوں میں جب کوئی آپ کو چائے کا پیالہ پیش کرے، تو سمجھ لیں اس نے اپنا دل آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہاں چائے سے انکار محض 'نا' نہیں، بلکہ ان کی خلوص بھری دوستی سے منہ موڑنے کے برابر ہے اسے رد کرنا میزبان کی دل شکنی سمجھا جاتا ہے میں نے بھی جب وہ گرم پیالہ تھاما، تو محسوس ہوا کہ اس کڑوی چائے میں ان کی روایات کی کتنی مٹھاس چھپی ہے۔ یہ ان کا اندازِ محبت ہے، جسے میں نے بخوشی قبول کیا۔ ڈیرے پر واپس آکر میں نے بارڈر کی طرف جانے کی بات کی: تو انہوں نے پوچھا کیوں میں نے کہا ”بس ویسے ہی گھومنے پھرنے کے لیے جانا چاہتا ہوں، اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے احتیاطاً کچھ ضروری باتیں تھیں وہ بھی بتائیں انہوں نے غور سے میری بات سنی اور کہا:
”ٹھیک ہے، تمہیں آواران تک لے جائیں گے۔ راستہ محفوظ ہے، تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ تم بس ہماری ہدایات پر عمل کرنا، اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنا۔“ اسی دن، انہوں نے مجھے ایک مقامی شخص کے حوالے کیا، جو بارڈر تک جانے اور آواران تک پہنچانے کے لیے ذمہ دار تھا۔ اس شخص نے راستے کی تفصیل دی، اور بتایا کہ راستہ محفوظ ہے، لیکن احتیاط لازمی ہے۔ ڈیرا خان بہادر کے لوگ، جنہوں نے مجھے دو دن تک اپنے گھرانے کی مہمان نوازی دکھائی، مجھے رخصت کرنے آئے۔ انہوں نے بڑے احترام سے کہا: ”اب تمہاری اگلی منزل آواران ہے۔ تم ہمارے ساتھ محفوظ ہاتھوں میں ہو۔“ انہوں نے مجھے اون کی بنی شال اور کچھ تحفے بھی دیئے میں نے شکریہ ادا کیا، اور ان کے ہاتھوں سے الوداع کہا۔
نوشکی کا یہ سفر، مہمان نوازی، اور مقامی لوگوں کی ثقافت میرے لیے ایک یادگار تجربہ بن گیا۔ میں نے وہاں دو دن گزارے، ہر چیز دیکھی، اور سب کچھ ذہن میں محفوظ کیا — چائے، ٹوپیاں، اونٹ کی شالیں، اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی مہمان نوازی۔ میرے ساتھ جو شخص آواران تک جا رہا تھا، اس کا نام فراز بلوچ تھا، تقریباً 45 سال کا ایک مضبوط اور تجربہ کار شخص۔ اس کی شخصیت میں مہمان نوازی اور اعتماد دونوں جھلک رہے تھے۔ وہ پہلے ہی علاقے کے راستوں اور مقامی لوگوں کے حالات سے بخوبی واقف تھا، اور مجھے ہر لمحے یہ اعتماد دیتا رہا کہ راستہ محفوظ ہے۔ راستہ سنسان اور خشک تھا، لیکن کنارے کنارے چھوٹے چھوٹے گاؤں، چند مقامی لوگ، اور پتھریلی زمین کے مناظر نے سفر کو دلچسپ بنایا۔ فراز بلوچ راستے میں مجھے ہر جگہ کی تفصیل بتاتا رہا — کہ یہ گاؤں کس کے زیرِ انتظام ہے، یہاں کے لوگ کس کام میں مشغول ہیں، آواران اور بارڈر کے قریب کون سے ڈیرے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ وہ مجھے بلوچی میں کچھ الفاظ بھی سکھاتا رہا، اور پھر میں ان پر مسکرا کر باتیں کرتا رہا۔ یہ سفر میں بعد میں لکھوں گا، مگر یہاں ایک بات کہنا ضروری ہے۔
میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ زمین نفرت کی نہیں، مہمان نوازی کی ہے۔ میں پنجابی تھا، زبان مختلف تھی، لباس

مختلف تھا، مگر دلوں کے دروازے بند نہیں تھے۔ یہاں کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کس قوم سے ہو، کس صوبے سے ہو، کس زبان میں سوچتے ہو۔

بس ایک سوال تھا: ''مہمان ہو؟'' اور جب جواب ''ہاں'' تھا، تو پھر سب کچھ اپنا ہو گیا۔ یہی بلوچ ہیں۔ یہی پٹھان ہیں۔ یہی پنجابی ہیں۔ مسئلہ عوام نہیں، مسئلہ وہ ہاتھ ہیں جو اوپر بیٹھ کر دھاگے ہلاتے ہیں۔ جو ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ: پنجابی بلوچ کا دشمن ہے بلوچ پٹھان کا دشمن ہے پٹھان سندھی سے الگ ہے

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ: ہم سب ایک ہی دھوپ میں جلتے ہیں ہم سب ایک ہی غربت میں سانس لیتے ہیں ہم سب ایک ہی نظام کے نیچے دبے ہوئے ہیں یہ نفرت ہماری نہیں، یہ مسلط کی گئی ہے۔ یہ لڑائیاں ہماری نہیں، یہ کرائی گئی ہیں۔

سیاست دانوں نے ہمیں آپس میں الجھا دیا، تاکہ ہم ان سے سوال نہ کریں۔ ہمیں زبانوں میں بانٹا گیا، قومیتوں میں تقسیم کیا گیا، صوبوں کے نام پر لڑوایا گیا — صرف اس لیے کہ اصل مجرم محفوظ رہیں۔

اگر بلوچ واقعی پنجابی سے نفرت کرتا، تو ایک اکیلا پنجابی اس کے ڈیرے میں دو دن مہمان نہ بنتا۔ اگر پٹھان واقعی نفرت کرتا، تو وہ راستہ نہ بتاتا، چائے نہ پلاتا، لفظوں میں تحفظ نہ دیتا۔ یہ جو آج کی لڑائیاں ہیں، یہ عوام کی نہیں، مفادات کی ہیں۔ اور اگر عالمی ضمیر سن رہا ہے، تو اسے معلوم ہونا چاہیے: یہ خطہ دہشت کا نہیں، درد کا خطہ ہے یہاں لوگ جنگ نہیں، عزت چاہتے ہیں

یہاں نفرت نہیں، انصاف مانگا جا رہا ہے ہم بھائی تھے، ہم بھائی ہیں، اور اگر ہمیں چھوڑ دیا جائے — تو ہم بھائی ہی رہیں گے۔ یہ باتیں کسی کے خلاف نہیں، یہ سوچ کے حق میں ہے۔ یہ بندوق نہیں، آئینہ ہے۔ سفر تقریباً دس سے بارہ گھنٹے کا تھا۔ راستے کے دوران ہم نے چھوٹے چھوٹے اسٹاپ لیے، پانی پیا، اور مقامی گاؤں کے لوگ ہمیں حیرت بھری نظروں سے دیکھتے۔ ہر اسٹاپ پر فراز بلوچ لوگوں سے بات کرتا، اور میں انہیں محض ہلکی سے تعارف کے ساتھ بتاتا کہ میں صرف سیر کے لیے آیا ہوں۔

فراز بلوچ نے راستے میں مجھے بتایا کہ آواران کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں، لیکن ان سے بات کرنے کے لیے احترام اور ادب لازمی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر کسی ڈیرے پر قیام کرنا ہو، تو پہلے سلام کرنا اور پھر اپنا مقصد واضح کرنا سب سے ضروری ہے آخرکار ہم آواران کے قریب پہنچے اور تو پہلی بات جو محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ یہ علاقہ واقعی حساس اور خطرناک ہے۔ یہاں کے پہاڑ اور وادیاں اکثر خالی اور سنسان دکھائی دیتے ہیں، اور راستے میں چھوٹے چھوٹے ڈیرے اور مقامی آبادی کے چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ یہاں زیادہ خطرہ اکثر غیر ہم آہنگ گروہوں، غیر قانونی ہتھیار رکھنے والے، اور دور دراز علاقوں میں چھپے ہوئے ماضی کے جنگجوؤں سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہر قدم پر احتیاط ضروری ہے، اور کسی پر فوری بھروسہ کرنا غیر محفوظ ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنے مقامی ہمراہ، فراز بلوچ کے ساتھ، ایک محفوظ اور مہمان نواز ڈیرا تک کا سفر طے کیا۔ یہ لوگ واقعی دل کے صاف اور مہمان نواز تھے

سب سے پہلے تو میں نے ڈیرا کے بزرگوں اور مقامی لوگوں کو بلوچی انداز میں سلام کیا:
''سلام علیکم'' کے بجائے میں نے کہا:''السلام برے''لوگوں کی نظریں مجھ پر تھیں — کچھ تجسس، کچھ احتیاط، اور کچھ خالص مہمان نوازی۔

:وعلیکم السلام، واجہ

(واجہ' بلوچی میں جناب یا سر کو کہتے ہیں)

میں نے کہا زمن آرام چاہت – (مجھے آرام چاہیے)

یہ سن کر چند لوگ آپس میں دیکھنے لگے، جیسے اندازہ لگا رہے ہوں۔ پھر ایک آواز آئی:

سر چملاں (سر انکھوں پر)

میں نے پھر بلوچی میں مختصر تعارف دیا، تھوڑا ہچکچاتے ہوئے:''میں پنجاب سے آیا ہوں، تفریح کیلئے زیادہ بلوچی نہیں آتی، لیکن یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں کے لوگ، رسم و رواج کیسے ہیں۔''

ان میں سے کچھ لوگ مسکرا دیے اور بولے

:بے زمہ بخیر آمدید(خوش امدید بھائی)اسی لمحے فراز بلوچ آگے بڑھا۔ وہ میرے ساتھ تھا، اور بلوچی زبان اس کی اپنی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے میرا تعارف خود سنبھال لیا۔فراز نے ان سے نرم مگر پُراعتماد لہجے میں بات کی، کچھ جملے تیزی سے کہے، کچھ آہستہ — وہ انہیں بتا رہا تھا کہ میں کون ہوں، کیوں آیا ہوں، اور میرا مقصد صرف گھومنا، دیکھنا اور سیکھنا ہے۔ میں سب کچھ لفظ بہ لفظ نہیں سمجھ پایا، مگر لہجے اور چہروں سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ فضا بدل رہی ہے۔ سختی کی جگہ نرمی آ رہی تھی، اور اجنبیت کی جگہ اپنائیت۔ بات ختم ہوئی تو ایک بزرگ نے مسکرا کر کہا:''اب یہ ہمارا مہمان ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔''اور یوں، چند جملوں کے تعارف اور فراز بلوچ کی چند باتوں نے میرے اور اس اجنبی زمین کے درمیان ایک خاموش سا اعتماد قائم کر دیا۔

بلوچ معاشرے میں مہمان نوازی صرف روایت نہیں، غیرت کا حصہ ہوتی ہے۔بلوچوں کی نمایاں خصوصیت ہے یہ وہ اپنے مہمان کو ذمہ داری سمجھتے ہیں۔اگر مہمان ان کے دائرے میں آ جائے، تو اس کی حفاظت، عزت، اور ضرور تمیز بان کی غیرت سے جڑ جاتی ہے۔یہاں مہمان پر ہاتھ اٹھنا یا اسے نقصان پہنچنا صرف جرم نہیں — بدنامی سمجھا جاتا ہے۔اسی لیے جب کسی نے کہا:''اب یہ ہمارا مہمان ہے''تو وہ جملہ نہیں تھا، وہ ایک اعلان تھا — کہ اب اس شخص کی طرف کوئی میلی آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔بلوچ معاشرے کی ایک اور خاموش مگر مضبوط روایت یہ ہے کہ وہ اپنے مہمان سے زیادہ سوال نہیں کرتے۔یہاں یہ بدتمیزی سمجھی جاتی ہے کہ کسی اجنبی سے فوراً پوچھا جائے:

کہاں جا رہے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ کب واپس جاؤ گے؟پہلے اسے بیٹھنے کی جگہ دی جاتی ہے،

پہلے اس کا بوجھ ہلکا کیا جاتا ہے، پھر وقت خود فیصلہ کرتا ہے کہ کیا پوچھنا ہے اور کیا نہیں۔میں نے محسوس کیا کہ

کئی لوگ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے، مگر زبان خاموش تھی۔نہ تفتیش، نہ جرح، نہ شک۔یہاں اجنبی ہونا جرم نہیں، بے ادبی جرم ہے۔جب تک میں ان کے دائرے میں تھا،
میری خاموشی بھی قابلِ احترام تھی اور میری لاعلمی بھی۔یہ بلوچوں کی وہ روایت ہے جس میں انسان کو پہلے انسان سمجھا جاتا ہے، پھر اس کی شناخت پوچھی جاتی ہے۔ رات میں ڈیرا میں قیام کے دوران، میں نے ماحول کو محسوس کیا—چھوٹے چولہے کی آگ، دھویں کی خوشبو، ہاتھ سے بنی چیزیں، اور لوگ جو اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف تھے مگر مہمان کو پوری توجہ دے رہے تھے۔انہوں نے بتایا کہ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور غیر ہم آہنگ عناصر سے اپنے علاقے کو محفوظ رکھتے ہیں۔انہوں نے کھانے میں بلوچی پکوان پیش کیے—چھوٹی چھوٹی روٹیاں، مقامی گوشت، اور مخصوص مصالحہ جات، جو عطر کی خوشبو کے ساتھ خوشبودار لگ رہے تھے۔رات کو، میں نے فراز بلوچ سے کہا''، تم واپس جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ میں خود بارڈر تک جاؤں گا۔
تمہاری زحمت بہت شکریہ، لیکن میرا کام خود کرنا ضروری ہے۔''فراز بلوچ نے بہت اصرار کیا کہ وہ ساتھ جائے اور مدد کرے، لیکن میں نے اسے منع کر دیا:اور کہا میں خود سب دیکھ لوں گا۔ تمہارا بہت شکریہ۔''اگلی صبح فراز بلوچ واپس چلا گیا، اور میں اکیلا ہی اگلے مرحلے کے لیے تیار ہوا۔ اب میرا مقصد تھا ماہی گیروں سے ملاقات کرنا، ساحلی بارڈر کی صورتحال جاننا۔ اس کے لیے میں نے پہلے سے ذہن میں پلان بنایا تھا کہ کس طرح ایک دن ڈیرا میں گزاروں، لوگوں سے بات چیت کروں، اور اپنی شناخت محفوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھوں۔ڈیرا میں ایک دن قیام کے دوران، میں نے ماحول، لوگوں کی عادات، کھانے پینے، اور راستے کے بارے میں ہر چیز نوٹ کی۔ اگلی صبح، میں مقامی ڈیرے سے تھوڑر دور ماہی گیروں سے ملاقات کرنے کیلئے گیا شروع میں وہ لوگ مجھے دیکھ کر ذرا محتاط ہو گئے۔ کیونکہ یہ علاقہ حساس اور خطرناک تھا۔اجنبی چہرہ، وہ بھی اس علاقے میں—یہ فطری بات تھی۔ ان کی نظریں سوال کرتی تھیں، مگر لہجے میں سختی نہیں تھی۔میں نے حسبِ روایت پہلے سلام کیا، پھر آہستہ اور شائستگی سے اپنا تعارف کروایا۔ میں نے بتایا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں، صرف سیر و تفریح اور علاقے کو دیکھنے کے شوق میں۔
بلوچی کے چند الفاظ، کچھ اردو، اور باقی اشاروں سے بات آگے بڑھی۔ چند لمحوں بعد ایک دو لوگوں نے اردو میں جواب دینا شروع کیا، تو فضا کچھ ہلکی ہو گئی۔بات چیت آہستہ آہستہ روزمرہ موضوعات کی طرف چلی گئی—ماہی گیری، موسم، سمندر کا مزاج، اور ان کی محنت بھری زندگی۔ انہوں نے بتایا کہ کب سمندر نرم ہوتا ہے اور کب اچانک خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں زیادہ سوال نہیں کر رہا تھا، بس سن رہا تھا۔ یہی بات شاید ان کو پسند آئی۔کچھ دیر بعد انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ چائے آئی، سادہ مگر خلوص سے بھری ہوئی۔ میں نے انکار نہیں کیا، کیونکہ یہاں انکار کو اپنائیت سے دوری سمجھا جاتا ہے۔ اسی ایک کپ چائے نے اجنبیت کا پردہ خاصا ہٹا دیا۔دوپہر کے بعد، جب باتیں کچھ کھل گئیں، میں نے بہت احتیاط سے، باتوں باتوں میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص آگے کی طرف جانا چاہے—یعنی ساحلی راستے سے جیوانی کی سمت—تو راستہ کیسا ہوتا ہے۔ میں نے کوئی سیدھا سوال نہیں کیا، بس عمومی انداز میں بات رکھی۔ وہ فوراً نہیں بولے۔ کچھ

لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک نے کہا کہ راستہ ہے، مگر سمجھ بوجھ ضروری ہے۔ دوسرے نے بات آگے بڑھائی کہ اگر نیت صاف ہو اور بندہ زیادہ شور نہ کرے تو مسئلہ نہیں ہوتا۔ میں نے فوراً واضح کیا کہ میرا مقصد صرف دیکھنا اور سمجھنا ہے، کوئی اور ارادہ نہیں۔ میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی واضح کیا کہ میں کسی ہوٹل یا شہر میں نہیں ٹھہرا ہوا، بلکہ قریبی ڈیرے پر ہی رکا ہوں اور وہاں باقاعدہ مہمان کی حیثیت سے موجود ہوں۔ یہ بات سنتے ہی ان کے چہروں پر ایک غیر محسوس سا اطمینان آ گیا۔ یہاں مہمان ہونا محض قیام نہیں، بلکہ ذمہ داری بھی سمجھا جاتا ہے۔ ایک نے دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا، جیسے کہنا چاہتا ہو کہ ''یہ اکیلا اور بے آسرا نہیں ہے۔''

انہوں نے کہا: ''ٹھیک ہے، پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ تم ہمارے ہی مہمان ہو۔'' اس جملے کے ساتھ ہی فضا مزید کھل گئی باتوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ انہوں نے مجھے ساحل کے نشیب و فراز، موسم کے بدلتے تیور، اور ان دنوں کی کہانیاں سنائیں جب سمندر مہربان بھی ہوتا ہے اور کبھی اچانک قہر بھی بن جاتا ہے۔ جب ہم خاصے گھل مل گئے، تو میں نے نہایت احتیاط سے ایک مرتبہ پھر بات چھیڑی۔ میں نے براہِ راست کچھ نہیں کہا، بس اتنا پوچھا کہ اگر کوئی واقعی آگے جانا چاہے، ساحل کے ساتھ ساتھ، تو کیا ممکن ہے؟ بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ان کی نظریں بدل گئیں—اب وہ مہمان کو نہیں، نیت کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نے ذرا سنجیدہ لہجے میں پوچھا: ''یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں سمجھ گیا کہ یہاں ایک لفظ بھی تول کر بولنا ہوتا ہے۔ میں نے فوراً بات سنبھالی اور صاف انداز میں کہا کہ میرا کوئی غلط ارادہ نہیں، نہ ہی میں کسی مسئلے میں پڑنا چاہتا ہوں۔ بس جاننے اور سمجھنے کا شوق ہے، بس اتنا ہی۔ انہوں نے مجھے شک کی نگاہ سے ضرور دیکھا، مگر لہجہ سخت نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد ایک ماہی گیر نے کہا:

''تم ہمارے مہمان ہو، اس لیے بات سن لی۔ مگر یہ علاقہ کھیل نہیں ہے۔ یہاں ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھا جاتا ہے۔''

میں نے سر ہلا کر ان کی بات تسلیم کی۔ اس کے بعد ماحول دوبارہ نسبتاً نارمل ہو گیا، مگر احتیاط صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ دیر مزید بات چیت کے بعد شام کے قریب میں نے اجازت چاہی کہ میں واپس ڈیرے کی طرف جانا چاہتا ہوں اور اگر ممکن ہو تو میں ایک دن ان کے ساتھ سمندر میں گزارنا چاہتا ہوں

انہوں نے بات سنی، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، جیسے خاموش مشورہ ہو رہا ہو۔ آخرکار ایک نے کہا:

''ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔ ہم کل ویسے بھی جیوانی کی طرف نکل رہے ہیں۔ اگر چاہو تو ہمارے ساتھ آ سکتے ہو۔''

میں نے فوراً شکریہ ادا کیا، مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا کہ آج کی رات میں ڈیرے پر ہی گزاروں گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں وہاں جن لوگوں کا مہمان بنا ہوا ہوں، پہلے ان کا حق بنتا ہے کہ میں ان کا شکریہ ادا کروں، ان سے اجازت لوں، اور انہیں اعتماد میں رکھوں۔ میں کسی کے احسان کو خاموشی سے چھوڑ کر جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ بات سن کر ان کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ شاید انہیں میرا یہ انداز اچھا لگا۔ انہوں نے کہا: ''یہ ٹھیک ہے۔ مہمان کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ صبح پھر نکلیں گے۔'' میں نے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا، ہاتھ ملا کر رخصت لی، اور واپس ڈیرے کی طرف چل پڑا یہ لوگ مستقل ایک جگہ نہیں رہتے تھے۔ ان کی زندگی سمندر کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ کبھی کئی دن بستی میں رہتے،

پھر ایک چکر میں سمندر کی طرف نکل جاتے، اور بعض اوقات ایک ہفتے یا دس دن بعد واپس آتے۔ یہ آنا جانا ان کے لی معمول تھا، مگر ہر بار احتیاط کے ساتھ۔ وہ جانتے تھے کہ کون سا وقت ٹھیک ہے، اور کب رک جانا بہتر ہے۔میں شام ڈھلے واپس ڈیرے میں آ گیا۔ دن بھر کی باتوں، چہروں اور اشاروں کے بعد اب دل قدرے مطمئن تھا۔ ڈیرے والوں نے حسبِ روایت کھانا تیار کر رکھا تھا—سادہ مگر خلوص سے بھرا ہوا۔ ہم سب ایک ہی چٹائی پر بیٹھے، اور میں نے دن بھر کی ملاقاتوں کا مختصر ذکر کیا۔ میں نے بتایا کہ میں ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ جیوانی پوائنٹ کی طرف جانا چاہتا ہوں، بس دیکھنے اور سمجھنے کے لیے۔ انہوں نے زیادہ سوال نہیں کیے، صرف اتنا کہا کہ ''یہ علاقہ آسان نہیں، مگر نیت صاف ہو تو راستے خود کھل جاتے ہیں۔

''رات وہیں ڈیرے میں گزری۔ ، ٹھنڈی ہوا، اور اندھیرے میں جلتا ایک مدھم سا لیمپ—یہ سب کسی اور ہی دنیا کا احساس دے رہے تھے۔ صبح سویرے، فجر کے بعد، ڈیرے والے میرے لیے پھر سے متحرک ہو گئے۔ چائے بنی، کچھ خشک روٹیاں اور مکھن سامنے رکھا گیا۔ رخصت کا وقت قریب تھا۔ میں نے جاتے ہوئے اپنی طرف سے محبت کی ایک نشانی پیش کی۔ میرے پاس پنجاب سے لایا ہوا خالص ملتان کا اجرک نما رومال تھا۔ میں نے وہ انہیں پیش کیا۔ انہوں نے ، مسکرا کر قبول کر لیا۔ جواب میں انہوں نے مجھے ایک ہاتھ سے بنی ہوئی بلوچی ٹوپی اور خشک مچھلی کا چھوٹا سا پیکٹ دیا—یہاں کا خاص تحفہ۔ یہ لین دین نہیں تھا، یہ اعتماد اور رشتے کی علامت تھی۔انہوں نے مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، ہاتھ ملا کر، کندھے پر ہاتھ رکھ کر۔ اس رخصتی میں کوئی لمبا جملہ نہیں تھا، بس آنکھوں میں ایک خاموش یقین تھا۔

یوں، میں نے ڈیرے میں چند دن گزارا کر لوگوں کا اعتماد حاصل کیا، ماحول کو پرکھا، اور بارڈر تک کے لیے اپنا ایک ابتدائی ذہنی خاکہ مکمل کیا۔

سمندر کی طرف میں راہگیروں کے ساتھ روانہ ہوا، اور وہیں سے ڈیرہ چھوڑ دیا۔راستہ کافی طویل تھا۔ کہیں پہاڑ تھے، کہیں خشک اور بے جان زمین،اور کبھی کبھار کوئی چھوٹا سا گاؤں جیسے انسانی موجودگی کا آخری نشان آخر کار ہم وہاں پہنچ گئے۔ سمندر قریب تھا، مگر اس قربت میں بھی ایک اجنبیت تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سامنے ہو کر بھی خود کو ہم سے الگ رکھے ہوئے ہےاگلی صبح جب روشنی پھیلی تو فیصلہ ہوا کہ کشتی کو پانی کے کنارے لایا جائے۔ کشتی کوئی نئی نہیں تھی، مگر مضبوط تھی—ایسی جس نے پہلے بھی کئی سخت دن دیکھے تھے۔سب سے پہلے کشتی کو ریت سے آہستہ آہستہ پانی کی طرف سرکایا گیا۔لکڑی اور فائبر کے جوڑ دیکھے گئے—کہیں دراڑ تو نہیں، کہیں کیل ڈھیلی تو نہیں۔رسیاں کھولی گئیں، پھر دوبارہ باندھی گئیں،تاکہ سفر کے دوران کوئی ڈھیلا پن نہ رہے۔انجن کو ایک بار چلایا گیا، پھر دوسری بار۔آواز سنی گئی—کیا یہ معمول کے مطابق ہے؟دھواں زیادہ تو نہیں؟ایندھن کا اندازہ لگایا گیا۔پانی نکالنے کا راستہ صاف کیا گیا۔ کشتی کے اندر موجود سامان اس طرح رکھا گیا کہ توازن بگڑنے نہ پائے۔یہ سب تیاری تھی—کیونکہ سمندر لاپرواہی معاف نہیں کرتا۔

سمندر میں اترناہم سمندر میں اترے تو وہ عام دن نہیں تھا۔سورج ابھی پوری طرح نکلا نہیں تھا، مگر روشنی اتنی تھی کہ پانی کا اصل رنگ دکھائی دینے لگا—نیلا نہیں،سیاہی مائل سبز۔میرے دل میں ایک عجیب سا بوجھ تھا، جیسے سینہ نمکین ہوا سے

نہیں بلکہ کسی انجانے انجام سے بھرا ہوا ہو۔ماہی گیروں نے خاموشی سے کشتی کو پانی میں دھکیلا——ایسی خاموشی جس میں باتیں کم اور تجربہ زیادہ بولتا ہے۔ان کے ہاتھوں کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ یہ لوگ سمندر سے باتیں نہیں کرتے،اس سے حساب رکھتے ہیں۔میں کشتی میں بیٹھا

تو پہلی بار احساس ہوا کہ زمین پیچھے رہ گئی ہے۔یہ صرف فاصلہ نہیں تھا——یہ اعتماد کا ٹوٹنا تھا۔زمین پر آدمی گر بھی جائے تو اٹھ سکتا ہے،سمندر میں گرنے کا مطلب ہے...بس اللہ کا نام۔۔۔حالات کا جائزہ۔۔کشتی نے آہستہ آہستہ حرکت لی۔ کنارے کا پانی پر سکون تھا،

مگر چند ہی لمحوں میں لہروں کا مزاج بدلنے لگا۔یہ وہ جگہ تھی جہاں سمندر انسان کو خوش آمدید نہیں کہتا——وہ بس دیکھتا ہے کہ تم کون ہو۔ہم نے آگے بڑھنے سے پہلے ایک مکمل چکر لگایا۔معمول سے زیادہ دور تک گئے،مگر واپسی کا راستہ ذہن میں رکھا۔اس دن خطرہ عام دنوں سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ہوا کی رفتار بدل رہی تھی،اور لہریں بتا رہی تھیں کہسمندر اوپر سے کچھ اور ہے،اندر سے کچھ اور۔

ایک تجربہ کار ماہی گیر،جس کے چہرے پر دھوپ اور نمکین ہوا کے برسوں کے نشان تھے،اس نے آہستہ سے کہا:"آج کل سختی بڑھی ہوئی ہے۔"یہ ایک جملہ نہیں تھا——یہ پورے سمندر کا خلاصہ تھا۔سختی کا مطلب راستہ ممکن ہے،مگر خطرہ معمول سے کہیں زیادہ ہے۔سختی کا مطلب صرف گشت نہیں ہوتا۔اس کا مطلب ہوتا ہے:آنکھیں زیادہ جاگ رہی ہیں،ریڈار خاموش نہیں،اور یہ جو بڑے جہاز نظر آتے ہیں کارگو،آئل ٹینکر،مال بردار——وہ اکیلے نہیں چلتے۔ان کے ساتھ قوانین چلتے ہیں،نظام چلتا ہے،اور وہ نظام جذبات نہیں سمجھتا۔دور ایک بڑا جہاز گزرا۔وہ اتنا بڑا تھا کہ ہماری کشتی اس کے سامنے کھلونا لگ رہی تھی۔اس کے ارد گرد کی لہریں بھی مختلف تھیں——بھاری،منظم،جیسے وہ بھی قانون کے تحت چل رہی ہوں۔ماہی گیر نے بتایا کہ ایسے جہازوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے:بندرگاہوں پر کاغذ بولتے ہیں،کھلے سمندر میں سگنل بولتے ہیں،اور اگر درمیان میں کوئی غلط جگہ آ جائے تو سوال نہیں،سیدھا انجام آتا ہے سمندر میں سفر کرتے وقت آنکھیں صرف سامنے نہیں ہوتیں۔دائیں بائیں،پیچھے،اور دور افق تک نظر رکھنی پڑتی ہے۔کبھی کسی دوسرے ملک کی ساحلی لکیر دھند میں جھلک دکھا دیتی ہے،کبھی دور کوئی بڑا جہاز آہستہ آہستہ حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ایسے میں اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ وہ کس راستے پر ہے،کتنا فاصلہ ہے،اور اُس کی سمت ہماری سمت سے ٹکرا تو نہیں رہی۔ماہی گیر نے صاف کہا کہ یہاں ہر چیز حساب مانگتی ہے۔رفتار ذرا سی زیادہ ہو جائے تو کشتی اچھلنے لگتی ہے،کم ہو جائے تو لہریں قابو میں لے لیتی ہیں۔

رات کے وقت تو خطرہ اور بڑھ جاتا ہے——روشنی کم،آوازیں زیادہ،اور انسان کا اپنا خوف سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔بعض راستوں پر تو ہلاکت کا خدشہ بھی رہتا ہے،خاص طور پر جب گزرگاہ تنگ ہو یا ارد گرد نگرانی زیادہ ہو۔جو لوگ غیر قانونی طور پر سمندر کے ذریعے ایران پہنچتے ہیں،وہ سیدھے اور محفوظ طریقے سے نہیں جاتے۔یہ عام طور پر ہوتا ہے:اسمگلنگ نیٹ ورکس کے ذریعے پرانے ماہی گیر جنہیں دہائیوں کا تجربہ ہو یا جرائم پیشہ گروپس سے جُڑے لوگ یہ اکیلے آدمی کا فیصلہ نہیں ہوتا۔یہ پورا منظم نظام ہوتا ہے:کشتی اینڈ ھنوقتموسماور رابطے سب کنٹرول میں۔اور پھر بھیاکثر

کامیاب نہیں ہوتے۔بہت سے کیسز میں لوگ پکڑے جاتے ہیں،کچھ لاپتہ ہو جاتے ہیں، اور کچھ سمندر میں جان کھو دیتے ہیں۔یہ خبریں عام طور پر سامنے نہیں آتیں، مگر ریاستی نظر سے اوجھل بھی نہیں ہوتیں۔ سمندر میں ریڈار کوسٹ گارڈ ڈرون اور مسلسل نگرانی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔۔۔جیوانی پوائنٹ۔۔

ہم جیوانی پوائنٹ پر تھے—بلوچستان کے ساحلی علاقے میں واقع ایک حساس مقام۔یہ گوادر اور کراچی کے درمیان آتا ہے۔یہاں سے عمان کے خلیج اور عرب سمندر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔یہ جگہ ماہی گیری اور سیاحت کے لیے مشہور ضرور ہے، مگر سکیورٹی کے لحاظ سے انتہائی حساس بھی ہے۔اسی لیے یہاں اسمگلنگ کے راستے بھی زیادہ استعمال ہوتے ہیں،اور اسی وجہ کچھ دنوں سے یہاں پابندیاں بھی سخت لگی ہوئیں تھیں جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس وقت گشت مزید بڑھا دی گئی ہے۔جیوانی پوائنٹ کی افواج اور ایف سی ہر وقت نگرانی کر رہی تھیں۔کشتی کے راستے میں خطرہ زیادہ تھا۔ لہریں بڑھ رہی تھیں۔سمندری راستہ سخت تھا۔رہنما نے کہا کہ تجربہ کار لوگوں کے لیے یہ سفر ممکن ہے—تقریباً سات سے دس دن درکار ہوں گے۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس پاسپورٹ اور ضروری دستاویزات نہیں تھیں۔وہ خود کارگو یا شپ کے ذریعے جا سکتا تھا، مگر میرے لیے یہ بالکل ممکن نہیں تھا۔اُس نے صاف کہا:"کارگو کے ساتھ جاؤ تو سخت چیکنگ ہو گی،شپ کے ساتھ جاؤ تو بھی رسک بہت زیادہ ہے۔"میں نے فوراً انکار کر دیا۔میں ایک فیصد بھی رسک نہیں لے سکتا تھا—ایسا رسک جس میں واپسی کا راستہ بند ہو جائے۔وہ بولا کہ اُس کے پرانے دوست بڑے جہازوں پر کام کرتے ہیں، نظری طور پر راستہ نکل سکتا ہے—مگر پھر خود ہی رک گیا۔

کہا:"وہاں اعتماد ذاتی نہیں، نظامی ہوتا ہے،اور نظام میں جذبات کی کوئی جگہ نہیں۔"میرا مسئلہ بالکل واضح تھا۔میرے پاس کاغذات نہیں تھے۔اور بغیر کاغذات سمندر صرف خطرہ دیتا ہے،راستہ نہیں ہم نے مزید آگے جانے کے بجائے کشتی کو ایک لمبا سا چکر دلوایا۔سمندر وہیں تھا—نہ ناراض، نہ مہربان—بس اپنے وزن کے ساتھ موجود۔دوپہر کی دھوپ اب پانی پر چمکتی ہوئی لکیریں بنا رہی تھی۔ہوا میں وہ تیزی نہیں رہی تھی

جو صبح دل میں کھٹک پیدا کر رہی تھی، مگر فیصلہ ہو چکا تھا۔ہم پچھلی پیرَ واپس لوٹ آئے۔جب کشتی نے کنارے کو چھوا تو یوں لگا جیسے سمندر نے ہمیں خاموشی سے جانے کی اجازت دے دی ہو۔نہ کوئی شور،نہ کوئی سوال۔ہم ماہی گیروں کی بستی کی طرف بڑھے۔وہی جھونپڑیاں،وہی رسّے،وہی جال جو ہر روز کی طرح اپنی جگہ پڑے تھے۔وہاں بیٹھ کر وقت جیسے ذرا آہستہ ہو گیا۔ایک کونے میں آلو مچھلی پک رہی تھی ہلکی آنچ،سادھی سی خوشبو،اور نمک مرچ کی وہ مہک جو تھکن کو خود ہی کچھ دیر کے لیے بھلا دیتی ہے۔ہم نے وہی کھانا کھایا۔کوئی دسترخوان نہیں تھا،کوئی رسمی بات نہیں تھی—بس سمندر سے لوٹنے والوں کا سادہ سا کھانا۔

میں خاموش تھا۔سب کچھ سوچ میں گھل رہا تھا۔واپسی کا فیصلہ،ادھورا سفر،اور وہ راستے جو آج نہیں کھلے تھے۔ماہی گیر ہنس رہے تھے،باتیں کر رہے تھے،جیسے یہ سب معمول ہو۔شاید ان کے لیے تھا بھی۔میرے لیے یہ واپسی صرف پیچھے ہٹنا نہیں تھی—یہ ایک اور دن جیت جانے جیسا تھا۔میں بھی اب یہی سوچ رہا تھا کہ سمندر کے اس پار کیسے پہنچا جا سکتا

ہے۔میں چاہتا تھا کہ خفیہ طریقے سے، دو نمبر راستہ اختیار کیا جائے——ایسا جس میں میری موجودگی اور پہچان سامنے نہ آئے۔رہنما، جو بڑا تجربہ کار اور پرانا ماہی گیر تھا، خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔وہ پرانا ماہی گیر واقعی عام آدمی نہیں تھا۔اس کے چہرے پر عمر اور سمندر دونوں کے نشان تھے،اور بات کرتے وقت ایسے بولتا تھا جیسے ہر لفظ پہلے بھی کئی بار سچ ثابت ہو چکا ہو اس نے کہا:''اگر تم سات دن، یا دس دن رک سکتے ہو تو حالات بدل سکتے ہیں۔یہ سختی مستقل نہیں رہتی۔
سمندر بھی اور نگرانی بھی——دونوں کبھی کبھی سانس لیتے ہیں۔''میں نے اس کی بات سنی، مگر مسئلہ انتظار کا نہیں تھا۔میں رک سکتا تھا،سات دن بھی، دس دن بھی۔اصل مسئلہ یہ تھا کہ کوئی یقین نہیں تھا کہ حالات واقعی بدلیں گے۔
موسم کا مزاج غیر یقینی تھا،راستہ کھلنے کا کوئی وقت طے نہیں تھا،اور سمندر میں یقین صرف ایک چیز کا ہوتا ہے——کہ یقین کبھی مکمل نہیں ہوتا۔وہ ماہی گیر آگے بولا۔اس کے لہجے میں اعتماد تھا،ایسا اعتماد جو صرف رابطوں اور تجربے سے آتا ہے۔''میرے جاننے والے بڑے جہازوں میں ہیں،کارگو میں، شپ میں،اندر کام کرنے والے لوگ۔اگر کوئی مسئلہ بنتا بھی ہے،اگر کسٹم یا چیکنگ میں کوئی ہاتھ ڈال بھی دے،تو نکلوانا میرا کام ہے۔وہ مسئلہ نہیں رہتا۔''وہ بالکل صاف کہہ رہا تھا کہ گرفتاری مسئلہ نہیں ہوگی مارپیٹ، جیل، یا روک——یہ سب اس کے لیے قابلِ حل تھا۔اس کے رابطے تھے،اور وہ رابطے سمندر کی طرح گہرے تھے۔میں جانتا تھا کہ اگر میں غیر قانونی طریقے سے جانا چاہوں،تو وہ راستہ نکال سکتا ہے۔یہ بات ممکن تھی۔اور سچ یہ تھا کہ مجھے پکڑے جانے کا خوف نہیں تھا۔نہ جیل کا،نہ روک کا،نہ پوچھ گچھ کا۔اصل خوف کچھ اور تھا۔اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی ایک لمحے میری شناخت سامنے آگئی،اگر میرا نام،میرا چہرہ،یا میرا تعلق کسی فائل، کسی اسکرین، یا کسی رپورٹ میں آ گیا——تو پھر یہ صرف سفر نہیں رہتا۔وہ ایک نشان بن جاتا۔میں منظرِ عام پر نہیں آنا چاہتا تھا۔میرا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں پکڑا جاؤں گا یا نہیں۔میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں پہچانا نہ جاؤں۔میں نے ماہی گیر کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا:''اگر موسم کی وجہ سے کشتی رکی، یا راستے میں کوئی غیر متوقع چیکنگ ہوئی،اور اس لمحے میری شناخت سامنے آ گئی——تو پھر سب ختم ہو جائے گا۔''وہ چند لمحے خاموش رہا۔پھر آہستہ سے بولا:''یہ بات ٹھیک ہے۔پکڑ نکلوا لی جاتی ہے،شناخت واپس نہیں لی جاتی۔''اسی دوران ایک ماہی گیر نے جو برسوں سے انہی پانیوں میں سانس لیتا آیا تھا——آہستہ آواز میں ایک اور امکان کا ذکر کیا۔اس نے ادھر اُدھر دیکھا،پھر بولا:''ایک راستہ اور بھی ہوتا ہے... فیمیل کے ذریعے۔''اُس پرانے ماہی گیر نے اسکی طرف دیکھا پھر اس نے آہستہ سے کہا: ہاں''ایک اور راستہ بھی ہے۔فیمیل پلان آخری نہیں... مگر موجود ہے۔''میں نے اس کی طرف دیکھا۔وہ آنکھیں جو سمندر کے اتنے راز جانتی تھیں آج کچھ اور تول رہی تھیں۔میں نے حیرت سے پوچھا:''فیمیل پلان؟ وہ کیسا ہوگا؟''
پھر اسنے بولنا شروع کیا اور کہا''فیمیل والا پلان ایسا نہیں جو ہر کسی کو بتایا جائے۔ایک عورت کے ساتھ——قانونی دکھاوے کے اندر، غیر قانونی نیت چھپی ہوتی ہے۔''وہ بولا کہاس کے کچھ جاننے والے کارگو کی دنیا میں ہیں کاغذات ہوتے ہیں،نام ہوتے ہیں،شناختیں عارضی ہوتی ہیں،ایسی جو سفر کے اختتام تک ساتھ دیتی ہیں اور پھر خود ہی غائب ہو جاتی ہیں۔میں نے کہا، ''اور میں؟ میں اس کے ساتھ کیا کر رہا ہوں؟''''تم اس کے ساتھ چلتے ہو، لیکن تم فیصلہ نہیں کرتے۔تم

صرف موجود رہتے ہو، میں نے کہا: ''کیسے؟'' وہ آہستہ سے مسکرایا، جیسے بات سمندر کی ہو، قانون کی نہیں۔ ''عورت کے ساتھ آدمی ہمیشہ کم دکھائی دیتا ہے۔ لوگ سوال عورت سے کرتے ہیں، مرد بس ساتھ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا: ''تو وہ بیوی ہوتی ہے؟'' اس نے سر ہلایا، مگر پورا نہیں۔ '' کبھی بیوی، کبھی ساتھ چلنے والی، کبھی بس ایسی عورت جس کے ساتھ تمہاری موجودگی معمول لگتی ہے کہیں ایسی عورت جو سوالوں سے گھبرا رہی ہو۔ اور یاد رکھو گھبراہٹ اکثر شک نہیں جگاتی، ہمدردی جگاتی ہے۔'' میں نے کہا: ''اور اگر سوال سیدھا مجھ سے ہو؟'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ''تو عورت بیچ میں آ جاتی ہے سمندر میں معمول سب سے بڑی ڈھال ہوتا ہے۔'' میں نے محسوس کیا یہ کوئی کاغذی بات نہیں تھی۔ یہ نفسیات تھی۔ نظر کا زاویہ۔ انسانی تجسس کی سمت۔ وہ بولا: ''جب چیکنگ ہوتی ہے تو سوال اکثر یہ نہیں ہوتا کہ یہ کون ہے، سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ منظر کیوں بنا ہوا ہے۔ عورت منظر کو نرم کر دیتی ہے۔

آوازیں کم ہو جاتی ہیں۔ نظر ٹھہر جاتی ہے۔'' میں نے اس کی بات کا وزن محسوس کیا۔ یہ کوئی راستہ نہیں تھا، یہ نظر سے بچنے کا تصور تھا۔ میں خاموش رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہیں سن تو رہا ہوں، مگر قبول نہیں کر رہا۔ اس نے بات آگے

بڑھائی: ''یہ ایک مہینے کا کھیل ہے۔ انتظار، تیاری، اور پھر وقت کے ایک چھوٹے سے دریچے سے گزرنا۔ میرے دوست یہ سب کروا سکتے ہیں۔ تمہیں بس بہنا ہوگا— فیصلہ نہیں کرنا ہوگا۔'' یہیں پر میرا دل رک گیا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ یہ دو نمبر تھا— میں تو ابتدا سے جانتا تھا کہ میرا پہلا راستہ صاف نہیں ہوگا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس پلان میں ایک اور زندگی شامل تھی۔ ایک عورت— ایک چہرہ— ایک کردار جو محض راستہ بنانے کے لیے استعمال ہوتیاس نے واضح کیا کہ اگر سب کچھ ٹھیک چلے تو راستہ بن سکتا ہے، مگر اگر ذرا سی لغزش ہو جائے تو کہانی ایک دم پلٹ جاتی ہے۔ یہاں مسئلہ پکڑے جانے کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہمیرا تھا۔ میری شناخت۔ میرا نام۔ میرا چہرہ کسی لمحے غلط فریم میں آ جانا۔ میں نے پہلی بار واضح الفاظ میں کہا: ''یہ میں نہیں کر سکتا۔'' ماہی گیر نے چونک کر دیکھا۔ شاید اسے انکار کی امید نہیں تھی۔ میں نے کہا: ''راستہ بند ہو تو میں رک سکتا ہوں۔ پکڑا جاؤں تو شاید نکل بھی آؤں۔ لیکن'' اس میں کسی اور کی زندگی میرے فیصلے کی قیمت بن رہی ہے۔'' میں کسی عورت کو ڈھال بنا کر اپنی راہ آسان نہیں کرنا چاہتا میں چاہتا ہوں اگر میں جاؤں تو اپنے فیصلے کے ساتھ جاؤں کسی اور کے سائے میں نہیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا: ''اسی لیے یہ ہر کسی کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ سمندر سے ڈرتے ہیں، اور کچھ اپنے آپ سے۔'' میں نے جواب دیا: میں دوسرے والوں میں ہوں۔ یہ پلان راستہ دکھا سکتا ہے، مگر مجھے خود سے دور لے جائے گا۔ اور میں بارڈر پار کرنا چاہتا ہوں، ضمیر نہیں۔ میرے اندر ایک عجیب سی بےچینیجڑ پکڑ رہی تھی۔ یہ راستہ ممکن تھا، مگر میں جانتا تھا کہ یہ وہ قیمت تھی جو میں ادا نہیں کر سکتا تھا یہ بات چھپانے کی نہیں تھی اور نہ ہی میں خود کو دھوکہ دے رہا تھا۔ ظاہری سی بات ہے، میرا پہلا پلان شروع سے یہی تھا کہ میں غیر قانونی طریقے سے ہی جاؤں گا۔

میں پیچھے سے اسی نیت،

اسی منصوبہ بندی کے ساتھ آیا تھا۔ سمندر کا راستہ، غیر قانونی عبور، اور شناخت چھپائے رکھنا— یہ سب پہلے ہی ذہن میں

طے تھا۔ لیکن جب یہاں پہنچا تو ایک مسئلہ واضح ہو چکا تھا۔ سختی معمول سے کہیں زیادہ تھی۔ گشت بڑھ چکی تھی، نگاہیں زیادہ جاگ رہی تھیں، اور سمندر وہ نہیں تھا جو خاموشی سے راستہ دے دے۔ دو نمبر طریقے سے پار کرنے کے راستوں میں سے ایک راستہ فیمیل پلان موجود تھا۔۔ایسا پلان جس کے تحت کئی لوگ پہلے بھی نکل چکے تھے۔ کاغذات، کردار، اور کہانی —سب ترتیب میں آ سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس پلان کے ساتھ میرا ضمیر مطمئن نہیں تھا میں رسک لینے والا آدمی ہوں، مگر اندھا رسک نہیں۔ ایسا رسکجس میں شناخت سامنے آنے کا امکان ہو، جس میں نام، چہرہ، یا وجود کسی سسٹم کا حصہ بن جائے وہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ اور میں یہ جانتا تھا کہ بعض اوقات منصوبہ وہ نہیں ہوتا جو ہم بناتے ہیں، بلکہ وہ ہوتا ہے جسے حالات اجازت دیتے ہیں۔ اسی لیے میں نے خود کو ایک بار پھر روکا۔ سمندر سامنے تھا، راستہ ممکن تھا، مگر رسک میری حد سے باہر جا چکا تھا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ سمندر کے کنارے رہنے والے ماہی گیر سادہ نہیں ہوتے—نہ وہ بے وقوف ہوتے ہیں اور نہ فرشتے۔

لیکن وہ اسمگلر بھی نہیں ہوتے جب تک حالات اور ضرورت انہیں اس حد تک نہ لے جائیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے کسی لمحے بھی حد پار کی، یا ضمیر کو نظر انداز کیا، تو وہ لوگ فوراًر کے بغیر آگے بڑھ سکتے تھےاصل بات یہ تھی کہ میں ان کے لیے کوئی غیر معمولی سودا نہیں تھا۔ میں نہ پہلا آدمی تھااور نہ آخری جو ان کے سامنے کسی سفر کی نیت لے کر آیا ہو۔ ایسے لوگ ان کے سامنے روز آتے ہیں—کچھ جلدی میں، کچھ لالچ میں، اور کچھ خوف میں۔ ڈیل کیا تھی؟ یہاں کوئی فلمی ڈیل نہیں ہوئی۔ نہ بھاؤ تاؤ، نہ قسمیں، نہ کوئی تحریری وعدہ۔ بس تین چیزیں تھیں: وقت سمندر کے لوگ جلدی کرنے والے آدمی پر اعتبار نہیں کرتے۔ خاموشی جو آدمی کم پوچھتا ہے وہ زیادہ محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ واضح حد میں نے صاف کہا کہ میں وہ کام نہیں کروں گا جس میں میری شناخت سامنے آئے یا کسی اور کو استعمال کیا جائے۔ یہ بات انہیں پسند آئی۔ یہ ماننے میں کوئی حرج نہیں ہاں، پیسہ شامل تھا۔ لیکن لالچ کی حد تک نہیں۔ یہ وہ رقم تھی جو اس دنیا میں

"وقت ضائع نہ ہونے" کی قیمت سمجھی جاتی ہے۔ یہ رشوت نہیں تھی، یہ فیس بھی نہیں تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ کوئی "غیر ملکی خیرات" نہیں کر رہے تھے۔ یہ عام آدمی نہیں تھے—یہ تجربہ کار ماہی گیر تھے، سمندر کے قوانین جاننے والے، اور اپنے فائدے اور نقصان کو حساب سے ناپنے والے۔ ڈیل کا خلاصہ سادہ تھا: وقت اور رسک کا معاوضہ یہ لوگ سمندر کے کنارے سخت حالات میں اپنا وقت اور اپنا رسک لگا رہے تھے۔ اگر کچھ غلط ہوتا—

کشتی کو نقصان پہنچتا، یا چیکنگ میں مسئلہ آتا—تو پہلا نقصان ان کا ہوتا۔ اسی لیے وہ ایک مناسب معاوضہ چاہتے تھے، تاکہ ان کے خطرے اور وقت کی قیمت ادا ہو جائے۔ یہ پیسہ، ایک طرح کے "سفر کے لیے عارضی تحفظ کی قیمت" تھا۔ وہ مجھے اس لیے راضی نہیں ہوئے کہ میں خاص تھا، بلکہ اس لیے کہمیں نے انہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جو آدمی اپنی حد جانتا ہے، اپنی شناخت بچانا چاہتا ہے، اور اندھا رسک نہیں لیتا—ایسا آدمی ان کے لیے قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ سمندر کے کنارے اعتماد کوئی جذباتی لفظ نہیں ہوتا یہ حفاظتی اصول ہوتا ہے۔ ماہی گیر زیادہ سوال نہیں کرتے، اور زیادہ سوال کرنے والوں پر اعتماد بھی نہیں کرتے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی حد سے زیادہ جاننا چاہتا ہے وہ آگے جا کر کسی

کے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ان کے اصول سادہ مگر سخت ہوتے ہیں:اگر آدمی بارڈر پار بھی کر جائے تو وہ ہمارے لیے خطرہ نہ بنے۔اور اگر وہ واپس بھی آ جائے تو تب بھی خطرہ نہ بنے۔اسی لیے وہ ایسے لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں جو کم بولتے ہیں،اپنی حد جانتے ہیں،اور کسی کو استعمال کرنے پر اصرار نہیں کرتے۔میرے لیے اعتماد اس لیے ضروری تھا کہ میں اپنی شناخت چھپانا چاہتا تھا۔اور ان کے لیے اعتماد اس لیے ضروری تھا کہ وہ کسی ایسے آدمی کے ساتھ نہ جُڑیں جو کل کو ان کے لیے خطرہ بن جائے۔وہ جانتے تھے کہ جو آدمی اپنے اصولوں پر کھڑا رہتا ہے وہ راستہ بدل سکتا ہے،فیصلہ روک سکتا ہے،مگر زبان نہیں بدلتا۔اسی خاموش سمجھ بوجھ نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب رکھا۔نہ میں ان کے لیے خطرہ تھا،نہ وہ میرے لیے۔کیونکہ اس دنیا میں سمندر سے زیادہ بے رحم چیز بدلی ہوئی بات ہوتی ہے یہ لوگ مجھے پار کروانا چاہتے تھے کیونکہ میں نے ان کے اصول مانے،اپنا رسک سمجھا،اور انہیں دباؤ میں نہیں ڈالا۔ان کا فائدہ،میرا فائدہ——یہی ہماری خاموش ڈیل تھی۔میں نے ان کے ساتھ جو تعلق بنایا وہ صرف مالی معاملہ نہیں تھا بلکہ اعتماد تھا اگرچہ پہلا قدم بالکل واضح تھا۔میں نے ان کے معاوضے کی پہلی قسط ادا کر دی تھی——جو قیمت وہ اپنے وقت،رسک اور تجربے کے عوض چاہتے تھے۔آوران کے اندر جب میری پہلی بار ماہی گیروں سے ملاقات ہوئی تھی،تو وہ محض سلام دعا نہیں تھی۔وہ ایک پہچان تھی——ایک دوسرے کو تولنے کا عمل۔سمندر کے کنارے رہنے والے ماہی گیر ایک نظر میں فیصلہ نہیں کرتے۔وہ دیکھتے ہیں کہ سامنے والا آدمی جلد باز ہے یا ٹھہرا ہوا،جھوٹ بولتا ہے یا بات ناپ کر کرتا ہے،اور سب سے اہم یہ کہ وہ اپنی حد جانتا ہے یا نہیں۔وہیں آوران کے اندر ہی پیسے کی بات بھی ہو گئی تھی۔میں نے وہ رقم ادا کر دی تھی جو ان کے حساب سے"بات سنجیدگی سے لینے" کی قیمت تھی۔یہ مکمل ادائیگی نہیں تھی،بلکہ ایک طرح کی حاضری تھی یہ بتانے کے لیے کہ میں بات کہہ کر غائب ہونے والوں میں سے نہیں۔اور سب سے اہم بات——ہر ماہی گیر ایک جیسا نہیں ہوتا۔کچھ محب وطن ہوتے ہیں——اپنے لوگوں کی مدد کو ترجیح دیتے ہیں۔کچھ بس اپنے فائدے کے پیچھے ہوتے ہیں صرف اپنا مفاد دیکھتے ہیں،میں نے جو پرانا ماہی گیر چُنا،وہ واقعی تجربہ کار اور محبِ وطن تھا۔میں نے اپنی پوری صورتحال،اپنی پہچان،اور اپنے خطرات صرف اسی کے سامنے رکھے۔وہی میری باتوں کا مرکز بنا،اور اسی کے ساتھ ہر فیصلہ،ہر راستہ،اور ہر شرط طے ہوئی۔دوسروں کا جو اسکے ساتھی تھے میں نہیں جانتا۔شاید ان کے اپنے مفاد،اپنی وجوہات ہوں۔

لیکن میری ساری پلاننگ،اعتماد اور رسک——سب کچھ اسی ایک پرانے ماہی گیر کے ساتھ مکمل ہوا۔اور یہی وجہ تھی کہ میں نے خود کو محفوظ محسوس کیا،اور سفر کا اگلا مرحلہ

سوچنے کی ہمت کی۔کیونکہ سمندر کی دنیا میں جان سے زیادہ زبان کی قیمت ہوتی ہے۔ہر کوئی اپنا فائدہ دیکھتا ہے،اور ہر کسی کے لیے اس کے اصول سب سے اہم ہوتے ہیں۔اگلے دو دن میں نے انہی ماہی گیروں کے ساتھ گزارے۔نہ کوئی نیا منصوبہ بنا،نہ کوئی فوری فیصلہ ہوا۔کبھی ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا،کبھی جال سمیٹنے میں ہاتھ بٹانا،کبھی خاموشی سے سمندر کو دیکھتے رہنا جیسے وہ خود کچھ کہہ دے۔

تیسرا باب ۔۔۔۔۔۔ بے آواز قبیلہ

تیسرے دن میں نے خود بات چھیڑی۔ میں نے کہا کہ میں یہاں مزید نہیں رک سکتا۔ نہ اس لیے کہ وقت کم ہے، بلکہ اس لیے کہ یہاں رکنا اب میرے مسئلے کا حل نہیں رہا۔ اگر میں یہاں سے نکلوں، تو مجھے تمہاری رہنمائی اور اجازت چاہیے۔" وہ خاموش رہا، جیسے ہر لفظ کی گہرائی ناپ رہا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ بولا:"سمندر ہر بار راستہ نہیں دیتا۔ کبھی کبھی آدمی کو زمین کے راستے آزمانے چاہیئں کچھ گروہ ایسے ہیں، جو سمندر سے نہیں، زمینی راستوں سے عبور کراتے ہیں۔ میں نے پوچھا:"وہ لوگ کیسے ہیں؟" اس نے سیدھا جواب دیا، بغیر کوئی وزن ہلکا کیے یہ لوگ اپنے اصول کے پابند ہیں— خطرناک بھی، مگر تجربہ کار۔ لیکن یاد رکھنا— وہاں اصول ہم جیسے نہیں ہوں گے۔ وہ قیمت مانگیں گے، اور قیمت صرف پیسہ نہیں ہوتی۔"" اگر تم واقعی اس بیلٹ کو عبور کرنا چاہتے ہو، تو ایک گروہ ہے— ہم انہیں 'بے آواز قبیلہ' کہتے ہیں۔" میں نے نام دہرایا۔ بے اواز قبیلہ وہ مسکرایا نہیں، بس اتنا بولا:" یہ نام ان کا نہیں، ہم نے ان کے لیے رکھا ہے۔ وہ خود کسی نام کے محتاج نہیں۔" "تمہیں چاغی کے مغربی سرحدی بیلٹ میں، ایک جگہ پر جانا ہوگا جسے ہم 'کالا سنگھ بیلٹ' کہتے ہیں۔ جہاں زمین اپنا رنگ بدلتی ہے، اور راستے اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔ وہاں ایک جگہ ہے— نہ گاؤں، نہ کیمپ— بس ایک ٹھہراؤ۔" وہ لوگ راستے بتائیں گے، لیکن تمہاری اپنی ذمہ داری ہوگی۔ اگر تم ان کے طریقے اور اصول مان لو، تو راستہ نکل سکتا ہے۔ ورنہ، ہر فیصلہ تمہارا ہوگا۔ یہ لوگ سب سمجھتے ہیں کہ کون سا راستہ محفوظ ہے، کس پہاڑ کی چوٹی یا وادی میں خطرہ کم ہے، اور کس خالی مقام پر چیکنگ کا امکان زیادہ میں نے پھر سوال کیا، جو اصل میں میرے دل میں تھا:"میں ان لوگوں سے ملوں گا کیسے؟ میں جا کر کیا کہوں گا؟ کس کا حوالہ دوں گا تاکہ وہ بات سنیں؟" پرانا ماہی گیر کچھ لمحے چپ رہا۔ پھر بولا:"وہ نام نہیں پوچھتے، اور حوالہ بھی نہیں مانگتے جیسے شہر کے لوگ مانگتے ہیں۔ تم وہاں جا کر کسی کا نام مت

لینا۔بس یہ کہنا کہ تم سمندر سے آئے ہو،اور تمہیں کالا سنگھ بیلٹ کا راستہ دکھایا گیا ہے۔" وہ ذرا جھکا اور بولا:" اگر وہ سنجیدہ ہوں گے تو خود پوچھیں گے کہ تمہیں یہاں تک کس نے بھیجا ہے۔تب بس اتنا کہنا: 'ایک پرانے آدمی نے جس کا کام سمندر سے ہے۔' وہ سمجھ جائیں گے۔" میں نے پھر سوال کیا:" جدھر تم مجھے بھیج رہے ہو، کیا یہ تمہارے جاننے والے ہیں؟

کیا ان پر میں بھروسہ کر سکتا ہوں؟" وہ تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا:" میں ایک بات واضح کر دوں۔ہماری ملاقاتیں محدود رہی ہیں،

ایک دو دفعہ کام ہوئے،اور بس اتنا ہی۔ان کے ساتھ روزانہ یا مستقل تعلق نہیں ہے۔یعنی تم جا سکتے ہو،راستہ ان سے مل کر طے کر سکتے ہو، لیکن بھروسہ یا وابستگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔یہ دنیا، یہ راستہ، صرف ان کے اصول اور تمہاری سمجھ پر چلتا ہے۔

تمہارے لیے بس یہی ہے: اگر جانا چاہتے ہو، میں تمہیں راستہ دکھا دوں گا، باقی فیصلہ اور انجام تمہارے ہاتھ میں ہے میں نے سر ہلایا اور کہا سب سمجھ گیا ہوں میں نے ان سے اجازت لی،، بغیر کسی وعدے کے۔

پھر میں نے رخ موڑا اور چاغی کے سرحدی بیلٹ کی طرف" نکل پڑا— جہاں سمندر ختم ہو جاتا ہے اور زمین آدمی کا امتحان لیتی ہے۔دو دن کے سفر کے بعد میں بالاخر اس مقام پر پہنچ گیا جسے پرانا ماہی گیر 'کالا سنگھ بیلٹ' کہتا تھا۔راستہ آسان نہیں تھا— زمین اپنی شکل بدل رہی تھی،

کبھی پتھریلی پہاڑیوں کے درمیان، کبھی کھلی وادیوں میں،اور کہیں اچانک خشک نالے، جو لگتا تھا جیسے زمین خود آدمی کو پرکھ رہی ہو۔

چھوٹے سے ٹھہراؤ پر پہنچا، جہاں نہ گاؤں تھا، نہ کیمپ، بس چند پتھریلے جھاڑ اور خشک ندی کا نشیب۔میں نے کچھ دیر انتظار کیا،اور پھر دھیما سا شور سنائی دیا— زمین کے کنارے سے قدموں کی آوازیں، ہلکی سرگوشی، دو یا تین لوگ، چہرہ چھپائے، قریب آئے۔میں نے آہستہ کہا:" میں سمندر سے آیا ہوں،

اور مجھے کالا سنگھ بیلٹ کا راستہ دکھایا گیا ہے۔" وہ رک گئے، ایک نے آنکھیں ہلکی سی تنگ کیں، پھر دوسرا بولا:

" کون دکھایا؟ کس کے کہنے پر تم یہاں آئے ہو؟" میں نے جواب دیا:" ایک پرانا آدمی، جس کا کام سمندر سے ہے، مجھے تمہارا راستہ دکھانے کے لیے کہا۔" وہ چند لمحے خاموش رہے، سر ہلایا، اور کہا:" ٹھیک ہے۔ تم آگے بڑھ سکتے ہو، پر اصول ہمارے ہیں۔راستہ مشکل ہے،اور قیمت صرف وہ نہیں جو عام لوگ سمجھیں۔دیکھنا اپنے قدموں میں،اور فیصلے تمہارے ہاتھ میں ہوں گے۔" پھر انہوں نے میرے قریب آ کر نہ زمین کے نقشے کھولے— نہ کوئی عام کاغذ، بلکہ ایک چھوٹے موبائل کے ذریعے، سمجھایا جہاں انہوں نے چھوٹے نشانات سے راستہ دکھایا: کون سی وادی سے جانا محفوظ ہے، کس چوٹی سے خطرہ کم ہے،اور کس مقام پر ممکنہ نگرانی ہو سکتی ہے۔

ایک جگہ وہ مجھے ایک خاص پتھریلے نکات کی طرف لے گئے،اور کہا:" یہ فلانی وادی ہے، یہاں سے گزرو تو چھپی ہوئی

راہ ہے۔دوسری وادی پر پہنچ کر، یہ نشانی دیکھنا—ایک انوکھا پتھر، دو جھاڑ کے درمیان۔یہ تمہیں اگلے پڑاؤ تک لے جائے گا۔"میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، سر ہلایا،

دو دن کی محنت،اور یہ مختصر ملاقات،اب میرے لیے اگلے قدم کی تیاری تھی۔

میں نے انہی نشانیوں سے، چاغی کے بیلٹ کی پہاڑیاں عبور کرنا شروع کیں، جہاں زمین، پتھر اور ہوا ایک ساتھ انسان کو پرکھ رہی تھی۔ان کی بتائی گئی وادیوں، چوٹیوں اور پتھروں کی نشانیوں کے مطابق میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔

سوا گھنٹے کے بعد، میں ایک اور مختصر ٹھہراؤ پر پہنچا، جہاں ایک اور نشانی،ایک انوکھا پتھر جس پر خالی جگہ میں دو لکیریں بنی ہوئی تھیں، جس جگہ کا انہوں نے مجھے بتایا تھا اب وہاں میں پہنچ چکا تھا میں نے اپنے قدم روکے، اور آگے دیکھا—چار لوگ ایک غار کے قریب، بس ایک کھلی جگہ پر، پتھریلے زمین کی نشیب میں بیٹھے تھے چاروں نے مجھے دیکھا، چاروں کے ہاتھ میں ہتھیار تھے چہرے سخت، نظریں پرکھتی ہوئی۔ان میں سے ایک نے پوچھا"تم یہاں کیسے پہنچے؟"

میں نے کہا"میں سمندر سے آیا ہوں، اور مجھے کالا سنگھ بیلٹ کا راستہ دکھایا گیا ہے۔ان میں سے ایک نے سر ہلایا، پھر دھیرے سے قدم آگے بڑھایا وہ چاروں ذرا قریب آ گئے۔ابتدا اردو میں ہوئی۔ان کی اردو ٹوٹی پھوٹی تھی، جیسے الفاظ بوجھ بن رہے ہوں۔ میں نے بات بدلی، لہجہ بدلا، اور پھر بلوچی کے چند جملے استعمال کیے—بس اتنے کہ اجنبیت کم ہو جائے، مگر پہچان نہ بنے۔وہ سمجھ گئے۔ میں بھی سمجھ گیا۔

پھر سوال شروع ہوئے۔ایک نے پوچھا"کس بیلٹ میں رہے ہو؟ شمال یا جنوب؟"میں نے کہا کسی میں نہیں میں بلکل نیا ہوں۔بس بتایا گیا تھا کہ یہاں سے راستے زیادہ ملتے ہیں۔"

پھر اسنے کہا"یہ راستہ تم نے خود چنا ہے یا کسی نے دھکیلا ہے میں نے نظریں جھکا لیں اور کہا"راستے اکثر آدمی خود نہیں چنتا—بلکہ وہ اسے چن لیتے ہیں۔"راستوں کا کتنا علم ہے؟میں نے لاعلمی ظاہر کی،

"کس گروہ کے ساتھ کام کیا ہے؟"میں:"کام نہیں—سفر۔ اور وہ بھی عارضی۔""تم پر اعتبار کیوں کریں؟"میں:"مت کرو۔ بس مجھے آزما لو۔"اسنے پھر کہا کیا تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟میں نے سوال کو مسکراہٹ میں ٹال دیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"میں:

"سرحد پار کا راستہ۔ باقی خود سنبھال لوں گا۔"اور اگر راستہ مہنگا ہوا؟"میں:"تو میں رک جاؤں گا۔ حد سے آگے نہیں جاؤں گا۔اگر ہم نے راستہ بتانے سے انکار کر دیا تو؟میں نے جواب نہیں دیا—خاموشی ہی کافی تھی۔ میں نے خود کو کمزور دکھایا—جسمانی طور پر۔لیکن ذہنی طور پر میں تیار تھا۔ میں جانتا تھا کہ سوال کیسے سنے جاتے ہیں، اور جواب کیسے چھپائے جاتے ہیں۔ صحافت نے مجھے یہی سکھایا تھا: سچ ہمیشہ لفظوں میں نہیں ہوتا۔دوران صحافت میں نے بہت سے سوال اس سے پہلے بھی سنے تھے—کمرے بدلتے رہے، چہرے بدلتے رہے، صرف لہجہ وہی رہا۔مجھے معلوم تھا کہ کب خاموش رہنا ہے، کہاں آدھا سچ کافی ہے،

اور کس جگہ پورا سچ خطرہ بن جاتا ہے۔ میں کسی سوال سے نہیں گھبرایا۔اس لیے نہیں کہ میرے پاس ہر جواب تھا، بلکہ اس لیے کہ مجھے پتہ تھا کون سا جواب دینا ہے اور کون سا اپنے اندر رکھنا ہے۔
باہر سے میں تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا—شاید کمزور بھی۔ لیکن اندر الحمدللہ میں پوری طرح ہوش میں تھا۔اور یہی وہ فرق ہوتا ہے جو زندہ نکلنے والوں اور صرف چلنے والوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ وہ مجھے بچہ سمجھ رہے تھے۔کمزور جسم، سیدھی باتیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ذہن اگر تیار ہو تو جسم پیچھے رہ جاتا ہے۔اب شام ڈھل رہی تھی رات تیزی سے اتر رہی تھی۔ پہاڑوں پر اندھیرا ایسے پھیل رہا تھا جیسے کسی نے آہستہ آہستہ چراغ گل کر دیے ہوں۔ انہوں نے اشارہ کیا، اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ یہ کوئی گرفتاری نہیں تھی، نہ ہی باقاعدہ مہمان نوازی—بس ایک غیر اعلان شدہ معاہدہ تھا جیسے کہا جا رہا ہو: فی الحال تم ہمارے دائرے میں ہو ہم ایک پتھریلی ڈھلوان کے نیچے اترے، جہاں آگ جل رہی تھی، اور رات کے کھانے کی تیاری ہو چکی تھی۔
روٹی، سادہ سا سالن، اور وہ خاموشی جو صرف ان جگہوں پر ہوتی ہے میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ بالکل ویسے ہی جیسے تھکا ہوا مسافر کھاتا ہے نہ شکوہ، نہ سوال۔ اور نہ زیادہ بولا، بس اتنا کہ اجنبیت برقرار رہے کھانے کے بعد کوئی رسمی اختتام نہیں ہوا۔ بس پیالے ایک طرف ہوئے، اور باتوں کا درجہ اور نیچے آ گیا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ آسمان پر ستارے اتنے واضح تھے جیسے زمین سے کوئی فاصلہ ہی نہ رہا ہو۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ کہاں لیٹنا ہے۔ نہ حکم، نہ درخواست—بس سمت۔ میں نے دری لی اور پتھروں کے قریب خاموشی سے لیٹ گیا۔
میں کروٹ بدلتا رہا، نیند اور ہوشیاری کے درمیان۔ آنکھیں بند تھیں مگر سماعت جاگ رہی تھی۔ قدموں کی آواز، سرگوشیاں، اور کبھی کبھی خاموشی کا اچانک بھاری ہو جانا۔ یہ وہ نیند ہوتی ہے جس میں انسان سوتا نہیں—بس خود کو بند کر لیتا ہے۔ پہلی صبح سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا مگر وہ جاگ چکے تھے۔ یہاں جاگنا الارم سے نہیں ہوتا، عادت سے ہوتا ہے۔ صبح بغیر اعلان کے آ گئی۔ کھانا پھر سادہ تھا، باتیں کم۔ ہر شخص محدود لفظوں میں بندھا ہوا۔ دن کے وقت وہ بکھر جاتے۔ کوئی پہاڑی کنارے پر، کوئی دوربین لگا کر سرحد کی سمت دیکھتا کوئی نشیب میں دور دیکھتا ہوا—جیسے پہرہ بھی ایک خاموش مشق ہو۔ میں درمیان میں تھا۔ نہ مکمل مہمان، نہ قیدی۔ بس موجود۔ میں زیادہ تر پہاڑی کے دامن میں ہی رہا۔ نہ مجھے روکا گیا، نہ بلایا گیا۔ دن کا کھانا سادہ ہوتا تھا، لیکن وقت پر ہوتا تھا۔ یہ چیز میں نے نوٹ کی۔ باتیں ہوتی تھیں، مگر محدود۔ زیادہ تر عام سی باتیں: موسم، راستہ، اور کبھی کبھی بے مطلب ہنسی۔ شام کو ہم پھر اکٹھے ہو جاتے۔ آگ جلاتے، کھانا کھاتے، اور خاموش بیٹھے رہتے۔ جب کبھی میں باڈر کے راستے کی پوچھنے کی کوشش کرتا، تو جواب مکمل ہونے سے پہلے دوسری سمت مڑ جاتا۔ ''دیکھیں گے۔'' ''وقت بتائے گا۔'' ''ہم خود سرحد پار کروائیں گے یہ کہہ دیتے یہ جملے پہلے دن عام لگے، پھر مانوس، اور پھر مشکوک۔ دوسری رات میں نے یہ بھی غور کیا کہ پہرہ بدلنے کا طریقہ کتنا خاموش ہے۔ کوئی اعلان نہیں، کوئی آواز نہیں۔ بس ایک سایہ ہٹتا اور دوسرا آ جاتا۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ تیسرے دن سے پہلے کوئی واضح مسئلہ نہیں تھا۔ سب کچھ بظاہر اپنی جگہ درست لگ رہا تھا۔ لیکن اصل مسئلہ یہی تھا کہ سب کچھ بظاہر

درست تھا۔ تیسرے دن ایک آدمی آیا تھا۔ میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ زیادہ دیر نہیں رکا۔ بس بیٹھا، چائے پی، اور آہستہ آہستہ بات کرتا رہا۔ وہ مجھ سے نہیں بولا، لیکن وہ بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے تھوڑا دور ایک چٹان پر بیٹھا تھا۔ وہ آدمی جو آیا تھا تھوڑی دیر بعد چائے پی کر خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد فضا میں ایک عجیب سا خلا رہ گیا۔ جیسے اس کے ساتھ کوئی جملہ بھی یہیں چھوڑ دیا گیا ہو جو ابھی مجھ سے بولا نہیں گیا تھا۔ اس اجنبی ادمی کے جانے کے بعد دوسرا آدمی جو اجنبی بندے کے ساتھ بیٹھ رہا میرے قریب آیا۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن کبھی اتنی نزدیکی سے نہیں۔ اس نے نہ بیٹھنے کا کہا، نہ کھڑے ہونے کا۔ بس ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اور ہم وہاں سے ذرا ہٹ کر غار کے قریب آ گئے۔ ہم غار کے قریب رُک گئے۔ وہاں روشنی کم تھی، آوازیں بھی جیسے دیواروں میں جذب ہو جاتی تھیں۔ اس نے بات شروع نہیں کی۔ بس کچھ لمحے خاموش کھڑا رہا، جیسے دیکھ رہا ہو کہ میں کہاں تک سنتا ہوں۔ پھر بولا، آہستہ، ایسے جیسے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہو: ''ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ یہ جملہ مجھے اجنبی نہیں لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہاں کوئی چیز بلا قیمت نہیں ملتی۔
میں نے خود ہی بات آگے بڑھائی، جان بوجھ کر۔ کہا: ''اگر مسئلہ پیسوں کا ہے تو وہ بھی بات ہو سکتی ہے۔'' وہ ذرا سا مسکرایا— وہ مسکراہٹ جو خوشی نہیں اندازہ لگانے کے لیے ہوتی ہے۔ کہنے لگا: ''یہ سودا پیسوں کا نہیں ہوتا۔ پیسے تو سب سے آسان چیز ہیں۔'' یہ وہ لمحہ تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں جس قیمت کی بات کر رہا تھا وہ کچھ اور ہے۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ راستے صاف نہیں ہوتے۔ یہاں کوئی سفید کپڑے پہن کر سرحد پار نہیں کرتا۔ پھر اس نے کپڑے کے اندر رکھا ہوا چھوٹا سا پیکٹ صرف اشارے سے دکھایا— پورا نہیں، بس اتنا کہ بات واضح ہو جائے۔ ''یہ ہمارا مال ہے۔ تم نے ساتھ لے جانا ہے۔'' میں نے سیدھا سوال کیا، بغیر گھمائے: ''کدھر پہنچانا ہے؟'' وہ ایک لمحہ رکا، پھر بولا: ''سرحد کے اُس پار ہمارا بندہ ہوگا۔ تم بس یہ اسے دے دینا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم۔'' میں نے فوراً اگلا سوال کیا— وہ سوال جو ٹالا نہیں جا سکتا: ''اور اگر راستے میں کوئی خطرہ ہوا؟ فورس، یا کوئی مسئلہ؟'' اس بار وہ مسکرایا نہیں۔ اس بار اس کی آواز میں یقین تھا— یا کم از کم یقین دکھانے کی کوشش۔ ''نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں ایسی جگہ سے پار کروائیں گے جہاں یہ لفظ سنا ہی نہیں جاتا۔ کوئی فورس نہیں، کوئی چیک نہیں۔ یہ ہم پر چھوڑ دو۔'' پھر اس نے بات مکمل کی، بالکل صاف: ''مال پہنچے گا، تم نکل جاؤ گے۔ اس کے بعد تمہارا راستہ الگ، ہمارا الگ۔'' میں نے پھر پوچھا: سرحد پار کرنے کے بعد، میں کیسے جانوں کہ تمھارا بندہ کہاں ہے؟ اور نشانی کیا ہو گی؟ اس نے آہستہ سے کہا: ''دو کلومیٹر کے فاصلے پر تمہیں ہمارا بندہ ملے گا۔ تمہیں زیادہ تلاش نہیں کرنا پڑے گا، بس ایک نشانی یاد رکھو۔ جس شخص کے پاس تم جاؤ گے، اس کے ہاتھ میں بالکل یہی پیکٹ ہوگا۔ اسی شکل کا، اسی طرح بندھا ہوا۔ یہی اس کی نشانی ہے۔'' میں نے چونک کر پوچھا: ''اور اگر کوئی غلط آدمی یہ سب کر دے، تو میں کیسے جانوں کہ یہ وہی ہے؟'' اس نے آہستہ سے کہا: ''غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ یہ نشانی صرف اسی کے لیے ہے، غلط آدمی وہاں پہنچتا ہی نہیں۔'' پھر اس نے اطمینان دلانے کے انداز میں کہا: ''فکر مت کرو۔ اس راستے پر ویسے بھی کوئی نہیں ہوتا۔ جو ہوتے ہیں وہ ہمارے ہی ہوتے ہیں۔

"اب سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ یہ پیسوں کی ڈیل نہیں تھی — ورنہ بات آسان ہوتی۔ یہ اعتماد کی ڈیل تھی، اور اعتماد یہاں زبردستی لیا جاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں اب انکار کرتا تو مسئلہ صرف انکار کا نہیں رہے گا۔ یہ لوگ خود کو بھی بچاتے ہیں۔ جو ان کے بیچ یہ بات سن لے، وہ باہر جا کر آزاد نہیں رہتا۔ ان کے نیٹ ورک، ان کے راستے، ان کے چہرے — یہ سب ان کے لیے راز ہوتے ہیں، اور راز قیمت مانگتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ کام کا فیل ہونا نہیں — راز کا باہر جانا ہوتا ہے۔ اور میں اب ایک راز بن چکا تھا۔ ایسا راز جو ان کے لیے کبھی بھی خطرے کا سبب بن سکتا تھا اور یہ لوگ خطرے راستے میں نہیں چھوڑتے۔ وہیں کام تمام کر دیتے ہیں۔ اسی لیے میں نے ظاہر میں ہاں کی۔ دل سے نہیں، مجبوری سے۔ وہ ہاں جو آدمی اپنی جان بچانے کے لیے کہتا ہے — اپنے ضمیر سے نہیں۔ پھر "ٹھیک ہے،" میں نے کہا۔ "جیسا آپ کہیں۔" وہ کچھ مطمئن ہوا۔ مجھے اب ساری صورتحال سمجھ آ گئی تھی۔ میں ان کے ساتھ رہ چکا تھا، ان کے دائرے میں سو چکا تھا، ان کے کھانے میں شریک ہو چکا تھا۔ یہ سب ان کے حساب میں "شمولیت" تھی۔ اور شمولیت کے بعد پیچھے ہٹنا غداری سمجھا جاتا ہے۔ ایک عجیب سی بے چینی میرے دل میں اُترنے لگی۔ ایک طرف یہ کام میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

دوسری طرف اس کے بغیر واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ سرحد کے اُس پار پکڑا جانا صرف گرفتاری نہیں — یہ ایسی الجھن ہے جس سے کوئی صحافت بھی نہیں نکال سکتی۔ میں نے پھر پوچھا: "ایک بات بتاؤ — مجھے کیسے یقین ہو کہ جب میں یہ امانت پہنچا دوں گا تو مجھے تمھاری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا؟" وہ ذرا سا رکا۔ ایسا نہیں لگا کہ سوچ رہا ہو — بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے جواب پہلے ہی طے شدہ ہو۔ وہ آہستہ سا مسکرایا، اور کہا: "یقین کی بات تو تب ہوتی ہے جب آدمی آزاد ہو۔ تم تو ابھی بھی ہمارے رحم و کرم پر ہو۔" یہ کوئی جواب نہیں تھا، یہ ایک یاد دہانی تھی۔ اس نے بات آگے نہیں بڑھائی، نہ وعدہ کیا، نہ انکار — بس بات کو وہیں چھوڑ دیا جہاں سوال خود ہی بوجھ بن جائے۔ میں مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن اندر ایک اضطراب سا پھیل گیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ معاملہ صرف راستے کا نہیں، صرف سرحد کا نہیں — یہ ایک ایسا کھیل تھا جس میں کام نکلنے کے بعد مہرے کی حیثیت ختم بھی ہو سکتی ہے۔ میرا ان پر مکمل یقین وہیں ٹوٹنے لگا تھا۔ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ لوگ اپنا کام نکلوا کر میرا حساب بھی خود ہی بند کر سکتے ہیں۔ میں باہر سے خاموش تھا، مگر اندر خطرے کا احساس اور گہرا ہو رہا تھا۔ اب یہ صرف خوف نہیں تھا — یہ سمجھ تھی۔ اور اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ زبان سے ہاں ہی رہے گی، مگر ذہن اب اپنا راستہ خود بنائے گا۔ یہ لوگ کسی کو باہر کے کام میں صرف ایک وجہ سے ہی لاتے ہیں — تاکہ وہ ان کے کام کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھا لے۔ اور اگر بوجھ کہیں گر جائے تو کندھا ہی بدل دیا جاتا ہے۔ جو بات اب واضح ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مجھے صرف گزارنا نہیں چاہتے تھے — وہ مجھے درمیان میں رکھنا چاہتے تھے۔ ایک ذریعہ۔ ایک واسطہ۔ ایک ایسا وجود جس پر اگر کچھ آ جائے تو اصل ہاتھ نظر ہی نہ آئیں۔ میں نے اس سے پھر پوچھا، جیسے بس ایک عام سا سوال ہو: "کب نکلیں گے؟" کہنے لگا: "آج ہی۔ رات گیارہ بجے۔" میں نے سر ہلایا۔ زیادہ ردِ عمل نہیں دیا۔ نہ حیرت، نہ سوال۔ بس اتنا کہا: "ٹھیک ہے۔" وہ شاید اسی

جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے بات کو وہیں روک دیا، جیسے مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ نہ راستے کی تفصیل، نہ آگے پیچھے کی بات۔ بس ایک وقت۔ رات گیارہ بجے۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ خاموشی میں مزید کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں واپس آ گیا۔ غار کے اندر آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہی جگہ جہاں میں پہلے بھی اکثر بیٹھا رہتا تھا۔ میرے پاس اب وقت تھا۔ زیادہ نہیں۔ بس رات گیارہ بجے تک۔ میں جانتا تھا کہ میں نے ہاں کسی یقین پر نہیں کی تھی۔ میں نے ہاں صرف اس لیے کی تھی کہ مجھے وقت چاہیے تھا۔ اور وقت اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت تھا۔ میں بیٹھا سوچتا رہا۔ ایک راستہ نہیں، کئی راستے ذہن میں ابھرے۔ کچھ سیدھے تھے، مگر خطرناک۔ کچھ محفوظ لگتے تھے، مگر ادھورے۔ مجھے یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ مسئلہ مال کا نہیں ہے۔ مال میں لے جا سکتا تھا۔ یہ مجھے پہلے دن سے پتہ تھا۔ دو نمبر راستہ، دو نمبر چیز— یہ سب نیا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ مال کے بعد تھا۔ بارڈر کے اُس پار میں کیا بنوں گا؟ ایک آدمی... یا ایک مسئلہ؟ کیونکہ سچ یہ تھا کہ مال پہنچانے کے بعد میرے ساتھ کیا ہوگا— اس کی کوئی یقین دہانی نہیں تھی۔ میں بیٹھا رہا اور اسی سوچ کو آگے بڑھاتا رہا۔ پھر ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ٹھیک ہے— میں ان کی بات مانتا ہوا نظر آؤں۔ مال ساتھ لوں۔ خاموش رہوں۔ کوئی سوال نہ کروں۔ کوئی جلدی نہ دکھاؤں۔

بالکل ویسا ہی جیسا وہ چاہتے تھے۔ سرحد تک ان کے ساتھ۔ پھر سرحد پار ان کے کہے ہوئے راستے سے۔ لیکن صرف اتنی دیر تک جتنی دیر میرے لیے ضروری ہو جب سرحد پار کروا دی جائے گی۔ وہ بندہ جو دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ تو کیوں نہ میں دو کلومیٹر پورے ہونے سے پہلے ہی اپنا راستہ بدل لوں؟ خاموشی سے۔ بغیر کسی کو بتائے۔ ایک اور طرف نکل جاؤں۔ کاغذ پر یہ بھی ممکن لگتا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے یہ خیال خود ہی ٹوٹنے لگا۔ میں نے خود سے کہا: نہیں۔ ایسا نہیں۔ اگر میں اچانک راستہ بدلتا ہوں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لوگ یہ پہلے سے نہ سوچ چکے ہوں؟ ظاہری سی بات تھی— انہوں نے مجھ پر مکمل اعتبار نہیں کیا ہوگا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ ان کے ذہن میں پہلے سے ایک اور منصوبہ موجود ہو۔ ایک ایسا منصوبہ جو میرے ہر ممکن قدم کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہو۔ ایسے لوگوں کے لیے اصل خطرہ مال نہیں ہوتا— اصل خطرہ آدمی ہوتا ہے جو مال لے کر غائب ہو جائے۔ اور میں انہی کے بیچ ایک ایسا آدمی تھا جس پر وقت نظر رکھی جا رہی ہو گی ضرور انہوں نے سرحد کے پار میری نگرانی کا بھی بندوبست کیا ہوگا اسی لیے اگر میں اچانک کوئی حرکت کرتا ہوں تو یہ میرے لیے اور بھی بڑا مسئلہ بن سکتا ہے میں براہِ راست پھنس سکتا ہوں۔ یہ راستہ مجھے آزاد نہیں کرتا— یہ مجھے اور گہرے خطرے میں ڈال دیتا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ قدم جلدی میں اٹھایا گیا تو واپسی کا کوئی موقع نہیں بچے گا۔ اسی لیے میں نے اس خیال کو وہیں روک دیا۔ رد نہیں کیا— بس ابھی کے لیے ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے خود سے کہا: یہ پلان ابھی نہیں۔ اسے میں پلان بی کے طور پر رکھوں گا۔ اگر باقی سب ناکام ہوا— تب۔ لیکن ابھی مجھے کچھ اور سوچنا تھا۔

کچھ ایسا جو انہیں چونکائے بغیر مجھے وقت دے۔ کچھ ایسا جس میں میں ان کے کھیل کا حصہ بھی رہوں اور پھر بھی اپنی جگہ بنا سکوں۔ میں غار کے اندر خاموش بیٹھا رہا۔ وقت آہستہ آہستہ شام کی طرف سرک رہا تھا۔ اور میرے پاس ابھی بھی

رات گیارہ بجے تک سانس لینے کی مہلت تھی۔ پھر میرے ذہن نے ایک خطرناک موڑ لیا۔ ایسا خیال جو زبان پر نہیں آتا صرف دماغ کے اندھیرے کونے میں پیدا ہوتا ہے۔ میرے بیگ میں ایک چھوٹی سی چیز تھی۔ کوئی ہتھیار نہیں۔ کوئی تیز دھار نہیں۔ بس ایسی چیز جس کی موجودگی خود میں ایک امکان تھی۔ اگر میں کچھ ایسا کروں کہ یہ شام کا کھانا کھانے کے بعد سب سو جائیں تو کیسے رہے گا پھر میں نے اسی منصوبے پر سوچنا شروع کیا اور خود سے کہا شام کے کھانے سے پہلے پانی میں ایسی دوا ملا دوں گا جو چند گھنٹوں کے لیے ان سب کو سلا دے کھانا یہاں بس کھانا نہیں ہوتا۔ یہ ایک وقت ہوتا ہے جب سب ایک جگہ ہوتے ہیں۔ وہ چار ادمی تھے اور کھانا ہم مل کر کھاتے تھے میں کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔
بس خاموشی سے نکلنا چاہتا تھا اگر یہ لمحہ یہ منصوبہ میرے حق میں چلا گیا— تو شاید میں خاموشی سے یہ جگہ چھوڑ سکوں۔
لیکن اسی سوچ کے ساتھ ایک اور آواز بھی اُٹھی۔ اگر یہ منصوبہ ناکام ہو گیا تو؟میں جانتا تھا کہ ہر منصوبہ سب پر ایک جیسا اثر نہیں ڈالتا۔ ایک آدمی سو سکتا ہے— دوسرا نہیں۔ اور یہی فرق خطرہ بن جاتا ہے۔ اگر کسی نے کھانے کے دوران پانی نہ پیا تو تو پھر؟ میں جانتا تھا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ غلطی دوسرا موقع نہیں دیتی۔ پھر میرے پاس واپس مڑنے کا وقت نہیں ہوگا۔ پھر وہی ہوگا جو انہوں نے میرے لیے سوچ رکھا ہے۔ اسی لیے میں نے اس خیال کو فیصلہ نہیں بنایا اور یہ کوئی مکمل منصوبہ بھی نہیں تھا۔ بس ایک سوچ تھی۔ ایسی سوچ جو تب آتی ہے جب آدمی دیوار کے ساتھ لگ چکا ہو۔ میں نے اسے پلان اے کا نام دیا۔ دل میں۔ زبان پر نہیں۔ اور خود سے بس اتنا کہا: اگر یہ لمحہ میرے حق میں ہوا— تو میں خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اور اگر یہ بھی میرے خلاف نکلا— تو پھر مجھے پلان بی پر جانا ہی ہوگا۔ یہ وہ راستہ تھا جسے میں اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن ذہن میں اس کا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ یہاں صرف ایک پلان پر انحصار کرنا خودکشی کے برابر تھا۔ میں نے خود سے طے کیا کہ میں پہلے پلان اے پر چلوں گا۔ آخری حد تک۔ اور اگر حالات وہاں تک پہنچ گئے جہاں خاموشی بھی کام نہ آئے— تو پھر جو راستہ بچے گا وہی میرا ہوگا۔ میں نے یہ سب کسی جوش میں نہیں سوچا تھا۔ نہ بہادری میں۔ نہ ضد میں۔ یہ حساب تھا۔ ٹھنڈا۔ خاموش۔ کیونکہ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ سودا مال کا نہیں تھا۔ یہ سودازندگی کا تھا۔ اور زندگی کے سودے میں ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ اب کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ سوچ فیصلہ بن چکی تھی۔ میں نے اپنی سوچ یہیں روک دی۔ اب مزید سوچ خطرناک ہو سکتی تھی۔ شام قریب آ رہی تھی۔ اور میں خاموشی سے اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جہاں یا تو رات میری ہو گی— یا پھر میں کسی اور کے حساب میں اجاؤں گا

میرا دل اب تیز دھڑک رہا تھا۔
شام واقعی قریب آچکی تھی— اور عجیب بات یہ تھی کہ سب کچھ بالکل میرے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا، جیسے وقت بھی اس لمحے کے لیے ذرا سا سست چلنے لگا ہو۔میں نے اپنے منصوبے کے مطابق پانی کے اندر دوا ملا دی تھی آگ پھر جلائی گئی۔ حسبِ معمول سب ایک ایک کر کے آ کر بیٹھ گئے۔بالکل ویسے ہی جیسے پچھلی شاموں میں بیٹھتے تھے۔میں نے خود کو بالکل معمول کے مطابق رکھا۔نہ جلدی، نہ بے چینی۔بس ایک تھکا ہوا مسافر— جیسا میں پہلے دن سے بنا ہوا تھا۔

میں باہر سے بالکل معمول پر تھا—اندر دل کسی قید پرندے کی طرح دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔
سب کچھ بظاہر میرے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔وہ سب اب کھانے کیلئے آ گئے تھے کھانا بھی کھا رہے تھے۔باتیں بھی کر رہے تھے۔اور ہنس بھی رہے تھے وہ پانی بھی پی رہے تھے جس میں میں نے دوا ملا دی تھی
میری بھوک تو ویسی ہی مٹ چکی تھی ہر نوالہ نگلتے وقت
یوں لگتا جیسے حلق میرے ساتھ بحث کر رہا ہو پھر اچانک دوا نے آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔
کھانے کے بعد سب زیادہ دیر بیٹھے نہیں۔وہی ہوا جس کا یہاں میرے پلان کے مطابق ہونا تھاایک ایک کر کے وہ درختوں کے سائے تلے پھیلنے لگے۔کوئی پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر،کوئی آگ سے ذرا فاصلے پر،کوئی خاموشی سے کروٹ بدل کر۔باتیں ختم ہو چکی تھیں۔
آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔پھر انہیں وہ نیند آئی جو ارام ارام سے نہیں اتی بس اچانک آ جاتی ہے آدھے گھنٹے کے اندر فضا بدل گئی۔سانسیں گہری ہو گئیں،آوازیں ٹوٹ گئیں،اور وہ جگہ جہاں کچھ دیر پہلے لوگ تھےاب صرف جسم رہ گئے تھے۔میں خاموش بیٹھا یہ سب دیکھتا رہا۔نہ جلدی،نہ حرکت۔میں جانتا تھا
کہ اب وقت میرے حق میں ہےاور وقت یہاں زیادہ دیر کسی کا نہیں رہتا اب میرا اپنا کام شروع ہونا تھا میں آہستہ سے اٹھا۔اتنا آہستہ کہ پتھر بھی فرق محسوس نہ کرے۔ہر قدم سوچ کر رکھا۔زمین کو پرکھتے ہوئے،سایوں کو گنتے ہوئے۔میں نے سامان کی طرف نظر دوڑائی۔وہاں ایک جگہ پر ان میں سے ایک نے اپنا سامان رکھا ہوا تھا۔کوئی لاپرواہی نہیں— بس عادت۔کیونکہ یہاں ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ اس دائرے میں سب اپنے ہیں۔ان میں سے ایک نے اپنا ہتھیار ایک طرف رکھا ہوا تھا۔پرانی سی، مگر سنبھالی ہوئی۔وہی سرحدی علاقوں میں عام ملنے والی AK طرز کی رائفل میں نے وہی اٹھائی سادہ، سخت جان، اور بنا کسی دکھاوے کے۔
ایسی رائفل جو خود کو منوانے کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی۔میں نے اسے کسی تجسس سے نہیں دیکھا۔نہ حیرت سے،نہ گھبراہٹ سے۔
بس ایک پہچان تھی۔جیسے کوئی پرانی چیز اچانک برسوں بعد سامنے آ جائےاور دل میں یہ خیال آئے: ہاں— یہ تو مجھے معلوم ہے۔مجھے ہتھیار اجنبی نہیں لگے۔میں انکے وزن سے بھی واقف تھا یہ میری پہلی بار نہیں تھی۔میری زندگی میں ایسے دنپھلے آ چکے تھے جب میں بنا کسی کمزوری کے ہتھیار چلا چکا تھا ہتھیار صرف چیز نہیں ہوتے،ذمہ داری بھی ہوتے ہیں۔میں نے رائفل کو بس اتنا جانچا جتنا ضروری تھا—
نہ زیادہ، نہ کم۔جیسے کوئی آدمی اپنا جوتا پہنتے وقت دیکھتا ہے کہ فیتے ٹھیک ہیں یا نہیں۔ساتھ ہی میں نے ایک سادہ سا چاقو بھی اٹھا لیا۔کوئی خاص نہیں—بس وہی جو ایسے علاقوں میں ہر آدمی کے پاس ہوتا ہے۔میں یہ سب اپنے دفاع کے لیے لے رہا تھا۔نہ کسی حملے کے لیے،نہ کسی دشمنی کے لیے۔میں یہاں ہتھیار استعمال کرنے نہیں آیا تھالیکن خالی ہاتھ جانا بھی خود کو قسمت کے حوالے کرنے جیسا تھا اس علاقے میں صرف انسان خطرہ نہیں ہوتے۔

یہاں ہر چیز چوکسی مانگتی تھی— جنگلی جانور، اچانک نکل آنے والی پرانی پگڈنڈیاں، اور وہ خاموش گھات جو بغیر آواز کے سامنے آ جاتی ہے۔ بہت خطرناک ہوتی ہے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیتی تو اس لیے ہتھیار پاس رکھنا ضروری تھا میرا دل اب بھی تیز دھڑک رہا تھا مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ علاقہ جانوروں کا بھی ہے، اور انسانوں کا بھی— اور دونوں اپنے اپنے طریقے سے خطرناک ہوتے ہیں۔ میں پیچھے کا بھی سوچ رہا تھا، اور آگے کا بھی۔

پیچھے وہ لوگ تھے جن کے دائرے سے میں بغیر اجازت نکل رہا تھا۔ اور آگے وہ راستہ تھا جسے مجھے اکیلا طے کرنا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب خوف صرف دل میں نہیں رہتا— وہ سانس میں گھل جاتا ہے۔ میں نے اپنی گرفت درست کی۔ کوئی جوش نہیں۔ بس اتنا کہ اگر یہ رات میرا امتحان لے— تو میں بالکل بے بس نہ ہوں۔ اج یہاں ایک قدم یا تو زندگی کی طرف ہو گا— یا ہمیشہ کی خاموشی کی طرف۔ میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یہ اب فرار نہیں تھا۔ یہ بقا تھی۔ اور بقا میں انسان وہ سب کرتا ہے جو وہ عام دنوں میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں خاموشی سے اندھیرے میں آگے بڑھ گیا۔

اب واپسی نہ لفظ میں تھی، نہ سوچ میں۔ اب یا تو راستہ کھلنا تھا— یا یہ رات اپنا حساب پورا کرنے والی تھی

میں آگے بڑھ رہا تھا۔ راستہ پتھریلا تھا، کہیں ڈھلوان، کہیں جھاڑیاں۔ ایک طرف چٹانیں تھیں، دوسری طرف گھنا اندھیرا — ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ اندھیرے میں اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، مگر شاید ایک گھنٹہ ہی گزرا ہو گا۔

میں جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا کہ ایک چٹان کے پیچھے حرکت ہوئی۔ اگلے ہی لمحے ایک نقاب پوش شخص میرے سامنے آ گیا۔ یوں نہیں کہ دور سے دکھائی دیا ہو— وہ بالکل اچانک نکلا، جیسے وہیں بیٹھا ہو اور بس اسی لمحے کا انتظار کر رہا ہو۔ اس نے کچھ کہا۔ آواز سخت تھی، الفاظ اجنبی۔ شاید بلوچی تھی،

یا کوئی اور مقامی زبان مجھے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک بات صاف تھی: یہ بات چیت نہیں تھی۔

میں نے اس رات کسی پر بھروسہ کرنے کا حق اپنے اندر دفن کر دیا تھا اس اندھیرے میں، اس راستے پر، ایسے آدمی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

میرے ذہن میں ایک بات بالکل صاف تھی اگر میں نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں لگا دیا

تو شاید وہ موقع مجھے دوبارہ نہ ملے میں نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہ خالی نہیں تھا اسکے پاس بھی رائفل تھی اور یہی وہ لمحہ تھا جہاں شک کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے جہاں مزید سمجھنے کی ضرورت نہیں رہتی جیسے ہی سامنے والے شخص سے مجھے فائر کا وہم ابھرا میں نے فوراً ردِ عمل دیا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی لوڈڈ۔ میں نے ٹریگر دبا دیا گولی سامنے والے شخص کی رانوں میں جا لگی اس سے پہلے کہ میں دوسرا فائر کرتا میں فوراً زمین پر لیٹ گیا اور زمین پر لیٹے ہی کروٹ بدل دی تاکہ اگر اس کی طرف سے بھی اگر کوئی فائر ہو تو میں اپنے اپ کو پہلے بچا سکوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اس کی طرف سے گولی نہیں چلی

میری گولی جیسی اس کی ران پر لگی تھی وہ وہیں گر گیا تھا میرا مقصد کسی کو مارنا نہیں تھا بس خود کو اور اپنی جان کو محفوظ رکھنا ضروری تھا میں نے اسے زخمی کر دیا تھا— اسی حد تک کافی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل میدان میں آدمی کا مقصد

ہمیشہ بقا ہوتا ہے، نہ کہ فتح یا انتقام۔یہ لمحہ مجھے یہ سمجھا گیا کہ اپنا دفاع ضروری ہے، اپنی جان بچانا سب سے پہلے آتا ہے۔
یہ سب کچھ دس سیکنڈ میں ہو چکا تھا میدان میں سوچنے کا وقت نہیں ہوتا...وہاں صرف لمحے ہوتے ہیں اور وہ بھی بے رحم کتابوں میں یہ سب آسان لگتا ہے مگر اصل میدان میں سردیوں میں بھی بدن سے پسینہ نکلتا ہےاس وقت دماغ منصوبے نہیں کھولتا۔کوئی نقشہ سامنے نہیں آتا۔کوئی سبق ترتیب سے یاد نہیں آتا۔سب سے پہلے جسم ردِعمل دیتا ہے۔دل زور سے دھڑکتا ہے، اتنا کہ کانوں میں اپنی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔
سانس بے ترتیب ہو جاتی ہے — کبھی تیز، کبھی رکی ہوئی۔ نظر اچانک تنگ ہو جاتی ہے، جیسے دنیا سکڑ کر صرف سامنے والے منظر تک محدود ہو گئی ہو۔اس لمحے آدمی سوچ کر فیصلہ نہیں کرتا۔
وہ اندازہ نہیں لگاتا کہ کون صحیح ہے، کون غلط ہے، اس کا مقصد کیا ہے، کیا کوئی اور بھی آس پاس ہے۔میدان میں اصل چیز ''فوری ردِعمل'' ہوتی ہے۔جسم خود بخود حرکت کرتا ہے — جھک جانا، ہٹ جانا، پیچھے ہونا، سمت بدل لینا۔اکثر بعد میں انسان کو یاد بھی نہیں رہتا کہ اس نے حرکت کیسے کی تھی۔ بس یاد رہتا ہے کہ وہ حرکت ہو گئی تھی۔اس وقت خوف بھی مکمل شکل میں محسوس نہیں ہوتا۔خوف بعد میں آتا ہے —جب ہاتھ کانپتے ہیں،
جب سانس نارمل ہونے لگتی ہے،جب دماغ سوال پوچھنا شروع کرتا ہے۔اصل میدان میں الجھن نہیں ہوتی —کیونکہ سوچنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔
وہ خالص لمحہ ہوتا ہے: یا تو تم حرکت کرتے ہو یا جم جاتے ہو۔
اور جو حرکت کر لیتا ہے،وہ بعد میں بیٹھ کر سوچتا ہے کہ ابھی ہوا کیا تھا میری بھی اس وقت وہی حالت ہو چکی تھی— دماغ مکمل طور پر شاک، دل زور سے دھڑک رہا، سانس بے ترتیب، اور ہر حرکت صرف ردِعمل کے تحت۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب سوچنے کا وقت نہیں، بس ہر قدم بچاؤ اور آگے نکلنے کے لیے۔میں نے اسکی طرف جا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔وہ شخص—جو اچانک سامنے آیا—میرا مقصد نہیں بننا چاہیے شاید وہ اکیلا نہ ہو، شاید اس کے ساتھ کوئی اور بندہ ہومیں یہ جاننے کے لیے رکا نہیں کہ وہ اکیلا تھا یا نہیں، یا وہ انہی لوگوں سے تھا جنہیں میں پہلے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔یا جو ابھی میں پیچھے گروہ چھوڑ کر آ رہا تھا،
اس کا ان کے ساتھ کوئی لنک ہواور یہ بھی ممکن تھا کہ اس شخص کی ان لوگوں کے ساتھ دشمنی ہواس کے قریب جانا، خود کو خطروں میں ڈالنا، یا اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا—یہ سب ممکنہ طور پر میری بقا کے لیے خطرہ بنتا۔میں نے اس پر اعتماد نہیں کیا۔ میں نے اس کے لباس یا حالت کی تفصیل تک نہیں دیکھی، بس یہ جانا کہ وہ ادھر ہی فلحال پڑا ہوا ہے۔ جھاڑیوں کی طرف ذرا سا نظر دوڑائی، دوسری طرف بھی کروٹ بدل کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلا۔چند لمحے میں میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی آگے بڑھنا ہی محفوظ ہے۔
میں نے فوراً اپنا راستہ بنایا، ادھر ادھر محتاط نظر دوڑائی، اور اس کی طرف بالکل نہیں بڑھا۔ وہ ادھر ہی فلحال پڑا ہوا تھا، میں نے نہ رکا، نہ پیچھے مڑا، بس اپنا راستہ برقرار رکھا۔ ڈھلوانوں کی طرف بڑھتے ہوئے، تیز قدموں سے آگے نکلتا جا رہا تھاہر

لمحہ یہ خیال چل رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا غلط قدم بھی مکمل منصوبے کو برباد کر سکتا ہے
مگر میں نے اس پر غور نہیں کیا، بس حرکت میں رہا۔ اندھیرا میرا ساتھی تھا اور ڈھلوانیں میرے راستے کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ ہر قدم محتاط، ہر لمحہ ہوشیار اور ہر حرکت ردعمل کی بنیاد پر۔
اور ساتھ دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اتنے قریب خطرہ آیا، مگر میں زندہ ہوں۔ ابھی تو خطرہ مکمل طور پر ٹلا نہیں تھا، ہر لمحہ محتاط رہنا ضروری تھا، مگر دل میں یہ یقین تھا کہ میرا رب مجھے ہر خطرے سے بچائے گارات گزرتی رہی، اور گزرتے گزرتے صبح ہونے لگی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے روشن میں بدل رہا تھا، اور پہاڑوں کے درمیان روشنی کی ہلکی لکیریں پھیلنے لگیں۔
قریب ہی ایک ندی بہہ رہی تھی، جو عموماً بارشوں کے موسم میں ہی منظر پر آتی ہے۔ میں نے ندی کے کنارے رک کر وضو کیا، پانی کی ٹھنڈک اور بہاؤ نے جسم اور ذہن دونوں کو کچھ سکون دیا۔ وضو کے بعد میں نے نماز ادا کی، دل میں شکر ادا کیا کہ ابھی تک خطرہ ٹل گیا ہے، اور میں زندہ ہوں۔ نماز کے بعد میں نے سوچا کہ تھوڑا آرام ضروری ہے پورا دن اور پوری رات میں سویا نہیں تھا، خوف اور چوکنا رہنے کی حالت میں گزرا تھا، اور جسم بھی کافی تھک چکا تھا اور ویسے بھی رات کے مقابلے میں صبح کے وقت پہاڑ خطرناک ہو سکتے ہیں، رات کا اندھیرا پہاڑ——یہ سب میرے لیے ایک قدرتی پردہ تھے، جس کے پیچھے میں محفوظ اور آزاد تھا۔ رات کے وقت خطرہ کم ہوتا ہے، اور اندھیرے میں آدمی کچھ زیادہ آزاد محسوس کرتا ہے لیکن دن میں سب کچھ واضح نظر آتا ہے، ہر قدم پر خطرہ بڑھ سکتا ہے، اس لیئے میں نے رات کو سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور میں نے دل میں یہ ٹھان لیا تھا کہ اب میں خود ہی سرحد پار کروں گا۔ کسی کے سہارے پر نہیں، کسی پر بھروسہ نہیں۔ یہ فیصلہ میرا تھا، اور بس میرا۔ سوچ میں حیرانی، مگر عزم پختہ تھا پھر میں نے قریب ہی ایک غار نما درے کا رخ کیا۔ پہاڑی ڈھلوان پر یہ غار چھپا ہوا تھا، چھوٹا سا مگر محفوظ، اور وہاں میں نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔ پھر میں نے غار کے اندر قدم رکھا، بیگ اور ہتھیار ایک طرف رکھا اور
زمین پر لیٹ گیا میں نے آنکھیں بند کیں، سانسوں کو معمول پر لایا، اور دل میں یہ سوچا کہ اسی جگہ میں چند لمحوں کے لیے سکون حاصل کروں۔ پہاڑوں کی خاموشی، ہوا کی ہلکی سرسراہٹ، اور دور ندی کی بہاؤ کی آواز نے ذہن کو کچھ راحت دی میں چاغی کے پہاڑوں کے قریب ایک غار نما پتھریلے درہ میں تھا
جہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر وہ وہ عظیم پہاڑ ابھرے ہوئے تھے
جہاں پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے تجربات کیے گئے تھے، لیکن یہاں کی خاموشی اور فضا بالکل الگ تھی میری آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی ذہن کسی خاموش سوچ میں کھو گیا۔ اچانک ایک اور منظر میرے ذہن میں نمودار ہوا۔ یہ وہ منظر تھا جب پاکستان نے 1998 میں پہلا ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں اُس لمحے کو محسوس کیا——جب ہمارے پہاڑوں کی چھپی ہوئی طاقت نے دشمنوں کے منصوبوں کو ناکام کیا، اور دنیا کو بتا دیا کہ پاکستان اپنی حفاظت کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ وہی پہاڑ، جو آج برف اور دھوپ میں روشن کھڑے ہیں، ایک دن ہماری بقا کا محور بن گئے

تھے۔

وہ پہاڑ، جنہیں آج ہم فخر سے دیکھتے ہیں، تب پاکستانی سائنسدانوں، فوجی ماہرین اور گمنام ہیروز کی محنت اور قربانی کا مرکز تھے۔ وہ لوگ جن کے نام شاید تاریخ کی کتابوں میں نمایاں نہیں،

مگر جنہوں نے اپنی جان، اپنا وقت، اپنی زندگیاں اس وطن پر قربان کر دیں۔ رات دن محنت کی، خطرات مول لیے، دشمنوں کے چالوں کو ناکام بنایا، اور پاکستان کو محفوظ بنایا۔ پھر وہ لمحہ بھی ذہن میں آیا جب دشمن بھارت نے اپنے ایٹمی دھماکے کیے تھے۔

ہر طرف خطرہ چھا گیا تھا۔

سرحدوں پر دباؤ تھا۔

فوجی نقل و حرکت بڑھ گئی تھی۔ جاسوسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ پاکستان کو عالمی دباؤ میں جکڑنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ دشمن نے اپنی طاقت دکھائی، اپنا غرور دنیا کے سامنے رکھا، جیسے وہ سمجھ رہا ہو کہ اب پاکستان کو خوف زدہ کر دیا جائے گا۔

لیکن ہم نے اُس غرور کو ایسے توڑا کہ تاریخ نے وہ دن یاد رکھ لیا۔ چاغی کی زمین گرجی...اور اس کی بازگشت صرف بلوچستان تک محدود نہ رہی— وہ واشنگٹن تک پہنچی۔

واشنگٹن کے ہیڈکوارٹرز میں بیٹھے تجزیہ کار حیران رہ گئے کہ یہ کیسے ممکن ہوا۔

لندن اور پیرس میں سفارتی حلقے ہل گئے۔ دہلی میں خاموشی چھا گئی۔ تل ابیب سمیت دیگر عالمی مراکز میں فوجی مشیر نقشے دوبارہ دیکھنے لگے۔ ہر جگہ ایک ہی سوال تھا: یہ ملک، جسے کمزور سمجھا جا رہا تھا، یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ ہم نے ایک بار میں دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

مگر حقیقت یہی تھی پاکستان نے جارحیت کے لیے نہیں، دفاع کے لیے قدم اٹھایا تھا۔

ہم نے کسی پر چڑھائی نہیں کی، ہم نے صرف یہ اعلان کیا کہ ہم جھکیں گے نہیں۔ یہ منظر پاکستان کے ہر شہری کے دل میں فخر کی ایک لہر بن کر دوڑ گیا۔ بچے، بوڑھے، جوان— سب کی آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی۔ وہ بچے جو اُس وقت چھوٹے تھے، کہتے تھے:

"ہمیں فیڈر نہیں چاہیے، ہمیں ایٹم بم چاہیے— ہمیں اپنے وطن کی حفاظت کے لیے طاقت چاہیے۔" یہ صرف ایک نعرہ نہیں تھا، یہ ایک احساس تھا— کہ قوم نے بڑی قربانی دے کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔

ہر گمنام ہیرو، ہر سائنسدان،

خصوصاً ڈاکٹر عبدالقدیر خان،

ہر فوجی، ہر محقق— سب نے اپنی زندگیاں کھپا دیں۔ کچھ شہید بھی ہوئے، جن کی قبروں پر آج بھی خاموش دعائیں ہوتی ہیں۔ اور جو زندہ رہے، وہ بھی نام و نشان کے بغیر اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے نام چھپائے رکھے، مگر پاکستان

کا نام بلند کر دیا۔
یہ سب سوچتے سوچتے میری آنکھوں پر نیند سی طاری ہونے لگی۔میں پہاڑوں کے درمیان لیٹا انہی خیالات میں کھو گیا—
کہ ایک قوم نے خوف کے سامنے جھکنے کے بجائے جرات دکھائی،اور دنیا کو حیران کر دیا۔مگر پھر...دل کے اندر ایک سوال اٹھا۔ہم نے ایٹمی قوت حاصل کی...ہم نے دشمن کے غرور کو توڑا...دنیا کو بتا دیا کہ پاکستان کمزور نہیں...
مگر کیا ہم نے اس طاقت کا حق ادا کیا؟یہ صرف ہتھیار نہیں تھا۔یہ ایک امانت تھی۔
یہ ایک ذمہ داری تھی۔یہ وہ دولت تھی جو اللہ نے ہمیں عزت کے ساتھ عطا کی—امتحان کے طور پر۔وہ سائنسدان جنہوں نے زندگیاں کھپا دیں،وہ گمنام ہیرو،
وہ والدین جنہوں نے اپنے بیٹے وطن پر قربان کیے—
کیا ہم نے ان کی محنت کی لاج رکھی؟یہ سوال صرف حکمرانوں سے نہیں۔یہ ہم سب سے ہے۔ایٹمی طاقت صرف فخر نہیں ہوتی،یہ کردار مانگتی ہے،دیانت مانگتی ہے،
اتحاد مانگتی ہے۔اگر قوم تقسیم ہو جائے،اگر ادارے کمزور ہو جائیں،اگر ذاتی مفاد قومی مفاد پر غالب آ جائے—
تو سب سے بڑی طاقت بھی محض علامت بن کر رہ جاتی ہے۔میں سوچنے لگا—ہم نے دشمن کو جواب دے دیا،
لیکن کیا ہم نے خود کو بھی جواب دیا؟یہ طاقت صرف سرحدوں کے لیے نہیں تھی۔
یہ اُس نظریے کے لیے تھی جس پر یہ ملک بنا تھا۔
کشمیر...فلسطین...اور دنیا کے وہ سب مظلوم لوگ جو اپنے حق کے لیے کھڑے ہیں—ہم نے تو یہ طاقت اس لیے حاصل کی تھی کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مسلمان ہمیشہ کمزور رہے گا۔
ہم نے یہ اس لیے بنایا تھا کہ جب کسی مظلوم کی آہ بلند ہو،تو دنیا کو معلوم ہو کہ ایک ریاست کم از کم اخلاقی قوت کے ساتھ موجود ہے۔پاکستان صرف ایک جغرافیہ نہیں تھا۔
یہ ایک وعدہ تھا۔یہ ایک ذمہ داری تھی۔اگر اندر سے ہم کمزور ہو جائیں،اگر قیادت میں کمزوری آ جائے،تو عوام کا سر خود بخود جھکنے لگتا ہے۔
چاغی کے پہاڑ آج بھی خاموش کھڑے ہیں۔وہ کچھ نہیں کہتے—مگر ان کی خاموشی سوال کرتی ہے:کیا ہم اُس فخر کے لائق بنے رہے جو ان پہاڑوں نے ہمیں دیا تھا؟طاقت حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے،مگر طاقت کے ساتھ انصاف کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔یہ سب سوچتے سوچتے میری آنکھوں پر نیند نے آہستہ آہستہ قبضہ کر لیا پہاڑوں کے درمیان لیٹا ہوا انہی خیالات میں کھو گیا۔نیند نہ جانے کتنی دیر رہی۔
جب آنکھ کھلی تو غار کے دہانے سے ہلکی سی سنہری روشنی اندر سرک رہی تھی۔چند لمحے مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔پھر یادوں نے آہستہ آہستہ ترتیب پکڑی—رات، فائر، ڈھلوانیں، چاغی کے پہاڑ، اور وہ سارے سوال۔میں فوراً سیدھا نہیں اٹھا۔پہلے خاموشی سنی۔پھر سانس روکی۔پھر آہستہ سے کروٹ بدلی اور غار کے دہانے کی طرف نظریں جمائیں۔

کوئی آواز نہیں تھی—نہ قدموں کی چاپ، نہ پتھروں کے سرکنے کی سرسراہٹ۔ صرف ہوا تھی جو پہاڑوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی مدھم سی گونج پیدا کر رہی تھی۔ میں نے بیٹھ کر آنکھیں ملیں، پانی کی بوتل سے چند گھونٹ لیے، اور پھر باہر نکل کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سورج ڈھلنے کو تھا۔ اندازہ ہوا کہ میں کافی دیر سو چکا تھا۔ جسم کچھ ہلکا محسوس ہو رہا تھا، مگر ذہن پہلے سے زیادہ چوکنا۔ میں نے وضو کیا، عصر کی نماز ادا کی، اور دل میں شکر ادا کیا کہ ایک اور دن بحفاظت گزر گیا۔
پھر میں نے بیگ درست کیا، ہتھیار چیک کیا، اور دل میں وہی عہد تازہ کیا—سرحد مجھے خود عبور کرنی ہے۔ کسی کے سہارے نہیں۔ سورج مکمل طور پر غروب ہوا تو میں غار سے نکلا۔
پہاڑوں پر سیاہی دوبارہ اتر رہی تھی—اور یہی میرا وقت تھا۔ میں سیدھے راستے پر نہیں چل رہا تھا۔ کبھی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ، کبھی چٹانوں کے سائے میں، کبھی جھاڑیوں کے پیچھے رک کر چند لمحے سن لیتا کہ کہیں کوئی حرکت تو نہیں۔ ہر بیس تیس قدم کے بعد میں رک جاتا۔ پیچھے دیکھتا۔
رات کا اندھیرا میرا ساتھی تھا، مگر دشمن بھی ہو سکتا تھا۔ کہیں قدم پھسل سکتا تھا، کہیں آواز ہو سکتی تھی۔
میں نے پوری رات سیدھا نہیں چلنا تھا۔ زگ زیگ انداز میں، قدرتی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ اگر کوئی دور سے دیکھ بھی رہا ہو تو سیدھی لکیر میں میری سمت کا اندازہ نہ لگا سکے۔ کبھی دور کہیں کسی جانور کی آواز آتی تو میں فوراً زمین سے چپک جاتا۔ کبھی ہوا زور سے چلتی تو میں اس کی آڑ میں چند تیز قدم اٹھا لیتا۔ وہ رات طویل تھی۔ جسم تھکتا تھا، مگر دماغ سونے نہیں دیتا تھا۔ فجر کے قریب میں نے ایک پتھریلی اوٹ تلاش کی—دو بڑی چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سا خلا۔ وہاں کچھ دیر رکا، نماز ادا کی، اور دن چڑھنے سے پہلے خود کو پھر چھپا لیا۔
دن کے وقت میں نے حرکت تقریباً بند رکھی۔ ذہن میں ایک ہی نقشہ تھا—سرحد اب زیادہ دور نہیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ مجھے درست راستہ معلوم نہیں تھا۔ نہ کوئی باقاعدہ نشان، نہ کوئی رہنما۔ پیچھے کا خوف بھی زندہ تھا—کہ کہیں وہ زخمی شخص اکیلا نہ ہو۔
کہیں اس کے ساتھی تلاش میں نہ نکل آئے ہوں۔ اور ایک اور سایہ بھی ساتھ چل رہا تھا—وہ گروہ... جنہیں میں وادی کے اُس تنگ موڑ پر پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ جنہیں وقتی طور پر دبا تو دیا تھا، مگر ختم نہیں کیا تھا۔ دل بار بار خبردار کر رہا تھا—اگر وہ سنبھل گئے ہوں تو؟
اگر انہوں نے میرا تعاقب شروع کر دیا ہو؟ اگر وہ پہاڑی راستوں سے مجھ سے پہلے اوپر پہنچ جائیں؟ آگے کا خوف الگ تھا

—

کہ سرحد کے قریب نگرانی زیادہ ہو گی۔ کہ کہیں میں غلط سمت میں نہ جا رہا ہوں۔
اندھیرا صرف آنکھوں کے سامنے نہیں تھا، راستے کے فیصلے میں بھی تھا۔ مگر اب واپس جانا ممکن نہیں تھا۔
واپسی کا مطلب تھا ان سب خطروں کو دوبارہ جگانا۔
اور آگے بڑھنے کا مطلب تھا ان سب خطروں کو پیچھے چھوڑ دینے کی کوشش۔

میں نے سانس گہری لی ہتھیلی مٹھی میں بھینچی،اور دل ہی دل میں خود سے کہا—خوف اگر پیچھے بھی ہے اور آگے بھی، تو بہتر ہے کہ انسان اُس سمت چلے جہاں مقصد ہو۔کیونکہ کم از کم وہاں خوف کے ساتھ معنی بھی ہوتے ہیں جب دوسری رات اتری تو میں نے آخری مرحلے کا فیصلہ کیا۔میں نے اندازہ لگایا کہ اب میں سرحدی علاقے کے قریب ہوں۔ زمین کی ساخت بدل رہی تھی—چٹانیں کم، کھلی پٹی زیادہ۔ یہ خطرناک علامت تھی۔میں نے ایک نسبتاً بلند مقام تلاش کیا اور وہاں سے نیچے کے علاقے کو دیر تک دیکھتا رہا۔دور کہیں مدھم سی روشنی جھلملائی—شاید کوئی چوکی، شاید کوئی آبادی، شاید محض وہم۔میں نے فوراً نیچے اتر کر آڑ لے لی میں بالکل نئے علاقے میں تھا۔کوئی واضح نشان نہیں،کوئی پگڈنڈی نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

مگر میں نے خود سے کہا تھا—میں سرحد تک پہنچوں گا۔

اب میں واقعی سرحد کے قریب تھا۔ہوا میں عجیب سا تناؤ محسوس ہو رہا تھا، جیسے زمین خود خبردار کر رہی ہو کہ آگے قدم سوچ کر رکھنا۔میں نے رات کے گہرے ہونے کا انتظار کیا۔دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔

ہر سایہ کسی انسان جیسا لگتا تھا۔مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔آہستہ آہستہ، جھک کر، کبھی رینگ کر، کبھی دوڑ کر چھوٹے فاصلے طے کرتا یہ جلد بازی کا وقت نہیں تھا۔یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔میں نے طے کیا کہ اگلا قدم اندھیرے میں نہیں اٹھاؤں گا۔پورا ایک دن...میں یہیں رہوں گا۔میں نے ایک ایسی جگہ چنی جہاں سے نیچے کا علاقہ صاف دکھائی دیتا تھا، مگر میں خود چٹانوں کے پیچھے مکمل طور پر اوجھل تھا۔اوپر سے دیکھنے والا مجھے نہ دیکھ سکتا تھا،

اور نیچے سے گزرنے والا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ کوئی نگرانی کر رہا ہے۔ صبح کی پہلی روشنی کے ساتھ میں نے مشاہدہ شروع کیا۔سورج آہستہ آہستہ اوپر آیا،اور میں خاموشی سے پتھروں کے درمیان لیٹا رہا۔حرکت کم سے کم۔سانس بھی ناپ کر لیتا تھا۔

میں نے نیچے کی پٹی کو کئی حصوں میں بانٹ لیا—دائیں جانب کھلا میدان، بائیں جانب ہلکی سی ڈھلوان،درمیان میں ایک خاموش راستہ جو شاید پگڈنڈی تھا۔ہر گھنٹے بعد میں نظریں بدلتا،زاویہ بدلتا، مگر جگہ نہیں بدلتا تھا۔دوپہر تک میں نے چند بار ہلکی سی نقل و حرکت دیکھی—شاید دور چرواہے،شاید سرحدی گشت۔

میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا،اور یہی غیر یقینی سب سے بڑا خطرہ تھا۔میں نے ذہن میں نوٹ کر لیا—یہ علاقہ مکمل خالی نہیں ہے۔شام کے قریب میں نے ایک اور بات محسوس کی—کوئی بھی باقاعدہ قافلہ یا مسلسل آمد و رفت نہیں تھی۔نقل و حرکت بے ترتیب تھی۔یعنی یہ راستہ مصروف گزرگاہ نہیں، مگر مکمل محفوظ بھی نہیں۔

یہ اہم مشاہدہ تھا۔اندھیرا گہرا ہوا تو میں نے آخری بار نیچے جھانکا۔روشنی پھر جھلملائی—اب واضح تھا، وہ وہم نہیں تھا۔ کوئی چوکی یا مستقل مقام ضرور تھا۔میں نے پورا دن اسی پتھر کے سائے میں گزار دیا تھا—بغیر آواز،بغیر نشان چھوڑے،بغیر کسی کو اپنی موجودگی کا احساس دلائے۔

اب میرے پاس اندازے نہیں،

مشاہدات تھے۔ یہ جگہ عبور کی جاسکتی تھی— مگر صرف ایک مخصوص لمحے میں پھر میں نے پتھروں کے پیچھے بیٹھ کر خاموشی سے تیمم کیا۔ کیونکہ پانی بہت کم تھا، ہر قطرہ قیمتی بس اتنا کہ اپنی پیاس بجھا سکوں تیمم کرنے کے بعد عشاء کی نماز ادا کی۔

زمین میری جائے نماز، آسمان میری چھت۔ دل میں دعا تھی: ''اللہ، میرا سفر آسان فرما، میرے قدم مضبوط رکھ، اور انجام خیر عطا فرمانماز کے بعد میں نے جھک کر، پتھروں کے پیچھے چھپتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا۔ ڈھلوانوں کے ساتھ اترتے ہوئے، ہر چند گز کے بعد رک کر نیچے دیکھتا، ہر سایہ کا جائزہ لیتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہ لمحہ آیاایرانی سر زمین چند گز کے فاصلے پر تھی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ہاتھ کانپ رہے تھے میں نے تقریباً دس منٹ تک ایک ہی جگہ بیٹھ کر نیچے کا حصہ دیکھا، ہر حرکت کا مشاہدہ کیا دل کے اندر ایک اور خوف سر اٹھا رہا تھا۔ کیا آگے کوئی ایرانی فورس کا گشت تو نہیں؟ کیا کہیں دور کسی پتھر کے پیچھے کوئی سپاہی نظر رکھے بیٹھا ہو؟ یا شاید کوئی اور گروہ، کوئی اسمگلر، کوئی اجنبی، جو رات کی خاموشی میں حرکت کو بھانپ لیتا ہو؟

میں نے آنکھیں سکیڑ کر دوبارہ اندھیرے کو دیکھا۔ ہر سایہ مجھے انسان لگتا، ہر جھاڑی میں کسی کے کھڑے ہونے کا گمان ہوتا۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی دل کی دھڑکن تیز کر دیتا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین کے اور قریب کر لیا، سانس آہستہ کر دی، حتیٰ کہ مجھے اپنی ہی سانس کی آواز بھاری لگنے لگی۔ یہ صرف سرحد نہیں تھی، یہ ایک فیصلہ تھا۔ اگر آگے کوئی فورس ہوتی، اگر کسی کی نظر پڑ جاتی، تو واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا، نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں —''یا اللہ، تیری امان میں ہوں۔'' پھر میں نے خاموشی سے کہا الوداع، پاکستان۔ وہ زمین جس پر میں نے زندگی کے سب لمحات جھیلے، جس کی سرحدیں میرے لیے حفاظت کی علامت تھیں، اب پیچھے رہ رہی تھیں۔ دل میں خوف بھی تھا، یادیں بھی، مگر قدم آگے بڑھنے پر مجبور تھے۔ پھر میں نے فیصلہ کیا، محتاط قدموں سے لکیر کراس کی۔ وہ لمحہ— پاکستان کے الوداع اور ایران کی سرزمین کا پہلا لمس— ایک عجیب ملی جلی کیفیت تھی: خوف، سکون، اور اللہ کے بھروسے کا اعتماد۔

ایران کی زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے چند قدم آگے بڑھائے، پھر رک گیا۔ پانچ منٹ تک میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، ہر ممکنہ خطرے کا اندازہ لگایا۔ پھر میں نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کیا، چھپتے چھپتے، آہستہ آہستہ۔

ایران کی سرزمین مکمل طور پر میرے قدموں تلے تھی، میں آگے بڑھتا رہا، مکمل چوکنّا، مکمل محتاط، ایران کی زمین پر اپنی نئی راہ تلاش کرتا ہوا۔

رات کا سناٹا گہرا ہو چکا تھا

رات کے اندھیرے میں، دور کہیں بھی کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کئی بار رک کر نیچے کی طرف دیکھا، ہر جھاڑی، ہر پتھر کو پرکھا، یہ جاننے کے لیے کہ کہیں کوئی ایرانی فورس، سرحدی چوکی یا کوئی اجنبی گروہ تو نظر نہیں رکھ رہا۔ دل کی دھڑکن تیز تھی، مگر ہر قدم پر اللہ کے بھروسے کا سہارا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے پہاڑوں اور نشیبوں کے درمیان چلنا جاری رکھا۔ رات بھر کی محتاط چال، چھپتے چھپتے، مجھے صبح کے پہلے پہلو تک لے آئی۔ صبح کے قریب، دور ایک

مدھم روشنی دکھائی دی۔ ایک چھوٹا سا گاؤں — چند مٹی کے گھر، کھلی چھتیں، اور چند جانور — جو پہاڑوں کے نشیب میں بسے ہوئے تھے۔ یہ گاؤں سرحدی علاقوں کی عام بستیوں کی طرح تھاایران کے سرحدی علاقے میں یہ میرے پہلا منظر تھایہ گاؤں ایران کے صوبہ سیستان ضلع میر جاوہ کے سرحدی علاقے میں تھا، قدیم زمانے میں یہاں سے کاروانوں کے تجارتی راستے گزرتے تھے، اور سرحد کے گرد پہاڑی ڈھلوان اور ویران زمینیں ہمیشہ حفاظتی نقطہ نظر سے اہم سمجھی جاتی تھیں۔اس علاقے میں زیادہ تر سنی بلوچ لوگ آباد ہیں، پہاڑوں اور ویران راستوں کے ساتھ سادہ، محنتی اور اپنے ماحول کے مطابق محتاط زندگی گزارتے ہیں۔دوسری طرف، قریب کے بڑے شہر، جہاں حکومت کا کنٹرول زیادہ مضبوط ہے شیعہ آبادی کی اکثریت پائی جاتی ہے۔یہ سرحدی علاقوں کے گاؤں اور بڑے شہروں کے درمیان ثقافتی اور نسلی فرق کو ظاہر کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ سرحد کے قریب رہنے والے لوگ زیادہ محتاط اور ہمدردی کے ساتھ رہتے ہیں، جبکہ بڑے شہر میں نظم و نسق اور حکومتی کنٹرول زیادہ سخت ہے۔میں نے اپنی حکمت عملی ذہن میں دہراتے ہوئے، احتیاط سے بیگ اور سامان کا جائزہ لیا ہتھیار کو زمین کھود کر دفن کر دیا

گاؤں کے قریب رک کر ماحول کا مشاہدہ کیا، ہر ممکن خطرے کا اندازہ لگایا، اور دل ہی دل میں دعا کی کہ اللہ یہ سفر بلا حادثہ آگے بڑھے۔پھر میں ایک گھر کے دروازے پر پہنچا جہاں ایک عورت، اس کا شوہر، اور دو بیٹے اور ایک بیٹی— رہتے تھے۔ میں نے اپنی حالت، خوف اور محتاط رویہ ظاہر کیا تاکہ وہ جان سکیں کہ میں بے ضرر اور محتاط ہوں۔ابتداء میں وہ مجھے دیکھ کر محتاط تھے، پھر عورت نے پوچھا: تم کون ہو اور یہاں کیسے پہنچے؟ میں جانتا تھا کہ یہاں کے لوگ غیر معمولی محتاط ہیں، اور اگر کوئی جھوٹ یا غیر واضح مقصد دکھایا تو کبھی یقین نہیں کریں گے اس لیئے میں نے صاف جواب دیا میں ایک پاکستانی ہوں اور چھپ کر ایا ہوں عورت نے آنکھیں بڑی کر کے دیکھا، پھر مرد نے سخت لہجے میں کہا: ''تم نے غیر قانونی راستہ اختیار کیا؟ تم کیوں چھپ کر آئے؟ پھر میں نے اپنے ذہن میں جو پہلے سے منصوبہ بنایا ہوا تھا اسی کے مطابق جواب دیا میں نے کہا ''میں یورپ جانا چاہتا تھا، لیکن میرے حالات ایسے تھے کہ قانونی طریقے سے یہ ممکن نہیں تھا۔ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ سرحد پار کرانے والے لوگ ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ رابطہ کیا اور یہاں پہنچا ہوں۔''

پھر اسی شخص نے پوچھا

تمہارے ساتھ کون تھا باقی لوگ کدھر ہیں ؟میں نے کہا:

''وہ... وہ لوگ... وہ خطرناک تھے... بہت خطرناک۔ مجھے نہیں معلوم، میں... میں الگ نکل آیا۔''میں نے رک کر سانس سمیٹا، دل دھڑک رہا تھاآنکھوں میں تھوڑی سی نمی، لہجے میں ہلکی لرزش، اور ہر لفظ آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔

میں نے آگے کہا: ''یہ لوگ صرف سرحد پار کرانے والے نہیں تھے... وہ... وہ منشیات فروش بھی تھے، اور کچھ دوسرے بھی... ہم تقریباً پندرہ سے بیس عام لوگ تھے، جنہیں انہوں نے سرحد پار کرانا تھا۔ میں... میں تو... میں الگ نکل آیا، مجھے جیسے ہی موقع ملا میں وہاں سے فرار ہو گیا بھاگ گیا۔ میں ان کے سامنے نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بہت خطرناک لگ رہے تھے، اور میں... میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں ہیں۔ میں خود کو بچاتے بچاتے یہاں پہنچ گیا۔''میرے انداز میں وہ رونے کی

چھوٹی سی ہمدردی، خوف اور معصومیت نظر آ رہی تھی۔ وہ شاید سمجھ گئے کہ میں واقعی مجبور ہوں، اور یہ کہ میں کوئی خطرناک بندہ نہیں، بلکہ بس اپنی زندگی بچانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔
پھر اسی شخص نے کہا"تم واقعی پاکستانی ہو؟ پڑھے لکھے لگتے ہو، لیکن ایسے سرحد پار کرنا... ؟"میں نے دل ہی دل میں ایک بار دعا کی، پھر دھیرے سے کہا:"ہاں، میں پاکستانی ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں، اور بہت مجبوری کی وجہ سے یہ راستہ اختیار کیا میں محتاط ہوں، اور بس اپنی زندگی بچانا چاہتا ہوں پھر اس شخص نے تھوڑے نرمی سے پوچھا اب ہم تمھاری کیا مدد کر سکتے ہیں میں نے کہا میرا مقصد صرف آگے بڑھنا ہے۔""آپ کی مہربانی ہوگی اگر اپ مجھے اج یہاں رہنے اور محفوظ راستے سے شہر زاہدان تک پہنچنے میں میری مدد کر دیں مرد نے آنکھیں اچھی طرح میری طرف گھمائیں، پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا:"ٹھیک ہے۔ تم ہمارے ساتھ رک سکتے ہو۔ آج دن اور رات یہاں گزارو۔ کل صبح ہم تمہیں شہر زاہدان تک محفوظ پہنچا دیں گے اس دن میں نے ان کے ساتھ گزارا، کھانا کھایا، تھوڑی دیر بات کی، اور گھر کے قریب رہ کر گاؤں کے ماحول کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ سادہ، محنتی اور محتاط ہیں، ہر قدم پر غور کرتے ہیں، اور کسی پر آسانی سے بھروسہ نہیں کرتے۔میں نے دل میں پہلے ہی ایک منصوبہ بنایا ہوا تھا
اگر یہ لوگ میرا اعتبار کر لیں... اگر انہوں نے مجھے پناہ دے دی... تو میں ان کے ساتھ رہوں گا۔ اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہوا تو میں وہی کروں گا جو پہلے کر چکا ہوں —— خاموشی سے، اپنے راستے پر، اکیلا۔"لیکن عجیب بات یہ تھی کہ جب میں اس گھر کے صحن میں بیٹھا تھا، مٹی کی دیواروں کے سائے میں، تو مجھے پہلی بار لگا کہ شاید مجھے بھاگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اس مرد کی آنکھوں میں شک تھا... مگر نفرت نہیں تھی۔عورت کے لہجے میں احتیاط تھی... مگر سختی نہیں تھی۔بچے مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی خطرہ نہیں، بلکہ کوئی بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔
شاید میرا حلیہ ہی ایسا تھا۔
ایک نوجوان... تھکا ہوا... گرد آلود کپڑے... سانس ابھی تک پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی۔بات کرنے کا انداز بھی نرم تھا۔ میں ویسے بھی پڑھا لکھا تھا، لہجہ شہری تھا، الفاظ سوچ کر ادا کر رہا تھا۔وہ مجھے کسی مجرم کی طرح نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بچہ غلط راستے میں پھنس گیا ہو شام تک میں ان کے ساتھ بیٹھا رہا۔گھر کے قریب ہی رہا، زیادہ حرکت نہیں کی کیونکہ ان کا اعتماد توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے میں خود بھی جا سکتا تھا۔ میں پہلے بھی اتنا کر چکا تھا۔
لیکن میں تھکا ہوا تھا۔ جسم جواب دے رہا تھا۔یہ دوسرا ملک تھا... ماحول اجنبی تھا... اور سب سے بڑھ کر آگے کچھ چیک پوسٹیں اور اہم مقامات تھے جہاں ذرا سی غلطی مہنگی پڑ سکتی تھی۔اس لیۓ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے اس گاؤں کے کسی گھر میں جا کر بھروسہ آزماؤں۔ اگر سب ٹھیک رہا —— تو ان کے سہارے آگے بڑھ جاؤں گا۔اگر نہیں —— تو پھر میں اکیلا تھا، اور اکیلا رہنے کا ہنر سیکھ چکا تھا۔پھر رات کو مرد نے کھانے کے دوران خاموشی توڑی۔وہ آہستہ سے بولا:"دیکھو... ہم تمہاری مدد کریں گے۔ مگر احتیاط ضروری ہے۔ یہاں ہر چیز سادہ نہیں ہوتی میں نے سر ہلایا۔میں سن رہا تھا۔ پوری توجہ

سے۔اس نے کہا کہ صبح نکلنے کا طریقہ ایسا ہو گا کہ کسی کی نظر تم پر نہ جائے تم ہمارے ساتھ مختلف جگہوں سے بکریاں چراتے ہوئے ایک چرواہے کی صورت میں جاؤ گے جب چیک پوسٹ اور حساس سرحدی جگہ سے گزر جاؤ گے تو اس کے بعد پھر تمہاری اپنی ذمہ داری ہو گی ہم تمہیں بس اتنا سہارا دے سکتے ہیں کہ تم یہاں سے محفوظ نکل جاؤ۔ آگے کا راستہ تمہیں خود طے کرنا ہو گا۔" مجھے اس کا یہ طریقہ پسند ایا میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دی پھر رات جب گہری ہو گئی اور گھر کے صحن میں خاموشی اتر آئی، تو مجھے ایک بستر دے دیا گیا۔ سادہ سا بستر... ایک کونے میں، دیوار کے ساتھ۔
میں لیٹ تو گیا... مگر نیند فوراً نہیں آئی۔آنکھیں چھت کی طرف تھیں، مگر ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔دل کے اندر ایک عجیب سا ملا جلا احساس تھا۔ایک طرف سکون... کہ کم از کم آج کی رات چھت میسر ہے۔دوسری طرف خوف... کہ کہیں یہ سکون عارضی نہ ہو۔میں خود سے پوچھ رہا تھا: "کیا واقعی یہ لوگ مخلص ہیں؟" "کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے کسی کو خبر کر دی ہو؟" "کہیں یہ مجھے روک کر کسی کے حوالے تو نہیں کرنے والے؟" فطری خوف تھا۔انجان جگہ... انجان لوگ... دوسرا ملک... انسان چاہے کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو، دل میں ایک اندیشہ ضرور رہتا ہے۔میں نے سوچا...
ممکن ہے ان کے بھی اپنے رابطے ہوں۔ ممکن ہے وہ کسی کو اطلاع کر دیں۔ ممکن ہے یہ مہربانی صرف وقتی ہو۔لیکن پھر میں نے دن کے مناظر یاد کیے۔ان کی آنکھوں میں جو سادگی تھی... عورت کے لہجے میں جو نرمی تھی... بچوں کا جو بے تکلف انداز تھا... وہ سب جھوٹ نہیں لگ رہا تھا۔میرا دل آدھا مطمئن تھا... آدھا چوکنا۔
اعتماد بھی آ رہا تھا... مگر مکمل نہیں۔خوف بھی تھا... مگر حد سے زیادہ نہیں۔میں نے خود کو سمجھایا: "اب جو ہونا ہے، ہو گا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں کچھ نہیں۔" میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی انہوں نے کچھ اور ارادہ کیا ہو، تو میں کیا کر سکتا ہوں؟اس وقت میں مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر تھا۔اور شاید یہی حقیقت انسان کو سب سے زیادہ عاجز بنا دیتی ہے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ دل کے کسی کونے میں ایک ہلکی سی روشنی تھی —— جیسے کوئی اندر سے کہہ رہا ہو: "نہیں... یہ لوگ ویسے نہیں ہیں۔" خوف اور بھروسہ... دونوں ایک ساتھ میرے سینے میں موجود تھے۔ایک قدم آگے... ایک قدم پیچھے۔آخر کار، مسلسل سوچتے سوچتے، تھکن غالب آ گئی۔ذہن آہستہ آہستہ دھندلا ہونے لگا۔سانسیں برابر ہو گئیں۔
اور انہی ادھورے خدشات اور آدھے یقین کے ساتھ... میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔اگلی صبح واقعی خاموش تھی۔
ایسی خاموشی... جس میں الفاظ کم اور احساس زیادہ ہوتے ہیں۔فجر کی ہلکی سی روشنی ابھی پوری طرح پھیلی بھی نہیں تھی کہ گھر کے صحن میں آہستہ آہستہ حرکت شروع ہوئی۔ نہ کوئی غیر ضروری بات، نہ کوئی سوال۔ جیسے سب سمجھتے ہوں کہ آج کا دن معمولی نہیں ہے۔
میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل میں ایک لمحے کو خیال آیا——
"سب ٹھیک ہے؟ یا کچھ بدل گیا ہے؟" مگر سب ویسا ہی تھا۔ سادہ۔ پرسکون پھر سادہ سا ناشتہ کیا گیا۔روٹی... تھوڑی سی چائے عورت نے چائے میرے سامنے رکھتے ہوئے بس اتنا کہا،
"راستہ لمبا ہو تو خالی پیٹ نہیں نکلتے۔" اس جملے میں ماں جیسی نرمی تھی۔میں نے کپ کو دونوں ہاتھوں سے تھاما—— شاید

گرمی کے لیے نہیں، اپنے اندر کے لرزتے احساس کو سنبھالنے کے لیے۔وہ مرد میرے سامنے بیٹھا تھا۔ کم بولنے والا۔ مگر اس کی خاموشی میں ایک عجیب سا ساتھ تھا۔ کبھی کبھی سفر میں خون کے رشتے نہیں ہوتے... مگر رفیقِ سفر بن جاتے ہیں۔
کھانے کے بعد اس نے کہا:''بیگ اندر ہی رہنے دو اپنی چیزیں اس میں سے نکال لو
کیونکہ بیگ اگر کسی نے دیکھ لیا تو شک ہو جائے گا اور تمھارے لیئے مسلہ بن جائے گا
میں نے سر ہلایا۔ ناشتے کے بعد
جو سامان تھا، وہ میں نے بیگ سے نکال لیا پھر اسے اس نے سادہ سے کپڑے میں باندھ کر ایک گٹھڑی بنا دی۔وہ عورت اندر سے کپڑے لے کر آئی اپنے بیٹے کے۔سادہ، دھلے ہوئے مگر گھسے ہوئے کپڑے۔ دیہاتی انداز کے۔ چرواہے جیسے۔
اس نے کپڑے میرے سامنے رکھے دیئے
اور پھر اس مرد نے اتنا کہا:''یہ پہن لینا۔'' لہجے میں نہ حکم تھا، نہ سختی۔بس ایک ذمہ داری تھی... جیسے وہ مجھے اپنی امانت سمجھ رہا ہو۔میں نے اپنے کپڑے بدلے۔ آئینے جیسی کوئی چیز تو وہاں نہیں تھی، مگر جب میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا، اپنی آستینوں کو... تو خود کو پہچاننے میں ایک لمحہ لگا۔
کل کا شہری نوجوان... آج ایک سادہ چرواہا لیکن مجھے دقت نہیں ہوئی کیونکہ میں بھی پاکستان کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور جب میں سکول پڑھتا تھا تو صبح پڑھنے جاتا اور شام کو بکریاں چراتا
وہ مجھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔میں نے وہ چھوٹی سے گٹھڑی کندھے پر رکھی اور ہم آہستہ آہستہ نکلے۔ بکریاں آگے تھیں، ہم پیچھے۔نہ جلدی، نہ گھبراہٹ۔ بالکل ایسے جیسے روز کی زندگی ہو۔جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔میں ان کے ساتھ چل رہا تھا، مگر ہر قدم کے ساتھ دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔فرق صرف اتنا تھا کہ آج اس دھڑکن میں صرف خوف نہیں تھا... ایک عجیب سا سکون بھی شامل تھا۔ جیسے انسان کو معلوم ہو کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔راستے میں میں نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔وہ مٹی کی دیواریں... سادہ سا دروازہ... صحن میں رکھی چارپائی...کل تک وہ ایک اجنبی گھر تھا۔آج وہ میرے لیے ایک قلعہ تھا۔ایک پناہ گاہ... جس نے مجھے بغیر سوالوں کے قبول کیا۔میں نے دل میں کہا: کچھ سفر انسان اپنی ہمت سے طے کرتا ہے۔
اور کچھ سفر... انسانیت اس کے لیے راستہ نرم کر دیتی ہے۔
آج کا سفر انہی میں سے ایک تھا۔ چلتے ہوئے وہ باپ بیٹے معمول کی باتیں کرتے رہے — جانوروں، موسم اور پانی کے بارے میں۔ میں خاموش تھا، مگر اندر بہت کچھ چل رہا تھا۔
ہر قدم کے ساتھ دل میں دعا تھی۔ ہر سانس کے ساتھ ایک امید۔راستہ کچا تھا، کہیں پتھریلا، کہیں نرم مٹی والا۔
کسی نے ہمیں خاص توجہ سے نہیں دیکھا۔ہم بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے روز کے معمول کا حصہ ہوں۔ بکریاں آگے گھاس سونگھتی ہوئیں، کبھی ادھر، کبھی ادھر مڑ جاتیں۔ باپ بیٹا معمول کی آواز میں انہیں ہانکتے رہے۔ہم نے سیدھا گزرنے کے بجائے وہی راستے اختیار کیے جو عام چرواہے اختیار کرتے ہیں کچھ دیر بعد دور کہیں سرحدی گشتی دستہ اپنی

روٹین پیٹرولنگ پر تھا۔ ان کے قدموں کی دھیمی چاپ اور وائرلیس سیٹ کی مدھم سرگوشیاں فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔

میرا دل غیر معمولی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھنا تھا۔ ہم نے بکریوں کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا، جیسے سب کچھ معمول کا ہو۔ یہ ایک خاموش حکمتِ عملی تھی—سادگی کے پردے میں گزر جانا۔ سرحدی چوکی سے کچھ فاصلے پر گشتی دستہ علاقے کا گشت کر رہا تھا۔ ان کی نظریں ارد گرد کے ہر سایے کو پرکھ رہی تھیں۔ ہم نے فاصلہ برقرار رکھا۔ میں نے سر جھکائے رکھا، ہاتھ میں لاٹھی، اور بکریوں کو اس طرح ہانکا جیسے یہ روز کا معمول ہو۔چوکیاں ایک ایک کر کے پیچھے رہتی گئیں۔ سانس ابھی بھی قابو میں نہ تھی۔ جب آخری نگرانی پوسٹ سے گزر رہے تھے تو ایسے لگا جیسے میرا دل پسلیوں سے ٹکرا رہا ہے خیر یہ پوسٹ بھی گزر گئ اور ہم حساس علاقے سے نکل آئے توتب وہ مرد رکا۔اس نے آس پاس نظر دوڑائی، پھر اپنے بیٹے سے کہا، ''اب تم آگے لے جاؤ۔''پھر میری طرف دیکھ کر بولا، ''یہ اونٹ ہے۔ اس پر بیٹھ جاؤ۔ آگے کا راستہ آسان ہو جائے گا۔''میں نے ایک لمحے کو اسے دیکھا۔آنکھوں میں وہی خاموش اعتماد تھا۔میں نے اسکا شکریہ ادا کیااور اونٹ پر سوار ہوا۔اونٹ کی نرم، ہلتی ہوئی چال کے ساتھ ہم آگے بڑھنے لگے۔تقریباً چار پانچ کلومیٹر کا سفر ہم نے اسی طرح طے کیا۔خاموش۔صرف ہوا کی ہلکی سرسراہٹ اور اونٹ کے قدموں کی نرم دھمک اور اخر ہم پھر پکی سڑک کے قریب پہنچ گۓوہ لڑکا رکا، جیب سے کچھ مقامی کرنسی نکالی اور میرے ہاتھ میں دے دی۔''یہ رکھ لو، شہر تک کام آئے گی۔''میں نے کہا، ''بس تھوڑا سا کافی ہے، باقی میں خود سنبھال لوں گا۔''اس نے اصرار نہیں کیا، مگر جو ضروری تھا، وہ دے دیا۔

پھر اس نے اشارے سے سمجھایا کہ گاڑیاں کس سمت جاتی ہیں، اور شہر کا نام دہرا دیا۔

کچھ دیر بعد ایک گاڑی رکی اسنے کرایہ ادا کیا، اتنا جتنا درکار تھا، اور میری رہنمائی کی کہ میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔میں نے گاڑی کے دروازے بند کیے اور بیٹھ گیا۔اس نے ایک آخری بار سر ہلایا، جیسے یہ کہہ رہا ہو:''اب تم خود آگے بڑھو، سب ٹھیک ہوگا۔''میں گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا،ہوا تھا بلکل خاموشی اختیار کیۓ ہوئے۔ باہر دھوپ اور مٹی کی خوشبو تھی، اور ہوا میں سرحد کے قریب کے خشک میدانوں کی خشکی کا اثر محسوس ہو رہا تھاسرحدی علاقے سے نکلتے ہوئے، زمین پر پتھر اور چھوٹے چھوٹے کیچڑ کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ راستہ سیدھا نہیں تھا، دھندلا سا اور ٹوٹا پھوٹا، جیسے کسی نے وقت کے ساتھ اسے چھوڑ دیا ہو۔سفر کے دوران گاڑی میں موجود لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے تھے، کچھ آدھی نیند میں، کچھ سر جھکائے، اور کچھ باہر کی ویران فضا کو دیکھتے ہوئے۔ وہ خاموش تھے، لیکن کبھی کبھی ایک دو لفظی بات چیت سنائی دیتی، جیسے کوئی معمولی سوال یا ہلکی سی ہنسی۔ ایرانی مسافر عام طور پر ایسا ہی خاموش اور صبر سے بھرپور انداز رکھتے ہیں، خاص طور پر ایسے ویران علاقوں میں جہاں راستے طویل اور سخت ہوں۔گاڑی کی دھیمی گڑگڑاہٹ اور ہر جھٹکا سفر کو زیادہ محسوس کروا رہا تھا کبھی کبھی ہم سرحدی گشتی دستے کے چند اہلکار نظر آتے، جو کسی چوکی یا راستے پر اپنی معمول کی پیٹرولنگ کر رہے ہوتے ڈرائیور گاڑی کی رفتار قابو میں رکھے ہوئے تھا، ہر موڑ، ہر چڑھائی پر احتیاط کر رہا تھا۔ میں نے

باہر نظر دوڑائی، دور دور تک خشک جھاڑیاں، کھلے میدان، اور سرحدی پہاڑی سلسلے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں بکریاں چر رہی تھیں، کہیں ایک دو گاؤں کی چھتیں دھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی سرحدی گشتی دستے کے چند اہلکار نظر آتے، جو کسی چوکی یا راستے پر اپنی معمول کی پیٹرولنگ کر رہے ہوتے وقت گزرتا گیا، موسم بدل رہا تھا مگر اندر ایک سکون بھی تھا— وہ اعتماد جو اس لڑکے اور اس کے والد نے دیا تھا۔ میں اب زاہدان شہر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

چوتھا باب ــــــــ پہلا شکار

گاڑی زاہدان شہر کے بیرونی حصے میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے جو چیز محسوس ہوئی وہ شور نہیں تھا——بلکہ لہجے کا فرق تھا۔ یہاں آوازیں سرحدی دیہات کی طرح نرم نہیں تھیں۔ یہاں فارسی غالب تھی، بلوچ لہجہ اس میں گھلا ہوا تھا۔
بازاروں میں دکانوں کے بورڈ فارسی میں تھے۔لوگ تیز قدموں سے چل رہے تھے۔میں اب بھی پچھلی نشست پر
خاموش تھا۔لیکن اب میری خاموشی خوف کی نہیں—— مشاہدے کی تھی۔میں جانتا تھا——یہاں سے میرا اصل کام شروع ہو گیا جس کیلئے میں نے سرحد پار کی پھر گاڑی سے اتر کر میں سیدھا کسی بڑے ہوٹل کی طرف نہیں گیا۔ بڑے ہوٹل سوال

پوچھتے ہیں۔اور سوال شناخت مانگتے ہیں۔میں نے شہر کے نسبتاً پرانے حصے کا رخ کیا جہاں چھوٹے سرائے ہوتے ہیں۔جہاں مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔جہاں کوئی زیادہ دیر کسی کو یاد نہیں رکھتا۔پھر میں نے سرائے کے دروازے پر قدم رکھا۔ باہر سے یہ معمولی سا دکھائی دیتا تھا، کوئی بڑی شناختی نشانیاں نہیں، بس ایک چھوٹا سا بورڈ جس پر فارسی میں ''مسافر خانہ'' لکھا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا، جہاں چند مسافر بیٹھے یا کھڑے تھے، اور سامنے والی دیوار کے ساتھ چند چارپائیاں رکھی تھیں۔

میں نے قدم آہستہ بڑھایا، آواز کم رکھنے کی کوشش کی۔ دروازے کے اندر ایک درمیانی عمر کا آدمی بیٹھا تھا، شاید چالیس سال کے لگ بھگ، سنجیدہ مگر تھوڑا مصروف۔ اس کا لباس سادہ لیکن صاف تھا، ایک پرانا مگر دھلا ہوا قمیص اور پتلون۔ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے کسی کاغذ کو دیکھ رہا تھا، لیکن جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے نظر اٹھائی اور خاموشی سے مسکرا دیا۔میں نے فارسی میں نرم لہجے میں کہا،

''سلام، آیا ہوں، کیا کمرہ دستیاب ہے؟''اس نے سر ہلایا اور بغیر زیادہ سوال کیے کہا:

''کمرہ ہے، کتنے دن کے لیے چاہیے؟''میں نے نرم لہجے میں جواب دیا، دو تین دن کیلئے

اس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔چائے کا کپ میز پر رکھا... اور اس کی آواز ذرا سنجیدہ ہو گئی ۔کارت شناسایی لطفاً

(شناختی کارڈ، براہِ مہربانی۔)

میرا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔یہ وہ سوال تھا جس کا مجھے اندازہ تھا... مگر امید تھی شاید نہ پوچھے میں نے ہلکا سا توقف کیا۔پھر آہستہ سے کہا:''من پاکستانی هستم...''وہ ذرا چونکا۔

''پاکستانی؟''میں نے سر ہلایا۔

''بله... از پاکستان آمدم۔ پاسپورت همراهم هست۔ اگر لازم باشد نشان می دهم.''

(جی، پاکستان سے آیا ہوں۔ پاسپورٹ میرے پاس ہے، ضرورت ہو تو دکھا دیتا ہوں۔)

میں نے یہ جملہ ایسے کہا جیسے میرے پاس چھپانے کو کچھ نہیں۔لہجہ سادہ رکھا۔

آنکھیں مستحکم۔وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اگلا سوال کیا:''برای چه آمدید؟ کار است یا تجارت؟''

(کس مقصد سے آئے ہیں؟ کام کے لیے یا تجارت کے لیے؟)

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ دی۔''نه... فقط بازدید. چند روزی می خواهم شهر را ببینم. شنیده‌ام زاهدان حال و هوای خاصی دارد.''

(نہیں، بس وزٹ کے لیے۔ سنا ہے زاہدان کا ماحول خاص ہے، دو تین دن شہر دیکھنا چاہتا ہوں۔)

اس نے اب ذرا مختلف انداز سے سوال کیا۔آواز میں ہلکا سا تجسس تھا:''اگر برای گردش آمده‌اید... چرا هتل بزرگ نمی‌روید؟ اینجا ساده است.''

(اگر سیر کے لیے آئے ہیں تو بڑے ہوٹل میں کیوں نہیں؟ یہ تو سادہ جگہ ہے۔) یہ وہ لمحہ تھا جہاں اصل جواب دینا تھا۔

میں نے کندھے ہلکے سے جھٹکے۔''راستش... من سفر سادہ دوست دارم. جاھای شلوغ و رسمی را ترجیح نمی دھم. اینجا آرام تر است... و برای چند شب کافی ست.''
(سچ کہوں تو مجھے سادہ سفر پسند ہے۔ زیادہ رسمی اور مصروف جگہیں پسند نہیں۔ یہاں پر سکون ہے، اور چند راتوں کے لیے کافی ہے۔)میں نے مزید اضافہ کیا:''ضمن اینکہ، می خواھم بیشتر وقت را در بازار و شھر بگذرانم... نہ در ھتل.''(اور ویسے بھی زیادہ وقت شہر میں گزارنا ہے، ہوٹل میں نہیں۔)اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا...پھر ہلکا سا مسکرایا۔شاید اسے جواب منطقی لگا۔شاید اسے احساس ہوا کہ ہر غیر ملکی امیر سیاح نہیں ہوتا۔شاید اسے بس کرایہ چاہیے تھا۔اس نے رجسٹر کھولا۔''اسم تان را بنویسید.''
(اپنا نام یہاں لکھ دیں۔)
میں نے نام لکھا۔پاسپورٹ کا نمبر درج کیامالک نے رجسٹر کھولا اور کہا:''سہ شب... برای ھر شب مبلغ مشخص است.''
(تین راتوں کے لیے ہر رات کی مخصوص رقم ہے۔)میں نے سر ہلایا اور کہا:''باشہ، قبول دارم.''
(ٹھیک ہے، میں قبول کرتا ہوں۔)اس نے چابی میز پر رکھی۔''اتاق شمارہ پنج.''
(کمرہ نمبر پانچ۔)
دس بجے صبح میں نے چابی لی اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں نے سوچا:کبھی کبھی شک سوال سے نہیں، جواب کے انداز سے ختم ہوتا ہے۔میں نے کوئی ڈرامائی بہانہ نہیں بنایا۔
نہ کاروبار، نہ کس سے کوئی ملاقات کا ذکر کیا، نہ کوئی کہانی۔بس ایک سادہ مسافر۔
سادہ قیام۔سادہ وجہ۔اور یہی سادگی سب سے مضبوط پردہ ہوتی ہے۔میں کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کیا۔ سامان کا شاپر ایک طرف رکھا پھر کمرے کے ہر کونے کو ایک نظر سے جانچ پڑتال کی، بستر، پنکھا، کھڑکی، اور دروازے کا لاک دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھا، گہری سانس لی، یہ کمرہ صرف ایک عارضی ٹھکانہ تھا، مگر میرے مشن کے لیے نقطہ آغاز بھی۔کچھ ضروری چیزیں لینی تھیں، جن کے لیے مجھے بازار جانا تھاپھر میں نے کمرے کو اچھی طرح لاک کیا اور بازار کی طرف نکل پڑا۔ بازار بلکل قریب تھا جہاں ضرورت کی ہر چیز میسر تھی بازار میں قدم رکھا تو چھوٹے چھوٹے اسٹالز ہر طرف تھے۔
دکانوں کی قطاریں، چائے کے اسٹالز، کرنسی چینج کے کاؤنٹرز، اور چھوٹے بیگ، نوٹ بک، اور کھانے کی اشیاء کے اسٹالز۔
سب سے پہلے میں نے کرنسی چینج کرائی۔کاؤنٹر پر ایک نوجوان بیٹھا تھا، جو نقدی گن رہا تھا۔میں نے نرم لہجے میں کہا:''سلام... می خواھم مقداری پول تبدیل کنم.''
(سلام... میں کچھ کرنسی بدلنا چاہتا ہوں)
اس نے میری بات غور سے سنی اور پوچھا:''چہ مقدار؟''
(کتنی رقم؟)میں نے جواب دیا:

''پانزده هزار تومان، لطفاً۔''
(پندرہ ہزار تومان، براہِ مہربانی)اس نے پیسے گنے اور مجھے نقد ایرانی کرنسی دی۔
رقم لینے کے بعد میں قریب ایک دوکان پہ گیا وہاں سے میں نے ایک بیگ خریدا—سادہ لیکن مضبوط۔اس کے ساتھ پنسل اور ایک کاپی لی، تاکہ مشاہدات، نوٹ، اور نقشے درج کیے جا سکیں۔پھر کچھ کھانے کی چند چیزیں بھی خریدیں—سادہ اور فوری استعمال کی۔
کچھ دیر بعد میں واپس سرائے کی طرف روانہ ہوا۔کمرے میں داخل ہوا، بیگ اور خریدی ہوئی چیزیں ترتیب سے رکھیں اور بیٹھ کر کھانا کھایا۔یہ لمحہ پر سکون تھا کھانے کے بعد میں نے وضو کیا اور نماز پڑھییہاں میں نے وہ سب کچھ کیا جو عادت تھی: دل کو سکون دینا، دعائیں کرنا، اور کمرے کے چھوٹے سے حصے میں خود کو مرکزِ توجہ سے الگ کرنا۔نماز پڑھنے کے بعد
کمرے کے ایک کونے میں میں نے اپنے بیگ سے کاپی، پنسل، اور نوٹ بک نکالی۔ پھر بیٹھ گیا اور موبائل سے نقشہ کھولا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اگلے دن اپنا کام کس طرح شروع کروں گا۔ سب سے پہلے تو میں نے میڈیا چینلوں کا معائنہ کرنے کا پلان بنایا
میرا مقصد واضح تھا اس لیئےمیں نے فیصلہ کیا کہ ہر چینل کی کارروائی کو تفصیلی نقشے اور جدول میں درج کروں گا۔
میرا اصل ہدف میڈیا کے ان چہروں کو پہچاننا تھا جو سکرین کے سامنے کچھ اور، اور سکرین کے پیچھے کچھ اور تھے۔
میں نے اپنی تگ و دو کو ان چار نکات میں سمو دیا:
1.شناخت۔ وہ کون سے مخصوص رپورٹرز، ڈائریکٹرز اور اینکرز ہیں جو عوامی جذبات سے کھیل رہے ہیں؟ انکی رپورٹنگ کا انداز کیا ہے؟ کون پروپیگنڈا پھیلا رہا ہے؟ان کا اصل چہرہ کیا ہے اور وہ کس کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں؟کون سی ویڈیوز اور خبریں سب سے زیادہ گردش کر رہی ہیں؟اس کے بعد میں نے پرنٹ میڈیا پر توجہ دی میگزین والے اور پرنٹ میڈیا کے رابطے کی تفصیل تیار کی:
اخبارات، میگزین، اور مقامی جرائد۔کون کون سے آرٹیکل یا رپورٹیں پروپیگنڈا کی حامل ہیں؟کس لکھاری سے رابطہ بنایا جا سکتا ہے؟کس کا دائرہ کار زیادہ ہے؟
2. رابطہ کاری۔"تحقیقی دلچسپی" "مقامی ثقافت" کا بہانہ بنا کر یا کسی آرٹیکل میں دلچسپی دکھا کر رابطہ قائم کر کے ان لوگوں کے حلقے میں داخل ہونا، ان کے موبائل نمبرز اور ای میلز حاصل کرنا، اور ان کے کام کرنے کے طریقے کو قریب سے دیکھنا۔یہ ریکارڈ کرنا کہ کون سی خبریں اور ویڈیوز ایران کی رگوں میں نفرت گھول رہی ہیں اور ان کا براہِ راست اثر پاکستان کے مفادات پر کیا پڑ رہا ہے۔
3. خارجی روابط کا ثبوت: خاموشی سے یہ دیکھنا کہ ان میڈیا پرسنز کے ڈورے کہاں بندھے ہیں؟ کیا ان کے پیچھے اسرائیلی انٹیلی جنس کی منصوبہ بندی ہے یا کوئی اور خارجی قوت؟

4. حتمی مقصد:
بغیر کسی مداخلت کے ایک ایسی جامع رپورٹ تیار کرنا، جو مستقبل میں ان تمام 'میڈیا ہینڈلرز' کو بے نقاب کر سکے اور پاکستان کو ان کے ممکنہ اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔
یہ تفصیلی پلان میں اپنی نوٹ بک میں درج کر چکا تھا۔
اب میری کاپی میں ہر چینل، ہر رپورٹر، اور ہر ڈائریکٹر کے لیے الگ الگ ریکارڈ پیج موجود تھا: ان کے نام، رابطے کا طریقہ، سرگرمیوں کا تجزیہ وغیرہ
میں نے ان سب کے لیے باقاعدہ ایک جدول تیار کر لیا تھا۔
ہر نام کے سامنے ایک خالی خانے کی جگہ تھی۔
ہر سرگرمی کے مقابل ایک تجزیاتی کالم ڈھانچہ مکمل تھا۔اب جو بھی رپورٹ مجھے ملتی جائے گی میں اسی جدول میں اس کی تفصیل شامل کرتا جاؤں گا ہر نئی اطلاع کے ساتھ ایک نیا اندراج۔ ہر مشاہدے کے ساتھ ایک نیا نوٹ۔یوں میرا ریکارڈ بکھرا ہوا نہیں، بلکہ منظم ہو گاجب میں نے اپنی نوٹ بک میں میڈیا کے اس پورے جال کا نقشہ مکمل کر لیا، تو قلم کی نوک کے ساتھ ساتھ میرے اعصاب کی ڈوریاں بھی جواب دینے لگیں۔ تین گھنٹے تک لگاتار 'جدول' (Tables) بناتے، میڈیا ہاؤسز کے رابطے جوڑتے اور اس پورے جال کو کاغذ پر اتارتے اتارتے میرے اعصاب کی ڈوریاں تڑخنے لگی تھیں رات کی سیاہی گہری ہو چکی تھی اور زاہدان کی خاموشی میں صرف میرے سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی ڈائری بند کی——وہ نقشہ اب تیار تھا۔ دشمن کی چالیں، میڈیا کا پروپیگنڈا اور وہ تمام مہرے جو اس بساط پر بچھے تھے، ان سے کیسے نمٹنا ہے میرے ذہن میں واضح ہو چکے تھے۔میں نے ڈائری بند کی اور اسے اپنے تکیے کے نیچے ایسے چھپایا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سینے سے لگاتی ہے۔
میں بستر پر ڈھیر ہوا تو آنکھیں بند ہوتے ہی وہ مناظر لہرانے لگے جنہوں نے مسلم امہ کے کلیجے چاک کر دیے تھے۔ مجھے شام کی جلتی گلیاں اور عراق کے کھنڈرات یاد آنے لگے۔ وہاں بھی تو یہی کھیل کھیلا گیا تھا! وہاں بھی تو میڈیا کے ذریعے ذہنوں میں زہر بھرا گیا تھا، تفرقے کی آگ لگائی گئی تھی اور پھر پورے کے پورے ملک راکھ کے ڈھیر میں بدل دیے گئے تھے۔میرا دل بیٹھنے لگا——وہی خونی کھیل، وہی 'سائنس' جو تل ابیب اور لندن کے منجمد ایوانوں میں تیار ہوئی تھی، اب تہران کی سڑکوں پر آزمائی جا رہی تھی۔ میرا سینہ ہول سے بھر گیا کہ اگر یہ آگ یہاں نہ رکی، تو اس کی چنگاریاں سرحد پار کر کے میرے اپنے پاکستان کے آنچل تک پہنچیں گی۔ میرا بلوچستان، میرا گھر، میرے بھائیوں کی مسکراہٹیں... کیا دشمن نے ہمیں بھی اسی 'عراقی اور شامی' انجام کی طرف دھکیلنے کا منصوبہ بنا لیا ہے؟"اب مجھے تہران اور مشہد کے بازار نہیں، بلکہ اپنے پاکستان کی گلیاں دکھائی دیں۔ جو آگ آج ایران کے اس میڈیا کے ذریعے بھڑکائی جا رہی ہے، جو 'سازشیں'واشنگٹن تل ابیب پیرس دہلی اور لندن کے بند کمروں میں بیٹھ کر لکھی جا رہی ہیں، وہ اگر سرحد پار کر گئی تو میرا بلوچستان خاکستر ہو جائے گا۔ میرا وطن، میرا گھر، جہاں میرے اپنوں کے خواب بستے ہیں،وہ اس عالمی سازش کی راکھ میں

کیسے دب سکتا ہے؟
میں نے کروٹ بدلی تو تکیہ آنسوؤں سے نم تھا یا شاید اس تڑپ سے جو مجھے سونے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے خود کو تسلی دی: 'سو جا اے مسافر، کہ تیرا یہ آرام کرنا بھی ایک خاموش جہاد ہے۔ اگر اللہ کی رضا شاملِ حال ہو تو ایک محافظ کی نیند بھی اس کے سجدوں میں شمار ہوتی ہے۔'
میں نے سوچا، یہ جو میں اس وقت ٹوٹ کر بکھر رہا ہوں، یہ تھکن نہیں، یہ تو اس فرض کا لمس ہے جو خدا نے میرے نصیب میں لکھا ہے۔ ایک مجاہد جب اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان اور نیند کا نذرانہ پیش کرتا ہے، تو اس کا آرام کرنا بھی کسی مصلّے پر کھڑے ہونے سے کم نہیں۔ یہ نیند نہیں، یہ تو کل کے اس طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے جو باطل کے ان ایوانوں کو تہس نہس کر دے گا میرا بستر کوئی مخملی سیج نہیں تھا، بلکہ ایک مورچہ تھا جہاں سے میں نے کل صبح ان طاقتوں کا سامنا کرنا تھا جو لفظوں کے لبادے میں زہر بیچتی ہیں۔"میں نے دعا مانگی کہ یا اللہ! جب کل کا سورج طلوع ہو، تو میری آنکھوں کو وہ بصیرت عطا کرنا کہ میں اخبار کی سرخیوں کے پیچھے چھپے ہوئے خنجروں کو دیکھ سکوں میں ان 'ہیڈ لائنز' کے پیچھے چھپے خون آشام چہروں کو بے نقاب کروں گا۔ میں ان بیانیوں کے پرخچے اڑا دوں گا جو میرے پاکستان کے امن کو نگلنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ اسی جذبے اور وطن کی مٹی کی خوشبو کو اپنے خیالوں میں بسائے میں نے آنکھیں موند لیں۔ جسمانی درد اپنی جگہ، مگر یہ یقین کہ میں حق کے محاذ پر کھڑا ہوں، مجھے ایک ایسی نیند کی وادی میں لے گیا جہاں آرام بھی کسی جہاد سے کم نہ تھا۔جب زاہدان کی فضاؤں میں 'اللہ اکبر' کی صدا گونجی، تو میری آنکھیں ایک نئے عزم کے ساتھ کھلیں۔ رات کی وہ تھکن، وہ اضطراب اور وہ تڑپ اب ایک ٹھنڈے اور فولادی ارادے میں ڈھل چکی تھی۔ میں نے وضو کیا اور جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ وہ صبح کی نماز نہیں تھی، بلکہ کائنات کے مالک کے سامنے اپنے مشن کی منظوری کی ایک درخواست تھی۔ سجدے میں سر رکھا تو دل کی دھڑکنوں نے گواہی دی کہ یہ پیشانی باطل کے سامنے کبھی نہیں جھکے گی۔ میں نے دعا مانگی: 'یا اللہ! میرے قلم کو وہ کاٹ دے کہ میں ان چہروں کو بے نقاب کر سکوں جو پیرس کی رنگینیوں، لندن کی سرد گلیوں اور تل ابیب کے بنکروں میں بیٹھ کر انسانیت کا لہو پینے کے منصوبے بناتے ہیں'۔"نماز سے فارغ ہو کر میں نے اپنا سامان سمیٹا۔ اب میرے سامنے صرف زاہدان نہیں تھا، بلکہ وہ پورا نقشہ تھا جس کے تانے بانے پیرس کے تھنک ٹینکس سے لے کر لندن کے میڈیا ہاؤسز تک پھیلے ہوئے تھے۔
یہ محض ایران کی اندرونی آگ نہیں تھی، یہ ایک ایسی 'خفیہ سائنس' تھی جس کا ماسٹر مائنڈ فرانس اور برطانیہ کے محفوظ کمروں میں بیٹھ کر کمپیوٹر کی ایک کلک سے تہران کی سڑکوں پر بھائی کو بھائی سے لڑا رہا تھا۔مجھے ان چہروں سے نقاب نوچنا تھا جو خود کو 'انسانی حقوق کا علمبردار' کہتے ہیں لیکن جن کے قلم کی روشنائی معصوموں کے خون سے بنتی ہے۔ میں نے نیلے رنگ کی شرٹ پہنی تاکہ میں ایک مقامی طالب علم یا چھوٹا صحافی لگوں سرائے سے نکل کر میں نے 'خیابانِ آزادی' کا رخ کیا۔ سورج اب پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ دکانوں کے شٹر کھل رہے تھےسب سے پہلے میں ایک مقامی نیوز اسٹینڈ کی طرف گیا۔ یہاں صبح سویرے اخبارات کے بنڈل اترتے ہیں۔ ابھی اخبار فروش اخبارات کی تہہ لگا رہا تھا کہ میں

وہاں پہنچ گیا۔ میں نے ایک مقامی اخبار اٹھایا۔ میری نظریں سرخیوں کو چھان رہی تھیں کہ اچانک ایک چھوٹی سی خبر پر ٹھہر گئیں۔ وہ خبر کسی سیاسی جلسے کی نہیں تھی، بلکہ ایک مقامی تنظیم 'انجمنِ فکرِ نو' کے سالانہ کنونشن کا اشتہار تھا جو اگلے دن زاہدان کے ایک کمیونٹی ہال میں ہونا تھا۔ خبر میں لکھا تھا: "جدید میڈیا اور ہماری نسل—اصفہان اور تہران کے مقتدر صحافیوں کی شرکت" خبر میں کوئی خاص مشکوک بات نہیں تھی یہ ایک عام سی ادبی و صحافتی تقریب لگ رہی تھی، مگر میرے لیے یہ اہم تھا کہ اصفہان اور تہران سے لوگ یہاں آ رہے ہیں۔ میں نے اخبار خریدا تہہ کیا، اسے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور ایک گہرا سانس لے کر بازار کی طرف نکل گیا وہاں سے پیدل چلتا ہوا 'رسول مارکیٹ' پہنچ گیا۔ یہ بازار اسمگل شدہ الیکٹرانکس کا گڑھ ہے یہاں موبائل فونز اور سیٹلائٹ ریسیورز کی دکانیں بھری پڑی تھیں میرا خیال تھا کہ شاید یہاں مجھے کچھ 'غیر قانونی سگنلز' یا 'پروکسیز' کی تقسیم نظر آئے گی، لیکن میں غلط تھا۔ میں نے دو تین بڑی الیکٹرانکس کی دکانوں کے چکر لگائے، 'تحقیقی طالب علم' بن کر دکانداروں سے بات کرنے کی کوشش کی، مگر وہاں سب کچھ نارمل تھا۔ دکاندار اپنے گاہکوں کے ساتھ روٹین کے سودے کر رہے تھے۔ نہ کوئی مشکوک کارڈ تقسیم ہو رہا تھے، نہ ہی کوئی خفیہ سافٹ ویئر۔ مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی، مگر یہی حقیقت تھی۔ دشمن اتنا نادان نہیں ہوتا کہ سرِ عام اپنی دکان سجا کر بیٹھے۔

ظہر کی نماز کے بعد میں نے زاہدان کے ان علاقوں کا رخ کیا جہاں عموماً سیاسی تناؤ رہتا ہے۔ میں ان گلیوں میں گھوما جہاں دیواروں پر پرانے اشتہارات لگے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ کسی طرح کوئی ایسی 'وال چاکنگ' یا کوئی ایسا لنک مل جائے جو مجھے کسی ویب سائٹ تک لے جائے، مگر وہاں بھی خاموشی تھی۔ سڑکوں پر پولیس کی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں اور لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ 'خفیہ مداخلت' اتنی گہری ہے کہ اسے سطح پر ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ مغرب تک میں شہر کے تقریباً اہم جگہوں کے چپے چپے کی خاک چھان چکا تھا۔ پیر تھکن سے شل ہو رہے تھے اور ذہن اس 'ناکام دن' پر تھوڑا بوجھل تھا۔ میں نے ایک جوس کی دکان پر کھڑے ہو کر تازہ انار کا جوس پیا اور سوچا، "شاید میں کسی غلط سمت میں جا رہا ہوں؟" زاہدان کی شام جب ڈھلی تو میں کسی ہارے ہوئے لشکر کے سپاہی کی طرح اپنے قدموں کو گھسیٹتا ہوا سرائے کے کمرے میں پہنچا۔ وہ پورا دن ایک لاحاصل مشقت کی نذر ہو گیا تھا۔ میں نے رسول مارکیٹ کے ایک ایک پتھر کو چھان مارا تھا، الیکٹرانکس کی ان دکانوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہا جہاں سے کسی 'سگنل' یا 'خفیہ پروکسی' کی بو آ سکتی تھی، مگر ہر جگہ ایک پراسرار سی نارمل زندگی تھی۔ دکاندار معمول کے سودے کر رہے تھے اور گاہک اپنی خریداری میں مگن تھے۔ مجھے کہیں کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جو میرے اس شک کو یقین میں بدل دیتا کہ یہاں کوئی 'خفیہ مداخلت' ہو رہی ہے۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا کمرے کی دیواریں جیسے میرا مذاق اڑا رہی تھیں۔ میں نے ایک مقامی ڈھابے سے لایا ہوا ٹھنڈا ہو چکا سالن اور نان نکالا اور بے دلی سے دو چار لقمے حلق میں اتارے۔ بھوک جیسے مر چکی تھی، صرف ایک تھکن تھی جو ہڈیوں کے اندر تک اتر گئی تھی۔ 26 سال کی عمر میں جب انسان بڑے بڑے خواب لے کر نکلتا ہے اور سامنے دیوار کھڑی ہو جائے، تو وہ کرب لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

عشاء کی اذان گونجی تو میں نے بوجھل قدموں سے وضو کیا۔ جائے نماز پر کھڑا ہوا تو دل سے ایک ہی فریاد نکلی: 'یا اللہ! میں تیرے بھروسے پر اس انجان ملک کی خاک چھان رہا ہوں۔ میں اپنے وطن، اپنے پاکستان کی سلامتی کا سودا کرنے نہیں، اسے بچانے نکلا ہوں۔ مجھے کوئی راستہ دکھا، میری محنت کو رائیگاں نہ ہونے دے۔' دعا مانگتے ہوئے میری آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے وہ آنسو نکل آئے جو صرف ایک تنہا مجاہد کی آنکھ میں ہوتے ہیں۔

دعا کے بعد میں تھوڑی دیر وہیں مصلے پر بیٹھا رہا۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ پھر اچانک میرا ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف گیا جہاں وہ اخبار مڑا تڑا پڑا تھا جو میں نے صبح نیوز اسٹینڈ سے خریدا تھا۔ میں نے اسے نکالا اور میز کی مدہم روشنی میں اسے پھیلا دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے ایک بار دیکھ کر ردی میں پھینک دوں گا اور سو جاؤں گا

میں نے سرسری نظر ڈالی، وہی پرانی خبریں تھیں۔ مگر جب میں اسے تہہ کرنے لگا، تو میری نظر ایک بار پھر اسی چھوٹے سے ڈبے میں بند خبر پر ٹھہر گئی: 'جدید میڈیا اور ہماری نسل—اصفہان اور تہران کے مقتدر صحافیوں کی شرکت'۔

میں رک گیا۔ میرا ذہن، جو تھکن سے مفلوج ہو رہا تھا، اچانک بیدار ہوا۔ 'اصفہان اور تہران کے مقتدر صحافی؟' میں نے خود سے سوال کیا۔ 'اس دور افتادہ اور پسماندہ سرحدی علاقے زاہدان میں، جہاں سیکیورٹی کی اتنی سخت تہیں ہیں، یہ بڑے نام ایک عام سی ادبی نشست کے لیے کیوں آ رہے ہیں؟

میرا ذہن ایک عجیب سے تضاد کا شکار تھا۔ ایک طرف میرا منطقی دماغ کہہ رہا تھا، 'اے مسافر! تو حد سے زیادہ سوچ رہا ہے۔ یہ محض تیرا وہم بھی تو ہو سکتا ہے ہر چیز کو جاسوسی کی عینک سے دیکھنا تجھے پاگل کر دے گا۔'

ایک ادبی نشست ہوگی، کچھ لوگ اکٹھے ہوں گے، چائے پیئیں گے اور چلے جائیں گے۔ تو کیوں خواہ مخواہ موت کے جبڑے میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے؟'

مگر میرا دوسرا دماغ، جو ایک تربیت یافتہ مجاہد کا دماغ تھا، وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: 'نہیں! اصفہان کا میڈیا ہاؤس اور تہران کے مقتدر نام اس دور افتادہ سرحد پر بلاوجہ نہیں آتے۔ 'کیا یہ میرا وہم ہے؟' میں نے خود سے پوچھا۔ 'کیا میں ایک ایسی لکیر کا پیچھا کر رہا ہوں جو کہیں ختم نہیں ہوتی؟' تذبذب کا ایک طوفان تھا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ زاہدان کی سیکیورٹی کی سختی میرے سامنے تھی؛ وہاں ایک غلط قدم کا مطلب تھا عمر بھر کے لیے کسی گمنام زندان کی تاریکی۔ لیکن پھر مجھے وہ دعا یاد آئی جو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مانگی تھی۔ کیا یہ اخبار کا ملنا اسی دعا کا جواب تھا؟ کیا قدرت نے مجھے ایک موقع دیا تھا کہ میں ان 'مقتدر چہروں' کے پیچھے چھپے اصل مہروں کو دیکھ سکوں؟ اچانک میرے اندر ایک بجلی سی لہری۔ 'اگر یہ میرا وہم بھی ہے، تو ایک مجاہد کا وہم بھی ایک الرٹ ہوتا ہے!' میں نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اگر وہاں سے مجھے کوئی سراغ نہ ملا تو کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن ہوگا کہ میں نے کوشش کی۔ اور اگر وہاں واقعی کچھ ہوا... اگر وہ 'سگنل' وہیں سے نکل رہا ہوا... تو یہ میری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ میرا پلان اب واضح ہو چکا تھا۔ چاہے یہ میرا وہم ہو یا حقیقت، مجھے اس کمیونٹی ہال کے اندر جانا تھا اب سوال یہ تھا کہ میں وہاں جاؤں گا کیسے؟ میں ایک ایسا مسافر تھا جس کی اس زمین پر کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ ایک غیر قانونی شخص کا ایسی جگہ جانا جہاں سیکیورٹی کے سخت

پہرے ہوں گے، خود کو موت کے جبڑے میں دینے کے مترادف تھا۔ لیکن تجسس اور وطن کی فکر خوف پر غالب آ چکی تھی۔میں نے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کسی زخمی شیر کی طرح چکر کاٹنا شروع کر دیے۔ میرے قدموں کی چاپ اس خاموش رات میں ایک عجیب سا آہنگ پیدا کر رہی تھی۔ میں کبھی رک کر کھڑکی سے باہر زاہدان کی سوئی ہوئی سڑکوں کو دیکھتا اور کبھی واپس آ کر میز پر پڑے اس اخبار کے تراشے کو گھورنے لگتا۔ میرا دماغ اس وقت کسی سپر کمپیوٹر کی طرح ہزاروں 'پروگرامز' چلا رہا تھا۔'اگر میں ایک صحافی بن کر جاؤں تو وہ مجھ سے میرا 'کارتِ پریس' (Press Card) مانگیں گے، جو میرے پاس نہیں ہے۔ اگر میں ایک عام شہری بن کر جاؤں تو شاید وہ مجھے اندر ہی نہ جانے دیں کیونکہ ایسی نشستیں مخصوص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔''اگر میں ایک مہمان بن کر جاؤں گا تو مجھ سے 'دعوت نامہ' (Invitation) مانگا جائے گا میں کرسی پر بیٹھ گیا، سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر اچانک اٹھ کر دوبارہ ٹہلنا شروع کر دیا۔

'کیا میں ایک الیکٹرک ریپیئرنگ والا بن کر جاؤں؟ نہیں، وہاں سیکیورٹی والے ہر اوزار کی تلاشی لیں گے۔ کیا میں ایک ویٹر بن کر گھسنے کی کوشش کروں؟ وہ بھی خطرناک ہے، وہاں کے عملے کی اپنی پہچان ہوتی ہے۔'ہر منصوبہ بنتا اور میری عقل کی ٹھوکر سے ریت کے گھروندے کی طرح ڈھ جاتا۔ مجھے ایک ایسا روپ چاہیے تھا جو 'بے ضرر' بھی ہو اور 'فطری' بھی پھر ایک اور منصوبہ میرے ذہن میں ایا۔اگر میں 'انتظامیہ' کا حصہ بن کر اندر گھس جاؤں؟

ایران کے ان بڑے ایونٹس میں ہمیشہ مقامی نوجوانوں کی ایک ٹیم 'رضاکار' (Volunteer) کے طور پر کام کرتی ہے جو مہمانوں کو پانی پلانے، نشستیں دکھانے یا پروٹوکول دینے پر مامور ہوتی ہے۔اصفہان اور تہران سے آنے والے ان بڑے صحافیوں کے لیے زاہدان کے مقامی لڑکے ہی یہ کام کریں گے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان 'رضاکاروں' کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا۔ ایک ایسا کارکن جس پر کسی کی نظر نہ پڑے، مگر جس کی نظر سب پر ہو۔"

"اب ایک بڑا مسئلہ سامنے تھا۔ ان رضاکاروں کا کوئی مخصوص یونیفارم ہوگا؟ یا کوئی خاص بیج (Badge)؟ میں نے اخبار کے اشتہار کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ وہاں منتظمین کے طور پر ایک مقامی تعلیمی ادارے کا لوگو تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عام طور پر سفید قمیض اور گہرے رنگ کی پتلون پہنتے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے میرے پاس ایک سفید شرٹ اور کالی پینٹ موجود تھی۔

بیج کا مسئلہ میں نے یوں حل کیا کہ میرے پاس ایک پرانا لانیارڈ (گلے میں ڈالنے والا تسمہ) موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی نے پوچھا تو میں کہہ دوں گا کہ 'میرا کارڈ ابھی پرنٹ ہو کر نہیں آیا' یا میں اسے اپنی جیب میں اس طرح رکھوں گا کہ صرف تسمہ نظر آئے۔ ان بڑے ایونٹس کی افراتفری میں کوئی بھی نچلے درجے کے کارکن کا شناختی کارڈ چیک نہیں کرتا، بشرطیکہ آپ کا اعتماد فولادی ہو۔"میں نے ذہن میں پورا نقشہ تیار کر لیا۔ میں ہال کے مرکزی دروازے سے نہیں، بلکہ اس راستے سے داخل ہوں گا جہاں سے سامان اندر جا رہا ہوگا۔ میں خود کو اتنا مصروف ظاہر کروں گا جیسے پوری انتظامیہ کا بوجھ میرے ہی کندھوں پر ہے۔ سیکیورٹی اہلکار عام طور پر ان لوگوں کو نہیں روکتے جو خود تندہی سے کام کر

رہے ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں پانی کی بوتلیں یا کچھ فائلیں ہاتھ میں پکڑوں گا اور تیزی سے سیکیورٹی گیٹ سے گزر جاؤں گا۔ ایک نظر ان کی آنکھوں میں ڈالوں گا، ایک ہلکا سا 'سلام' کروں گا جیسے میں انہیں پہلے سے جانتا ہوں، اور سیدھا اندر ہال میں جا کر پیچھے کی کسی اندھیری نشست پر بیٹھ جاؤں گا جہاں سے پورا اسٹیج اور مہمانوں کی کرسیاں صاف نظر آتی ہوں۔" یہ سارا خاکہ میرے ذہن میں بن گیا تھا، لیکن اب باری تھی 'پریکٹس' کی۔ میں جانتا تھا کہ سیکیورٹی اہلکار کی عقابی نظریں صرف کاغذ نہیں دیکھتیں، وہ لہجے کی تھراہٹ اور آنکھوں کا خوف پڑھتی ہیں۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے کنڈی لگا کر بند کیا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اگلے دو گھنٹے میں نے وہ 'کردار' جیا جو مجھے کل نبھانا تھا۔میں نے بار بار فارسی کے ان مخصوص الفاظ کی مشق کی جو ایک مقامی 'رضاکار' (Volunteer) کی زبان پر ہونے چاہئیں۔ 'خستہ نباشید آغا' (تھکنا نہیں آقا)، 'ببخشید، لیستِ مہمانان کجاست؟' (معذرت، مہمانوں کی لسٹ کہاں ہے؟)۔ میں نے اپنے لہجے سے وہ 'پاکستانی مٹھاس' نکالنے کی کوشش کی اور اسے زاہدان کے مقامی لب و لہجے میں ڈھالنے کی تگ و دو کرتا رہا۔ میں کبھی بیٹھتا، کبھی تیزی سے چلتا، کبھی کسی فرضی سیکیورٹی والے کو اپنا 'خیالی کارڈ' دکھاتا۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی نے میرا نام پوچھا، تو میرا جواب بغیر کسی ہچکچاہٹ کے 'رضا' ہونا چاہیے۔ ان دو گھنٹوں کی تپسیا نے میرے اندر کے خوف کو ایک 'اداکار' کے اعتماد میں بدل دیا۔" جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا لہجہ اب مجھے دھوکہ نہیں دے گا، تو میں نے قلم اور ڈائری ایک طرف رکھی اور بستر پر گر گیا۔ وہ نیند نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی خاموشی تھی جو کسی بڑے معرکے سے پہلے طاری ہوتی ہے۔" فجر کی اذان نے جب زاہدان کی فضاؤں میں ارتعاش پیدا کیا، تو میں بیدار ہوا۔ وضو کے پانی نے میری رات بھر کی تھکن دھو ڈالی۔ نماز کے بعد میں نے مصلّے پر بیٹھ کر ہاتھ اٹھائے تو دعا میں الفاظ کم اور تڑپ زیادہ تھی۔

'یا اللہ! میں ایک انجان زمین پر، تیرے ہی بھروسے پر ایک ایسے جال میں قدم رکھ رہا ہوں جس کے تانے بانے میرے وطن کی بربادی سے جڑے ہیں۔ میرے قدموں کو استقامت دے اور میری زبان کو حق کی کاٹ عطا کر۔'میں نے وہی سفید استری شدہ قمیض اور گہرے رنگ کی پتلون پہنی۔ گلے میں ایک سادہ سا تسمہ (Lanyard) ڈالا تاکہ میں دور سے ہی انتظامیہ کا حصہ لگوں۔میں ہوٹل سے نکلا اور ایک مقامی ٹیکسی لی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے جب اس کمیونٹی ہال کا نام سنا، تو اس نے آئینے میں مجھے دیکھا۔ 'وہاں تو بڑے بڑے لوگ آ رہے ہیں تہران سے، تم بھی وہیں جا رہے ہو؟' میں نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، 'جی آغا! ہم تو وہاں میزیں سجانے اور پانی پلانے والے چھوٹے لوگ ہیں

انتظامیہ نے بلایا ہے، شاید کچھ مزدوری مل جائے یا ان بڑے صحافیوں کی خدمت کر کے کچھ سیکھنے کو مل جائے۔' ڈرائیور نے ایک گہرا سانس لیا اور خاموش ہو گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے پیچھے بیٹھا یہ 26 سالہ لڑکا ایران اور پاکستان کے درمیان بننے والی ایک ہولناک سازش کی جڑیں کاٹنے جا رہا ہے۔"ہال کے سامنے پہنچا تو منظر دیکھ کر ایک لمحے کو میری سانسیں رک گئیں۔ کالی وردیوں والے انقلابی گارڈز اور سادہ لباس اہلکار پورے علاقے کو گھیرے ہوئے تھے۔ مرکزی گیٹ پر 'کارتِ شناسائی' (ID Cards) کی سخت پڑتال ہو رہی تھی۔ میں نے ٹیکسی سے اترتے ہی اپنا رخ ہال کے عقبی راستے کی طرف کیا، جہاں سے کھانے کے کریٹ اور پانی کی بوتلیں اندر جا رہی تھیں۔میں نے ایک بھاری نظر آنے والا

'کاغذات کا بنڈل' اٹھایااور اسے کندھے پر رکھ کر اس طرح چلنا شروع کیا جیسے میں اس پروگرام کی 'جان' ہوں اور میرے بغیر سب ادھورا ہے۔ جیسے ہی میں گیٹ کے قریب پہنچا، ایک سخت گیر اہلکار نے مجھے روکا۔ میرا دل پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا، مگر میری رات والی مشق کام آئی۔ میں نے ڈبے کے پیچھے سے بڑی جھلاہٹ کے ساتھ زاہدان کے مخصوص لہجے میں، جو فارسی اور بلوچی کا آمیزہ تھافارسی میں کہا 'آغا! اصفہان والے مہمانوں کی لسٹ اندر پہنچانی ہے، دیر ہو رہی ہے!' میری آنکھوں میں ایسی بے باکی تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔اس نے بڑی بے نیازی سے بنڈل کے ایک کونے کو چھو کر دیکھا، پھر اس کی نظر میری نیلی شرٹ سے ہوتی ہوئی میرے گلے میں لٹکے اس تسمے (Lanyard) پر جا ٹھہری جو واسکٹ کے نیچے سے ہلکا سا جھانک رہا تھا۔

میرا دل ایک لمحے کو جیسے تھم گیا۔ اس تسمے کے آخر میں وہ جعلی کارڈ تھا جسے اگر وہ ذرا سا بھی کھینچ کر دیکھ لیتا تو اس پر لکھی تحریر اور اس کی ناقص پرنٹنگ میری موت کا پروانہ بن سکتی تھی مگر میری مجاہدانہ خاموشی اور اعصابی ٹھہراؤ نے اسے یہ یقین دلا دیا کہ میں اس سسٹم کا ایک ادنیٰ مگر ضروری پرزہ ہوں اس نے تسمے کو ہلکا سا چھوا، اسے ذرا سا اوپر کر کے دیکھا، مگر شاید میری قسمت یا رب کی نصرت اس وقت میرے پہرے پر تھی۔اس نے کارڈ کو پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی اور بڑے کھردرے لہجے میں کہا: 'برو! زود باش!' (جاؤ! جلدی کرو!)

میں نے کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ فتح کے قریب ہی سب سے زیادہ ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ میں نے بنڈل کو کندھے پر ذرا سا اور اوپر کیا اور بڑے اطمینان سے گیٹ پار کر گیا۔ جیسے ہی میں ہال کی مرکزی راہداری میں داخل ہوا، میں نے محسوس کیا کہ میرے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند رینگ رہی تھی، مگر میرے قدم اب پہلے سے زیادہ مضبوط تھے۔"

اندر کی فضا میں وہ مخصوص حبس تھا جو کسی بڑے ہنگامے سے پہلے کی خاموشی میں ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ راہداری کے ساتھ ہی ایک اسٹور نما چھوٹا کمرہ ہے جہاں کچھ خالی کرسیاں اور پرانے پردے پڑے تھے۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی؛ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے وہ بھاری بنڈل ایک کونے میں چھپایا اور اپنی واسکٹ کے بٹن درست کیے۔ اب میں ایک بوجھ ڈھونڈنے والا مزدور نہیں، بلکہ اصفہان سے آئے ہوئے وفد کا وہ 'خاموش سایا' بن چکا تھا جو کہیں بھی موجود ہو سکتا تھا۔میں بڑے اعتماد سے مرکزی ہال کے بھاری لکڑی کے دروازوں کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

ہال میں داخل ہوتے ہی میری نظریں ان بڑے بڑے رنگین بینرز پر جم گئی تھیں جن پر 'آزادیِ فکر' اور 'جدید صحافت' کے سنہری حروف چمک رہے تھے۔ پورا ہال کسی عالمی سیمینار کی طرح سجا ہوا تھا۔

ہر کرسی پر ایک فولڈر اور قلم رکھا تھا، جیسے یہ کوئی علمی درسگاہ ہو۔ہال ابھی ادھا خالی تھا، مگر پہلی چند قطاروں میں وہی 'مخصوص لوگ' بیٹھے تھے جن کے حلیے اور جدید ترین لیپ ٹاپ تضاد کی پوری کہانی سنا رہے تھے۔ میں نے ہال کے بالکل آخری کونے میں، جہاں روشنی کم تھی اور ایگزٹ گیٹ قریب تھا، ایک نشست سنبھال لی۔میں نے اپنی ٹوپی کو تھوڑا نیچا کیا اور اسٹیج پر لگی ان خالی کرسیوں کو دیکھنے لگا جہاں تہران اور اصفہان کے وہ 'مقتدر صحافی' بیٹھنے والے تھے۔ میرے اندر

کا صحافی اب ایک نفسیاتی شکاری بن چکا تھا۔ تقریب کا آغاز قریب تھا، اور میری روح اس 'میڈیا وار' کے پردے چاک کرنے کے لیے بے قرار تھی۔"تقریب کا اغاز ہوا تو پہلا مقرر مائک پر ایا، اس کا لہجہ دھیما اور عالمانہ تھا، جیسے وہ کوئی بہت بڑی فلسفیانہ حقیقت بیان کرنے والا ہو۔ اس نے 'جدید دنیا میں صحافت کے بدلتے تقاضوں' پر بات شروع کی۔ اس کی تقریر بالکل نیوٹرل (غیر جانبدار) تھی۔ وہ اخلاقیات، سچائی اور غیر جانبداری کا درس دے رہا تھا۔ اس کے بعد آنے والے دو مقررین نے بھی اسی راہ پر چلتے ہوئے عالمی میڈیا کے معیار کی باتیں کیں، جیسے وہ صرف ایک تعلیمی لیکچر دے رہے ہوں۔ مگر چوتھے اور پانچویں مقرر نے جب مائیک سنبھالا تو ہال کی فضا یکسر بدل گئی۔ ان کا لہجہ اب 'نیوٹرل' نہیں رہا تھا، بلکہ ان کے لفظوں میں آزادیِ اظہار کے نام پر ایک سلگتی ہوئی چنگاری تھی۔ انہوں نے بڑی مہارت سے ایرانی نظام، پابندیوں اور حکومت کے آہنی شکنجے پر ایسی تنقید کی کہ ہال میں موجود نوجوانوں کے چہروں پر جذبات کی لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ 'جب قلم کی زبان بند کی جاتی ہے، تو خون بولتا ہے'۔

میں آخری نشست پر بیٹھا ان کے ہر لفظ کو اپنے ذہن کے ترازو میں تول رہا تھا۔ ان کا انداز اتنا پُراثر تھا کہ ایک لمحے کو تو میں بھی سوچنے لگا کہ شاید یہ واقعی 'حق کی آواز' بلند کر رہے ہیں۔ تضاد اتنا گہرا تھا کہ شک کی کوئی ٹھوس بنیاد نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سب کچھ وہی کہہ رہے تھے جو ایک آزاد معاشرے کا مطالبہ ہوتا ہے، مگر میرے اندر کا مجاہدانہ وجدان مضطرب تھا۔ 'کیا یہ واقعی سچ ہے؟ یا یہ وہی "سافٹ وار" ہے جس کا مقصد ذہنوں میں بغاوت کا بیج بونا ہے؟' تقریب اپنے آخری مراحل میں تھی

ان دو مقررین کی اس سلگتی ہوئی تقریر کے بعد، جس نے ہال کی فضا میں ایک انجانی سی بغاوت بھر دی تھی، دو مزید مقررین اسٹیج پر آئے۔ میں نے اپنی نشست سنبھالی اور تمام تر حسیات کو ان کے لہجے کی لرزشوں پر مرکوز کر دیا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کی گفتگو میں دور دور تک کسی 'سازش' کا شائبہ تک نہ تھا۔ان میں سے ایک ادھیڑ عمر صحافی نے جب مائیک سنبھالا، تو اس کے لہجے میں ایک عجیب سا وقار اور ٹھہراؤ تھا۔ اس نے اسلامی انقلاب کی بنیادوں، اس کی جدوجہد اور عصری تقاضوں پر ایسی مدلل اور جاندار گفتگو کی کہ ہال میں موجود کئی لوگ سبحان اللہ پکار اٹھے۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا کہ کس طرح ایک صحافی کو اپنے نظریات اور اپنی مٹی سے جڑا ہونا چاہیے۔ اس کی باتوں میں وہ مٹھاس اور سچائی تھی جو صرف ضمیر کی آواز میں ہوتی ہے۔دوسرے مقرر نے بھی اسی ڈگر پر چلتے ہوئے 'اسلامی صحافت کے عالمی کردار' پر روشنی ڈالی۔ ان دونوں کی تقریریں اتنی شفاف اور مدلل تھیں کہ میرے اندر کا وہ شک، جو صبح سے کسی ناگن کی طرح سر اٹھا رہا تھا، ایک دم سے دب گیا۔ 'کیا میں واقعی ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہا ہوں؟' میں نے خود سے سوال کیا۔ 'کیا یہ محض ایک علمی نشست ہے جہاں ہر مکتبہ فکر کو اپنی بات کہنے کی آزادی دی گئی ہے؟'مجھے کوئی ایک کڑی، کوئی ایک لفظ یا کوئی ایک اشارہ ایسا نہیں ملا جسے میں 'دشمن کی چال' قرار دے سکتا۔ تضاد کی انتہا یہ تھی کہ ایک ہی اسٹیج سے 'بغاوت' کی چنگاری بھی نکلی تھی اور 'نظریاتی دفاع' کی ڈھال بھی پیش کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی شطرنج کی بساط تھی جہاں سفید اور کالے مہرے اتنی مہارت سے ترتیب دیے گئے تھے کہ ایک 26 سالہ صحافی کے لیے اصل

کھلاڑی کو پہچاننا ناممکن ہو رہا تھا۔
"تقریب کے اختتام کا اعلان ہوتے ہی ہال کی سنجیدہ فضا ایک دم شور و غل میں بدل گئی۔ یونیورسٹی کے نوجوان، جوشیلے طلبہ اور مقامی رپورٹرز اسٹیج پر موجود مہمانوں کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ کوئی تصویر کھنچوا رہا تھا، کوئی آٹو گراف مانگ رہا تھا، اور کوئی اپنے نظریاتی سوالات کے جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ میں آخری صف سے اٹھا اپنی ٹوپی کو ذرا سا درست کیا اور پورے اعتماد کے ساتھ رامین کی طرف بڑھا، جو اپنے دو تین ساتھیوں کے درمیان کھڑا کسی گہری بحث میں مصروف تھا اس کے ساتھ کھڑے طالب علم بھی اسی کی طرح پرجوش اور ذہین لگ رہے تھے۔ رامین، جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک نہایت متوازن اور گہری تقریر کی تھی، وہ اصفہان کا ایک ابھرتا ہوا صحافی اور رپورٹر لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی متانت اور آنکھوں کی ذہانت بتا رہی تھی کہ اس کے لفظوں کے پیچھے کوئی گہرا فلسفہ چھپا ہے۔ میں نے قریب پہنچ کر بڑے باوقار مگر نرم لہجے میں فارسی میں سلام کیا:
'سلام آغا رامین! عجب تقریرِ دلنشینی بود' (سلام جناب رامین! کیا ہی دلنشین تقریر تھی)۔ رامین نے مڑ کر دیکھا، اس کے لبوں پر ایک ہمدردانہ مسکراہٹ آئی اور اس نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا:
'سلام برادر! ممنون از لطفِ شما' (سلام بھائی! آپ کی ذرہ نوازی کا شکریہ)۔ اس کی آواز میں وہ مخصوص اصفہانی مٹھاس تھی جو کسی بھی اجنبی کو ایک پل میں اپنا بنا لیتی ہے۔ اس کے ساتھ کھڑے دو طالب علم بھی خاموش ہو گئے اور تجسس سے میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر رامین نے مجھ سے پوچھا شما از کدام دانشگاہ ہستید؟"(آپ کس یونیورسٹی سے ہیں) من از پاکستان آمدہ ام (میں پاکستان سے آیا ہوں)، یہ سننا تھا کہ جیسے پورے گروہ پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ رامین کے ساتھ کھڑے وہ دونوں طالب علم ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے، ان کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت اور تجسس تھا۔ رامین جیسے اپنی جگہ جم گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے گہرے سائے لہرائے اور اس کے ہونٹ بے اختیار کھل گئے۔ 'پاکستان سے؟' اس نے فارسی میں دہرایا، اور اس کے لہجے میں وہ فطری حیرانی تھی جو ایک ملک سے دوسرے ملک کے مسافر کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے رامین نے تپاک سے میرا ہاتھ تھاما، اس کی گرفت میں وہ گرم جوشی تھی جو صرف مخلص دوستوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے
اس نے اردو اور فارسی کے ملے جلے لہجے میں حیرت سے کہا۔ 'خوش آمدید! خوش آمدید! ایک برادر ملک سے مسافر یہاں زاہدان کے اس چھوٹے سے ہال میں؟ یہ تو بہت بڑی بات ہے
میں نے فوراً اپنی 'کور اسٹوری' (Cover Story) پیش کی: 'جی، میں ایک طالب علم ہوں اور صحافت پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ ایران کے بدلتے ہوئے میڈیا اور عالمی اثرات میرا موضوع ہیں۔ میں یہاں ایک مہینے کے وزٹ پر آیا ہوں پھر ان طالب علموں نے بھی بڑے جوش سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ان کے لیے یہ ایک انوکھی بات تھی کہ کوئی نوجوان سرحد پار سے صرف ان کی صحافت پر ریسرچ کرنے یہاں پہنچا ہے۔ رامین نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ایک دوستانہ اشارہ کیا، جیسے وہ انہیں بتانا چاہ رہا ہو کہ اب وہ مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ لڑکے مسکراتے ہوئے

رخصت ہوئے رامین نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑے خلوص سے کہا: بہت خوب! ایک پاکستانی کا یہاں ہونا ہمارے لیے اعزاز ہے۔ لیکن زاہدان میں صحافت کی ریسرچ؟ یہ تو ایک بنجر اور کٹھن علاقہ ہے۔' اس نے مجھے آزمائشی نظروں سے دیکھا۔"

میں نے مسکرا کر جواب دیا: 'آغا! بنجر زمینوں میں ہی تو سب سے زیادہ راز دفن ہوتے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہاں کا میڈیا تہران اور اصفہان کے مقابلے میں کتنا مختلف ہے۔' پھر رامین نے بڑے پرتپاک لہجے میں کہا

دوست! تم ریسرچ کے لیے آئے ہو تو تم نے صحیح بندے کو ڈھونڈ لیا ہے۔ میں خود ابھی صحافت کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں، لیکن میں تمہیں وہ کچھ دکھا سکتا ہوں جو تمہاری ریسرچ کو چار چاند لگا دے گا۔' اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر فارسی میں ایک ایسا جملہ کہا جس نے دوستی کی بنیاد رکھ دی: 'مسافرِ عزیز! تو تنہا نیستی، من برادرِ تو ہستم' (پیارے مسافر! تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارا بھائی ہوں)۔ رامین کا انداز اتنا بے تکلف تھا کہ مجھے وہ اپنا کوئی بچھڑا ہوا یار لگنے لگا۔ اس نے مجھے چائے پینے کی دعوت دی اور ہم ہال سے باہر نکل آئے۔ وہ بھر مجھ سے پاکستان کے بارے میں پوچھتا رہا، لاہور کی گلیوں اور اسلام آباد کے پہاڑوں کا ذکر ایسے کرتا رہا جیسے وہ خود وہاں رہ کر آیا ہو۔ پھر اسنے مجھ سے پوچھا. دوست! یہ سب تو ٹھیک ہے کہ تم پاکستان سے آئے ہو اور ایرانی صحافت پر تحقیق کر رہے ہو... مگر ایک بات مجھے ابھی بھی سمجھ نہیں آئی۔ تم اس دور افتادہ زاہدان کے اس چھوٹے سے، پسماندہ ہال میں کیسے پہنچ گئے؟ تہران اور اصفہان کے بڑے میڈیا ہاؤسز چھوڑ کر اس گرد آلود سرحد پر تمہیں کیا ملنے والا تھا؟' اس کے لہجے میں شک نہیں تھا، بلکہ ایک گہرا تجسس تھا ـــــ وہ تجسس جو ایک تربیت یافتہ صحافی کی پہچان ہوتا ہے۔ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا، اپنے چہرے پر وہی 'مظلوم طالب علمی' والی سادگی برقرار رکھی اور فارسی میں بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا: 'آغا رامین! آپ تو جانتے ہیں کہ صحافت کی روح کسی بڑے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں نہیں، بلکہ ان دور دراز گلیوں میں ملتی ہے جہاں سے سچ جنم لیتا ہے۔ تہران اور اصفہان تو وہ مقامات ہیں جہاں خبر "تراشی" جاتی ہے، مگر زاہدان وہ جگہ ہے جہاں خبر "پیدا" ہوتی ہے۔ میں ایرانی میڈیا کے ان اثرات پر ریسرچ کر رہا ہوں جو سرحدی علاقوں کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ جب میں نے کل صبح اخبار میں "انجمنِ فکرِ نو" اور آپ جیسے مقتدر صحافیوں کی شرکت کا اشتہار دیکھا، تو میرا دل پکار اٹھا کہ اگر میں یہاں نہ آیا، تو میری ریسرچ ادھوری رہ جائے گی۔' رامین یہ سن کر ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا، پھر اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ اور متاثر کن مسکراہٹ ابھری۔ اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ بتاؤ میرے بھائی! اس اجنبی شہر میں تمہارا کوئی ٹھکانہ ہے؟ رامین نے جب میرے ٹھکانے کے بارے میں پوچھا، تو میں نے ایک لمحے کے لیے اپنی 'مظلومیت' کو مزید گہرا کیا۔ میں نے ایک آہ بھری اور سامنے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: 'آغا! میں یہاں ایک عام سی سرائے کے چھوٹے سے کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ایک طالب علم کے پاس اتنا بجٹ کہاں کہ وہ بڑے ہوٹلوں میں قیام کر سکے۔ بس اپنا کام کر رہا ہوں اور اللہ پر بھروسہ ہے۔'

رامین کے چہرے پر ایک دم ہمدردی کی لہر دوڑی، ایسی لہر جو کسی بھی انسان کا دل پگھلا سکتی ہے۔ اس نے میرے کندھے

پر ہاتھ رکھا اور بڑے دبنگ لہجے میں فارسی میں کہا: 'ہرگز نہ! ایک پاکستانی بھائی اور صحافت کا مسافر اس گرد آلود سرائے میں رہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ آج سے تم میرے بھائی ہو اور میرے مہمان ہو۔ اصفہان میں میرا اپنا ٹھکانہ ہے، وہاں چلو۔ وہاں تمہیں وہ سکون اور وہ کتابیں ملیں گی جو تمہاری ریسرچ کی کایا پلٹ دیں گی۔' میں نے اسے انکار کرنے کی کوشش کی، جو کہ میری 'نفسیاتی چال' کا حصہ تھی، تاکہ اسے مجھ پر ذرا بھی شک نہ ہو۔ 'نہیں آغا! آپ کی بڑی مہربانی، میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔' مگر رامین کہاں ماننے والا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے میرا بازو پکڑا اور مسکراتے ہوئے بولا، 'تکلیف؟ تکلیف تو تب ہوگی جب میں ایک مخلص محقق کو اس حالت میں چھوڑ دوں گا۔ رامین کی دعوت میں ایک ایسی کشش تھی جو کسی بھی مسافر کے قدم ڈگمگا سکتی تھی، مگر میرے اندر کا صحافی ابھی شک اور یقین کی اس سرحد پر کھڑا تھا جہاں ایک غلط فیصلہ مشن کو مٹی میں ملا سکتا تھا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور ایک دھیمی مگر پر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا:

'آغا رامین! آپ کی ذرہ نوازی کا بے حد شکریہ، مگر میں ابھی ایک دو دن زاہدان میں مزید ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ میری تحقیق کے کچھ گوشے ابھی تشنہ ہیں اور یہاں کے کچھ مقامی لوگوں سے میری ملاقاتیں طے ہیں۔ آپ تشریف لے جائیں، میں انشاء اللہ کل یا پرسوں تک اپنا کام سمیٹ کر اصفہان پہنچوں گا اور آپ کو مطلع کر دوں گا۔'

رامین کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت چمکی، جیسے اسے اس 'انکار' کی توقع نہ تھی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ ایک 'مظلوم طالب علم' اتنی بڑی آفر سن کر فوراً ہامی بھر لے گا۔ مگر اس نے فوراً اپنی حیرت پر قابو پایا اور جیب سے ایک نفیس سا کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ 'ٹھیک ہے دوست! تمہارا ذوقِ تحقیق قابلِ تحسین ہے۔ یہ میرا کارڈ ہے، اس پر میرا پرسنل نمبر اور اصفہان کے دفتر کا پتہ درج ہے۔ وہاں پہنچ کر بس ایک کال کرنا، میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔' پھر رامین اور میری گفتگو اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا ہاتھ تھاما، ایک بار پھر اصفہان آنے کا پکا وعدہ لیا کل پرسوں یا ہفتے بعد جیسے ہی پہنچو، مجھے اس نمبر پر اطلاع دینا۔

تم میرے بھائی ہو، بھولنا مت۔ میں نے ایک ممنون مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا اور ہال کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہی سیکیورٹی اہلکار اب بھی وہاں موجود تھے، مگر اب ان کا رخ آنے والوں کی طرف تھا۔ باہر جانے والے ہجوم پر ان کی نظریں اتنی گہری نہیں تھیں۔ میں ہال کے بھاری دروازوں سے باہر نکلا تو زاہدان کی شام کی ہوا نے میرے جھلسے ہوئے چہرے کو چھوا۔ جب میں اپنے سستے سے مسافر خانے کے کمرے میں واپس پہنچا تو میرا وجود تھکن سے چور تھا، مگر دماغ کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ آج کا پورا دن ایک عجیب سے تضاد کا شکار رہا تھا۔ اگر میں مشن کے لحاظ سے دیکھوں تو ہال کے اندر مجھے ایسی کوئی 'ٹھوس' چیز نظر نہیں آئی تھی جسے میں دشمن کی کسی بڑی کارروائی کا ثبوت کہہ سکوں۔ اسٹیج پر ہونے والی تقریریں، لوگوں کا ہجوم، اور وہ صحافتی بحثیں —— سب کچھ اتنا نارمل اور سپاٹ تھا کہ مجھے اپنی سوچ پر شک ہونے لگا۔ کیا میں واقعی ایک وہم کا پیچھا کر رہا تھا؟ کیا یہ دشمن اتنا گہرا ہے کہ اس کے گڑھ میں پہنچ کر بھی مجھے اس کی آہٹ سنائی نہیں دی؟

ناکامی کا یہ احساس مجھے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ پورے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی میرا ہاتھ خالی تھا۔ لیکن... پھر میرے ذہن میں رامین کا چہرہ ابھرا میں نے میز پر رامین کا وہ نفیس کارڈ رکھا۔ اس پر سنہری حروف میں اصفہان کا پتہ اور اس کا عہدہ درج تھا۔
'کیا یہ واقعی ایک مخلص صحافی کی ہمدردی تھی، یا ایک شکاری کا وہ جال جس میں وہ مجھے اصفہان لے جا کر ہمیشہ کے لیے خاموش کرنا چاہتا تھا؟'میرا تین سالہ تجربہ مجھے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ رامین جیسے لوگ اتنی جلدی کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اس کا مجھے اصفہان بلانا محض ذرہ نوازی نہیں، بلکہ میری 'نگرانی'(Surveillance) کرنے کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔"پہلے تو میرے شک نے مجھے روکا، اسی لیے میں نے اسے وہاں انکار کیا تھا کہ کہیں یہ کسی جال کا پہلا پھندا نہ ہو۔ لیکن جیسے جیسے اب میں اس ملاقات کو دہراتا، رامین کا وہ تپاک، وہ بے ساختہ ہمدردی اور اس کی آنکھوں میں جھلکتی وہ مخلص چمک مجھے کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید یہ میرا وہم ہے کہ ہر شخص غدار ہے۔ رامین میں مجھے ایک ایسا بھائی نظر آنے لگا تھا جس کی تلاش میں، میں اس اجنبی زمین پر بھٹک رہا تھا۔ اس کی دعوت میں وہ خلوص تھا جو بناوٹی نہیں ہو سکتا۔ مجھے لگا کہ قدرت نے ایک کٹھن سفر کے بعد مجھے ایک ایسا ہمدرد دے دیا ہے جو میری ریسرچ کے لیے ایک فرشتہ ثابت ہو سکتا ہے۔" عشا کی اذان ہوئی تو میں نے وضو کیا اور جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ نماز کے بعد جب میں نے ہاتھ اٹھائے، تو میری دعا میں ایک عجیب سی عاجزی تھی۔
'یا اللہ! تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اگر رامین واقعی مخلص ہے، تو میرے لیے اس کے ذریعے راستے کھول دے، اور اگر اس کے پیچھے کوئی فریب ہے، تو میرے قدموں کو استقامت دے۔'نماز نے میرے اندر کے ہیجان کو سکون میں بدل دیا۔ میں نے اپنی ڈائری نکالی اور اس پورے دن کا نچوڑ لکھا۔ میرا اعتبار اب رامین پر پختہ ہو چلا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اصفہان جانا اب محض ایک ضرورت نہیں، بلکہ میرے مشن کی کلید بن چکا ہے۔ اصفہان وہ شہر تھا جہاں اس سازش کی جڑیں ہو سکتی تھیں، اور رامین وہ شخص تھا جو ان جڑوں تک میرا ہاتھ پہنچا سکتا تھا۔"میں نے رات گئے اپنا حتمی پلان ترتیب دیا۔ میں نے طے کیا کہ میں کل صبح کی پہلی بس سے اصفہان روانہ ہو جاؤں گا۔ رامین کے کارڈ کو میں نے اپنی ڈائری کے محفوظ ترین گوشے میں رکھا۔ پلان یہ تھا: صبحِ سویرے مسافر خانے کا حساب بے باق کر کے خاموشی سے نکلنا ہے۔
زاہدان کے مین بس ٹرمینل سے اصفہان کا ٹکٹ لینا ہے۔ سفر کے دوران اپنی 'مظلوم طالب علم' والی پہچان کو برقرار رکھنا ہے تاکہ کسی بھی سیکیورٹی چیکنگ پر شک نہ ہو۔
اصفہان پہنچتے ہی رامین کو مطلع کرنا ہے، مگر اس کے ٹھکانے پر جانے سے پہلے اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینا ہے کہ کوئی میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ پھر میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور وہ مختصر 'خفیہ رپورٹ' جو میں نے اب تک تیار کی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹ بند کی اور بستر پر لیٹ گیا رامین کے خلوص پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اپنے مشن کی سنگینی کو ذہن میں رکھتے ہوئے، میں ایک گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ فجر کی اذان کی آواز جب زاہدان کی ٹھنڈی ہواؤں میں گونجی، تو میں بیدار ہوا۔ وضو کے پانی نے میری رات بھر کی ادھیڑ بن کو ایک تازگی میں بدل دیا۔ نماز کے بعد میں

نے مصلّے پر بیٹھ کر کافی دیر دعا کی؛ یہ دعا اس انجان راستے کے لیے تھی جہاں میں رامین کے بھروسے پر قدم رکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا مختصر سا سامان—وہی دو جوڑے کپڑے، ڈائری—بیگ میں ٹھونسا اور کمرے کا ایک آخری جائزہ لے کر نیچے اتر آیا۔"مسافر خانے کے نگران نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا مختصر سا حساب بے باق کر کے باہر کی ٹھنڈی ہوا میں نکل آیا۔ زاہدان کی سڑکیں ابھی جاگ رہی تھیں۔ میں نے ایک آخری نظر اس کمرے پر ڈالی جہاں میں نے اپنے مشن کی پہلی کڑیاں جوڑی تھیں۔ 'خدا حافظ زاہدان،' میں نے دبی آواز میں کہا اور بس ٹرمینل کی طرف روانہ ہو گیا میں زاہدان کے مین بس ٹرمینل 'پایانہ مسافربری' پہنچا۔ یہاں کی فضا میں ڈیزل کے دھوئیں اور مسافروں کے شور کا غلبہ تھا۔ میں نے ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف قدم بڑھائے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ 'کجا؟' (کہاں جانا ہے؟) اس نے پوچھا۔ 'اصفہان، یک صندلی وی آئی پی' (اصفہان، ایک وی آئی پی سیٹ)۔ میں نے اپنے لہجے کو جتنا ممکن ہو سکا مقامی اور سادہ رکھا۔ اس نے مجھے ساڑھے سات بجے والی بس کا ٹکٹ تھما دیا۔ میں نے خاموشی سے کرایے کی رقم ادا کی اور ویٹنگ ہال میں جا بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں موجود وہ ٹکٹ محض ایک کاغذ کا ٹکڑا نہیں تھا، بلکہ اصفہان کے اس 'پریس ہاؤس' تک پہنچنے کا میرا واحد راستہ تھا۔ ساڑھے سات بجے بس نے اپنا بھاری انجن سٹارٹ کیا اور زاہدان کے گرد آلود شہر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔"بس نے جب زاہدان کی حدود سے باہر نکلنا شروع کیا، تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ابھی شہر کی حدود ختم ہی ہوئی تھیں کہ 'ایست و بازرسی' (سیکیورٹی چیک پوسٹ) آ گئی۔ دو مسلح اہلکار بس کے اندر داخل ہوئے۔ میرا سانس حلق میں اٹک گیا۔ میں نے اپنا وہی فرضی 'سٹوڈنٹ کارڈ' جیب میں تیار رکھا اور نظریں کھڑکی سے باہر جما دیں۔ اہلکار نے ہر مسافر کے چہرے اور شناخت کو چیک کیا۔ جب وہ میرے پاس پہنچا، تو اس نے صرف میرے بیگ کو ہاتھ لگایا میری تنی ہوئی حالت کو شاید سفر کی تھکن سمجھ کر آگے بڑھ گیا اور

میرا 'طالب علم' والا بہروپ یہاں بھی کام کر گیا۔ یہ سفر طویل اور اعصاب شکن تھا۔ بس ایران کے وسیع ریگستانوں، 'دشتِ لوط' کے کناروں سے گزر رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر صرف ریت اور دور کہیں سنگلاخ پہاڑ نظر آ رہے تھے دوپہر اور عصر کے اوقات میں بس مختلف 'استراحت گاہوں' (RestAreas) پر رکی۔ میں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور خود کو لوگوں کی نظروں سے بچائے رکھا۔ جیسے جیسے سورج ڈھلا اور رات کا سایہ گہرا ہوا، بس کی لائٹیں بند کر دی گئیں اور مسافر نیند کی آغوش میں چلے گئے، مگر میری آنکھیں اصفہان کے انتظار میں کھلی تھیں۔"تقریباً 16 گھنٹے کی مسلسل

مسافت کے بعد، جب بس نے اصفہان کے مین ٹرمینل 'پایانہ کاوہ' میں قدم رکھا، تو گھڑی رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔ میں جب بس سے اترا، تو اصفہان کی ہوا زاہدان کے مقابلے میں نرم اور خوشگوار تھی۔ شہر اب خاموش ہو چکا تھا، مگر یہاں کی سڑکیں اور عمارتیں ایک خاص وقار کے ساتھ کھڑی تھیں۔"شہر کی روشنیاں کسی خواب کی طرح نظر آنے لگیں۔ اصفہان—جسے 'نصفِ جہاں' کہا جاتا ہے—رات کے اس پہر بھی ایک خاموش وقار کے ساتھ بیدار تھا۔ میں نے رامین کو ابھی فون نہ کرنے کا فیصلہ کیا 16 گھنٹے کا سفر میرے جوڑوں میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اپنا بیگ کندھے پر

سنبھالا اور ٹرمینل سے باہر نکل آیا جہاں ٹیکسیوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ میں نے جان بوجھ کر ایک ادھیڑ عمر کے ٹیکسی ڈرائیور کا انتخاب کیا جس کا چہرہ کسی پرانے اصفہانی نقشے کی طرح جھرجھریوں سے بھرا تھا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے 'خیابانِ چہار باغ' کے قریب ایک پرانے سے 'مسافرخانہ' (سرائے) کے سامنے اتار دیا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو کاؤنٹر پر ایک مقامی شخص بیٹھا تھا جو نیم خوابیدہ آنکھوں سے رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ میرے اندر کا صحافی اب چوکنا ہو چکا تھا کیونکہ یہاں کا پہلا سوال ہی میری موت یا زندگی کا فیصلہ کر سکتا تھا۔'سلام آغا! کمرہ مل جائے گا؟' میں نے فارسی میں نہایت نرمی سے پوچھا۔اس نے نظریں اٹھا کر میرا جائزہ لیا اور بیزاری سے رجسٹر میری طرف سرکایا۔ 'کارتِ شناسائی (ID کارڈ) دکھاؤ۔'میرا دل ایک لمحے کو جیسے دھڑکنا بھول گیا، مگر میں نے چہرے پر وہی 'مظلوم طالب علم' والی مسکراہٹ سجائی۔اور ہوٹل آنے سے پہلے جو میں نے منصوبہ بنایا تھا اسی پر عمل کرتے ہوئے میں نے جواب دیا'آغا! میں زاہدان یونیورسٹی سے ریسرچ کے لیے آیا ہوں، میرا اپنا کارڈ اور بٹوا بس میں چوری ہو گیا تھامیں نے اپنے چہرے پر ایسی پریشانی طاری کی جیسے میں واقعی ایک لٹا ہوا مسافر ہوں

اس نے میری تنی ہوئی حالت دیکھی، پھر میری بیگ پر جمی زاہدان کی دھول کو مگر اسکے باوجود"ہوٹل کا مینیجر، جس کی آنکھوں میں نیند اور شک کی ملی جلی لہر تھی، بار بار مجھ سے شناختی کارڈ (کارتِ شناسائی) کا تقاضا کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگراس مرحلے پر میں نے اسے مطمئن نہ کیا، تو اگلی صبح میں کسی حوالات میں ہوتا۔ میں نے اپنے چہرے پر ایک تھکی ہوئی مگر پُراعتماد مسکراہٹ سجائی اور جیب سے رامین کا وہ نفیس 'کارڈ' نکالا۔'یہ کارڈ دیکھیے...' میں نے رامین کا کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ 'یہ آغا رامین ہیں، اصفہان کے مشہور پبلشنگ ہاؤس سے۔ وہ میرے قریبی دوست ہیں اور میں انھی کی دعوت پر یہاں پہنچا ہوں۔ آپ چاہیں تو ابھی اس نمبر پر کال کر کے ان سے تصدیق کر سکتے ہیں۔''''رامین کا نام سنتے ہی مینیجر کے تیور بدل گئے اصفہان جیسے شہر میں میڈیا اور پریس سے جڑے لوگوں کا ایک خاص اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ اس نے کارڈ کو غور سے دیکھا، پھر میری طرف۔'تو آپ آغا رامین کے مہمان ہیں؟' اس نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ 'جی بالکل! دراصل میں اتنی رات گئے انہیں زحمت دینا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا، اسی لیے سوچا کہ آج کی رات آپ کے پاس قیام کروں اور صبح سویرے ان کے دفتر 'نقشِ قلم' پہنچ جاؤں۔'میری اس منطقی بات نے اس کا دل جیت لیا۔ اس نے رجسٹر پر میرا فرضی نام درج کیا اور رامین کے کارڈ کا حوالہ نوٹ کر لیا۔ 'خوش آمدید بھائی! معذرت چاہتا ہوں، سیکیورٹی کے حالات ایسے ہیں کہ ہمیں پوچھ گچھ کرنی پڑتی ہے۔' اس نے مسکرا کر چابی میرے حوالے کر دی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا؛ رامین کا نام میری پہلی 'کامیاب ڈھال' ثابت ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ میں نے جوتے اتارے اور بستر پر گر گیا۔ کمرے کی کھڑکی سے اصفہان کے میناروں کا عکس نظر آ رہا تھاکمرے کی مدھم روشنی میں، میں اکیلا اپنے بستر پر اصفہان کی خاموش رات کی آہٹیں سن رہا تھا۔ ذہن میں کل کے لیے نقشہ تیار ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں صبح دس بجے کے قریب ہوٹل سے نکلوں گا— یہ وہ وقت ہے جب دفاتر میں چہل پہل شروع ہو جاتی ہے اور کسی اجنبی کا نظر آنا حیران کن نہیں ہوتا۔ میرا منصوبہ سادہ مگر محتاط تھا: میں سیدھا رامین کے پاس نہیں جاؤں

گا، بلکہ واپس ٹرمینل یا کسی ایسے ہی مصروف 'چوہراہ' (چوک) پر جاؤں گا جہاں سے اسے کال کروں گا۔ میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں ابھی ابھی بس سے اترا ہوں اور سیدھا اسی کی طرف آ رہا ہوں۔انہی سوچوں کے جال بنتے بنتے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں نے الارم لگایا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ 16 گھنٹے کا سفر اور زاہدان کی وہ اعصاب شکن یادیں خواب بن کر میرے ذہن میں لہرانے لگیں۔ فجر کی اذان کی گونج نے جب اصفہان کے در و دیوار کو چھوا، تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے وضو کیا اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی۔ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے میں نے اپنے وطن کی سلامتی اور اپنے اس 'خاموش جہاد' کی کامیابی کے لیے دعا مانگی۔ جسم اب بھی ٹوٹ رہا تھا، تھکن پور پور میں سمائی ہوئی تھی، اس لیے میں نے مصلّے سے اٹھ کر دوبارہ کمبل اوڑھ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کل کی نفسیاتی جنگ کے لیے میرے اعصاب کا پرسکون ہونا ضروری تھا۔

صبح نو بجے کے قریب جب دوبارہ آنکھ کھلی، تو سورج اصفہان کی گلیوں میں اپنی چمک بکھیر چکا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا حلیہ درست کیا، وہی سفید قمیض پہنی اور بیگ سنبھالا۔ رامین کا کارڈ میری جیب میں ایک چابی کی طرح موجود تھا۔" میں نے اپنے فون سے رامین کا وہ نمبر ڈائل کیا جو کارڈ پر درج تھا۔

تین بیلز کے بعد دوسری طرف سے ایک مانوس، بھاری اور کھنکتی ہوئی آواز آئی:

'سلام! بفرمائید؟' (سلام! فرمایئے؟)میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی کو سمیٹا اور رٹے رٹائے الفاظ بولے:

من ذیشانم، از زاهدان به اصفهان آمده‌ام

‘‘(میں ذیشان زاہدان سے اصفہان پہنچا گیا ہوں)

دوسری طرف سے ایک دم گرمجوشی بھرا قہقہہ بلند ہوا۔ 'اوہ! میرے عزیز بھائی! تم اصفہان آ گئے؟ خوش آمدید! بہت خوشی ہوئی۔ تم ابھی کہاں ہو؟ وہیں ٹھہرو،

میں خود تمہیں لینے آ رہا ہوں!'

اپنی لوکیشن بتاؤرامین کے لہجے میں ایسی اپنائیت تھی کہ ایک لمحے کو مجھے بھی لگا کہ شاید وہ میرا واقعی بھائی ہے۔"رامین کے لہجے میں وہی سحر انگیز ہمدردی تھی جو میں نے زاہدان میں دیکھی تھی۔ میں نے اسے قریبی مشہور چوک کا نام بتایا۔ پندرہ منٹ بعد ایک چمکتی ہوئی کالی گاڑی میرے سامنے آ کر رکی۔ شیشہ نیچے ہوا اوررامین کی مسکراتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ گاڑی سے اترا اور مجھے ایسے گلے لگایا جیسے ہم برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست ہوں۔'تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو مسافر،' اس نے میرا بیگ پکڑتے ہوئے کہا۔ 'آؤ! آج اصفہان کے اس نقشِ قلم پریس میں تمہیں وہ دنیا دکھاؤں گا جسکا تم نے صرف خواب دیکھا ہوگا میں گاڑی کی آرام دہ نشست پر بیٹھ گیا، مگر میرا ہاتھ اپنے بیگ پر تنی ہوئی گرفت کے ساتھ تھا۔ جب گاڑی اصفہان کی خوبصورت سڑکوں پر دوڑنے لگی، تو میں نے رامین کے چہرے کو غور سے دیکھا—— وہ مسکرا رہا تھا، اور ساتھ اصفہان کی تاریخ بتا رہا تھا،

رامین کی کالی گاڑی اصفہان کی قدیم گلیوں سے گزرتی ہوئی ایک سادہ سی رہائشی بستی میں رکی۔ یہ کوئی عالیشان محل نہیں

تھا، بلکہ ایک مڈل کلاس محلے کا روایتی ایرانی گھر تھا۔ رامین نے انجن بند کیا اور ایک لمبی سانس لی۔ 'چلو دوست! آج دفتر کی مصنوعی روشنیوں سے دور، ذرا مٹی کی خوشبو میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'

گھر کے صحن میں انار کا ایک چھوٹا سا درخت تھا اور دیواروں پر نیلی ٹائلوں کا کام اصفہانی ثقافت کی عکاسی کر رہا تھا۔ رامین کی فیملی کا ذکر مختصر تھا، اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ ایک سادہ خاندان سے ہے اور اس نے یہ مقام اپنی محنت سے پایا ہے۔ ہم صحن میں بچھی قالین پر بیٹھ گئے۔ چائے کی پیالیاں میز پر سجی تھیں، مگر ہمارے درمیان جو گفتگو شروع ہونے والی تھی، اس کی کڑواہٹ چائے سے کہیں زیادہ تھی رامین کے گھر کے صحن میں بچھے اس قالین پر بیٹھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ انار کے درخت کے پتے ہلکی ہوا سے سرسرا رہے تھے۔ رامین نے چینی کے برتن سے ایک ٹکڑا اٹھایا، اسے دانتوں تلے دبایا اور چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر میری طرف دیکھا۔ 'سچ بتاؤ میرے بھائی! زاہدان سے اصفہان تک کا یہ طویل سفر تم نے کیسے طے کیا؟ کیا تمہیں ڈر نہیں لگا؟' اس نے بڑے سادہ سے لہجے میں پوچھا، مگر اس کی آنکھوں میں ایک صحافی کی مخصوص کھوج تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اصفہان کے نیلے آسمان کو دیکھا اور مسکرا کر جواب دیا: 'آغا رامین! سچ تو یہ ہے کہ شوق کے آگے سفر کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بس میں بیٹھا تو آنکھ لگ گئی، کبھی کہیں رک کر کچھ کھا لیا، کبھی کسی مسافر سے دو جملے بول لیے۔ اصفہان کی کشش اور آپ کی دعوت کا شوق ایسا تھا کہ 16 گھنٹے یوں گزرے جیسے چند منٹ۔ ڈر کا تو وقت ہی نہیں ملا، بس ایک دھن تھی کہ منزل تک پہنچنا ہے۔' رامین میری بات سن کر ہنس پڑا اور اصفہان کی باتیں سنانے لگا۔ اس نے بتایا کہ کیسے یہ شہر 'نصفِ جہاں' کہلاتا ہے، یہاں کے پلوں کی کیا تاریخ ہے اور کیسے یہاں کی گلیوں میں علم اور فن بستا ہے۔ ہم دو مڈل کلاس لوگ تھے، جو اپنے اپنے ملکوں سے ایک ہی جیسے خواب لے کر نکلے تھے۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنے بچپن کا ذکر کیا، اپنی جدوجہد بتائی کہ کیسے ایک عام گھرانے سے نکل کر اس نے میڈیا کی اس چمکتی دنیا میں اپنی جگہ بنائی۔

چائے کا دوسرا دور شروع ہوا تو ماحول مزید بے تکلف ہو چکا تھا۔ ہم اصفہان کے موسم، یہاں کے روایتی کھانوں اور عام زندگی پر باتیں کرتے رہے۔ رامین کے لہجے میں وہ اپنائیت تھی جو کسی بھی مسافر کا ڈر ختم کر سکتی تھی۔ مجھے ایسا لگنے لگا کہ جیسے میں کسی غیر ملک میں نہیں، بلکہ اپنے ہی کسی بڑے بھائی کے گھر بیٹھا ہوں۔ ''لیکن اہستہ اہستہ باتوں کا رخ بدلا۔ رامین نے تپائی پر پڑا خالی کپ ایک طرف سرکایا اور اس کا چہرہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں وہ 'چمک' اب کسی گہرے فکر میں بدل چکی تھی۔ تمہارا یہ ذوقِ تحقیق قابلِ تحسین ہے ۔ تم پاکستان سے ریسرچ کرنے آئے ہو میرے بھائی،' اس نے دھیمی اور بھاری آواز میں کہا، 'لیکن کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم جو خبریں لکھتے ہیں، ان کے پیچھے کتنے گھروں کی راکھ چھپی ہوتی ہے؟'ہم دونوں مڈل کلاس لوگ ہیں، ہم جانتے ہیں کہ ایک عام آدمی کا گھر کیسے بنتا ہے اور کیسے اجڑتا ہے۔ لیکن کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ واشنگٹن، لندن اور تل ابیب میں بیٹھے لوگ ہمارے گھروں کی چابی کیسے حاصل کر لیتے ہیں؟' رامین نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور مجھے وہ 'ماسٹر پلان' دکھایا جو تل ابیب، پیرس اور لندن کے بند کمروں میں تیار ہوتا ہے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا: 'دیکھو میرے بھائی! یہ عالمی طاقتیں اب بم نہیں گراتیں، وہ 'ہیرو'

پیدا کرتی ہیں۔ وہ ایک عام سے نوجوان کو سوشل میڈیا کے ذریعے راتوں رات 'انقلابی' بنا دیتے ہیں۔ وہ اسے ایک ایسا 'ہیرو' بناتے ہیں جو اپنی ہی ریاست کا دشمن بن جاتا ہے
اسے یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ریاست، اپنے باپ اور اپنی تاریخ سے بڑا ہے۔'اس نے ایک گراف دکھایا جس میں یمن، شام اور اب ایران و پاکستان کے نوجوانوں کے نفسیاتی پروفائلز تھے۔ 'وہ جانتے ہیں کہ ایک 26 سالہ نوجوان کے خون میں جوش زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اسے ایسا 'بیانیہ' (Narrative) دیتے ہیں کہ وہ اپنے ہی گھر کو آگ لگانا کارنامہ سمجھنے لگتا ہے۔ باپ نصیحت کرے تو وہ اسے دشمن کا ایجنٹ سمجھتا ہے۔ بیٹا جب باپ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، تو وہ اکیلا نہیں ہوتا، اس کے پیچھے واشنگٹن اور لندن کا پورا میڈیا کھڑا ہوتا ہے جو اسے 'ہیرو' پکار رہا ہوتا ہے میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میرا 26 سالہ وجود اب ایک بھاری ذمہ داری محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا: 'آغا رامین! اگر ہم نے آج ان نوجوانوں کو نہ بتایا کہ ان کے خوابوں کا سودا کون کر رہا ہے، تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہ صرف پاکستان یا ایران کی جنگ نہیں، یہ ہماری بقا کی جنگ ہے۔'' وہیں صحن میں بیٹھ کر ہم نے اپنا 'خفیہ پلان' بنانا شروع کیا۔ رامین نے مجھے ان 'بیک ڈور' لنکس تک رسائی دینے کا وعدہ کیا جہاں سے فرانسیسی اور اسرائیلی ہینڈلرز ہدایات بھیجتے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ: ہم ان 'فیک ہیروز' کے پیچھے چھپے ڈالرز کا سراغ لگائیں گے۔ ہم اس 'میڈیا الگورتھم' کو بے نقاب کریں گے جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بناتا ہے۔
ہم ایک ایسا 'کاؤنٹر بیانیہ' تیار کریں گے جو نوجوانوں کو جذباتی نعروں کے بجائے حقیقت کی طرف لائے۔
رامین نے میرا ہاتھ تھاما: 'تمہارا جذبہ اور میرا تجربہ مل کر ان جڑوں کو کاٹ سکتا ہے جو پیرس سے یہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔' میں نے محسوس کیا کہ آج اصفہان کے اس چھوٹے سے گھر میں دو ضمیروں نے مل کر ایک ایسی شمع روشن کی ہے جس کی روشنی سرحد پار میرے پاکستان تک پہنچے گی۔ ہم نے طے کیا کہ کل سے ہم 'نقشِ قلم' کے اندر بیٹھ کر اس نظام کو اندر سے توڑنا شروع کریں گے۔'' آہستہ آہستہ شام اصفہان کے آسمان پر اتر آئی۔ ہم صحن میں بیٹھے تھے، اور دھندلی روشنی میں انار کے پتے سرسرا رہے تھے۔ رامین نے مجھے اندر لے جانے کا اشارہ کیا، اور ہم چھوٹے سے مہمانی روم/بیٹھک میں آئے، جہاں ایک پرانا قالین اور چند صوفے رکھے تھے۔
یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں چاروں طرف کتابوں کے انبار تھے اور ایک پرانی سی میز پر دو کمپیوٹر رکھے تھے۔ رامین کا کوئی اپنا عالیشان دفتر نہیں تھا، وہ ایک مقامی پبلشنگ ہاؤس میں محض ایک محنتی ملازم تھا، مگر اس کے پاس وہ 'رسائی' تھی جو بڑے بڑے ناموں کے پاس نہیں ہوتی۔
رامین نے چائے کی باقی پیالیاں ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ رکھی، اور ساتھ ہی شام کا کھانا پیش کیا: روایتی ایرانی کباب، برنج کی خوشبو، اور تازہ سبزیوں کی پلیٹیں۔ یہ ایک مڈل کلاس گھرانے کا سادہ سا دستر خوان تھا، جہاں کوئی دکھاوا نہیں تھا، بس ایک خلوص تھا جس نے میری 16 گھنٹے کی مسافت کی تھکن اتار دی۔ ہم نے کھانے کے دوران صرف جسم کو نہیں بلکہ دماغ کو بھی خوراک دی بات چیت میں ہر لفظ ایک منصوبہ بندی کا حصہ بن رہا تھا کھانے کے دوران رامین نے ایک لمحے

کے لیے لقمہ روکا اور میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ 'دوست! کل میں تمہیں اپنے ایک بہت پرانے اور بھروسے مند ساتھی سے ملواؤں گا۔ اس کا نام داریان ہے ایک نڈر رپورٹر ہے اور جس 'سچ' کی تلاش میں تم پاکستان سے یہاں آئے ہو، اس کی بہت سی کڑیاں داریان کے پاس ہیں۔ ہم تینوں مل کر اس جال کو توڑیں گے۔' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
میرے ذہن میں ایک نیا نام نقش ہو گیا: 'داریان'۔ رامین کا اس پر اتنا بھروسہ مجھے حوصلہ دے رہا تھا کہ اب ہم اکیلے نہیں ہیں۔"
کھانے کے بعد رامین نے کہا
تمہارا بستر تیار ہے میرے بھائی! آج جی بھر کر سو لو، کیونکہ کل سے ہمیں اس نیند کو حرام کرنا ہے جو غفلت کا باعث بنتی ہے،' رامین نے مسکرا کر میرا کندھا تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔"میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، اصفہان کے قدیم مینار چاندنی میں نہا رہے تھے۔ میں نے سوچا، دشمن جتنا بھی طاقتور ہو، اس کی بنیادیں 'جھوٹ' پر کھڑی ہوتی ہیں، اور سچ کی ایک چنگاری پورے جھوٹ کے محل کو خاکستر کر سکتی ہے۔ میرا وجود اب تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اصفہان کے اس سادہ سے کمرے میں پاکستان اور ایران کی سلامتی کا ایک نیا دفاعی حصار تیار ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے رب پر بھروسہ کیا، جس نے مجھے زاہدان کی دھول سے نکال کر اصفہان کے اس بیدار ضمیر تک پہنچایا تھا۔ میں نے اپنا موبائل پر الارم لگایا اور ایک ایسی نیند کی آغوش میں چلا گیا جس کی صبح ایک بہت بڑے 'میڈیا معرکے' کا آغاز کرنے والی تھی۔"اصفہان کی فضاؤں میں جب فجر کی پہلی اذان گونجی، تو اس کی مسحور کن آواز نے کمرے کی خاموشی کو ایک پاکیزہ ارتعاش بخش دیا۔ میری آنکھ کھلی تو دل کی دھڑکنیں معمول سے تیز تھیں۔ یہ محض ایک نئی صبح نہیں تھی، یہ اس معرکے کا پہلا دن تھا جس کے لیے میں نے۔ سرحدیں پار کی تھیں۔ میں نے کمبل ہٹایا اور دبے قدموں باتھ روم کی طرف بڑھا۔ وضو کے پانی نے میرے اعصاب میں ایک نئی بجلی بھر دی۔ کمرے میں واپس آیا تو دیکھا کہ رامین بھی بیدار ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے کمرے کے قالین پر ہی اپنی اپنی جائے نماز بچھائی۔ باہر اندھیرا ابھی چھٹا نہیں تھا، مگر کمرے کے اندر ایک عجیب سا نور اور سکون تھا۔ میں نے جب سجدے میں سر رکھا، تو اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں سے دعا مانگی:
'یا باری تعالیٰ! آج میں باطل کے اس گڑھ میں قدم رکھنے جا رہا ہوں جہاں قلم سے سازشیں بنتی ہیں۔ مجھے وہ بصیرت عطا کر کہ میں ان کے مکر کو پہچان سکوں اور میرے قدموں کو وہ استقامت دے کہ موت سامنے کھڑی ہو تب بھی میرا ماتھا تیرے علاوہ کسی کے سامنے نہ جھکے۔' نماز سے فارغ ہو کر میں جائے نماز پر ہی بیٹھا رہا۔ رامین بھی خاموشی سے تسبیح پڑھ رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی، مگر ہماری نظریں جب ملیں تو ایک دوسرے کو یہ پیغام دے رہی تھیں کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"سورج کی پہلی کرن نے جب کھڑکی کے پردوں کو چھوا، تو ہم کچن کی چھوٹی سی میز پر ناشتے کے لیے جمع ہوئے۔ رامین کی سادگی اس کے دسترخوان سے بھی جھلک رہی تھی۔ ایک پلیٹ میں کچھ اخروٹ، شہد اور تندور سے تازہ آیا ہوا 'نانِ بربری'۔ بھاپ اڑتی ہوئی ایرانی چائے کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

ہم نے نہایت خاموشی سے ناشتہ کیا۔ یہ وہ خاموشی تھی جو کسی بڑے طوفان سے پہلے طاری ہوتی ہے۔ رامین نے نان کا ایک ٹکڑا توڑتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا: 'خوب پیٹ بھر کر کھالو میرے بھائی! آج کے دن ہمیں شاید لنچ کا وقت بھی نہ ملے'۔

ناشتہ ختم ہوا تو رامین اٹھا اور اپنی الماری سے کچھ فائلیں نکال لائیں جو اس نے پہلے سے تیار کر رکھی تھیں۔ اس نے میرا کندھا تھپتھپایا، 'تیار ہو؟' میں نے ایک گہرا سانس لیا اور سر ہلایا۔ پھر میں نے اپنا بیگ سنبھالا رامین نے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور ہم اصفہان کی قدیم گلیوں سے ہوتے ہوئے شہر کی کشادہ سڑکوں پر نکل آئے۔ گاڑی کی کھڑکی سے باہر اصفہان کے تاریخی مینار اور فیروزی گنبد کسی خواب کی طرح نظر آ رہے تھے۔

رامین خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا، مگر اس کی ابتر نگاہیں بار بار بیک ویو مرر (Back view mirror) میں پیچھے آنے والی گاڑیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ ایک تربیت یافتہ صحافی کی احتیاط تھی جو اب میرے خون میں بھی دوڑنے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم ایک جدید مگر سادہ سی عمارت کے سامنے تھے جس پر جلی حروف میں 'نقشِ قلم' لکھا تھا۔ گیٹ پر ایک تیکھی نظروں والا سیکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ جیسے ہی گاڑی رکی، اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں روکا۔ رامین نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور بڑی مہارت سے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے فارسی میں بااعتماد لہجے میں کہا: 'سلام! یہ میرے دوست ذیشان ہیں، پاکستان سے آئے ہیں، میرے ساتھ کچھ ریسرچ ورک میں تعاون کریں گے۔' ان کا عارضی اندراج کر لیں'۔ گارڈ نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا، رامین کے بااثر لہجے اور 'سرکاری ریسرچ' کے لفظ نے اپنا کام کر دیا۔ اس نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا، بس ایک وزٹر کارڈ نکالا اور میری شرٹ پر لگا دیااندر داخل ہو کر میں نے بڑی گہرائی سے ہر چیز کا مشاہدہ کیا۔ راہداریوں میں عام سی چہل پہل تھی، کمپیوٹرز پر لوگ خبریں ٹائپ کر رہے تھے، کیمرے سیٹ ہو رہے تھے۔ رامین نے مجھے پورا پریس ہاؤس دکھایا، ایڈیٹنگ روم سے لے کر پرنٹنگ سیکشن تک، سب کچھ نارمل تھا، ہم عمارت کے نچلے حصے میں واقع ایک چھوٹے سے کیفے ٹیریا کی طرف چلے گئے۔ وہاں خوشبوؤں اور سرگوشیوں کا ایک عجیب امتزاج تھا۔ ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا تھا۔ جیسے ہی ہم قریب پہنچے، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ 'داریان' تھا۔ قد آور، وجیہہ، اور آنکھوں میں ایک ایسی ذہانت جس کے پیچھے گہرے راز چھپے تھے۔ اس کے چہرے پر وہ خاص 'رعب' تھا جو صرف ذہین ترین دماغوں کا خاصہ ہوتا ہےاس کی مسکراہٹ میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو کسی کو بھی اپنا گرویدہ بنا سکتی تھی۔

ذیشان! یہ میرا وہ خاص دوست ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا، داریان رامین نے سے اسے گلے لگایا اور میرا تعارف کرایا'داریان! یہ میرا وہ پاکستانی بھائی ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔ داریان نے میرا ہاتھ اتنی مضبوطی سے تھاما جیسے وہ مجھے یہ یقین دلا رہا ہو کہ اس جنگ میں اب میں اکیلا نہیں ہوں۔ ''خوش آمدید ذیشان اس کی آواز میں ایک خاص رعب اور اپنائیت تھی، پھر وہاں سے ہم دفتر کی طرف واپس آئے کچھ دیر وہاں مشاہدہ کرنے کے بعد دفتر کے اندر کی مصنوعی

لائٹیں اور لوگوں کی سرگوشیاں اب میرے اعصاب پر بوجھ بننے لگی تھیں۔ داریان نے رامین کی طرف دیکھا اور پھر دبی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا:
'یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں ذیشان! یہاں ہم وہ باتیں نہیں کر سکتے جو تمہارے ضمیر اور میری فکر میں مشترک ہیں۔ چلو، کسی کھلی فضا میں چلتے ہیں جہاں آسمان کے نیچے ہم اپنے ضمیروں کا بوجھ بانٹ سکیں'۔ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم پریس ہاؤس کے حبس زدہ ماحول سے نکل کر کسی کھلے پارک یا شہر کے پرسکون کیفے ٹیریا کی طرف چلیں گے۔ ہمیں ایک ایسا 'پلان' بنانا تھا جو ان عالمی طاقتوں کے بیانیے کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکے۔ میں، رامین اور داریان— ہم تینوں اس عمارت سے باہر نکل آئے، یہ جانے بغیر کہ یہ 'کھلی فضا' ہمیں سچائی کے کس ہولناک موڑ پر لے جائے گی. ہم اصفہان کے مشہور 'زاینده رود' دریا کے کنارے واقع ایک پرسکون پارک میں آ گئے۔ چاروں طرف ہریالی تھی دور کہیں بچوں کے کھیلنے کی آوازیں اور چہل قدمی کرتے ہوئے خاندانوں کا شور ایک پرسکون زندگی کی تصویر پیش کر رہا تھا، مگر ہماری بنچ پر بیٹھے تین نفوس کے درمیان ایک ایسا سکوت تھا جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتا تھا۔
ہم نے پہلے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ رامین نے اصفہان کے موسم اور یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کا ذکر چھیڑا، جبکہ داریان نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ مجھے ایران کا ذائقہ کیسا لگا۔ یہ وہ رسمی گفتگو تھی جو اجنبیوں کے درمیان برف پگھلانے کا کام کرتی ہے، مگر ہم جانتے تھے کہ یہ محض ایک 'پردہ' ہے تاکہ ارد گرد گزرنے والے لوگوں کو ہم تین عام دوست نظر آئیں۔جب چائے کے ڈسپوزل کپ خالی ہو گئے اور فضا میں تھوڑی بے تکلفی آئی، تو داریان نے اچانک اپنا لہجہ دھیما کر لیا۔ اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک تہہ شدہ فائل نکالی۔ اس نے فائل کھولی تو اس میں ایک دھندلی سی تصویر اور کچھ ٹیکنکل ڈیٹا کی شیٹس تھیں۔'ذیشان! رامین! ذرا اسے دیکھو،' داریان نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ 'اس شخص پر مجھے شدید شک ہے۔ میں یقین کے ساتھ تو ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعی کسی بڑی ایجنسی کا کارندہ ہے یا نہیں، لیکن اس کی حرکات و سکنات ایک عام رپورٹر جیسی نہیں ہیں۔'
میں نے تصویر پر نظر جمائی۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا، جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی عیاری تھی رامین نے تصویر پر جھک کر اسے غور سے دیکھا اور داریان کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا'داریان! میں اس شخص کو کئی بار نقشِ قلم کی راہداریوں میں دیکھ چکا ہوں،
یہ تو ایک عام سا صحافی ہے، اسے تو کوئی سنجیدہ بھی نہیں لیتالیکن ہاں میں نے اسے کبھی نقش قدم کے نیوز ڈیسک پر باقاعدہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ یہ کون ہے؟'داریان نے جواب دیا''وہی تو معمہ ہے رامین! یہ شخص وہاں کا رجسٹرڈ رپورٹر نہیں ہے، مگر اس کی رسائی ان فائلوں تک ہے جنہیں چھونے کی اجازت تمہیں اور مجھے بھی نہیں ہے۔'یقین سے تو میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، فی الحال یہ صرف میرا ایک گہرا شک ہے۔ اس کا نام ''رضا'' ہے اور یہ ایک مقامی اخبار ''ندائے اصفہان'' کے لیے کام کرتا ہے، مگر اس کی سرگرمیاں ایک عام رپورٹر سے بالکل مختلف ہیں۔'پھر میں نے پوچھا داریان! اگر یہ کسی اور اخبار کا رپورٹر ہے، تو آپ کو اس پر اتنا شک کیوں ہوا؟ کیا آپ نے اسے کوئی ایسی حرکت کرتے دیکھا ہے جو

ایک عام صحافی نہیں کرتا؟'پھر داریان نے جواب دیا
ذیشان! شک کی پہلی وجہ اس کی وہ مخصوص جگہیں ہیں جہاں یہ پایا جاتا ہے۔ میں نے اسے دو تین بار ان پرانے ہوٹلوں کے گرد منڈلاتے دیکھا ہے جہاں غیر ملکی وفود اور سیاح قیام کرتے ہیں۔ ایک صحافی کا وہاں جانا عجیب نہیں، مگر اس کا وہاں چوروں کی طرح چھپ کر داخل ہونا بہت کچھ ظاہر کرتا ہے۔'میں نے اسے دو تین بار ان علاقوں میں نہایت پراسرار انداز میں گھومتے دیکھا ہے جہاں عام لوگوں کا جانا مشکل ہوتا ہے۔ یہ وہاں خبریں لینے نہیں، بلکہ شاید کچھ "دینے" یا "لینے" جاتا ہے۔'رامین نے کہا تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ یہ ان غیر ملکیوں سے براہِ راست رابطے میں ہے؟ کیا تم نے اسے کسی سے ہاتھ ملاتے یا کوئی چیز لیتے دیکھا ہے؟'داریان کا جواب: 'یقینی طور پر تو ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا رامین، مگر اس کا ان مخصوص ہوٹلوں کے چکر لگانا جہاں باہر سے آئے ہوئے لوگ ٹھہرتے ہیں، بہت کچھ ظاہر کرتا ہے۔ یہ صرف ایک رپورٹر نہیں لگتا، بلکہ ایک "کڑی" لگتا ہے جو یہاں کی خبریں کہیں اور پہنچاتا ہے پھر میں نے کہا صرف ہوٹلوں کے چکر لگانے سے تو غداری ثابت نہیں ہوتی اور صرف شک کی بنیاد پر ہم کسی کے پیچھے نہیں پڑ سکتے
کیا کوئی اور ٹھوس وجہ ہے؟'
داریان کا جواب: 'ایک اور وجہ بھی ہے۔ میں نے اس کا ایک تازہ کالم پڑھا ہے جو اس نے اپنے اخبار کے لیے لکھا تھا۔ اس میں اس نے نہایت مہارت سے خطے کے حالات کا ذکر کیا ہے، اور ذیشان۔۔۔ اس نے تمہارے ملک پاکستان اور خاص طور پر بلوچستان کے بارے میں کچھ ایسے ڈھکے چھپے جملے لکھے ہیں جو کسی عام رپورٹر کی سمجھ سے باہر ہیں۔ اس کے کالم کی زبان بالکل ویسی ہی ہے جیسی سرحد پار سے آنے والے زہریلے بیانیوں کی ہوتی ہے۔'بلوچستان؟ داریان! کیا واقعی اس نے بلوچستان کی اندرونی صورتحال پر بات کی ہے؟'ہاں! اس نے اشاروں کنایوں میں وہاں ہونے والی بے چینی کو ایک ایسا رنگ دیا ہے جو آگ لگانے کے لیے کافی ہے۔اس نے لکھا ہے کہ جو آگ عراق اور شام میں لگی، اب اس کے انگارے بلوچستان تک پہنچنے والے ہیں۔'اسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی بڑے مشن کا حصہ ہے اور اس کا اگلا ہدف تمہارا ملک ہے۔بلوچستان کا نام سنتے ہی میرے جسم میں بجلی کی ایک لہر دوڑی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے عراق کے کھنڈرات، شام کے نوحے، لیبیا کی تباہی، چیچنیا کی راکھ، بوسنیا کے مظلوم اور فلسطین کے بھوکے بچوں کی تصویریں گھوم گئیں۔ میرا خون کھول اٹھا اور میں نے اسکی تصویر پر مٹھی مار کر گرجدار آواز میں کہا:'آغاداریان! انہوں نے اپنی سازشوں سے عراق کو تباہ کیا، شام کو لہو لہان کیا، لیبیا، چیچنیا، بوسنیا اور یمن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔۔۔ انہوں نے عربوں کی سلطنتیں اجاڑ دیں، لیکن یاد رکھنا! یہ پاکستان ہے۔ میں ان غداروں کو اپنے وطن کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھانے دوں گا۔ ان کی سازشوں کا راستہ ادھر اصفہان میں ہی روک دیا جائے گا۔ میرے جیتے جی کوئی میرے بلوچی بہن بھائیوں پر میلی آنکھ نہیں ڈال سکتا!'رامین اور داریان میری اس تڑپ کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ میں نے داریان کی آنکھوں میں جھانک کر کہا: داریان! ہمیں اس رضا کو ٹریک کرنا ہے۔داریان نے کہا 'یہی تو ہمارا پلان ہے ہمیں اس کا جسمانی تعاقب (Physical Shadowing) کرنا ہوگا۔ ہمیں اسے اس وقت ٹریپ کرنا ہے جب وہ ان غداروں

کے ساتھ بیٹھا ہو۔'پھر میں نے کہا
تو کیا ہم کل سے اس کا پیچھا شروع کریں گے؟ ہمیں اس کے ہر سائے پر نظر رکھنی ہو گی۔'
رامین نے کہا بالکل! ہم اصفہان کی گلیوں میں اسکا پیچھا کریں گے اس سے پہلے کہ اس کا زہریلا قلم میرے ملک یا تمہارے پاکستان کو نقصان پہنچائے۔''' پارک میں بیٹھے کر ہم نے اس عالمی بساط کے مہروں کو مات دینے کے لیے ایک پلان ترتیب دیا ہم جانتے تھے کہ ایک چھوٹی سی غلطی ہمیں سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتی ہے یا دشمن کو چوکنا کر سکتی ہے۔ داریان نے ہم دونوں کی آنکھوں میں جھانک کر حتمی ذمہ داریاں بانٹیں میرا کام سب سے کٹھن تھا مجھے اس شخص (رضا) کا جسمانی تعاقب کرنا تھا۔ وہ کب گھر سے نکلتا ہے، دفتر کب جاتا ہے کس بس یا ٹیکسی میں سوار ہوتا ہے، کس موڑ پر رک کر پیچھے دیکھتا ہے اور کس کیفے میں کتنی دیر بیٹھتا ہے—یہ سب مجھے نوٹ کرنا تھا۔ میرا مقصد اس کے روزمرہ کے معمولات (Routine) کو سمجھنا تھا تاکہ ہمیں اس کے 'محفوظ ٹھکانوں' کا پتہ چل سکے۔ رامین کا تجربہ اور اصفہان کی زبان پر عبور اسے بہترین 'انفارمر' بناتا تھا۔ اس کی ذمہ داری منصور کے پسِ منظر کی چھان بین تھی۔ اسے منصور کے دفتر جانا تھا، وہاں کے کلرکوں سے دوستی گانٹھی تھی، اس کے ساتھ کام کرنے والے رپورٹرز کے ساتھ چائے پینی تھی اور باتوں باتوں میں یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کے دوست کون ہیں، اس کی مالی حالت کیا ہے اور وہ کن کالم نگاروں سے زیادہ رابطے میں رہتا ہے۔داریان کی ذمہ داری ہم دونوں کو تحفظ اور رابطہ فراہم کرنا تھا۔ وہ ہم سے تھوڑے فاصلے پر رہے گا۔ اگر میں رضا کے پیچھے گلی میں داخل ہوتا ہوں، تو داریان گلی کے دوسرے سرے پر نظر رکھے گا تاکہ اگر کوئی 'تیسرا شخص' جو رضا کا ساتھی ہو میرا پیچھا کر رہا ہو تو وہ مجھے فوراً الرٹ کر سکے۔ وہ اصفہان کے راستوں کا ماہر تھا، اس لیے کسی بھی ہنگامی صورتحال میں ہمیں وہاں سے بحفاظت نکالنا اس کی ذمہ داری تھی۔''
پارک کی نشست ختم ہوئی تو فضا میں ایک عجیب سا تناؤ تھا۔داریان اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا جبکہ میں اور رامین خاموشی سے گاڑی کی طرف آئے۔ گھر پہنچ کر ہم نے رات کا کھانا کھایا، مگر ذہن ان تصویروں اور فائلوں میں الجھا ہوا تھا جو داریان نے دکھائی تھیں۔ ہم نے ایک بار پھر اپنے پلان کو دہرایا۔ رامین نے سونے سے پہلے کہا: 'ذیشان! یہ راستہ خطرناک ہے، یہاں ایک غلط قدم ہمیں کسی اندھی کھائی میں گرا سکتا ہے۔' میں نے صرف اتنا کہا: 'آغا! جب ضمیر جاگ جائیں تو خوف سو جایا کرتے ہیں۔'صبح ہوئی تو ہم نے جلدی ناشتہ نمٹایا۔ پلان کے مطابق رامین کو پہلے اپنے دفتر 'نقشِ قلم' جانا تھا تاکہ وہاں حاضری لگا کر وہ رضا (مشکوک رپورٹر) کے اصل ٹھکانے 'ندائے اصفہان' کی جاسوسی کر سکے۔ میں رامین کے گھر سے نکل کر سیدھا رضا کے محلے میں پہنچ گیا اور ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان کے پاس کھڑا ہو کر اخبار پڑھنے کا ناٹک کرنے لگا۔ٹھیک سوا دس بجے رضا اپنے گھر سے نکلا۔ اس نے کالے رنگ کی جیکٹ پہنی تھی اور کندھے پر ایک بوسیدہ سا بیگ لٹکا رکھا تھا۔ وہ بار بار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنے سائے پر بھی شک ہو۔ میں نے فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے اس کا پیچھا شروع کیا۔ وہ پیدل چلتا ہوا ایک بس اسٹاپ تک آیا اور وہاں سے اصفہان کے قدیم بازار کی طرف جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ میں بھی ایک عام مسافر کی طرح اسی بس کے پچھلے حصے میں جا بیٹھا۔ وہ کھڑکی سے باہر

دیکھ رہا تھا، بالکل بے نیاز، جیسے اسے خبر ہی نہ ہو کہ کوئی اس کے ضمیر کی تہوں تک پہنچنے والا ہے۔ وہ شہر کے ایک پرانے حصے میں اترا، ایک دو گلیوں میں گھوما، ایک کیفے میں چند منٹ بیٹھا، مگر وہاں اس نے کسی سے ملاقات نہیں کی۔ اس کے بعد وہ سیدھا اپنے اخبار 'ندائے اصفہان' کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے دفتر کے باہر ایک فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ میں نے گھنٹوں وہاں گزار دیے کبھی اخبار پڑھتا، کبھی موبائل دیکھنے کا ناٹک کرتا، مگر میری نظریں اس کے دفتر کے صدر دروازے پر تھیں۔ میں انتظار میں تھا کہ شاید وہ کسی 'ہینڈلر' سے ملنے نکلے یا کوئی مشکوک حرکت کرے، مگر تک وہ باہر نہیں آیا۔ شام چار بجے کے بعد جب وہ نکلا، تو تھکا ہارا لگ رہا تھا۔ میں نے رامین کو میسج کر کے بتا دیا کہ رضا اپنے دفتر سے نکل چکا ہے وہ سیدھا بس اسٹاپ پر گیا اور واپس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے رہا یہاں تک کہ وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہو کر کنڈی چڑھا چکا تھا۔""میں رات نو بجے تک منصور کے گھر کے باہر رہا۔ مجھے لگا شاید وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کسی خفیہ ملاقات کے لیے نکلے، مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ نو بجے جب گلی میں سناٹا چھا گیا، تو میں وہاں سے اٹھا اور رامین کے گھر واپس آ گیا۔گھر پہنچا تو رامین پہلے سے ہی لاؤنج میں بیٹھا میرا منتظر تھا۔ اس کے چہرے کی تھکن بتا رہی تھی کہ اس کا دن بھی کچھ خاص مختلف نہیں گزرا۔رامین نے چائے کا مگ میری طرف بڑھاتے ہوئے سر جھٹکا۔ 'ذیشان! جیسے ہی تم نے مجھے فون پر بتایا کہ رضا اپنے گھر سے نکل کر دفتر کی طرف چل پڑا ہے، میں فوراً 'ندائے اصفہان' کے دفتر پہنچ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہاں سے کچھ ٹھوس ہاتھ آ سکے، مگر دیواریں بھی گونگی نکلیں۔'میں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور پوچھا، 'تم نے وہاں کیا طریقہ اپنایا؟ کسی سے بات ہوئی؟'رامین نے ایک لمبی آہ بھری۔ 'ہاں! میں نے وہی روایتی چال چلی۔ میں نے وہاں کے ایک پرانے کلرک اور ایک چپراسی سے بات چیت شروع کی۔ میں نے ان سے بڑے سادہ لہجے میں کہا کہ میں رضا صاحب کا مداح ہوں، ان کے کالموں کی گہرائی مجھے بہت متاثر کرتی ہے اور میں صرف ایک بار ان سے ملاقات کر کے ان کے کام کو سراہنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ عموماً کس وقت مل سکتے ہیں یا ان کے قریبی احباب کون ہیں؟'رامین نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر بات جاری رکھی، 'مگر ذیشان، ان کا جواب مایوس کن تھا۔ کلرک نے بس اتنا کہا کہ وہ وقت کا پابند ہے، اپنا کام کرتا ہے اور خاموشی سے نکل جاتا ہے۔ چپراسی نے بھی بس کندھے اچکا دیے جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ جس خاص معلومات—یعنی اس کے بیرونی روابط یا اس کے "پراسرار دوستوں"—کی ہمیں تلاش تھی، ان کے بارے میں وہاں کسی کے پاس کوئی خبر نہیں تھی۔ ایسا لگتا ہے جیسے رضا نے اپنے گرد خاموشی کا ایک ایسا حصار بنا رکھا ہے جسے توڑنا آسان نہیں'۔"ہم دونوں لاؤنج میں خاموش بیٹھے تھے۔ پہلے دن کی یہ بے ثمر کوشش ہمیں یہ احساس دلا رہی تھی کہ ہمارا حریف کوئی معمولی رپورٹر نہیں بلکہ ایک تربیت یافتہ مہرہ ہے۔

پھر رامین نے مجھ سے کہا

ذیشان! یہ کام اتنا اسان نہیں یہاں ہفتوں لگ جاتے ہیں ایک چھوٹی سی کڑی ڈھونڈنے میں'۔میں نے رامین کی طرف دیکھ کر جذباتی مگر دھیمی آواز میں کہا: 'آغا! انہوں نے ان تمام ملکوں کو ایک دن میں تباہ نہیں کیا تھا، انہوں نے برسوں ان خاموش دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر سازشیں بنیں تھیں۔ہم ان کے مکر کو ایک دن میں کیسے فاش کر سکتے ہیں؟

اگر پہلے دن ہمیں کامیابی نہیں ملی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی حکمتِ عملی بدلنی ہوگی۔ دشمن جتنا محتاط ہے، ہمیں اس سے دوگنا زیادہ صبر کرنا ہوگا'۔ رات کے پچھلے پہر جب میں بستر پر لیٹا، تو اصفہان کی خاموشی مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ پہلے دن کی ناکامی نے میرے عزم کو کمزور نہیں بلکہ مزید پختہ کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ میرے وطن کی جڑوں میں زہر ڈالنے کے لیے گھات لگا کر بیٹھے ہیں، اور میں انہیں اتنی آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔"دوسرے دن کا سورج بھی پہلے دن کی طرح ڈھلا۔ میں اصفہان کی ان گلیوں کی خاک چھان کر جب رات گئے رامین کے گھر پہنچا، تو میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ رضا کی روٹین آج بھی بالکل 'نارمل' تھی۔ وہی بس کا سفر، وہی خاموشی سے دفتر جانا، اور وہی بیزاری سے گھر واپس آ جانا۔ نہ کوئی مشکوک ملاقات، نہ کوئی پراسرار فون کال۔رامین لاؤنج میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ 'ذیشان! آج دوسرے دن کی رپورٹ بھی صفر ہے۔آج کی بھاگ دوڑ کے بعد میرے ذہن میں ایک سوال بار بار اٹھ رہا ہے۔ ہم رضا کا پیچھا صرف ایک "شک" کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ داریان نے جو تصویر دکھائی اور جو باتیں کیں، کیا وہ کافی ہیں؟ کل اس کے دفتر میں کلرک اور چپراسی کے رویے سے تو ایسا ہی لگا کہ وہ ایک عام سا، خاموش رہنے والا رپورٹر ہے۔ آج میں نے دوبارہ اس کے دفتر کے قریب چکر لگایا، چپراسی سے پھر بات چیت کی، مگر وہی جواب کہ رضا ایک عام سا محنتی آدمی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ایک بے گناہ کے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں؟'

میں نے بھی تذبذب کے عالم میں جواب دیا:'آغا رامین! سچ کہوں تو یہی خیال میرے ذہن کو بھی ڈس رہا ہے۔آج جب میں اس کے پیچھے بس میں بیٹھا تھا، تو مجھے وہ ایک نہایت مجبور اور عام سا رپورٹر لگاپورا دن گزر گیا، میں نے اس کا سائے کی طرح پیچھا کیا، مگر وہ کہیں نہیں رکا، کسی سے نہیں ملا۔ بس گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔ شاید ہمارا شک غلط ہو، شاید وہ واقعی صرف ایک محنتی کالم نگار ہی ہو۔'شاید داریان سے کوئی غلطی ہوئی ہو، یا شاید ہم نے تصویر کے مہروں کو غلط پڑھ لیا ہو۔ کسی کا پیچھا کرنا اور اس کی زندگی میں جھانکنا کوئی آسان کام نہیں، اور اگر وہ واقعی بے گناہ نکلا تو ہم اپنے ضمیر کو کیا جواب دیں گے؟'رامین نے تائید میں سر ہلایا۔ 'بالکل یہاں تو سب کچھ اتنا صاف ہے کہ شک کی گنجائش ہی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ شاید ہمیں یہ مشن یہیں ختم کر دینا چاہیے اس سے پہلے کہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔'میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ کمرے میں چھائے سکوت میں مجھے پھر وہ نقشے یاد آئے جن پر عراق، شام اور لیبیا کی بربادی لکھی تھی۔ میں نے رامین کی آنکھوں میں جھانک کر جذباتی لہجے میں کہا:'آغا رامین! تمہاری بات ٹھیک ہے، شاید ہمارا شک غلط ہو، لیکن ایک لمحے کے لیے سوچو۔۔۔ اگر وہ واقعی وہی "سایہ" ہوا جس کی ہمیں تلاش ہے، اور ہم نے اسے "عام" سمجھ کر چھوڑ دیا، تو کل جب میرے بلوچستان کی مٹی پر آگ لگی ہوگی، تو کیا میں خود کو معاف کر پاؤں گا؟ عراق اور شام میں بھی دشمن ایسے ہی "عام" بن کر گلیوں میں گھومتا تھا یہاں تک کہ اس نے جڑیں کاٹ دیں۔'میرا ضمیر کہتا ہے کہ چاہے دو دن مایوسی ملی ہو، ہمیں دستبردار نہیں ہونا چاہیے

رامین نے اثبات میں سر ہلایا۔ 'تم ٹھیک کہتے ہو۔ شک کی بنیاد کمزور ہو سکتی ہے، مگر ارادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ چلو، آج کی

مایوسی کو یہیں دفن کرتے ہیں۔ کل ہم ایک نئے زاویے سے کام شروع کریں گے۔ اگر وہ گناہ گار ہے، تو وہ کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرے گا، کیونکہ مجرم کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو، اپنا نشان کہیں نہ کہیں چھوڑ ہی دیتا ہے۔'رات کے اس پہر، اصفہان کی خاموشی میں ہم نے ایک بار پھر اپنے عزم کو تازہ کیا۔ پہلے دن کچھ نہیں ملا، مگر ہم جانتے تھے کہ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کی آہٹ بھی ہو سکتی ہے یا پھر محض ایک بے ثمر تعاقب— مگر ہم ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے اگلی صبح، اصفہان کی فضاؤں میں ایک عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی میں رضا کے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک پرانی دیوار کی اوٹ میں کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا رضا صبح گھر سے نکلا تو اندازہ تھا کہ معمول کی روٹین پر جا رہا ہے لیکن اج اسکے ہاتھ میں کچھ سامان تھا دروازہ بند کیا، ایک بار گلی کے دونوں طرف دیکھا، پھر سیدھا چل پڑا۔ قدم تیز نہیں تھے، مگر رکے بھی نہیں۔

تقریباً پچاس ساٹھ قدم آگے جا کر وہ دائیں طرف مڑا اور ایک دوسرے گھر کے سامنے رک گیا۔ دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی نے کھولا اور وہ بغیر ہچکچاہٹ اندر داخل ہو گیا۔ میں سڑک کے دوسری طرف کھڑا تھا، ایسے جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ نظر مسلسل اسی دروازے پر تھی۔ جیسے ہی وہ اندر گیا، میں نے فوری پیغام داریان کو بھیجا:

رضا ایک گھر میں داخل ہو گیا ہے لوکیشن شیئر کر رہا ہوں۔"

ساتھ ہی رامین کو بھی اطلاع

دی کے وہ اپنے دفتر نقش قلم سے یہاں آئے تقریباً دس منٹ بعد دروازہ دوبارہ کھلا رضا باہر نکلا ہاتھ میں کوئی نمایاں چیز نہیں تھی،اور جو گھر سے سامان لے کر ایا وہ بھی اسکے پاس نہیں تھا وہ سیدھا مین روڈ کی طرف بڑھا۔

میں نے فاصلے سے اس کا پیچھا شروع کیا۔ نہ زیادہ قریب، نہ بہت دور۔ بس اتنا کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو۔

وہ آخر کار اس سمت مڑ گیا

جہاں بس کھڑی ہوتی ہے اور وہ معمول کے مطابق اس میں بیٹھ کر دفتر جاتا وہ بس میں سوار ہو گیا میں بھی معمول کے مطابق عام مسافروں کی طرح اس بس میں سوار ہو گیا

میں نے چلتے چلتے دوبارہ میں نے داریان اور رامین کو میسج پر اطلاع دی"دفتر کی طرف جا رہا ہے میں پیچھے ہوں

تھوڑی دیر بعد بس رضا کے دفتر کے قریب پہنچ گئی وہ اترا اور حسبِ معمول دفتر کے گیٹ کے اندر داخل ہو گیا

میں بھی بس سے اتر گیا تھا اور تقریباً دس منٹ تک بس اسٹاپ پر ہی رک کر انتظار کرنے لگا تاکہ کوئی شک نہ ہو۔

دس منٹ تک میں وہیں رہا۔ نہ فون کان سے لگایا، نہ غیر ضروری حرکت کی۔ بس کبھی سڑک کی طرف دیکھتا، کبھی گھڑی کی طرف۔اسی دوران میں نے داریان کو سگنل دیا جو پہلے ہی رضا کے گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔داریان نے ایک عام سے نوجوان کا روپ دھارا اور منصور کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک ضعیف خاتون نکلی، جن کے چہرے کی جھریاں برسوں کی تھکن بیان کر رہی تھیں۔ داریان نے نہایت ادب سے پوچھا:'اماں جی! اسلام علیکم "معاف کیجیے گا، میں رضا کا دوست ہوں۔ اس کا گھر پوچھنا تھا، وہ کدھر ملے گا؟" خاتون نے غور سے اسے دیکھا، پھر بولیں:

"بیٹا، وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی نکلا ہے۔ اب تو گھر نہیں ہوگا۔ دفتر جاتا ہے وہ۔"
اس وقت گھر نہیں ہوگا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟داریان نے بڑی مہارت سے بات بنائی: 'جی اماں، میں ذرا دور رہتا ہوں، بس ان کا دوست تھا تو ملنے آگیا۔ چلو کوئی بات نہیں، میں دفتر چلا جاتا ہوں، ویسے وہ یہاں کیوں ایا سب خیریت ہے۔
اماں جی نے معصومیت سے کہا: 'نہیں بیٹا، سب خیریت ہے
ایک پارسل بھیجنا تھا تہران۔ میرا بیٹا وہاں رہتا ہے، اسی کے لیے تھا۔ بس وہی دے کر گیا ہے۔"داریان نے جب یہ سنا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل کر فوراً مجھے کال کی اور یہ ساری ڈیٹیل بتائی۔
'ذیشان! پارسل تہران جارہا ہے اور اس کا تعلق رضا کے دوست سے بتایا جارہا ہے، لیکن ہمیں اس پارسل کی حقیقت جاننی ہوگی۔'"یہ اطلاع ملتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔داریان! تم وہیں رہو۔ اس خاتون اور اس مقام سے نظر مت ہٹانا۔ میں فوراً تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ ہم مل کر کچھ فیصلہ کرتے ہیں اکیلے کوئی قدم نہ اٹھانامیں نے فوراً سڑک پر کھڑی ایک ٹیکسی روکی ڈرائیور کو مختصر پتہ بتایا۔راستے بھر ذہن میں صرف ایک بات چل رہی تھی — اگر پارسل واقعی تہران بھیجا جارہا ہے تو یا تو ابھی ہی موومنٹ ہوگی یا شام تک۔
تقریباً دس منٹ بعد میں وہاں‌ت پہنچ گیا۔ دریان پہلے سے ایک دکان کے سامنے کھڑا تھا،جیسے سگریٹ خریدنے آیا ہو۔ تھوڑی دیر میں رامین بھی دوسری سمت سے آ گیا۔ہم تینوں ایک ساتھ نہیں کھڑے ہوئے۔ پہلے الگ الگ حالات دیکھے۔ گلی پرسکون تھی۔ دروازہ بند تھا۔ کوئی غیر معمولی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی چند منٹ بعد ہم ایک کونے میں جا کر ملے جہاں سے گھر صاف دکھائی دیتا تھا مگر ہم نمایاں نہیں تھے۔ہم نے وہاں کھڑے ہو کر لمحوں میں ایک ہنگامی پلان ترتیب دیا۔ ہم جانتے تھے کہ اگر یہ پارسل ایک بار اصفہان سے نکل گیا، تو اس کا سراغ لگانا ناممکن ہو جائے گا۔میں نے سب سے پہلے جلدی میں فیصلہ کرنے کے بجائے صورتِ حال صاف کی۔"دیکھو، دو راستے ہیں۔پہلا میں یارامین، ہم میں سے کوئی ایک کوریئر والا (Courier Man) بن کر اس خاتون کے پاس جائے اور وہ پارسل وصول کر لے؟ ہم کہہ دیں گے کہ ہمیں رضا نے بھیجا ہے تاکہ یہ تہران روانہ کیا جا سکے۔'رامین نے ایک لمحے کے لیے اس پر غور کیا، مگر پھر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ 'ذیشان! یہ بہت بڑا رسک ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ رضا نے اس خاتون کو کیا نشانیاں بتائی ہیں۔ کوریئر والا کون ہوگا؟ اس کا حلیہ کیا ہوگا؟ وہ اکیلا ہوگا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا؟ اگر ہم وہاں گئے اور اس خاتون کو ذرا سا بھی شک ہو گیا، تو وہ فوراًرضا کو فون کر دے گی اور ہم رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں گے۔'داریان نے بھی رامین کی تائید کی۔ 'اور اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر ہم نے پارسل لے بھی لیا، اور اس کے پانچ منٹ بعد وہ اصل بندہ آ گیا جس نے وہ پارسل لینا تھا، تو وہ خاتون اسے بتا دے گی کہ کوئی ابھی پارسل لے کر گیا ہے۔ وہ لوگ فوراًالرٹ ہو جائیں گے اور ہمارا پورا مشن، ہماری شناخت اور ہماری جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ یہ مچھلی پکڑنے کے بجائے خود جال میں پھنسنے والی بات ہے پھر میں نے کہا دوسرا راستہ یہ ہے کہ انتظار کریں کہ اصل موومنٹ کیا ہوتی ہے پارسل لینے کے

لیے کون سا 'تیسرا' شخص نمودار ہوتا ہے۔
کس وقت آتا ہے۔ کیا طریقہ ہوتا ہے۔"ہم نے وہیں کھڑے کھڑے مختصر سا دوسرے پلان پر عملی خاکہ بنایا زمہ داریاں تقسیم کیں رامین تھوڑا فاصلے پر گاڑی کے ساتھ تیار رہے گاتاکہ اگر وہ پارسل کسی تیز رفتار سواری میں منتقل ہو، توگ ہم تعاقب کر سکیں۔ میری اور داریان کی ذمہ داری اس پارسل کو جسمانی طور پر حاصل کرنا تھی، چاہے اس کے لیے ہمیں کوئی بھی خطرہ کیوں نہ مول لینا پڑے۔رامین نے آخر میں کہا،"ابھی کوئی حرکت نہیں۔ صرف مشاہدہ
ہم تینوں الگ الگ سمتوں میں بکھر گئے — مگر نظر ایک ہی دروازے پر تھی۔ تقریباً پینتالیس منٹ گزر چکے تھے۔ گلی میں معمول کی آمدورفت تھی۔ ہم ابھی اپنی پوزیشن پر تھے ایک سادہ سی بائک گلی میں داخل ہوئی اور سیدھا اسی دروازے کے سامنے رکی یہ کوئی کوریئر والا نہیں تھا۔ نہ یونیفارم، نہ کمپنی کی گاڑی، نہ رسید کا بیگ ایک عام سا آدمی تھا۔وہ بائک سے اترا، ہیلمٹ اتاراسادہ کپڑے، ہاتھ میں موبائل، جیسے کسی سے لوکیشن کنفرم کر رہا ہو۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے وہی بوڑھی خاتون نکلیں۔ مختصر سی بات ہوئی — آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی، مگر انداز سے لگ رہا تھا جیسے پہلے سے طے شدہ ہو
پھر وہ گھر کے اندر چلا گیا۔
ہم تینوں اپنی اپنی جگہ پر ساکت کھڑے تھے۔گھڑی کی سوئی جیسے بھاری ہو گئی تھی۔ایک منٹ۔دو منٹ۔پانچ منٹ۔کوئی شور نہیں۔کوئی تیزی نہیں۔بس اندر خاموشی پانچ منٹ خاموشی کے بعد وہ دوبارہ باہر نکلا، اور اس کے ہاتھ میں وہ سامان تھا جو ہم دیکھنے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ اصفہان کی اس تنگ اور خاموش گلی میں، جہاں دیواروں کے سائے بھی پراسرار لگ رہے تھے، ہم نے غداری کے اس پارسل کو روکنے کے لیے اپنا سب سے خطرناک داؤ کھیلا۔ جیسے ہی اس شخص نے برقع پوش خاتون کو الوداع کہا اور خاتون نے اطمینان سے بھاری لکڑی کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھائی، ہماری رگوں میں دوڑتے لہو کی رفتار تیز ہو گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ وہ شخص ابھی مڑ کر اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ ہم کسی شکاری کی طرح اس پر جھپٹے۔اس سے پہلے کہ وہ شخص پیچھے مڑ کر دیکھتا
شور مچاتا یا کوئی مزاحمت کرتا، داریان نے پیچھے سے اس کے گلے میں اپنا بازو ڈال کر اسے 'سلیپر ہولڈ' (Sleeper Hold)
میں جکڑ لیا داریان کے آہنی بازوؤں کی گرفت اس کے سانس کی نالی پر کسی شکنجے کی طرح کس چکی تھی۔اس نے ہوا میں ہاتھ مارے مگرداریان کے مضبوط ہاتھوں کا ایک جھٹکا ہی کافی تھا،
اس کے حلق سے چیخ تو کیا، ایک سسکی بھی نہ نکل سکی اور وہ چند ہی سیکنڈوں میں بے ہوش ہو کر دریان کے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے لپک کر اس کے ہاتھ سے وہ پارسل چھینا اور دریان نے اسے وہیں دیوار کے ساتھ سہارا دے کر لٹا دیا، جیسے وہ کوئی نشئی یا تھکا ہوا مسافر سو رہا ہو۔ ہم گلی کے موڑ کی طرف دوڑ پڑے۔ ہم نے جان بوجھ کر گاڑی اس گلی میں کھڑی نہیں کی تھی تاکہ کوئی نمبر پلیٹ یا گاڑی کا حلیہ نوٹ نہ کر سکے۔ رامین تھوڑی دور مین روڈ پر

گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیے، ایک ہاتھ اسٹیرنگ اور دوسرا گیئر پر رکھے، عقاب کی طرح ہماری راہ تک رہا تھا۔ ہم ہانپتے ہوئے گاڑی کے قریب پہنچے، پچھلا دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ گاڑی کے اندر خاموشی تھی، صرف ہماری سانسوں کے پھولنے کی آوازیں آ رہی تھیں رامین نے کلچ چھوڑا اور گاڑی اصفہان کی ٹریفک میں گم ہو گئی۔ اس شخص کو جب ہوش آئے گا، اسے یہی لگے گا کہ شاید اسے اچانک چکر آ گیا تھا، اسے خبر بھی نہیں ہو گی کہ اس کے ہاتھ سے وہ قیمتی متاع غائب ہو چکی ہے جس کی قیمت وہ چکانے جا رہا تھا۔ ہم اصفہان کے اس ہنگامے سے دور، شہر کے مضافات میں واقع ایک قدیم اور اجاڑ "باغِ فین" کے ایک ویران کونے میں آ گئے، جہاں پرانے درختوں کے سائے اتنے گھرے تھے کہ سورج کی روشنی بھی اندر آنے سے کتراتی تھی۔ ہم ایک پتھریلے بنچ پر بیٹھ گئے۔ رامین کے ہاتھ تھوڑا لرز رہے تھے، مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سختی تھی۔ اس نے وہ پارسل نکالا جو ہم نے ابھی اس سوار سے چھینا تھا۔ یہ ایک عام سا گتے کا ڈبہ تھا جس پر اخبار لپٹا ہوا تھا، مگر اس کا وزن اور اس کی اہمیت کسی بم سے کم نہیں تھی۔ رامین نے اخبار کی تہیں ہٹائیں تو اندر سے کوئی خط یا رسید نہیں نکلی، بلکہ روئی اور مخمل کے ٹکڑوں میں لپٹا ہوا کچھ ایسا سامان برآمد ہوا جو اصفہان اور تہران کے امن کو تباہ کرنے کا مکمل نسخہ تھا۔

آئی ایم ای آئی (IMEI) کلوننگ ڈیوائس یہ ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک سیاہ آلہ تھا جس پر چھوٹے چھوٹے سرکٹس بنے ہوئے تھے۔ داریان نے اسے دیکھتے ہی دانت پیسے، 'ذیشان! یہ وہ الہ ہے جسے کسی بھی انٹرنیٹ کے ذریعے نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ یہ ڈیوائس کسی بھی عام موبائل کا شناختی نمبر چوری کر کے اسے کسی دوسرے بندے کے نام پر استعمال کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ ڈیوائس اس لیے بھیجی جا رہی ہو گی تا کہ جب وہ احتجاج کے دوران رابطے کریں، تو ایرانی سیکیورٹی اداروں کو پتہ ہی نہ چلے کہ اصل فون کس کا ہے'۔ ماچس کی ڈبیا نما اس کلوننگ آلے کو نکالنے کے بعد، رامین نے جب پارسل کے نچلے حصے سے روئی ہٹائی، تو وہاں چمکتے ہوئے دھاتی ٹکڑوں کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ تقریباً 15 سے 20 چھوٹے بیجز (Badges) تھے، جنہیں دیکھ کر ہم تینوں ایک لمحے کے لیے گنگ رہ گئے۔

ان بیجز پر بنے نشانات انتہائی عجیب اور پُراسرار تھے۔ وہ کسی عام تنظیم یا کسی مقامی کلب کے لوگو (Logo) نہیں تھے۔ ہر بیج پر 'ایک نیلا تکون (Triangle) تھا جس کے عین وسط میں ایک جلی ہوئی شمع اور اس کے گرد ایک زنجیر' بنی ہوئی تھی۔ یہ نشان اصفہان کی کسی گلی یا ایران کے کسی سیاسی حلقے میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

میں نے ایک بیج ہاتھ میں لیا، اس کی ٹھنڈک میری انگلیوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ 'یہ کیا ہے داریان؟ یہ نشان کس چیز کی نمائندگی کرتا ہے؟' میرا سوال ہوا میں معلق تھا۔"

داریان نے جواب دینے کے بجائے مجھ سے وہ بیج لیا اور اپنے بیگ سے ایک تیز روشنی والا چھوٹا لیمپ نکالا۔ اس نے بیج کو الٹا کیا اور اس کے کناروں پر لگی باریک خوردبینی مہر
(Micro-Stamp) کو دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے ہاتھ رک گئے اور اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا داریان لرزتی ہوئی آواز میں بولا: 'ذیشان! یہ نشان میں نے پہلے دیکھ رکھا ہے پچھلے سال جب میں دفاعی تجزیہ نگاری کے لیے ایک بین

الاقوامی سیمینار میں گیا تھا، تو وہاں ایک خفیہ بریفنگ میں ہمیں ان "سلیپر سیلز" (Sleeper Cells) کے بارے میں بتایا گیا تھا جنہیں اسرائیل تل ابیب (Tel Aviv) کی ایجنسیاں پوری دنیا میں آپریٹ کرتی ہیں۔ یہ "نیلا تکون اور جلی ہوئی شمع" ان کا وہ مخصوص کوڈ ہے جو صرف اس وقت ظاہر کیا جاتا ہے جب کسی ملک کے اندر بغاوت یا کسی بڑے 'آپریشن' کا آغاز کرنا ہو'۔ "داریان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی تپش تھی۔ اس نے بیج کی پشت پر موجود ایک باریک نمبر کی طرف اشارہ کیا: 'دیکھو ذیشان اور رامین! یہ نمبر 'B-72' ہے۔ یہ وہ مخصوص بیچ (Batch) ہے جو براہِ راست انٹیلی جنس نیٹ ورکس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ بیجز اصفہان کی کسی دکان یا کسی مقامی فیکٹری میں نہیں بن سکتے۔ یہ خالصتاً اسرائیلی ڈیزائن ہیں جو ان تخریب کاروں کو دیے جاتے ہیں جن کا مقصد سڑکوں پر ہنگامے کرنا اور حساس عمارتوں کو نشانہ بنانا ہوتا ہے۔ یہ بیج پہننے والا شخص دراصل یہ اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ وہ تل ابیب کے اشارے پر اپنے ہی ملک میں آگ لگانے کے لیے تیار ہے'۔ داریان کا لہجہ مزید سخت ہو گیا: 'مجھے اب سمجھ آئی کہ رضا کے پاس ان بیجز کا کیا کام تھا۔ یہ 15 سے 20 بیجز ان 20 چنیدہ غداروں کے لیے ہیں جو اصفہان کی پرسکون زندگی کو کسی غیر ملکی ایجنڈے کی بھینٹ چڑھانے والے تھے

"شمع" اصفہان کو جلانے کے لیے ہے اور یہ "زنجیر" اس ملک کے امن کو قید کرنے کے لیے ہے

باغِ فین کے اس پراسرار سناٹے میں، جب رامین نے اس چھوٹے سے گتے کے ڈبے کی آخری تہہ سے وہ کالی یو ایس بی (USB) نکالی، تو فضا میں موجود تناؤ مزید گہرا ہو گیا۔

رامین نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور نہایت احتیاط سے وہ یو ایس بی پورٹ میں لگائی۔ جیسے ہی اسکرین روشن ہوئی اور فائلز سامنے آئیں سب سے پہلے فولڈر میں اصفہان اور تہران کے ان حالیہ مظاہروں کی ایچ ڈی ویڈیوز تھیں جو ابھی تک پبلک نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں مظاہرین کو مخصوص 'اسٹریٹجک' مقامات پر پولیس کے ساتھ تصادم کے لیے اکسایا جا رہا تھا۔ کچھ ویڈیوز ایسی تھیں جن میں چہرے چھپائے ہوئے لوگ پیٹرول بم بنانے اور سیکیورٹی حصار توڑنے کی تربیت دے رہے تھے۔ اگلا فولڈر کھولتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس میں اصفہان کے ان حساس سرکاری مقامات کی تصاویر تھیں جہاں عام بندہ کیمرہ لے جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ تصاویر سیٹلائٹ کی نہیں تھیں، بلکہ کسی نے نہایت قریب سے، شاید اپنے 'رپورٹر کارڈ' کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ممنوعہ حدود کے اندر سے لی تھیں۔ ان تصاویر میں اصفہان کے مرکزی پاور گرڈ اور واٹر سپلائی سسٹم کے 'اینٹری پوائنٹس' کو سرخ نشانات سے واضح کیا گیا تھا۔ سب سے اہم وہ آڈیو کلپس اور تصاویر تھیں جن میں رضا کو چند غیر ملکیوں کے ساتھ ایک گمنام فارم ہاؤس میں میٹنگ کرتے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے انہیں اصفہان کے 'کمزور پوائنٹس' کی تفصیلات دے رہا تھا تاکہ وہ اسے اپنے 'سائبر نیٹ ورک' کے ذریعے استعمال کر سکیں۔ داریان نے جب یہ سب دیکھا تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ 'ذیشان! یہ ڈیٹا آن لائن اس لیے نہیں بھیجا گیا کیونکہ ایران کے سائبر سیکیورٹی فلٹرز اتنی بھاری اور مشکوک فائلز کو سیکنڈوں میں ٹریس کر لیتے، ان کا سائز اتنا بڑا تھا کہ سائبر سیکیورٹی کے فلٹرز انہیں فوراً پکڑ لیتے۔ اسی لیے انہوں نے اسے اس یو ایس بی میں محفوظ کر کے 'فزیکل' طریقے

سے منتقل کرنے کا خطرہ مول لیا'۔''ہم نے وہ تمام ڈیٹا کاپی کیا اور یو ایس بی سنبھال لی۔
پارک کے اس سنسنی خیز انکشاف کے بعد ہم تینوں خاموشی سے رامین کے گھر آ گئے۔رامین کے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہم تینوں—میں، رامین اور داریان—ایک گول میز کے گرد جمع تھے۔ میز پر وہی خفیہ بیجز، یو ایس بی اور IMEI ڈیوائس پڑی تھی جو ہم نے اس شخص سے چھینی تھی۔ داریان نے کھڑکی کے پردے برابر کیے اور دبی آواز میں بولا: 'ذیشان! رضا اس وقت ایک زخمی بھیڑیے کی طرح ہو گا جس کا شکار چھین لیا گیا ہو۔ وہ خوفزدہ بھی ہو گا اور تہران والے آقاؤں کو جواب دینے کے لیے بے چین بھی۔ ہمیں اسی بے چینی کا فائدہ اٹھانا ہے'۔ہم نے وہاں بیٹھ کر اگلے چوبیس گھنٹوں کا پلان ترتیب دیا ہم تینوں نے ذمہ داریاں بانٹیں داریان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ صبح سویرے، سورج نکلنے سے پہلے ہی رضا کے گھر کے باہر پوزیشن سنبھال لے گا۔ اس کا کام یہ دیکھنا ہے کہ رضا کے گھر کوئی مشکوک ملاقاتی تو نہیں آتا، یا وہ پارسل کھونے کے بعد کسی سے ہنگامی رابطہ تو نہیں کر رہا۔ جب رضا اپنے گھر سے نکل کر اپنے دفتر 'ندائے اصفہان' کی عمارت میں داخل ہو جائے گا، تو داریان ہمیں 'سگنل' دے گا۔داریان کی کنفرمیشن ملتے ہی، میں اور رامین ایک باقاعدہ 'پروفیشنل وفد' کی صورت میں اس کے دفتر پہنچیں گے۔ رامین چونکہ خود اصفہان کے صحافتی حلقوں کا ایک معتبر نام ہے اور 'نقشِ قلم' میں اہم عہدے پر فائز ہے، اس لیے وہی میرا 'تعارف' کروائے گا۔میں ایک پاکستانی ریسرچر بن کر اس سے ملوں گا۔ میری فارسی اتنی اچھی نہیں تھی، اس لیےرامین میرا ترجمان (Translator) بنے گا۔ میں اسے یہ تاثر دوں گا کہ میں اس کے کالموں کا مداح ہوں اور اسے ایک 'بڑی انٹرنیشنل کانفرنس'کا جھانسا دے کر شام کے کھانے کی دعوت دوں گارامین کا میرے ساتھ ہونا اس لیے بھی ضروری تھا کہ رضا کو شک نہ ہو۔ وہ سمجھے گا کہ رامین (جو خود ایک معروف ادارے 'نقشِ قلم' میں ہے) ایک غیر ملکی مہمان کو لے کر اس کے پاس 'سیر کروانے' یا 'معلومات لینے' آیا ہے۔ اس طرح اسے یہ شک بالکل نہیں ہو گا کہ گزشتہ روز جو پارسل اس سے چھینا گیا، اس کے پیچھے ہم ہو سکتے ہیں۔''رامین نے مسکرا کر کہا: 'ذیشان! رضا کو غیر ملکیوں سے ملنے اور خود کو ''بڑا تجزیہ نگار'' ثابت کرنے کا بہت شوق ہے۔ جب وہ دیکھے گا کہ ایک پاکستانی ریسرچر اس کے کالموں کا حوالہ دے رہا ہے، تو وہ اپنی ایگو (Ego) میں آ جائے گا اور وہیں وہ ہمارے جال میں پھنس جائے گا'۔
منصوبہ بندی مکمل ہوئی تو رات کافی ہو گئی ۔ داریان نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہوا تاکہ علی الصبح ہی رضا کے گھر کے باہر اپنی پوزیشن سنبھال سکے۔ میں اور رامین بھی اپنے بستروں پر لیٹ گئے، مگر ضمیر کی بے چینی نیند کی دشمن تھی۔ میرے ذہن میں بار بار وہی تل ابیب کے بیجز گھوم رہے تھے
انہی خیالات میں میں نیند کی اغوش میں چلا گیااصفہان کے قدیم میناروں سے جب فجر کی اذان کی روح پرور گونج ابھری، تو فضا میں ایک عجیب سا سکون چھا گیا۔ میں نے اور رامین نے اٹھ کر وضو کیا اور بارگاہِ الٰہی میں سر بسجود ہو گئے۔ نماز کے بعد ہم نے جلدی سے ناشتہ کیا اور اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنا وہ مخصوص سوٹ پہنا جو مجھے ایک سنجیدہ 'پاکستانی ریسرچ اسکالر' دکھا رہا تھا، جبکہ رامین نے اپنی پیشہ ورانہ فائلیں درست کیں تاکہ منصور رضا کو ذرہ برابر

بھی شک نہ ہو۔"ہم ابھی چائے کا آخری گھونٹ بھر ہی رہے تھے کہ رامین کے فون پر ایک مختصر سا میسج چمکا یہ داریان کا کوڈ ورڈ تھا: 'پرندہ گھونسلے سے نکل کر اڑان بھر چکا ہے'۔ تھوڑی دیر بعد داریان کی دوبارہ کال آئی، اس کی آواز میں دبی ہوئی سنسنی تھی: 'ذیشان! رضا اپنے دفتر "ندائے اصفہان" کی عمارت میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا ہے اور وہ بار بار بے چینی سے اپنے پیچھے دیکھ رہا ہے۔ وہ کل والے واقعے (پارسل چھیننے) سے بری طرح ہلا ہوا ہے، یہی وقت ہے اس کے اعصاب پر وار کرنے کا۔'میں نے رامین کی طرف دیکھا اور سر ہلایا: 'آغا! اب بساط بچھانے کا وقت آگیا ہے۔' ہم نے اپنی گاڑی نکالی اور اصفہان کی مصروف شاہراہوں کو چیرتے ہوئے 'ندائے اصفہان' کے دفتر کی جانب بڑھ گئے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا، مگر ہاتھ چٹان کی طرح مضبوط تھے دفتر کے استقبالیہ پر پہنچ کر رامین نے نہایت اعتماد سے اپنا کارڈ آگے بڑھایا۔ رامین کا نام اور اس کے ادارے 'نقشِ قلم' کی ساکھ نے جادو کا کام کیا۔ چند ہی منٹ میں ہمیں رضا کے کیبن کی طرف لے جایا گیا۔ کیبن کا دروازہ کھلا تو سامنے رضا اپنی میز پر بکھرے کاغذات کے درمیان بیٹھا تھا، اس کے چہرے کی زردی بتا رہی تھی کہ اس کی رات بھی جاگ کر گزری ہے۔ رامین نے ایک دوستانہ قہقہے کے ساتھ خاموشی توڑی: 'سلام آغا رضا! کیسے ہیں آپ؟ معذرت کہ بغیر بتائے آگئے، مگر میں اپنے ایک بہت ہی خاص دوست، ذیشان صاحب کو آپ سے ملوانے لایا ہوں، یہ آپ کے کالموں کے بہت بڑے مداح ہیں!'

یہ پاکستان سے ائے ہیں ریسرچ کیلئے رضا کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت اور خوف لہرایا، مگر 'پاکستانی ریسرچر' کا سن کر اس کی صحافیانہ ایگو (Ego) جاگ اٹھی۔"رضا نے مصافحہ کیا اور ہمیں سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے چہرے کی زردی اس کے اندرونی خوف کو بیان کر رہی تھی، مگر وہ اسے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں گفتگو کا آغاز کیا: 'آغا رضا! سلام۔۔۔ خوش بختم از ملاقاتِ شما
(آپ سے مل کر خوشی ہوئی)۔

من ذیشان استم۔۔۔ از پاکستان (میں ذیشان ہوں، پاکستان سے)۔'منصور رضا کے لبوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ آئی۔ اس نے جواب دیا: 'خوش آمدید آغا ذیشان! آپ جیسے محقق کا یہاں آنا ہمارے لیے اعزاز ہے۔'میری فارسی کی محدود حد دیکھ کر رامین فوراً پل کا کردار ادا کرنے لگا۔ اس نے بڑی مہارت سے میری بات کو پھیلا کر فارسی میں منصور کو سمجھایا: 'رضا صاحب! ذیشان صاحب دراصل خطے کی سیکیورٹی اور میڈیا کے اثرات پر ایک بہت بڑی انٹرنیشنل کانفرنس کے لیے ڈیٹا جمع کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اصفہان میں آپ سے بہتر تجزیہ نگار کوئی نہیں، جو زمینی حقائق کو اتنی گہرائی سے سمجھتا ہو۔'

رضا کی آنکھوں میں چمک آئی۔ اس کی 'انا' (Ego) کو ٹھیک نشانے پر ٹھیس لگی تھی۔ 'بے شک، بے شک! میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ وہ لکھوں جو عام آنکھ نہیں دیکھ پاتی،' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ تھوڑی دیر میں دفتر کا ملازم چائے کی پیالیاں میز پر رکھ گیا۔ چائے کی بھاپ فضا میں بلند ہو رہی تھی، مگر کمرے کا درجہ حرارت میرے لیے ذرا مختلف تھا۔ میں نے منصور کی میز پر بکھرے کاغذات پر ایک سرسری نظر ڈالی اور رامین کے ذریعے ایک گہرا سوال داغا: رضا

صاحب! آپ نے حال ہی میں اصفہان کے دفاعی ڈھانچے اور سیکیورٹی چیلنجز پر جو اشارے دیے ہیں، وہ بہت کمال کے ہیں۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ اصفہان جیسے پرامن شہر کو اندرونی طور پر مفلوج کرنا ممکن ہے؟'رضا چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے رک گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی ایک باریک بوند چمکی۔ 'دیکھیے ذیشان صاحب! دشمن ہمیشہ تاک میں رہتا ہے۔ ہمیں چوکنا رہنا پڑتا ہے،'اس نے گول مول جواب دیا۔ رامین نے ہنستے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپایا: 'رضا صاحب! اسی لیے تو ہم آپ کو زحمت دے رہے ہیں۔ آج شام ہم نے ایک خصوصی ڈنر (کھانے) کا اہتمام کیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہاں تشریف لائیں تاکہ ہم تفصیل سے بات کر سکیں جب رامین نے اسے شام کے کھانے کی دعوت دی، تو رضا کے چہرے پر ایک جھجک سی ابھری۔ اس نے اپنی میز پر پڑے ایک خالی کاغذ کو بے مقصد گھمایا اور دبی آواز میں بولا:'آغا رامین! معاف کیجیے گا، شام کو میرے کچھ اہم کام ہیں اور دفتر کی کچھ فائلیں بھی ابھی ادھوری ہیں۔ میرے لیے آج شام آنا ذرا مشکل ہو جائے گا' میں نے بھانپ لیا کہ وہ پارسل کھونے کے بعد کسی انجانے خوف کا شکار ہے اور وہ کسی سے ملنے سے کترا رہا ہے۔ میں نے فوراً اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی اور پُراعتماد لہجے کا سہارا لیا اور کہا آغا رضا! مہربانی فرما کر انکار مت کیجیے۔ دراصل میں بہت کم وقت کے لیے اصفہان آیا ہوں اور کل صبح سویرے مجھے یہاں سے ''تبریز'' کے لیے نکلنا ہے۔ میرے پاس صرف آج کی یہ ایک شام ہے جس میں میں آپ جیسے تجربہ کار صحافی سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کا نہ آنا میری اس تحقیق کے لیے بہت بڑا نقصان ہوگا'۔رامین نے بھی موقع پا کر تائید کی: 'رضا صاحب! ذیشان صاحب خاص طور پر آپ کے کالموں کا حوالہ اپنی ریسرچ میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ کل تبریز چلے گئے، تو یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا'۔رضا نے تبریز کا نام سنا تو ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ شاید اسے لگا کہ یہ 'پاکستانی ریسرچر' اسے کوئی ایسا بین الاقوامی پلیٹ فارم دے سکتا ہے جو اسے اس موجودہ بحران (پارسل کی گمشدگی) سے نکال لے۔

اس نے اپنی عینک درست کی، ایک گہرا سانس لیا اور بالآخر سر ہلا دیا:'ٹھیک ہے آغا ذیشان! آپ کی محبت کا شکریہ۔ میں شام کو آ جاؤں گا'۔''ہم نے اس سے وقت اور مقام طے کیا اور مصافحہ کر کے کیبن سے باہر نکل آئے۔ جیسے ہی ہم دفتر کی ٹھنڈی راہداریوں سے گزر کر باہر کی دھوپ میں آئے، رامین نے میرے کان میں سرگوشی کی: 'ذیشان! مچھلی کانٹے میں پھنس چکی ہے'۔ہم نے دور سے داریان کو دیکھا جو ایک پرانے اخبار کے پیچھے چھپا ہماری طرف نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے 'اوکے' کا سگنل دیا تو وہ چند لمحوں بعد گھوم کر ایک محفوظ کونے میں ہمارے پاس آ گیا۔ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے اسے پوری صورتحال سے آگاہ کیا: 'داریان! مچھلی نے چارہ نگل لیا ہے۔ وہ شام کے کھانے پر آنے کے لیے تیار ہو گیا ہے، لیکن یاد رکھنا، وہ ایک منجھا ہوا کھلاڑی ہے۔ وہ پارسل کھونے کے بعد کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ وہ یہاں آنے سے پہلے اپنے کسی ہینڈلر کو الرٹ کر سکتا ہے یا کسی محفوظ ٹھکانے پر جا کر اپنی ہدایات بدل سکتا ہے۔'داریان نے اپنی ٹوپی ٹھیک کی اور سنجیدگی سے سر ہلایا۔ 'تم فکر نہ کرو ذیشان! میں اس کا سایہ بن کر رہوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ وہ دفتر سے نکل کر کن گلیوں میں مڑتا ہے اور کس سے ہاتھ ملاتا ہے۔ اگر اس نے کسی کو بھی الرٹ کرنے کی کوشش کی، تو میں تمہیں فوراً سگنل دوں گا۔' ''داریان وہیں رک گیا اور اپنی پرانی موٹر

سائیکل پر سوار ہو کر 'ندائے اصفہان' کے عقب میں پوزیشن سنبھال لی۔ ہم وہاں سے نکل کر رامین کے گھر پہنچے تاکہ شام کے 'ڈرامے' کی تیاری مکمل کر سکیں۔

ہمارے پاس وقت کم اور کام بہت زیادہ تھا۔ ہمارے اندر پہلا سوال یہی تھا کہ رضا کے سامنے اپنا اصل روپ کیسے ظاہر کرنا ہے؟ میں نے رامین کے چہرے پر موجود الجھن کو بھانپ لیا تھا۔ رامین نے کہا: 'ذیشان! اگر ہم نے اسے یہ کہا کہ ہم اسی کے نیٹ ورک سے ہیں، تو وہ فوراً تصدیق کرے گا اور ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ہمیں کچھ ایسا کرنا ہے کہ وہ اپنے اصل آقاؤں کو بتانے کے قابل بھی نہ رہے'۔ ہم نے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنے 'نفسیاتی جال' کی آخری کڑیاں جوڑنا شروع کیں۔ ہم نے طے کیا کہ ہم رضا کو براہِ راست مجرم نہیں بنائیں گے، بلکہ اسے یہ احساس دلائیں گے کہ ہم اسی کے 'قبیلے' کے لوگ ہیں اور اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس کے سامنے "تیسرا ہاتھ" (The Third Force) بن کر ابھریں گے۔ ہم اسے یہ باور کرائیں گے کہ ہم اصفہان کے وہ باخبر لوگ ہیں جن کے ہاتھ اس کی غداری کا وہ پارسل لگ چکا ہے جسے وہ تہران بھیجنا چاہتا تھا۔ ہم اسے بلیک میل (Blackmail) کریں گے'۔

میں اسے یہ باور کراؤں گا کہ میں صرف ایک ریسرچر نہیں ہوں، بلکہ میرا تعلق بھی ایک ایسی بین الاقوامی تنظیم سے ہے جو خطے میں 'تبدیلی' چاہتی ہے۔ جب وہ انکار کرے گا، تو رامین نہایت سرد لہجے میں وہ تل ابیب والا بیج میز پر اس کے پاس رکھ دے گا اور کہے گا: 'رضا صاحب! یہ بیج اور اس پارسل کا سارا ڈیٹا اس وقت ہمارے پاس ہے۔ اب آپ کے پاس صرف دو گھنٹے ہیں۔ یا تو ہمیں ان تہران والے لوگوں کے نام بتا دیں جنہیں یہ پارسل ملنا تھا یا پھر ہم یہ سارا سامان صبح ہونے سے پہلے ایرانی انٹیلی جنس (وزارتِ اطلاعات) کے دفتر پہنچا دیں گے۔ اس پلان کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ رضا اب اپنے اصل ہینڈلرز کو فون بھی نہیں کر سکے گا، کیونکہ اگر اس نے انہیں بتایا کہ پارسل 'تیسرے ہاتھ' میں چلا گیا ہے، تو اس کے اپنے ہی اسے عبرت کا نشانہ بنا دیں گے۔ وہ ہمارے اور موت کے درمیان پس جائے گا اور اپنی جان بچانے کے لیے سچ اگل دے گا۔

دوسری طرف داریان ایک سائے کی طرح رضا کے پیچھے تھا۔ ہمیں اس کی مسلسل اپ ڈیٹس مل رہی تھیں۔ شام 05:00: داریان نے کنفرم کیا کہ رضا اپنے گھر پہنچ چکا ہے وہ گھر کے اندر ہے مگر کھڑکی کے پردے ہٹا کر بار بار باہر کی گلی کا جائزہ لے رہا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ضمیر کے خوف سے لڑ رہا ہے۔ پارسل کی گمشدگی نے اسے اس قدر ہلا کر رکھ دیا تھا کہ وہ اب ہر سائے کو اپنا دشمن سمجھ رہا تھا۔ شام 06:15: داریان کا میسج چمکا: 'رضا گھر سے نکل چکا ہے، وہ گاڑی میں اکیلا ہے اور تمہاری طرف ہی آ رہا ہے'۔

رضا ٹھیک سات بجے پہنچا، اس نے گہرے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کے چہرے کی پیلاہٹ دور سے ہی اس کے اندرونی خلفشار کا پتہ دے رہی تھی۔ ابھی ہمیں بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ داریان بھی ایک عام مقامی دوست کے روپ میں داخل ہوا اور ہم سے بغل گیر ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلے آدھے گھنٹے تک گفتگو کا دھارا نہایت عام رکھا گیا۔

میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں پاکستان کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور وہاں کے صحافتی کلچر پر بات شروع کی۔ رامین نے بڑی مہارت سے گفتگو کو سمیٹا اور رضا کی جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیے: 'رضا صاحب! آپ کے کالموں کا تو پورا اصفہان دیوانہ ہے۔ ذیشان صاحب خاص طور پر آپ کے اس وژن کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جس کے ذریعے آپ خطے کے مستقبل کو دیکھتے ہیں۔'

رضا نے چائے کی پیالی سنبھالی، اس کی انگلیاں ہلکی سی لرز رہی تھیں مگر وہ اپنی 'صحافتی انا' کی تسکین کے لیے بولنے لگا: 'دیکھو ذیشان بھائی، صحافت اصل میں نام ہی ان چھپی ہوئی حقیقتوں کو منظرِ عام پر لانے کا ہے جنہیں مقتدر حلقے دبانا چاہتے ہیں۔' وہ اپنے ہی جال میں پھنس رہا تھا، یہ سمجھے بغیر کہ وہ حقیقتیں اب ہماری جیب میں تھیں۔"جب چائے کے دور ختم ہوئے اور رضا پوری طرح ریلیکس (Relax) ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، تو میں نے رامین کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں نے اپنا لہجہ بدلا اور نہایت دبی مگر برف جیسی سرد آواز میں رامین کے ذریعے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر بات شروع کی: رضا صاحب! تبریز جانے سے پہلے میں اصفہان کی ایک ایسی "خبر" کے بارے میں آپ کی رائے چاہتا ہوں جو ابھی تک اخباروں میں نہیں آئی۔ میں نے سنا ہے کہ کل شہر کی ایک ویران گلی میں ایک شخص سے ایک پارسل چھینا گیا ہے۔ اس پارسل میں کچھ ایسی چیزیں تھیں جو تہران جانی تھیں، مگر وہ کسی "تیسرے ہاتھ" کے پاس پہنچ گئیں۔' رضا کا چہرہ ایک ہی لمحے میں کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کپکپاتی آواز میں پوچھا:

میں۔۔۔ میں سمجھا نہیں آغا رامین، آپ کس پارسل کی بات کر رہے ہیں؟' میں نے نہایت سکون سے اپنی جیب سے وہ نیلے تکون والا بیج نکالا اور میز پر اس کے سامنے رکھ دیا۔ 'ہم اس پارسل کی بات کر رہے ہیں رضا صاحب، جس میں تل ابیب کے یہ نشانات تھے جو اب ہمارے قبضے میں ہیں'۔"اس نے ایک نظر اس نیلے بیج پر ڈالی اور پھر اس کی نظریں ہم تینوں کے چہروں پر گھومیں، جہاں اسے رحم کی کوئی لہر نظر نہ آئی۔ رضا نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی۔"یہ... یہ تو کوئی بھی بنا سکتا ہے مجھے نہیں معلوم آپ لوگ شاید غلط فہمی میں ہیں۔"داریان نے میز پر تھوڑا آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسکی آواز اب برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی تھی: 'جھوٹ مت بولو رضا! ہمارے پاس وہ IMEI کلوننگ ڈیوائس بھی ہے، تمہاری اس فارم ہاؤس والی ملاقات کی ویڈیوز بھی ہیں، اور وہ یو ایس بی بھی جس میں وادیِ ہشت کے پاور گرڈ اور کوہِ نیلوفر کے ذخیرہ آب کی حساس تصاویر موجود ہیں۔ تم نے صرف اپنا قلم نہیں بیچا، تم نے اصفہان کے ہزاروں معصوموں کی زندگیوں کا سودا کیا ہے۔' ان مخصوص مقامات کا نام سنتے ہی رضا جیسے اندر سے ٹوٹ گیا۔ رامین نے اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ 'دیکھو رضا! ہم تمہیں پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ہم وہ "تیسرا ہاتھ" ہیں۔ ہم نہ تو ایجنسی سے ہیں اور نہ ہی تمہارے ان غیر ملکی آقاؤں کے ساتھی۔ اگر ہم نے یہ پارسل وزارتِ اطلاعات (MOIS) کے حوالے کر دیا، تو ایوین جیل کی کال کوٹھڑی تمہارا مقدر ہو گی۔ اور اگر تم نے کسی بھی اپنے ساتھی یا ہینڈلرز کو بتایا کہ ڈیٹا ہمارے پاس ہے، یا کسی اور نے تمھارے آقاؤں کو بتا دیا کے پارسل کسی تیسرے ہاتھ میں ہے تو یاد رکھنا وہ ہم سے

پہلے ہی تمہارا گلا گھونٹ دیں گے۔
وہ خود کو بچانے کیلئے تمھیں قبرستان بھیج دیں گے۔ غدار جب بے نقاب ہوتا ہے تو وہ اپنے مالکوں کے لیے بوجھ بن جاتا ہے۔اب صرف ہم ہی تمہیں بچا سکتے ہیں۔'رضا نے لرزتی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک ایسی بند گلی میں ہے جہاں موت ہر طرف سے اسے گھیر چکی ہے۔"اگر... اگر میں کچھ بتاؤں... تو کیا ضمانت ہے کہ میرا نام کہیں نہیں آئے گا؟"
میں نے آہستہ مگر واضح کہا
"ضمانت ہم نہیں دیتے۔ ہم راستہ دیتے ہیں۔"رضا نے پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس کے ہاتھ اب بھی ہلکے سے کانپ رہے تھے، مگر آواز میں پہلے سے کم لرزش تھی۔ شاید اعتراف کے بعد بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ "میں ہمیشہ سے صحافی نہیں تھا،" اس نے دھیرے سے کہا۔ ہم خاموش رہے۔ "اصفہان کی پرانی لائبریری... جو چوک کے پیچھے ہے... وہ اصل میں میری ہے۔ کتابوں کی چھوٹی سی دکان۔ پرانی نایاب کتابیں، تاریخی مخطوطات، اخباری تراشے... میں وہیں بیٹھتا تھا۔
رضا بولتا گیا: "صحافت میں میرا داخلہ بھی وہیں سے ہوا۔ غیر ملکی طلبہ، ریسرچرز، صحافی... سب کبھی نہ کبھی وہاں آتے تھے۔ کتابوں کے بہانے گفتگو شروع ہوتی تھی۔ پھر خیالات کا تبادلہ۔ پھر رابطے۔" رامین نے پوچھا:اور بوڑھی عورت سے کیا تعلق اور اسکا بیٹا کون۔رضا نے گہرا سانس لیا۔ "اسکا نام عمیر ہے وہ پہلی بار ایک ریسرچر کے طور پر آیا تھا۔ تاریخِ مشرقِ وسطیٰ پر کام کر رہا تھا۔ کم بولنے والا آدمی۔ مگر ہر بات نوٹ کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میری تحریر میں 'جرأت' ہے۔ بس وہیں سے رابطہ شروع ہوا۔" داریان نے کہا: "براہِ راست نہیں، نظریاتی دروازے سے۔" رضا نے سر ہلایا۔ "شروع میں صرف مضامین شیئر کیے جاتے تھے۔ پھر کچھ غیر شائع شدہ تجزیے۔ پھر اس نے کہا کہ کچھ مواد تہران پہنچانا ہے — 'فکری تبادلے' کے نام پر۔" میں نے درمیان میں پوچھا: "تم جانتے تھے یہ عام میڈیا کا حصہ نہیں؟" رضا نے نظریں جھکا لیں۔ "ہاں۔ مگر میں نے خود کو سمجھایا کہ میں تو صرف معلومات منتقل کر رہا ہوں۔" کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔ رامین نے عملی سوال کیا: "ملاقاتیں کہاں ہوتی تھیں؟" رضا نے بتایا: براہِ راست ملاقاتیں بہت کم۔ زیادہ تر رابطہ انکرپٹڈ میسجنگ ایپس پر۔ کبھی لائبریری میں عام گاہک کی طرح۔ کبھی کسی عوامی کیفے میں۔"اور پارسل؟" میں نے پوچھا۔رضا نے جواب دیا"ہمیشہ کسی تیسرے شخص کے ذریعے۔ میں خود کبھی آخری منزل تک نہیں جاتا تھا۔ بس چین کا ایک حصہ تھا۔"رامین نے دھیرے مگر کاٹ دار لہجے میں پوچھا
اس پارسل کی ڈیل کیا تھی؟ تمہیں وہ کس نے دیا؟ اور کیوں؟"رضا نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، جیسے یادوں کو ترتیب دے رہا ہو
مجھے ایک غیر ملکی شخص نے دیا تھا۔" رامین فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔"کہاں ملا تھا وہ تم سے؟"رضا نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا:"ہماری ملاقات
نقشِ جہاں کے قریب والے کیفے،میں ہوئی اس نے وہاں مجھے ایک کتاب دی پرانی فارسی لغت میں نے تیزی سے پوچھا:

"کتاب کے اندر؟"
رضا نے آہستہ کہا: "جی۔ کتاب کے ساتھ خالی خانے میں وہ چیزیں رکھی گئی تھی۔ جو اب اپکے پاس ہیں ایک ڈیوائس اور بیجز ،رامین نے سوال کو اور سیدھا کیا: "تمہارے اور اس غیر ملکی کے درمیان کیا طے تھا؟ پیسے؟ نظریہ؟ دباؤ؟"
رضا نے نظریں جھکا لیں۔"شروع میں نظریہ... بعد میں معاوضہ بھی آنے لگا۔ مگر براہِ راست کبھی کچھ نہیں کہا گیا۔ بس اتنا کہ 'یہ مواد تہران پہنچنا چاہیے'۔"میں نے صاف لفظوں میں کہا:"اور خالا جان؟"رضا نے فوراً جواب دیا:
"وہ... محترمہ زہرہ ہیں۔ محلے میں سب انہیں 'خالا جان' کہتے ہیں۔"رامین نے فوراً پوچھا:"کیا وہ جانتی ہیں کہ ان کے گھر کیا آتا جاتا ہے؟"
رضا نے نظریں چرائیں۔"میرے خیال میں... نہیں۔"داریان نے تیز لہجے میں کہا:"خیال میں؟ یا یقین ہے؟"رضا نے گہرا سانس لیا۔"وہ صرف ایک رابطہ پوائنٹ تھیں۔ اصل معاملہ ان کے بیٹے کے ذریعے ہوتا تھا۔"
"انہیں کچھ معلوم نہیں۔ ان کے لیے وہ سب 'کتابوں کا کام' تھا۔ کبھی کوئی پیکٹ آ جاتا، کبھی کوئی لڑکا دے جاتا۔ وہ سمجھتیں یہ انکے بیٹے عمیر کی ملازمت کا حصہ ہے۔"
رامین نے سنجیدگی سے پوچھا:" کبھی انہیں شک نہیں ہوا؟""وہ اپنے بیٹے پر مکمل اعتماد کرتی ہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہی ان کا سہارا ہے۔ وہ سوال نہیں کرتیں۔"
میں نے دوبارہ سوال کیا:
"تو ترتیب واضح کرو — غیر ملکی شخص نے تمہیں پارسل دیا۔ تم نے آگے خالہ جان کے گھر منتقل کیا۔ عمیر نے اسے سنبھالنا تھا۔ اور پھر؟رضا نے دھیرے سے کہا: " بالکل ایسے ہی آگے کا نام مجھے معلوم نہیں..."عمیر ہی پارسل کا ہینڈ آف پوائنٹ تھا۔رامین نے پوچھا: "عمیر کیا کرتا ہے؟" باہر سے دیکھا جائے تو ایک عام سا نوجوان ہے۔ تہران میں رہتا ہے۔ کہتا ہے وہ ڈیجیٹل میڈیا کا کام کرتا ہے۔ سوشل میڈیا پیجز سنبھالتا ہے، آن لائن ڈیزائننگ کرتا ہے، کبھی کسی کمپنی کے لیے فری لانس کنٹینٹ بناتا ہے۔"رامین نے فوراً پوچھا:
"یعنی سب کچھ قانونی اور معمول کے مطابق؟"رضا نے کہا:
"ظاہری طور پر ہاں۔"میں نے بات آگے بڑھائی:"اور حقیقت میں؟"رضا نے نظریں جھکا لیں۔
"حقیقت میں... وہ صرف سوشل میڈیا نہیں سنبھالتا تھا۔ وہ مخصوص مواد کو مخصوص جگہوں تک پہنچاتا تھا۔ بعض تحریریں، بعض تجزیے، بعض ڈیجیٹل فائلیں۔ اس کے پاس وہ صلاحیت تھی کہ چیزوں کو پھیلا سکے — بغیر شور کے۔"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پارسل اس کے پاس پہنچتا تھا، اور وہ آگے دیکھتا یا نہیں، یا کسی اور کو دیتا یہ میرے علم میں نہیں۔"
میں نے آہستہ کہا: "تو عمیر ہی رابطہ ہے، خالا جان صرف پردہ، اور باقی تمھیں معلوم نہیں۔""جی۔ یہی پورا سلسلہ تھا۔ کوئی اور مداخلت یا تفصیل نہیں۔"داریان نے کہا:
"یعنی وہ تکنیکی بازو تھا۔"

رضا نے جواب دیا"جی۔ اصل منصوبہ ساز نہیں مگر نظام کو چلانے والا۔میں نے آخری سوال رکھا:"اگلا مرحلہ کیا ہونا تھا؟"اگر پارسل پہنچ جاتا تو اپکو کیسے پتا چلتا؟رضا نے تھکی ہوئی آواز میں کہا:"اگر پارسل صحیح پہنچ جاتا، تو مجھے صرف ایک جملہ ملتا — 'کتاب مل گئی'۔ اور اگلے دو مہینے خاموشی۔"رضا کا پورا وجود تھر تھرا رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے اس کا فون رکھا اور سرد لہجے میں حکم دیا: 'میسج ٹائپ کرو عمیر کو۔۔۔ ابھی!'اس کی کپکپاتی انگلیوں نے اسکرین پر حروف لکھے:
پارسل میرے پاس محفوظ ہے
یعنی 'کتاب مل گئی ہے، وہ راستے میں ہے اور جلد تہران پہنچ جائے گی۔'میسج سینڈ (Send) ہوتے ہی میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ 'اب بتاؤ، ہم تہران میں اس سے کہاں ملیں گے؟ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟'رضا نے ہانپتے ہوئے جواب دیا: 'رامین صاحب، میں سچ کہہ رہا ہوں، میرا اس سے کبھی سامنا نہیں ہوا۔ وہ ایک سایہ ہے۔ لیکن۔۔۔' وہ رکا اور تھوک نگلتے ہوئے بولا، 'ایک بار میٹنگ کے دوران مجھے ایک مختصر سا اشارہ ملا تھا۔ اسے سب "دی لائبریرین" کہتے ہیں۔ تہران یونیورسٹی کے بالکل عقب میں ایک پرانی کتابوں کی گلی ہے، وہاں ایک نیلی لکڑی کے دروازے والی دکان ہے جس پر کوئی نام درج نہیں۔ وہیں اس کا ٹھکانہ ہے، یا شاید وہ وہیں رہتا ہے۔ بس یہی ایک سراغ میرے پاس ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا!'
داریان نے میز پر رکھے اس نیلے بیج کو انگلی سے گھمایا اور تلخی سے بولا: 'یعنی خالہ جان کا گھر صرف ایک ڈیڈ ڈراپ (Dead Drop) تھا، جہاں شک کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک بوڑھی ماں، جس کا کل سرمایہ اس کا بیٹا ہے، اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا بیٹا "کتابوں کے کام" کے لبادے میں کتنا زہریلا مواد تہران منتقل کر رہا ہے۔ کتنا معصوم پردہ ہے اس ہولناک غداری کے پیچھے۔'
میں نے رامین اور داریان کی طرف دیکھا اور کہااس غدار کے پاس اب دینے کے لیے کچھ نہیں بچاجو لوگ ضمیر کی قبا بیچ کر غداری کا راستہ چنتے ہیں، تاریخ انھیں کبھی معاف نہیں کرتی پھر رضا کا انجام وہی ہوا جو صدیوں سے ضمیر بیچنے والوں کا مقدر بنتا آیا ہے
میں، رامین اور داریان — ایک الگ کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کی فضا ساکت تھی، صرف ایک مدھم سا لیمپ جل رہا تھا جس کی روشنی میں میز پر بکھرے ہوئے وہ نیلے بیجز کسی زہریلے ناگ کے پھن کی طرح چمک رہے تھے۔میں صوفے پر ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا، ذہن اب بھی انکشافات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ داریان نے وہ 'نیلا بیج' اٹھایا جس پر تل ابیب کی مخصوص مہر لگی تھی۔ اس نے اسے روشنی کے سامنے کر کے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا:'دیکھو ذیشان! یہ رضا اس نیلے بیج کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہا اسرائیل (تل ابیب) کے ان آقاؤں نے اسے کوئی تمغہ دیاہے،اسے لگ رہا تھا کہ اسے بین الاقوامی سطح پر پہچان مل رہی ہے۔"
مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اس کی اپنی روح کا سودا تھا'۔"میں نے گہرا سانس لیا۔
"یہ لوگ تمغے نہیں دیتے... یہ زنجیریں دیتے ہیں۔"داریان تلخی سے مسکرایا۔"یہی تو پہلا جال ہوتا ہے۔ پہلے نظریہ دیتے

ہیں۔ پھر تعریف۔ پھر احساسِ اہمیت۔ پھر راز۔ اور آخر میں بلیک میل۔"
میں نے داریان کی طرف دیکھا، جو بیج کو حقارت سے گھور رہا تھا۔"داریان! دیکھو ان کا کمال۔۔۔ یہ دنیا بھر میں 'امن کے سفیر' بن کر گھومتے ہیں۔ یہ انسانی حقوق کے چارٹر پر دستخط کرتے ہیں، عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیکچر دیتے ہیں، اور پھر خاموشی سے ہمارے ہی جیسے کسی 'رضا' کے ہاتھ میں غداری کا یہ نیلا تمغہ تھما دیتے ہیں۔"داریان نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور تلخی سے ہنسا۔
"یہی تو ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے ذیشان! یہ وہ لوگ ہیں جو رات کی تاریکی میں معصوم بچوں پر فاسفورس بم برساتے ہیں اور صبح اٹھ کر انسانی حقوق کی پامالی پر بین الاقوامی عدالتوں میں دہائی دیتے ہیں۔ یہ وہ شکاری ہیں جو پہلے خود ہی جال بچھاتے ہیں اور جب شکار تڑپتا ہے تو دنیا کو دکھاتے ہیں کہ دیکھو، یہ جانور کتنا وحشی ہے۔"رامین نے میز پر پڑی تہران کی فائل بند کی اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولا:
"ذیشان، یہ 'گھوریا سازشیں'(Guerilla Stratagems) کوئی نئی بات نہیں ہیں۔ ان کا طریقہ واردات بڑا سادہ مگر ہولناک ہے۔ یہ پہلے آپ کے اندرونی نظام میں دراڑیں ڈالتے ہیں۔ یہ سوشل میڈیا کے ذریعے نوجوانوں کو بتاتے ہیں کہ تمہارا مذہب، تمہاری تہذیب اور تمہارا ملک تمہیں پیچھے رکھ رہا ہے۔ یہ 'آزادی' کا ایسا خواب دکھاتے ہیں جس کی تعبیر صرف خون اور بارود میں نکلتی ہے۔"
میں نے وہ بیج ہاتھ میں لیا۔ "اور ستم ظریفی دیکھو! اگر ہم اپنی بقا کی جنگ لڑیں، اگر ہم ان غداروں کا راستہ روکیں، تو دنیا بھر کا میڈیا ہمیں 'دہشت گرد' قرار دے دیتا ہے۔ یہ وہ جادوگر ہیں جو مقتول کو قاتل اور قاتل کو مسیحا ثابت کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔"
داریان نے مکہ میز پر مارا، "بالکل! یہ تہران میں بیٹھے اس 'لائبریرین' جیسے لوگ ہی اصل کینسر ہیں۔ وہ وہاں کتابیں نہیں، بلکہ وہ 'تزویراتی زہر' بانٹ رہا ہے جو ہماری آنے والی نسلوں کے ذہن مفلوج کر دے گا۔ یہ اسرائیل کی وہ کارروائی ہے جو کسی میزائل حملے سے زیادہ خطرناک ہے۔ میزائل تو صرف عمارتیں گراتا ہے، یہ لوگ کردار گراتے ہیں۔"
میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ باہر اندھیرا تھا، مگر دور کہیں تہران کی طرف جانے والی سڑک کی لکیر نظر آ رہی تھی۔"ہمیں وہاں جانا ہوگا رامین! اس لیے نہیں کہ ہم کسی سے بدلہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہم اس 'امن کے لبادے' میں چھپے بھیانک چہرے کو بے نقاب کر سکیں۔ ہم بتائیں گے کہ سرحد کے اس پار سے ہونے والی ہر کارروائی کے پیچھے امن کا پرچم نہیں، بلکہ معصوموں کا خون اور ایک عالمی سازش کا خاکہ چھپا ہے۔"رامین نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تیار ہو جاؤ ذیشان! یہ سفر صرف تہران تک کا نہیں ہے۔ یہ حق اور باطل کے اس پرانے معرکے کا ایک نیا باب ہے جہاں دشمن بہت چالاک ہے، لیکن اس کا غرور ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری بنے گا۔"ہم تینوں——میں، رامین اور داریان——میز کے گرد اس طرح بیٹھے گئے جیسے کسی بڑی شطرنج کی بازی کے آخری پارے ترتیب دے رہے ہوں۔ہم نے طے کیا کہ ہم رامین کی اپنی گاڑی استعمال کریں گے، جو تہران کی سڑکوں پر ایک جانی پہچانی سواری تھی۔

کوئی اضافی پروٹوکول نہیں، کوئی مشکوک ہنگامہ نہیں۔" ہماری طاقت ہمارا 'عام' دکھنا ہے،" داریان نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے کہا۔ "ہم اصفہان سے نکل کر مین ہائی وے پکڑیں گے اور کاشان (Kashan) کے راستے تہران میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ روٹ ہے جس پر ہزاروں لوگ روزانہ سفر کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے حلیے ایسے رکھنے ہیں کہ کسی ناکے پر موجود سیکیورٹی اہلکار کو ہم میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔"

پلان مکمل ہو چکا تھا۔ ہم نے طے کیا کہ ہم اپنی نیند پوری کریں گے تاکہ ہمارے اعصاب بیدار رہیں۔ صبحِ صادق کا وقت روانگی کے لیے بہترین تھا، رات کے آخری پہر جب اصفہان کی مساجد سے "الصلاۃ خیر من النوم" کی صدائیں بلند ہوئیں، تو ہم سب بیدار ہوئے۔ وضو کی ٹھنڈک نے سفر کی تھکن اور آنے والے خطرات کے خوف کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ہم نے فجر کی نماز ادا کی سجدوں میں جو سکون اور دعا مانگتے وقت جو یقین دل میں اترا، اس نے اعصاب کو فولاد بنا دیا۔ نماز کے بعد ہم نے ایک مقامی ڈھابے سے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا— گرم نان اور پنیر، بالکل عام ایرانی شہریوں کی طرح۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ناشتے کی میز پر بیٹھے یہ تین لوگ اس وقت خفیہ جنگ کے ایک اہم مشن پر نکلنے والے ہیں۔

پانچواں باب ۔۔۔۔ خطرناک جعلی کارڈز

نمازِ فجر کی ادائیگی اور ناشتے کے بعد، جب اصفہان کی فضاؤں میں تلاوتِ قرآن کی خوشبو رچی ہوئی تھی، ہم نے اپنے مختصر سے بیگ اٹھائے اور رامین کی گاڑی کی طرف بڑھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی، انجن کی مدھم سی آواز فجر کے سناٹے میں گونجی۔ رامین نے سٹیرنگ سنبھالا، میں اس کے برابر بیٹھا اور داریان پچھلی نشست پر اپنے مخصوص خاموش انداز میں براجمان ہو گیا۔ جیسے ہی گاڑی نے اصفہان کے خاموش چوک کو عبور کیا، مجھے احساس ہوا کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اب ہمارا رخ اس شہر کی طرف تھا جہاں عمیر جسے 'دی لائبریرین' کہتے ہیں اپنے مکروہ جال بچھائے بیٹھا تھا۔

اصفہان کی حدود ختم ہوتے ہی رامین نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ سڑک ہموار تھی اور ایم-7 (امیر کبیر ہائی وے) پر صبح کی ہلکی ٹریفک رواں دواں تھی۔ اصفہان سے تہران کا ساڑھے چار سو کلومیٹر کا یہ فاصلہ صرف دو شہروں کے درمیان نہیں، بلکہ ہماری زندگی کے سب سے بڑے مشن کی طرف پیش قدمی تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے نکل چکا تھا اور صحرائی منظر نامے میں ریت کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ رامین خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ داریان پچھلی نشست پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا، "رامین، یہ 6 گھنٹے کا سفر ہمیں اس شہر

کی طرف لے جا رہا ہے جہاں دشمن نے اپنا 'اعصابی مرکز' بنا رکھا ہے۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ عمیر صرف ایک مہرہ ہے؟" رامین نے مڑ میں مجھے دیکھا اور سنجیدگی سے بولا، "ذیشان، اسرائیل کا طریقہ کار ہمیشہ 'پیاز کے چھلکوں' جیسا ہوتا ہے۔ ایک تہہ کھولو تو دوسری نکل آتی ہے۔ وہ عمیر ایک تزویراتی کڑی ہے جو تہران کے پڑھے لکھے طبقے میں 'خاموش زہر' پھیلا رہا ہے۔ وہ نوجوانوں کو یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ تمہاری اصل ترقی اپنے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں ہے۔
تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد ہم کاشان کے قریب پہنچے، جہاں تاریخی عمارتوں کے مینار دور سے نظر آ رہے تھے۔ ہم رکے نہیں، کیونکہ ہمارا وقت قیمتی تھا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب ہم نے قم کے مشہور مقبروں کے سنہری گنبدوں کو بائی پاس کرتے ہوئے تہران کی طرف اپنا رخ برقرار رکھا۔ راستے میں جگہ جگہ سیکیورٹی کیمرے اور پولیس کی گاڑیاں نظر آتی رہیں، لیکن رامین کی مہارت اور ہماری 'عام شہری' والی شکل نے ہمیں کسی بھی قسم کی مشکوک نظر سے بچائے رکھا۔ سفر جاری رہا۔ راستے میں ہم نے ایک چھوٹے سے ریستوران پر چند منٹ رک کر قہوہ پیا تاکہ تھکن کا احساس چہرے پر نہ آئے۔
جیسے جیسے ہم تہران کے قریب پہنچ رہے تھے، ٹریفک کا اژدھام بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر، ٹھیک دوپہر 12:15 بجے، ہم نے تہران کے بلند و بالا ٹاورز اور دور سے نظر آتی البرز کی پہاڑیوں کو دیکھا۔ چھ گھنٹے کا یہ سفر اختتام پذیر ہوا، لیکن اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں سوا بارہ بجا رہی تھیں—یہ وہ وقت تھا جب تہران یونیورسٹی کے گرد بازاروں میں لوگوں کا رش اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ "ہم پہنچ گئے،" رامین نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے تہران کے 'آزادی اسکوائر' کی طرف اشارہ کیا۔
تہران کی حبس زدہ دوپہر میں خیابانِ انقلاب کا ہجوم ایک سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہم تینوں نے اپنے حلیے ایسے بنا رکھے تھے کہ کوئی ہمیں مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہ کرے۔ رامین کی گاڑی ایک محفوظ پارکنگ میں چھوڑنے کے بعد ہم اس تنگ گلی کی طرف مڑے جہاں عمیر کا ٹھکانہ تھا۔ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر رامین رکا اور ایک لمحے کے لیے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ داریان ہم سے تھوڑا پیچھے ایک ریڑھی والے سے کچھ خریدنے کے بہانے رکا ہوا تھا، مگر اس کی نظریں عقاب کی طرح گلی کے دوسرے سرے پر جمی تھیں۔ اس کی پیشہ ورانہ مہارت دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ ہم جیسے ہی اس نیلے لکڑی کے دروازے والی دکان کے سامنے پہنچے، میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ایک عجیب سی خاموشی نے ہمارا استقبال کیا۔ دکان کا آدھا شٹر گرا ہوا تھا اور دروازے پر ایک پرانا سا تالا لٹک رہا تھا۔ "یہ کیا؟" رامین نے دبی آواز میں کہا۔ "رضا نے تو کہا تھا کہ وہ اسی وقت یہاں ہوتا ہے۔" میں نے دکان کے شیشے سے اندر جھانکنے کی کوشش کی، جہاں کتابوں کے ڈھیر گرد آلود تھے، مگر اندر کوئی حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسی دوران برابر والی دکان، جو پرانی گھڑیوں کی تھی، سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا اور ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ رامین نے اپنی "صحافی" والی مہارت استعمال کی اور مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔
"سلام آغا! ہم اصفہان سے آئے ہیں، کچھ پرانی کتابوں کی تلاش تھی۔ کیا عمیر صاحب اندر ہیں؟" اس شخص نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر تھوک کر بولا، "عمیر؟ وہ تو آج کل یہاں نہیں ہے۔ پچھلے تین دن سے دکان بند ہے۔ سنا ہے

اس کی طبیعت ناساز ہے یا شاید وہ کسی کام سے شہر سے باہر گیا ہے۔"میری اور رامین کی نظریں ملیں۔ "کیا آپ کو معلوم ہے وہ کب تک واپس آئے گا؟" میں نے لہجے میں تجسس سموتے ہوئے پوچھا۔
گھڑی ساز نے کندھے اچکائے، "اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ کبھی ہفتوں غائب رہتا ہے اور کبھی اچانک نمودار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا ایک شاگرد، 'شام کو یہاں دوکان پہ آتا ہے۔ شاید وہ کچھ بتا سکے ہم وہاں سے خاموشی سے پیچھے ہٹ آئے۔ داریان اب ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ "کچھ گڑبڑ ہے،" داریان نے سرگوشی کی۔ "ایک ایسا شخص جس کا تعلق تل ابیب (اسرائیل) کے نیٹ ورک سے ہو، وہ یوں اچانک غائب نہیں ہوتا۔ یا تو اسے ہمارے آنے کی خبر ہو گئی ہے، یا پھر تہران میں کچھ بڑا ہونے والا ہے۔"میں نے گھڑی دیکھی، دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ "ہمیں شام تک کا انتظار کرنا ہوگا۔ عمیر کے شاگرد سے ملنا ضروری ہے، شاید وہی ہمیں عمیر کے 'اصل ٹھکانے' تک لے جائے۔"ہم تہران یونیورسٹی کے قریب ایک چھوٹے سے کیفے میں جا بیٹھے، جہاں طلباء کا رش تھا۔میں نے سڑک پر چلتے ہوئے نوجوانوں کے ہجوم کی طرف دیکھا، جو اپنی دھن میں مگن تھے۔ "میں نے ذہن میں سوچا یہ نوجوان جو یہاں سے گزر رہے ہیں، انہیں خبر بھی نہیں کہ ان کی پیٹھ کے پیچھے کس طرح ان کے مستقبل کا سودا ہو رہا ہے۔ یہ 'لائبریرین' انہیں کتابیں نہیں، بلکہ موت کا پروانہ بانٹ رہا ہے۔"تہران کی سڑکوں پر شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا اور ہوا میں ایک عجیب سی خنکی رچی ہوئی تھی۔ خیابانِ انقلاب پر موجود پرانی کتابوں کی دکانوں کے شٹر ایک ایک کر کے گر رہے تھے، مگر ہماری نظریں اسی ایک مخصوص دکان پر جمی تھیں جس کا نیلا دروازہ اب بھی آدھا کھلا تھا کہ اچانک ایک بیس بائیس سال کا لڑکا، جس کے کندھے پر پرانا سا تھیلا تھا، تیزی سے گلی میں داخل ہوا۔اس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا جو خاموش گلی میں جرس کی طرح بج رہا تھا اسنے اتے ہی دوکان کا شٹر اوپر کیا اور اندر داخل ہو گیا، رامین نے سرگوشی کی وہ آگیا ہم نے پانچ منٹ انتظار کیا تاکہ وہ پوری طرح سیٹل ہو جائے۔ پھر رامین نے مجھے اشارہ کیا اور ہم نہایت سکون سے چلتے ہوئے دکان کے اندر داخل ہو گئے۔ دکان کے اندر پرانی کتابوں کی ایک خاص خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور وہ نوجوان کاؤنٹر کے پیچھے کچھ رجسٹر دیکھ رہا تھا۔رامین نے ایک ماہر سیلز مین کی طرح اپنائیت سے بات شروع کی۔ "سلام آغا! معذرت چاہتے ہیں، ہم ذرا دیر سے آئے۔ کیا عمیر صاحب اندر ہیں؟"اس نوجوان نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیوں کے لیے ایک فطری سا تذبذب تھا۔ "سلام! نہیں، عمیر آغا تو پچھلے دو تین دن سے دکان پر نہیں آئے۔"
رامین نے ایک پرانی کتاب ہاتھ میں لی اور اس کے صفحات پلٹتے ہوئے بڑے بے فکرے انداز میں پوچھا، "بڑی عجیب بات ہے، ہم تو اصفہان سے خاص طور پر ان سے ملنے آئے تھے۔ سنا ہے ان کے پاس 'تاریخِ اصفہان' پر کچھ نایاب نسخے موجود ہیں۔ کیا وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں؟"اس نے کندھے اچکائے۔ "سچ کہوں تو مجھے کچھ نہیں پتہ کہ وہ کدھر گئے ہیں۔ آج کل تہران کے جو حالات ہیں، ہر کوئی اپنی دھن میں مگن ہے۔بھائی، ہم تو بڑی امید لے کر آئے تھے۔ کیا ان کا کوئی رابطہ ہونے کی توقع ہے؟ ہمیں اصفہان واپس نکلنا ہے۔"اس نوجوان نے ایک گہرا سانس لیا اور تھوڑا سوچ کر بولا، "دیکھیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا ایک مختصر سا فون آیا تھا۔ انہوں نے بس اتنا بتایا کہ 'کل صبح 10 بجے' وہ دکان پر

موجود ہوں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کل کچھ اہم کام نمٹانے ہیں، اس لیے وہ وقت پر پہنچ جائیں گے۔ اگر آپ کل 10 بجے آ سکیں تو وہ آپ کو یہیں ملیں گے۔"رامین نے مسکرا کر سر ہلایا۔ "بہت شکریہ بھائی! کل 10 بجے کا وقت ٹھیک ہے۔ ہم دوبارہ چکر لگائیں گے۔"

ہم دکان سے باہر نکل آئے۔ تہران کی سڑکوں پر اب احتجاجی نعروں کی گونج دور سے سنائی دے رہی تھی۔ داریان، جو سائے میں کھڑا سب دیکھ رہا تھا، ہمارے ساتھ مل گیا۔"کل صبح 10 بجے!" داریان نے سرگوشی کی۔ "اس کا مطلب ہے کہ عمیر اب کسی محفوظ ٹھکانے سے نکل کر سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہنگامے اور احتجاج دراصل ایک پردہ ہیں جس کے پیچھے دشمن اپنی آخری چال چلنے والا ہے۔"ہمیں آج کی رات اپنی پلاننگ مکمل کرنی ہوگی۔"ہم تینوں——میں، رامین اور داریان——اپنے کوٹ کے کالر اوپر کیے خاموشی سے خیابانِ انقلاب کی طرف بڑھ رہے تھے، جہاں انسانی سروں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ محض ایک ہجوم نہیں تھا، بلکہ ایک بپھرا ہوا طوفان تھا جو تہران کے قلب میں امنڈ آیا تھا سڑکوں پر ٹائر جل رہے تھے جن سے اٹھنے والا سیاہ دھواں آسمان کو چھو رہا تھا نوجوانوں کے گروہ، جن کے چہروں پر ماسک اور ہاتھوں میں پلے کارڈز تھے، بلند آہنگ نعرے لگا رہے تھے۔زن، زندگی، آزادی!" (عورت، زندگی، آزادی) —— یہ نعرہ فضا میں سب سے زیادہ بلند ہو رہا تھا۔"نان، کار، آزادی!" (روٹی، کام، آزادی) —— معاشی تنگدستی اور بے روزگاری کے خلاف اٹھنے والی یہ آواز دلوں کو دہلا رہی تھی۔"مرگ بر ستمگر، چہ شاہ باشد چہ رہبر!" (ظالم مردہ باد، چاہے وہ بادشاہ ہو یا رہبر) —— یہ نعرہ نظام کی تبدیلی کی علامت بن چکا تھا۔"آزادی، آزادی، آزادی!" —— ایک ہی لفظ کی تکرار تھی جو ایک جنون کی طرح پورے ہجوم میں سرائیت کر چکی تھی۔ یہ احتجاج بظاہر آزادیِ اظہار اور حالیہ معاشی پابندیوں کے خلاف تھا، مگر اس کے پسِ پردہ جو ارتعاش تھا، وہ میں اپنی پیشہ ورانہ بصیرت سے محسوس کر رہا تھا۔رامین نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچا تاکہ ہم کسی پولیس وین کی زد میں نہ آ جائیں۔ "ذیشان! دیکھ رہے ہو؟ یہ ہے وہ 'سافٹ وار' جس کا ایندھن ہمارے یہ معصوم نوجوان بن رہے ہیں۔ ان کے مطالبات جائز ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے چھپا ہوا ایجنڈا اسرائیل کا ہے۔"میں نے دیکھا کہ دور ایک بلند عمارت کی چھت پر کچھ لوگ سیٹلائٹ فونز کے ذریعے اس ہنگامے کی لائیو کوریج کر رہے تھے۔ یہ وہ کڑیاں تھیں جو میں جوڑنا چاہتا تھا۔ تہران اس وقت ایک آتش فشاں پر بیٹھا تھا، یہ وہی ماحول تھا جس کا فائدہ اٹھا کر 'عمیر' جیسے لوگ اپنے غیر ملکی آقاؤں کو حساس معلومات پہنچاتے ہیں۔میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ پولیس اور مظاہرین کے درمیان جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ آنسو گیس کے گولے فضا میں پھٹ رہے تھے، جس سے آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اس افراتفری میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا، مگر اسی دھوئیں اور چیخ و پکار کی آڑ میں دشمن کے "سلیپر سیلز" اپنا مشن پورا کر رہے تھے۔ جب ہنگامہ آرائی شدت اختیار کر گئی، تو ہم نے وہاں سے نکلنا ہی بہتر سمجھا کیونکہ ہم کسی غیر ضروری تفتیش کا حصہ نہیں بننا چاہتے تھے۔ ہم تہران کے ایک مصروف علاقے میں واقع ایک درمیانے درجے کے ہوٹل پہنچے، جہاں مسافروں کی گہما گہمی کی وجہ سے ہم محفوظ رہ سکتے تھے۔رامین نے گاڑی ایک اندھیرے کونے میں پارک کی اور ہم تیزی سے ریسیپشن کی طرف بڑھے۔ رامین نے، جس کا تہرانی لہجہ بالکل مقامی تھا،

کاؤنٹر پر موجود ادھیڑ عمر شخص سے بات شروع کی۔
"سلام آغا! ہمیں ایک بڑا کمرہ چاہیے، ہم تین دوست ہیں اور اصفہان سے کاروباری سلسلے میں آئے ہیں۔ باہر کے حالات دیکھ کر ہم نے سوچا کہ رات یہیں گزار لینا بہتر ہے۔" رامین نے نہایت اعتماد سے جھوٹ بولا اور اپنا مقامی شناختی کارڈ دکھایا۔ ہوٹل کا مالک، جو خود باہر کے ہنگاموں سے پریشان لگ رہا تھا، نے خاموشی سے چابی ہمارے حوالے کر دی اور رجسٹر میں اندراج کر لیا۔ اس نے ہم سے زیادہ سوالات نہیں کیے کیونکہ اس وقت تہران میں ہر کوئی صرف اپنی حفاظت کی فکر میں تھا۔ کمرہ نمبر 305 تیسری منزل پر تھا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، داریان نے اپنی پیشہ ورانہ عادت کے مطابق فوراً پردے گرا دیے اور کمرے کے کونے کونے کا جائزہ لیا۔
ہم تینوں بری طرح تھک چکے تھے۔ پورا دن اصفہان سے تہران کا طویل سفر، پھر دکان کے باہر گھنٹوں انتظار اور آخر میں احتجاج کے اس ہولناک ہجوم میں ایک گھنٹہ گزارنا—ہمارے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ رامین نے جوتے اتار کر صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے ایک لمبا سانس لیا، جبکہ داریان خاموشی سے کھڑکی کے پردے کی تھوڑی سی جھری سے باہر سڑک پر گشت کرتی پولیس کی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔
تہران کی سڑکوں پر پولیس کی گاڑیوں کے سائرن اور دور سے آتی نعروں کی گونج ایک لرزہ خیز پس منظر فراہم کر رہی تھی اب ہم نے نیچے چٹائی پر بیٹھ کر پلان بنانا شروع کیاداریان نے دھیمی اواز میں کہا "ذیشان! عمیر ایک لالچی انسان ہے۔ ہم اسے دکان کے اندر نہیں پکڑیں گے، بلکہ اسے 'اصفہان والے پارسل' کے نام پر باہر نکالیں گے ہم ہوٹل کے باہر سے کسی مقامی لڑکے کو چند تومان (پیسے) دے کر تیار کریں وہ ایک عام سا گاہک بن کر عمیر کی دکان میں جائے اور اسے وہ لفافہ پکڑا کر فوراً غائب ہو جائے لفافے کے اندر اصفہان کے اس 'نیلے بیج' کی ایک تصویر ہو گی اور نیچے لکھا ہوگا: "رضا نے سب کچھ اگل دیا ہے۔ اصفہان کا پارسل اب 'وزارتِ اطلاعات' (ایرانی انٹیلی جنس) کے پاس ہے۔ تم تہران کی اس دکان میں اب محفوظ نہیں ہو۔ اگر بچنا چاہتے ہو تو فوراً پچھلی گلی میں کھڑی سفید گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"عمیر جیسے ہی یہ پیغام پڑھے گا، اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ اسے لگے گا کہ رضا پکڑا گیا ہے اور اب اگلی باری اس کی ہے۔ وہ گھبراہٹ میں دکان کا پچھلا دروازہ کھولے گا اور اسی گلی میں آئے گا جہاں ہماری گاڑی کھڑی ہو گی۔ وہاں داریان ڈرائیور کی سیٹ پر ہوگا، جبکہ میں اور رامین پیچھے والی نشست پر چھپے ہوں گے جیسے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھے گا، وہ سیدھا ہمارے قبضے میں ہوگا۔ میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں داریان! یہ بہت بڑا رسک ہے۔ عمیر کوئی اناڑی نہیں، وہ ایک تربیت یافتہ لومڑی ہے۔ اسے شک ہو سکتا ہے کہ یہ ایرانی انٹیلی جنس (MOIS) کا بچھایا ہوا جال ہے جو اسے باہر نکالنے کے لیے ڈرا رہے ہیں۔ وہ باہر آنے کے بجائے وہیں دکان میں محصور ہو کر اپنے 'آقاؤں' کو سگنل بھیج دے گا ہمیں اسے 'خوف' سے نہیں بلکہ 'اعتماد' سے باہر نکالنا
ہوگا۔"رامین نے میری تائید کی۔ "ذیشان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ کام میں خود کروں گا۔ میں ایک 'قاصد' بن کر اندر جاؤں گا، اسے وہ بیج صرف 'دکھاؤں' گا، اسے دوں گا نہیں۔ میں اسے کہوں گا کہ رضا نے مجھے بھیجا ہے، وہ خود زخمی ہے اور

حالات کی وجہ سے نہیں آسکا، اس لیے سامان لینے کے لیے آپ کو پچھلی گلی میں کھڑی گاڑی تک آنا ہوگا۔" طے پایا کہ پچھلی گلی میں رامین کی گاڑی کھڑی ہوگی۔ جیسے ہی عمیر سامان کی لالچ میں گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھے گا، میں اور داریان وہاں موجود ہوں گے۔ ہمارے پاس کلوروفارم(Chloroform) سے بھیگی ہوئی روئی تیار ہوگی۔ اسے سنبھلنے کا ایک سیکنڈ بھی نہیں ملے گا۔ ہم اسے وہیں بے ہوش کریں گے اور گاڑی فوراً وہاں سے نکل جائے گی۔

رامین!" میں نے حیرانگی سے پوچھا، "اگر وہ کل 10 بجے دکان پر نہ آیا تو؟ تہران کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں، ہو سکتا ہے وہ زیرِ زمین (Underground) چلا گیا ہو۔"

رامین نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر سنجیدگی سے جواب دیا، "ذیشان، اگر وہ کل نہیں آتا تو ہم صبر کریں گے۔ ہم اگلے چوبیس گھنٹے اسی ہوٹل میں رکیں گے اور پرسوں دوبارہ وہی پوزیشن سنبھالیں گے۔ وہ جتنا بھی محتاط ہو، اسے اپنا نیٹ ورک چلانے کے لیے ایک بار تو دکان کے 'کمیونیکیشن سسٹم'(Communication System) تک آنا ہی پڑے گا۔ ہم اس وقت تک باز نہیں آئیں گے جب تک وہ ہمارے شکنجے میں نہ آ جائے۔"اب سوال یہ تھا کہ اسے گاڑی میں بے ہوش کرنے کے بعد کہاں لے کے جائیں؟ ہمارا تو تہران میں اپنا کوئی گھر نہیں تھا، اور کسی دوست یا واقف کار کے پاس جانا اسے اور خود کو موت کے منہ میں ڈالنے کے برابر ہے۔داریان نے سوچتے ہوئے کہاذیشان! ہم کسی عمارت میں نہیں رکیں گے۔ ہم تہران کے جنوب میں واقع 'بی بی شہربانو' کی پہاڑیوں کی طرف نکل جائیں گے۔ وہاں عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور پہاڑی ڈھلوانوں پر بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی سرائیں اور مسافر خانے ایسے ہیں جہاں کسی سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ وہاں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک گاڑی اور تین چار مسافروں پر کسی کو شک نہیں ہوگا، اور وہاں سے فرار کے راستے بھی زیادہ ہیں۔"

ہم نے اس پر اتفاق کیا۔ "ہمارا سب سے بڑا ہتھیار 'عام دکھنا' ہوگا۔ جیسے ہی عمیر بے ہوش ہوگا، ہم اسے پچھلی نشست پر لٹا دیں گے اور اس کے اوپر ایک موٹا کمبل ڈال کر اسے تکیے کا سہارا دے دیں گے۔ اگر کسی ناکے پر روکا گیا، تو رامین ڈرائیور بنے گا اور میں پیچھے اس کے ساتھ بیٹھوں گا۔ ہم کہیں گے کہ 'ہمارا یہ بھائی بیمار ہے اور ہم اسے ہسپتال لے جا رہے ہیں، لیکن راستے میں احتجاج کی وجہ سے ہمیں رکنا پڑا اور یہ سو گیا ہے'۔ تہران کے موجودہ حالات میں یہ ایک ایسا منظر ہے جس پر کوئی شک نہیں کرے گا۔"کمرے میں پلاننگ مکمل ہو چکی تھی میں نے رامین اور داریان کے چہروں کی طرف دیکھا، جن کی آنکھوں میں آنے والے کل کا اضطراب تھا۔میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کرسی پر ذرا آگے جھک گیا۔ "دوستو! کل ہم جس آگ میں کودنے جا رہے ہیں، اس میں واپسی کا راستہ شاید نہ ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم وہ سچ جان لو جو میں نے اب تک اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا۔"رامین نے چونک کر میری طرف دیکھا، "کیا بات ہے ذیشان؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔""رامین! میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" میری آواز تھوڑی لرز رہی تھی مگر لہجہ پرعزم تھا۔ "میں اصفہان کا ریسرچر یا کوئی صرف عام صحافی نہیں ہوں۔

میرا تعلق پاکستان کے صوبہ پنجاب سے ہے اور میں نے غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے یہاں تک کا سفر طے کیا

ہے۔"کمرے میں ایک لمحے کے لیے ایسی خاموشی چھا گئی کہ ہمیں اپنی سانسوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی داریان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں غیر قانونی؟" رامین نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔"ذیشان! تم ہوش میں تو ہو؟ تمہیں اندازہ ہے کہ اگر راستے میں کسی ناکے پر پولیس ہمیں روک لیتی اور تمہاری تلاشی لی جاتی، تو کیا ہوتا؟ تم اصفہان سے تہران تک ہمارے ساتھ رہے، مگر ہمیں بھنک تک نہ ہونے دی؟داریان نے اپنی کرسی پیچھے ہٹائی اور سنجیدگی سے بولا، "تم نے اتنا بڑا رسک کیوں لیا؟ تم جانتے ہو کہ تہران میں اس وقت غیر ملکیوں پر کتنی سخت نظر رکھی جا رہی ہے؟ اگر کل تم پکڑے گئے، تو تمہیں 'جاسوس' قرار دے کر کبھی واپس نہیں جانے دیا جائے گامیں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، "مجھے ڈر نہیں ہے، داریان! ڈر ہوتا تو میں اپنے پیارے پاکستان کو کبھی نہ چھوڑتا۔ میں نے یہ راز اس لیے بتایا کہ کل تہران کی سڑکوں پر احتجاج ہوگا، ہر طرف ناکے ہوں گے۔ اگر میں پکڑا گیا تو میری شناخت تم دونوں کے لیے بھی خطرہ بن سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر تم مجھے ایک 'غیر ملکی' سمجھو گے تو شاید تم مجھ پر وہ اعتبار نہ کر سکو جو ایک بھائی پر کیا جاتا ہے۔"میں تھوڑا رکا اور پھر جذباتی لہجے میں بولا، "لوگ کہتے ہیں کہ غیر ملکیوں کو عزت ملتی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ تہران کے ان حالات میں ایک غیر ملکی کو سب سے پہلے 'شک' کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے تم دونوں پر کوئی آنچ آئے

رامین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں کندھوں کو تھاما اور جذباتی آواز میں بولا، "ذیشان! تم نے ہمیں یہ بتا کر اپنا قد اور بھی بلند کر دیا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم صرف کتابوں کے رسیا ہو، مگر تم تو 'نظریاتی سرحدوں' کے محافظ نکلے۔ تم پاکستان سے یہاں اس لیے آئے کہ تم اس مشترکہ دشمن کو پہچانتے ہو جو ہمارے ملکوں کو لڑوانا چاہتا ہے۔"داریان نے بھی مسکرا کر سر ہلایا، "تم نے اچھا کیا جو بتا دیا۔ اب ہم اور بھی زیادہ محتاط ہوں گے۔ اب یہ جنگ صرف ایران یا پاکستان کی نہیں، بلکہ اس 'امت' کی ہے جس کے لیے تم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی۔ حق کے راستے میں کوئی سرحد رکاوٹ نہیں ہوتی۔"کمرے کا ماحول اب بدل چکا تھا۔ شک کی جگہ ایک ناقابلِ شکست یقین نے لے لی تھی۔ رامین نے مجھے گلے لگایا اور سرگوشی کی، "ذیشان! اب ہم تین نہیں، بلکہ ایک فولادی دیوار ہیں۔ کل کا سورج گواہ ہوگا کہ سرحد پار پاکستان سے آنے والا ایک ہمارا بھائی اور تہران کے بیٹے مل کر کیسے غداروں کا غرور خاک میں ملاتے ہیں۔"میرا اعترافِ حقیقت سننے کے بعد کمرے میں موجود اجنبیت کی آخری دیوار بھی گر چکی تھی۔رامین اور داریان کی آنکھوں میں اب میرے لیے وہ احترام تھا جو ایک سپاہی دوسرے سپاہی کے لیے محسوس کرتا ہے۔ ہم نے طے کیا کہ اب مزید بحث کے بجائے چند گھنٹے اپنے اعصاب کو آرام دینا ضروری ہے، کیونکہ کل کی دوپہر ہم سے جسمانی اور ذہنی طور پر بہت کچھ مانگنے والی تھی۔کمرے میں موجود ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ لائٹ بند کر دی گئی، مگر تہران کی روشنیاں اور دور سے آتی نعروں کی آوازیں پردوں کے سوراخوں سے اندر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کیں، مگر ذہن میں بلوچستان کی کچی پگڈنڈیوں سے لے کر تہران کی ان تپتی سڑکوں تک کا پورا سفر ایک فلم کی طرح چل رہا تھا۔ میں ایک غیر قانونی مسافر تھا، مگر میرا مقصد برحق تھا۔ تھکن اتنی تھی کہ کب نیند کی وادی میں اترا، پتہ ہی نہ

چلا۔ صبح سات بجے کے قریب رامین نے ہوٹل کے نیچے سے گرم نان اور پنیر کا انتظام کیا، جو ہم نے خاموشی سے چائے کے ساتھ کھایا۔ ناشتے کی میز پر اب کوئی بات نہیں ہو رہی تھی، صرف نظروں کا تبادلہ تھا جو ایک دوسرے کو ہمت دے رہا تھا۔ ساڑھے اٹھ بجے ہم ہوٹل کی لابی میں پہنچے۔ رامین نے بڑے اطمینان سے ہوٹل کا بل ادا کیا، کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ عام سے دکھنے والے مسافر کس قدر خطرناک مشن پر نکلے ہیں۔ ہم گاڑی میں بیٹھے تو تہران کی سڑکوں پر ٹریفک ابھی معمول سے کم تھی، مگر ہر چوک پر پولیس کے دستے اور آنسو گیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔"تیار ہو ذیشان؟" رامین نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے مرر میں میری آنکھوں میں جھانکا۔" بالکل رامین! آج اس 'نیلے دروازے' کے پیچھے چھپا ہوا غدار (عمیر) اپنے عبرتناک انجام کو پہنچے گا،" میں نے عزم سے جواب دیا۔

داریان نے پیچھے سے ایک کالی جیکٹ مجھے پکڑائی۔ "یہ پہنو، اس پر 'پریس' (Press) لکھا ہے۔ یہ تمہاری 'صحافی' والی شناخت کو مزید پختہ کرے گی اور احتجاج کے ہجوم میں تمہیں راستہ بنانے میں مدد دے گی۔"گاڑی آہستہ آہستہ خیابانِ انقلاب کی طرف بڑھنے لگی۔ تہران کی سڑکوں پر اب مظاہرین اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے اور فضا میں ایک بار پھر نعروں کی بازگشت گونجنے لگی تھی۔ نو بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے، اور ہماری منزل یعنی عمیر کی دکان اب صرف تھوڑے سے فاصلے پر تھی۔ اسرائیل کی جانب سے ایران پر ممکنہ حملے کی خبریں مقامی ریڈیو پر گونج رہی تھیں، جسے Radio Farda جیسے ذرائع مسلسل نشر کر رہے تھے، جو ماحول میں مزید سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ گاڑی کی کھڑکی سے تہران کا منظر کسی لرزہ خیز فلم کی طرح گزر رہا تھا۔ ابھی صبح کے نو بج کر تیس منٹ ہوئے تھے، مگر خیابانِ انقلاب (انقلاب اسٹریٹ) پر انسانی سروں کا سمندر امڈ آیا تھا۔ فضا میں جلے ہوئے ٹائروں کی بو اور دور سے آتی نعروں کی گونج اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ رامین نے بڑی مہارت سے گاڑی کو ہجوم کے درمیان سے نکالنے کی کوشش کی، مگر اچانک سامنے سے ایک پولیس کی بکتر بند گاڑی نے راستہ روک لیا۔ذیشان! ہمت مت ہارنا،" رامین نے سرگوشی کی۔

"داریان، تم پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھو جیسے تم بیمار ہو، اور ذیشان تم اپنا وہ 'پریس کارڈ' ہاتھ میں رکھو۔"

ایک درمیانے قد کا ایرانی پولیس افسر، جس کی آنکھوں میں رات بھر کی ڈیوٹی کی تھکن اور غصہ تھا، ہماری گاڑی کے قریب آیا۔ اس نے کھڑکی پر زور سے ہاتھ مارا اور فارسی میں گرج کر پوچھا، "کہاں جا رہے ہو؟ اس ہنگامے میں باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟"

رامین نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، "آغا! یہ ہمارے پاکستانی صحافی دوست ہیں، اصفہان سے آئے ہیں اور یونیورسٹی کے حالات کور (Cover) کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہاں ایک ضروری میٹنگ کے لیے پہنچنا ہے۔"افسر کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں، کیونکہ میرے پاس کوئی قانونی ویزا نہیں تھا۔ اس نے میرا 'پریس کارڈ' لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ "پاکستانی؟ تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟"میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں جواب دیا، "آغا! پاسپورٹ ہوٹل کے لاکر میں ہے، سیکیورٹی کی وجہ سے میں صرف یہ کارڈ ساتھ رکھتا ہوں۔"افسر نے تھوڑی دیر خاموشی سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ لمحہ جیسے برسوں پر محیط تھا۔ پھر اس نے کارڈ واپس کیا اور بڑبڑاتے

ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا: "جاؤ! مگر یاد رکھنا، اگر ہجوم نے گھیرا تو ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے۔" گاڑی جیسے ہی اس تنگ گلی کے قریب پہنچی جہاں وہ 'نیلا دروازہ' تھا، رامین نے اسے ایک محفوظ جگہ پارک کر دیا۔ ہم گاڑی سے اترے تو فضا نعروں سے لرز رہی تھی۔ دور سے آنسو گیس کے گولے پھٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پلان کے مطابق،" داریان نے اپنی جیکٹ کے اندر رکھے بیجز کو چیک کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ "رامین! تم گاڑی میں رہو گے، انجن اسٹارٹ رکھنا اور کسی بھی ہنگامی صورتحال کے لیے تیار رہنا۔ ذیشان! تم دکان کے باہر چوک پر پوزیشن سنبھالو اور ہجوم پر نظر رکھو۔ جیسے ہی میں عمیر کو باہر لاؤں، تم مجھے سگنل دو گے اور رامین کو الرٹ کر دو گے۔" میں نے اپنا 'پریس' والا کارڈ نمایاں کیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ تہران کا سورج آج تپ رہا تھا، مگر میرے اندر کی برف نہیں پگھل رہی تھی۔ میں چوک پر ایک ستون کے سہارے کھڑا ہو گیا، بظاہر احتجاج کی تصاویر لے رہا تھا، مگر میری نظریں اس نیلے دروازے پر جمی تھیں۔ ٹھیک سوا دس بجے داریان نے نہایت اطمینان سے دکان کے اندر قدم رکھا۔ وہ لڑکا، جس سے ہماری کل بات ہوئی تھی، کاؤنٹر پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ داریان نے اپنی آواز میں ایک مصنوعی رازداری پیدا کی اور پوچھا، "آغا! عمیر صاحب تشریف لا چکے ہیں؟" لڑکے نے کیبن کی طرف اشارہ کیا، "جی، وہ اندر اکیلے بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ داریان نے اپنی جیکٹ درست کی اور پردہ ہٹا کر دکان کے اندرونی کیبن میں داخل ہو گیا۔ اندر حبس تھا اور پرانے کاغذوں کی مخصوص بو رچی ہوئی تھی۔ میز کے اس پار ایک 30 سالہ کسرتی بدن نوجوان بیٹھا تھا، جس کا چہرہ کسی مجسمے کی طرح ساکت اور آنکھیں شاطرانہ چمک سے بھرپور تھیں۔ اس کا ایک پاؤں معذور تھا، جو میز کے نیچے ایک خاص زاویے پر رکھا تھا، مگر اس کی شخصیت سے ایک خاص قسم کا رعب اور پیشہ ورانہ کاٹ جھلک رہی تھی۔

داریان نے بغیر کسی گھبراہٹ کے میز کے قریب قدم بڑھایا اور نہایت پرسکون لہجے میں سلام کیا۔ "سلام آغا عمیر!" داریان نے خاموشی سے اپنی جیب سے وہ 'نیلا بیج' نکالا اور میز پر عمیر کے بالکل سامنے رکھ دیا۔ اس نیلے نشان کو دیکھتے ہی عمیر کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اس بیج کو دیکھا، پھر داریان کی آنکھوں میں جھانکا۔ "یہ۔۔۔ یہ اصفہان سے آیا ہے؟" عمیر کی آواز میں ایک تھرتھراہٹ تھی جو اس نے دبانے کی کوشش کی۔ داریان نے سر ہلایا۔ "جی، یہ پارسل آپ کے لیے اصفہان سے آیا ہے، رضا نے بھیجا ہے۔ رضا کہاں ہے؟" عمیر نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ داریان نے لہجے میں تھوڑی تھکن اور پریشانی پیدا کی۔ "رضا شدید زخمی ہے، اصفہان سے نکلتے وقت جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ فلحال سفر کرنے کے قابل نہیں، اس نے مجھے یہ پارسل سونپا ہے تاکہ آپ تک پہنچا دوں۔ حالات آپ کے سامنے ہیں، تہران کی ہر گلی میں پولیس کے ناکے لگے ہوئے ہیں اور ہر گاڑی کی تلاشی لی جا رہی ہے۔" عمیر نے شک کی نگاہ سے داریان کو دیکھا۔ "پارسل تمہارے پاس ہے؟"

نہیں،" داریان نے فوراً جواب دیا۔ "میں اکیلا اسے لے کر یہاں تک نہیں آ سکتا تھا۔ پولیس کا خطرہ بہت زیادہ ہے، اسی لیے ہم نے اسے تھوڑے فاصلے پر ایک پرانی گاڑی کے اندر چھپا رکھا ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چل کر اپنا پارسل وصول کرنا ہوگا، کیونکہ رضا کا کہنا ہے کہ یہ

صرف آپ کے حوالے ہی کرنا ہے
عمیر کی شاطرانہ فطرت اسے رکنے کا کہہ رہی تھی، مگر 'اصفہان والے ڈیٹا' کی تڑپ اور رضا کے زخمی ہونے کی خبر نے اسے مجبور کر دیا۔ اسے لگا کہ اگر اس نے دیر کی تو پولیس واقعی وہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا، اپنا معذور پاؤں سنبھالا اور ایک لمبی جیکٹ پہن لی اور کہا چلوداریان نے صرف سر ہلایا اور اسے باہر لے آیا۔ میں نے چوک سے دیکھا کہ داریان کے پیچھے وہ شاطر لومڑی (عمیر) نکل رہی ہے میں نے رامین کو خفیہ سگنل بھیجا اور خود بھی آکر گاڑی میں بیٹھ گیاعمیر نے ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ دکھائی اور اپنے مخصوص شاطرانہ انداز میں گلی کے دونوں سروں کا جائزہ لیا۔ داریان نے بڑی مہارت سے اس کا اعتماد بحال رکھا اور پچھلا دروازہ کھولا، "آغا! اندر بیٹھیے، عمیر بڑے اعتماد اور سکون کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا،اسکے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک تھی کہ آخر کار وہ قیمتی ڈیٹا اس کے ہاتھ لگنے والا ہے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس بند گاڑی کے اندر اس کی زندگی کا سب سے بڑا موڑ چھپا بیٹھا ہے جیسے ہی عمیر نے سیٹ سنبھالی داریان اسکے ساتھ بیٹھا اور دروازہ بند کر دیاعمیر ابھی اپنی نشست درست کر ہی رہا تھا کہ داریان نے عقاب کی سی تیزی سے اپنے فولادی بازوؤں کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد کسا۔ اس سے پہلے کہ عمیر کے شاطر دماغ میں خطرے کا الارم بجتا یا وہ اپنا معذور پاؤں حرکت میں لاتا، داریان نے اسے پیچھے کی طرف ایک زوردار جھٹکا دے کر سیٹ سے پیوست کر دیا۔
عمیر کا کسرتی بدن ایک لمحے کے لیے مچھلی کی طرح تڑپا، اس کی آنکھوں میں اچانک وہ فاتحانہ چمک غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایک ہولناک خوف نے لے لی۔
یہی وہ لمحہ تھا! جب میں نے
طاقتور محلول میں ڈوبی ہوئی روئی، جو ایک خاص ایئر ٹائٹ ڈبے میں بند تھی، نکالی اور پوری قوت سے اس کی ناک اور منہ پر جما دی۔ عمیر نے اپنی پوری جان لگا کر سر کو جھٹکنے کی کوشش کی، اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی آواز نکلی جو گاڑی کے بند شیشوں سے ٹکرا کر اندر ہی دم توڑ گئی۔ وہ طاقتور دوا اپنا کام کر رہی تھی۔ اس کے پھیپھڑوں میں اترنے والی وہ کڑوی اور بھاری بو اس کے اعصاب کو مفلوج کر رہی تھی۔ چند ہی سیکنڈز کی اس جاندار کشمکش کے بعد، اس کی آنکھیں، جو ابھی تک سازشوں کے تانے بانے بن رہی تھیں، اوپر کی طرف الٹ گئیں اور اس کا وجود ایک دم ڈھیلا پڑ کر سیٹ کی پشت پر ڈھیر ہو گیا۔"شکار اب پوری طرح ہمارے قبضے میں ہے،" میں نے ہانپتے ہوئے رامین کو اشارہ کیا۔رامین نے مڑ میں ایک فاتحانہ نظر ہم پر ڈالی اور ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور ہم تہران کی ان تپتی سڑکوں، پولیس کے ناکوں اور احتجاج کے دھوئیں کو چیرتے ہوئے اپنی اس نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں اس شاطر عمیر کا اصل احتساب ہونا تھا۔ تہران کا ہنگامہ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ گاڑی بی بی شہر بانو کی ڈھلوانوں پر بنے ایک متروکہ اور کچے راستے پر کھڑی تھی، جہاں سے نیچے شہر کی روشنیاں دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ فضا میں پہاڑی ہوا کی خنکی تھی، مگر گاڑی کے اندر تپش محسوس ہو رہی تھی۔ عمیر نے ایک لمبا سانس لیا اور جھرجھری لی۔ اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے کھلیں، مگر کلوروفارم کے اثر سے اس کا سر بوجھل تھاہوش آگیا، عمیر صاحب؟" رامین کی سرد آواز خاموشی کو چیرتی ہوئی

اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ عمیر نے ہانپتے ہوئے پوچھا، "تم۔۔۔ تم کون ہو؟ رضا کہاں ہے؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"میں نے اپنی جیب سے وہی 'نیلا بیج' نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ عمیر کی آنکھیں بیج کو دیکھ کر پھیل گئیں۔رضا اس وقت ہماری حفاظت میں ہے،" میں نے نہایت سکون سے کہا۔ "اور تم؟ تم اب اس 'تیسرے ہاتھ' کی گرفت میں ہو جس کا نہ تو ایران کی کسی ایجنسی سے تعلق ہے اور نہ ہی تمہارے ان غیر ملکی آقاؤں سے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو اس خطے میں 'گند' صاف کرنے نکلے ہیں۔ تم ہمیں ایک آزاد گروپ سمجھ سکتے ہو جو تمہاری غداری کی قیمت جانتا ہے۔"عمیر نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی۔ "تیسرا ہاتھ؟ تم لوگ محض اغوا کار ہو۔ اگر میرے لوگوں کو پتہ چلا، تو وہ تمھیں راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے۔"داریان نے اپنا چاقو نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے کیا اور برف جیسے لہجے میں بولا: "عمیر! اپنے 'آقاؤں' کی دھمکی ہمیں مت دو۔ وہ لوگ غداروں کو صرف استعمال کرتے ہیں، بچاتے نہیں۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلے گا کہ تم پکڑے گئے ہو، وہ سب سے پہلے تمہارا نام اپنے ریکارڈ سے مٹا دیں گے۔ تم ان کے لیے اب ایک 'ایکسپائرڈ مہرہ' (Expired Pawn) ہو۔""میں کچھ نہیں جانتا! تم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو،" عمیر نے ہانپتے ہوئے اپنا پہلا کارڈ کھیلا۔ اس کے لہجے میں جھوٹی خوداعتمادی تھی۔ "میں ایک عام شہری ہوں، تم مجھے اس طرح اغوا کر کے قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکو گے۔رامین نے قہقہہ لگایا، ایک ایسا قہقہہ جس نے عمیر کے ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا دی۔ اور پھر آہستہ سے اپنی جیب سے ایک سیاہ یو ایس بی (USB) نکالی اور اسے عمیر کی آنکھوں کے بالکل سامنے کر دیا۔"یہ دیکھ رہے ہو عمیر؟" رامین نے سرگوشی کی۔ "اس میں تمہاری وہ تمام ای میلز، وہ تمام 'انکرپٹڈ' پیغامات اور وہ بینک ٹرانزیکشنز موجود ہیں جو تم نے گزشتہ چھ ماہ میں اپنے آقاؤں کے ساتھ کیں

عمیر کا رنگ یکدم فق ہو گیا، مگر وہ ابھی بھی سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ سب جھوٹ ہے، یہ ڈیٹا پلانٹ کیا گیا ہو گا۔۔۔"اچھا؟ اور اس کا کیا کرو گے؟" میں نے دوسری جیب سے وہ نیلا بیج (Blue Badge) اور کچھ تصویریں نکال کر اس کی گود میں پھینک دیں۔ عمیر نے تصویروں پر نظر ڈالی تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ داریان نے ضرب لگاتے ہوئے کہا: "رضا نے ہم سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسے پتہ چل گیا ہے کہ تم اسے قربانی کا بکرا بنانے والے تھے اسے اپنی جان پیاری تھی اس نے تمہارے نیٹ ورک کی ایک ایک کڑی ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔ اب بتاؤ، کیا اب بھی تم ایک 'عام شہری' ہو؟"عمیر کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی۔ انکار کی ہر دیوار گر چکی تھی۔ اس نے اپنی بند مٹھیوں کو بھینچا اور ایک گہرا سانس لے کر سر پیچھے کی طرف گرا دیا۔"تمہیں لگتا ہے میں یہ سب پیسوں اور شہرت کے لیے کر رہا تھا؟" اس نے اچانک چیخ کر کہا، اس کی آواز میں غصہ اور مایوسی ملی جلی تھی۔ "میں اپنے لوگوں کے لیے 'حق' مانگ رہا تھا۔ یہ ملک پابندیوں کی وجہ سے دم توڑ رہا ہے۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ اگر بیرونی طاقتیں ہمیں اس نظام سے نجات دلانا چاہتی ہیں، تو اس میں کیا برائی ہے؟ تم لوگ مجھے غدار کہہ رہے ہو؟ غدار میں ہوں یا وہ جو عوام کا گلا گھونٹ رہے ہیں؟ ۔ کیا اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا گناہ ہے؟"میں نے اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا، میں نے اپنے ملک کے مستقبل کے لیے یہ راستہ چنا۔

رامین نے اس کے چہرے کے قریب ہو کر اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "حق؟ عمیر، تمہاری عقل پر پردہ پڑ چکا ہے۔ جن لوگوں سے تم مدد مانگ رہے ہو، وہ تمہارے ملک کو بچانے نہیں بلکہ اسے فلسطین 'لیبیا' اور 'شام' بنانے آئے ہیں۔ زرا سوچو کیا وہ ملک تمہیں آزادی دلائیں گے جنہوں نے تمہارے بچوں کی ادویات پر پابندیاں لگائیں؟ جو تمہاری معیشت کو اپاہج کر کے تمہیں سڑکوں پر لائے؟"تمہاری کرنسی کو کوڑیوں کے مول کر دیا تاکہ تمہارا باپ بجلی کا بل نہ بھر سکے اور تمہارا بھائی بے روزگار ہو کر سڑکوں پر آ جائے۔ اور پھر، جب تم بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر چیختے ہو، تو وہی لوگ تمہارے ہاتھ میں بندوق اور کیمرہ تھما دیتے ہیں کہ 'جاؤ اپنے ہی گھر کو آگ لگا دو، ہم تمہیں آزادی دلائیں گے'۔"وہ پہلے پابندیاں لگاتے ہیں تاکہ تم جیسے نوجوان مایوس ہو کر اپنے ہی گھر کو آگ لگا دیں، اور پھر وہ 'امن' کے نام پر یہاں میزائلوں کی برسات کریں گے۔ کیا تمہیں لگتا ہے وہ اسرائیل جو روزانہ ہمارے سائنسدانوں کو نشانہ بناتا ہے، وہ تمہیں خوشحالی دے گا؟

میں نے لہجہ تھوڑا نرم کیا مگر اس میں بلا کی سختی برقرار رکھی۔ "عمیر، اپنی بوڑھی ماں کا سوچو۔ وہ مصلے پر بیٹھ کر تمہارے گھر آنے کی راہ تک رہی ہو گی۔ اگر تم نے سچ نہ بتایا، تو تم تاریخ کے ان صفحات میں دفن ہو جاؤ گے جہاں غداروں کا نام تک مٹا دیا جاتا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟ جب اسرائیل یہاں بمباری کرے گا، تو کیا وہ تمہارے 'انقلابی جذبے' کو دیکھ کر میزائل کا رخ موڑ دے گا؟ نہیں عمیر! تم ان کے لیے صرف ایک ٹشو پیپر ہو، جسے استعمال کر کے وہ کوڑے دان میں پھینک دیں گے

جیسے انہوں نے عراق اور لیبیا کے 'انقلابیوں' کو پھینکا تھا۔ آج وہ ممالک کہاں ہیں؟ وہاں نہ نظام بچا، نہ روٹی ملی، اور نہ ہی وہ 'حق' جس کے خواب دکھا کر انہیں سڑکوں پر لایا گیا تھا۔ وہاں اب صرف قبرستان ہیں اور غیر ملکیوں کے قبضے میں تیل کے کنویں!"

داریان نے چاقو کی نوک اس کی ٹھوڑی پر رکھی۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے، عمیر۔ یا تو وہ سب بتا دو جو تم جانتے ہو اور اپنی ماں کی گود میں واپس چلے جاؤ، یا پھر اس اندھیری ڈھلوان پر اپنا انجام دیکھو جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا۔ عمیر کا جسم اب بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں برسوں سے بٹھائے گئے جھوٹ کے بت ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ 'انقلاب' کے نام پر دراصل 'استحصال' کا آلہ کار بن رہا تھا۔ میں نے عمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، میرا لہجہ اب اتنا سپاٹ تھا کہ جیسے کسی پتھر سے آواز آ رہی ہو۔ "عمیر! ہم تمہیں پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہمارا تعلق نہ تو ایران کی کسی سرکاری ایجنسی سے ہے اور نہ ہی تمہارے ان غیر ملکی آقاؤں کے کسی حریف سے۔ ہم وہ 'تیسرا ہاتھ' ہیں جو اس وقت حرکت میں آتا ہے جب ریاست کے ہاتھ بندھے ہوں اور غداروں کی جڑیں گہری ہو جائیں۔" میں ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے آخری وارننگ دی۔ "اب فیصلہ دوبارہ تمہارا ہے۔ اگر تم سچ سچ بتاؤ گے اور ہمارے ساتھ تعاون کرو گے، تو یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم تمہیں جانے دیں گے۔ تم اپنی ماں کے پاس واپس جا سکو گے۔" میں نے بات ادھوری چھوڑی اور رامین کی طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی۔

"وگرنہ۔۔۔ وگرنہ پھر تم خود جانتے ہو۔ یا تو اس ڈھلوان کے پیچھے تمہاری لاش ہوگی جسے کوئی ڈھونڈ نہیں پائے گا، یا پھر کل کے اخبار میں تمہاری تصویر کے ساتھ تمہاری غداری کی وہ داستان چھپی ہوگی کہ تمہاری نسلیں بھی سر اٹھا کر نہیں چل سکیں گی۔اب بتاؤ یہ نیلے بیج (Blue Badges) کس مقصد کے لیے ہیں عمیر کے چہرے پر موت جیسی زردی چھا گئی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا: یہ بیج۔۔۔ یہ 'تل ابیب' کی طرف سے بھیجے گئے شناختی نشان ہیں۔ دو دن بعد جب تہران کی سڑکوں پر سینکڑوں لوگوں کا ہجوم ہوگا اور ہر طرف آنسو گیس کا دھواں ہوگا، تو اس افرا تفری میں اپنے بندوں کو پہچاننا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ بیج صرف ان مخصوص 'آپریٹیوز' (Operatives) کے پاس ہوں گے جنہیں ہجوم کے اندر رہ کر اشتعال انگیزی کرنی ہے۔"میں نے مداخلت کی، "مطلب یہ ایک دوسرے کو پہچاننے کے لیے ہیں؟""ہاں،" عمیر نے سر جھکایا۔ "ان بیجوں کی پشت پر ایک خاص 'فلوروسینٹ'
(Fluorescent) مادہ لگا ہے جو صرف ایک مخصوص لینس والے چشمے سے نظر آتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب ہمارے لڑکے پولیس پر پتھراؤ کریں یا کسی سرکاری عمارت کو آگ لگائیں، تو وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور آپس میں نہ ٹکرا جائیں۔ یہ ایک 'سائلنٹ کمیونیکیشن' (Silent Communication) کا ذریعہ ہے تاکہ وہ ہجوم کے اندر ایک منظم یونٹ کی طرح کام کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کو کور (Cover) دے کر غائب ہو سکیں رامین نے وہ نیلا بیج عمیر کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور طنزیہ لہجے میں پوچھا، "عمیر! ہمیں بیوقوف مت بناؤ۔ اگر صرف ایک دوسرے کو پہچاننا ہی مقصد تھا، تو تم کوئی خاص رنگ کا رومال، کوئی مخصوص ٹوپی یا کوئی ہینڈ شیک بھی رکھ سکتے تھے۔ یہ پلاسٹک کا نیلا بیج ہی کیوں؟ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ اسرائیل نے اسے اتنی اہمیت دی؟"عمیر نے ایک تھکا ہوا سانس لیا، اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کسی اناڑی کے ہتھے نہیں چڑھا۔"آغا! رومال یا ٹوپی ہجوم کی چھینا جھپٹی اور آنسو گیس کے دھوئیں میں گم ہو سکتے ہیں، یا کوئی اور بھی ویسا ہی رومال پہن کر دھوکہ دے سکتا ہے۔" اس نے بیج کی پشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔یہ بیج دراصل ایک 'پیسیو ٹیگ' (Passive Tag) ہے۔ یہ ہمارے لڑکوں کے پاس موجود عام سمارٹ فونز کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔"
میں نے حیرت سے بھنویں سکیڑیں، "عام موبائل فون؟ وہ تو حکومت احتجاج کے دوران سب سے پہلے بند کر دیتی ہے۔" نیٹ ورک بند ہو سکتا ہے، مگر فون کی NFC اور بلوٹوتھ ٹیکنالوجی پھر بھی کام کرتی ہے۔" عمیر نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا، "ہمارے ہر آپریٹیو کے فون میں ایک خاص 'انکرپٹڈ ایپ' انسٹال ہے۔ جیسے ہی ہمارا ایک لڑکا ہجوم میں دوسرے کے قریب سے گزرتا ہے، اس کی جیب میں موجود فون خاموشی سے دوسرے کے نیلے بیج کو اسکین کر لیتا ہے۔ اگر بیج سے آنے والا سگنل اصلی ہو، تو فون ایک مخصوص انداز میں تھرتھراتا (Vibrate) ہے۔ اس طرح انہیں نہ تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی رک کر بات کرنے کی، بس پاس سے گزرتے ہی فون بتا دیتا ہے کہ 'یہ اپنا بندہ ہے'۔"اس نے ایک لمحہ وقفہ لیا اور پھر لہجے کو پراسرار بناتے ہوئے ایک ہولناک حقیقت سے پردہ اٹھایا: "لیکن اس کا سب سے بڑا جادو ہی اس کی 'خاموشی' میں چھپا ہے۔ اگر تہران کی پولیس یا ایجنسی کا کوئی جاسوس

بھیس بدل کر ہمارے گروپ میں گھس آئے، تو ہمیں کسی تفتیش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جیسے ہی وہ ہمارے کسی بندے کے قریب سے گزرے گا، اس کے پاس یہ مخصوص بیج نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا فون بالکل خاموش رہے گا۔ وہ 'موبائل کی خاموشی' ہی ہمارا سب سے بڑا سگنل ہے کہ ہمارے حصار میں کوئی 'گھس پیٹھیا' (Intruder) داخل ہو چکا ہے۔ اس طرح ہم تہران کی سڑکوں پر موجود لاکھوں کے ہجوم میں بھی اپنے بندوں کو الگ پہچان لیتے ہیں اور دشمن کو اپنے پلان سے دور رکھتے ہیں۔ "تو اس کا مطلب ہے عمیر۔۔۔ کہ اگر ہجوم میں تمہارے لڑکوں کا فون 'وائبریشن' (Vibration) کرے گا، تو وہ تمہارا اپنا بندہ ہوگا؟" رامین ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر لہجے کو مزید پراسرار بناتے ہوئے بولا، "اور اگر فون بالکل خاموش رہے گا، تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ سامنے والا کوئی 'گھس پیٹھیا' یا ایجنسی کا جاسوس ہے؟" عمیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموشی سے اپنا سر اثبات (ہاں) میں ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر موجود بے بسی بتا رہی تھی کہ اس کے نیٹ ورک کا سب سے بڑا راز اب فاش ہو چکا ہے۔ اب داریان نے تھوڑے سخت لہجے میں پوچھا۔ یہ 20 بیج تم نے ان 20 لڑکوں تک کیسے پہنچانے تھے؟ دو دن بعد تہران کی سڑکوں پر لاکھوں کا ہجوم ہوگا، تم ایک ایک کو ڈھونڈ کر تو یہ سینے پر نہیں ٹانک سکتے تھے۔ کیا تمہارا کوئی خفیہ تقسیم کا مرکز ہے یا کوئی خاص طریقہ؟" عمیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور ہانپتے ہوئے بتانا شروع کیا، "آغا! ان بیجز کی تقسیم کا طریقہ بہت ہی پیچیدہ اور محفوظ رکھا گیا تھا۔ مجھے یہ خود نہیں بانٹنے تھے، بلکہ کل صبح تہران کے 'گرینڈ بازار' (Grand Bazaar) میں ایک مخصوص جگہ پر پہنچانے تھے۔" داریان نے مداخلت کی، "مخصوص جگہ؟ کہاں؟" "بازار کے وسط میں ایک پرانی تسبیحوں اور جائے نمازوں کی دکان ہے،" عمیر نے انکشاف کیا۔ "وہاں کا دکاندار ہمارا ہمدرد ہے۔ مجھے وہ 20 بیج تسبیحوں کے ایک مخصوص تھیلے میں ڈال کر وہاں رکھ دینے تھے۔ وہ 20 لڑکے، جنہیں پہلے ہی 'انکرپٹڈ میسج' کے ذریعے وقت اور جگہ بتا دی گئی ہے، ایک ایک کر کے وہاں آئیں گے۔ وہ کوئی بات نہیں کریں گے، بس ایک خاص رنگ کی تسبیح کی قیمت پوچھیں گے اور دکاندار انہیں وہ بیج چپکے سے ان کی مٹھی میں تھما دے گا۔" رامین نے غصے سے پوچھا، "یعنی تم نے اس مقدس جگہ کو بھی اپنی گندی سازش کا حصہ بنا لیا؟"

"مجبوری تھی آغا! وہاں پولیس کا شک نہیں جاتا۔" عمیر نے سر جھکا کر کہا۔ "وہ لڑکے یہ بیج اپنی جیکٹ کے اندرونی حصے میں چھپا لیں گے۔ جیسے ہی دوپہر کے وقت احتجاج شروع ہوگا اور آنسو گیس کا دھواں پھیلے گا، وہ اسے اپنی قمیض کے کالر کے نیچے لگا لیں گے تاکہ ان کے فونز 'وائبریشن' شروع کر دیں اور وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ یہ تقسیم کا عمل اتنا خاموش ہوتا ہے کہ پاس کھڑے گاہک کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہاں تہران کی تباہی کا سامان بانٹا جا رہا ہے۔" داریان نے سرد لہجے میں ایک اور سوال پوچھا؟

عمیر! فرض کرو کہ اگر یہ بیج اس تسبیحوں والی دکان تک نہ پہنچے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا تمہارا یہ سارا 'ڈیجیٹل جال' ایک لمحے میں بکھر جائے گا؟ یا تمہارے ان آقاؤں نے کسی 'پلان بی' کا انتظام بھی کر رکھا ہے؟" عمیر کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ نمودار ہوئی، جو شکست اور چالاکی کا ایک عجیب امتزاج تھی۔ اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا: "آغا! اگر یہ بیج کل

صبح تک اس دکان تک نہ پہنچے، تو میرا 'مین ہینڈلر' (MainHandler) سمجھ جائے گا کہ پہلی کڑی ٹوٹ چکی ہے۔ ان بیجوں کا نہ پہنچنا ایک 'سائلنٹ الارم' (Silent Alarm) کی طرح کام کرے گا۔"رامین نے غصے سے اس کا گریبان جکڑا، "مطلب؟ کیا تمہارے پاس کوئی متبادل راستہ ہے؟""جی آغا! اگر یہ بیج نہیں پہنچتے، تو پلان بی خود بخود 'ایکٹیویٹ' (Activate) ہو جائے گا۔" عمیر نے ہولناک سچ اگلا۔ "اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب ہجوم کے اندر 'پہچان' کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ لڑکے، جو ان بیجوں کا انتظار کر رہے ہیں، انہیں ایک کوڈ ورڈ ملے گا کہ 'اندھیرا چھا چکا ہے'۔ اس کے بعد وہ بغیر کسی پہچان کے، اندھادھند توڑ پھوڑ شروع کر دیں گے۔ وہ بیج تو انہیں ایک دوسرے سے بچانے کے لیے تھے، لیکن ان کے بغیر وہ ہجوم میں ایک دوسرے کو بھی مار سکتے ہیں، مگر ان کا مقصد صرف 'خون خرابہ' کرنا ہوگا تاکہ تہران کی سڑکیں زخمیوں سے بھر جائیں اور الزام حکومت پر آئے۔میں نے اپنی جیب سے وہ سیاہ ڈیوائس نکالی اور اسے عمیر کی آنکھوں کے بالکل سامنے کر دیا۔ "اب اس کے بارے میں بتاؤ عمیر! یہ کالی ڈیوائس احتجاج میں کیا کرنے والی ہے؟"عمیر نے اس ڈیوائس کو دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے تھوک نگلا اور ہانپتے ہوئے بتانا شروع کیا:"آغا! یہ کالی ڈیوائس دراصل ایک 'سلیکٹو سگنل جیمر' (Selective Signal Jammer) ہے۔ اس کا مقصد تہران کے اس مخصوص احتجاجی چوک کو ایک ڈیجیٹل بلیک ہول بنانا ہے۔ جیسے ہی یہ ڈیوائس ایکٹیویٹ ہوگی، وہاں موجود ہر عام شہری اور پولیس والے کا موبائل سگنل مکمل طور پر کٹ جائے گا۔ کوئی بھی وہاں سے کال یا ویڈیو اپلوڈ نہیں کر سکے گا۔"میں نے اسے غور سے دیکھا، "تو تمہارا رابطہ کیسے ہوگا؟""یہی اس کا اصل کام ہے،" عمیر نے اعتراف کیا۔ "یہ ڈیوائس صرف ان موبائل فونز کو سگنل فراہم کرے گی جن میں ہمارا مخصوص سافٹ ویئر اور وہ 'نیلے بیج' موجود ہوں گے۔ ہمارے لڑکے ہجوم کے اندر بیٹھ کر وہ ویڈیوز ریکارڈ کریں گے جو امریکہ اور اسرائیل دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ ڈیوائس ان ویڈیوز کو سیکنڈوں میں تہران میں موجود ہمارے 'مین ہینڈلر' (Main Handler) تک پہنچا دے گی۔"اس نے ایک گہرا سانس لیا اور مزید ہولناک انکشاف کیا: "وہ ہینڈلر ان ویڈیوز کو فوراً ایڈٹ کر کے تل ابیب اور لندن بھیجے گا اور وہاں سے وہ پوری دنیا کے سوشل میڈیا پر 'وائرل' کر دی جائیں گی۔ وہ صرف وہی ویڈیو دکھائیں گے جس میں پولیس لاٹھی چارج یا آنسو گیس پھینک رہی ہوگی۔ اگر پولیس پر پتھراؤ ہو رہا ہوگا یا ہمارے لڑکے آگ لگا رہے ہوں گے، تو یہ ڈیوائس ان ویڈیوز کو دبا دے گی، انہیں اپلوڈ ہی نہیں ہونے دے گی۔ دنیا کو لگے گا کہ پرامن مظاہرین پر ظلم ہو رہا ہے، جبکہ اصل سچائی اس 'سیاہ ڈیوائس' کی پیدا کردہ خاموشی میں دفن ہو جائے گی۔"داریان نے خاموشی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ پانچ چمکدار سفید کارڈز نکال کر عمیر کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ ان کارڈز کی سطح پر لگی باریک گولڈن چپس گاڑی کی مدھم روشنی میں کسی سانپ کی آنکھ کی طرح چمک رہی تھیں۔"عمیر! جب تم بے ہوشی کی وادیوں میں بھٹک رہے تھے، تب ہم نے تمہاری تلاشی لی تھی۔" داریان کی آواز میں ایک عجیب سی کاٹ تھی۔ "ہمیں تمہاری جیکٹ کے خفیہ خانے سے یہ پانچ تحفے ملے ہیں۔ ہمیں ان کارڈز کی حقیقت جاننی ہے۔ اب تم ہمیں ایک ایک کر کے بتاؤ گے کہ یہ کیا ہیں؟ عمیر نے جب وہ کارڈز دیکھے تو اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا، جیسے اس نے اپنی موت کا

پروانہ دیکھ لیا ہو۔ اس نے ایک بار تھوک نگلا اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں اعتراف کرنا شروع کیا:
آغا! یہ کارڈز کسی بڑے گیٹ کو کھولنے کے لیے نہیں ہیں۔ یہ صرف ان مخصوص ٹیکنکل رومز (Technical Rooms) اور سروس گیٹس کی فزیکل رسائی کے لیے ہیں جہاں سیکیورٹی کا عملہ کم ہوتا ہے لیکن وہاں سے پورے نظام کی رگیں گزرتی ہیں۔میں نے مداخلت کی، "مطلب؟ یہ کارڈز تمھیں وہاں تک کیسے لے جاتے؟ وہاں تو گارڈز ہوتے ہوں گے۔" "یہی تو اصل چال ہے!" عمیر نے ہانپتے ہوئے انکشاف کیا۔ "یہ کارڈز مجھے خود استعمال نہیں کرنے تھے، بلکہ ان پانچ مقامی بندوں تک پہنچانے تھے جو پہلے ہی ان حساس اداروں کے اندر برسوں سے کام کر رہے ہیں۔ وہ وہاں کے پرانے ملازم ہیں، کوئی ٹیکنیشن ہے، کوئی الیکٹریشن ہے اور کوئی صفائی کے عملے کا سپروائزر۔ ان پر کوئی شک نہیں کرتا کیونکہ وہ برسوں سے وہاں کی خاک چھان رہے ہیں۔داریان نے بھنویں سکیڑیں، "اگر وہ پہلے ہی اندر ہیں، تو انہیں ان کارڈز کی کیا ضرورت تھی؟""ان کے پاس عمارت میں داخلے کا پاس تو ہے، مگر ان انتہائی حساس کمروں (Server or Power Rooms) تک رسائی نہیں تھی جہاں ڈیجیٹل لاکس لگے ہوتے ہیں۔" عمیر نے وضاحت کی۔ "یہ فرانسیسی کارڈز ان مخصوص لاکس کو 'بائی پاس' کرنے کے لیے پروگرام کیے گئے ہیں۔ میرا کام صرف ان
'اندرونی مہروں' کو یہ چابیاں تھمانا تھا۔ کل جب احتجاج کا شور مچے گا، تو یہ پانچوں لوگ خاموشی سے ان کارڈز کے ذریعے ان کمروں میں داخل ہوں گے اور وہاں موجود بجلی کے پینلز (کمیونیکیشن) کی تاریں کاٹ دیں گے۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ یہ تخریب کاری باہر سے نہیں بلکہ اندر کے اپنے ہی پرانے ملازم نے کی ہے۔داریان نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا، "عمیر! تم ان اداروں کے اندر خود تو جا نہیں سکتے تھے، اور نہ ہی ان پانچ غداروں سے براہِ راست مل سکتے تھے۔ تو پھر یہ کارڈز ان تک کیسے پہنچنے تھے؟ کیا تمہارے پاس کوئی جادوئی طریقہ ہے یا کوئی ایسا راستہ جس کا ہمیں علم نہیں؟"عمیر نے ایک گہرا اور بوجھل سانس لیا، اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب سچ بولنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔"آغا! جاسوسی کی دنیا میں 'براہِ راست ملنا' موت کو دعوت دینا ہے،" اس نے ہانپتے ہوئے انکشاف کیا۔ "مجھے ان پانچ لوگوں کی شکل تک نہیں معلوم۔ یہ کارڈز ایک 'ڈیڈ ڈراپ' (Dead Drop) کے ذریعے اگلے مرحلے تک پہنچنے تھے۔"رامین نے غصے سے پوچھا، "ڈیڈ ڈراپ؟ صاف صاف بتاؤ؟عمیر نے وضاحت کی۔ "مجھے ہدایت تھی کہ کل دوپہر کے وقت میں تہران کے 'پارکِ ملت' (Mellat Park) میں جاؤں گا۔ وہاں ایک مخصوص درخت ہے جس کے تنے میں ایک قدرتی سوراخ ہے جو جھاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ میں وہاں سے گزرتے ہوئے، بظاہر جوتا باندھنے کے بہانے جھکوں اور وہ پانچوں کارڈز ایک چھوٹے سے مقناطیسی ڈبے میں ڈال کر اس سوراخ کے اندر چھپا دوں۔"میں نے مداخلت کی، "اور پھر؟ وہ پانچ لوگ وہاں سے یہ کارڈز کیسے اٹھاتے؟""انہیں وہاں نہیں آنا تھا آغا!" عمیر نے ہولناک سچ اگلا۔ "سامان رکھنے کے بعد مجھے پارک سے باہر نکل کر ایک مخصوص سرکاری کوڑے دان پر چاک سے ایک چھوٹا سا نشان لگانا تھا۔ وہ نشان ایک 'سگنل' تھا اس تیسرے بندے کے لیے جو بظاہر وہاں 'صفائی والا ورکر آتا ہے۔ وہ اس نشان کو دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ امانت پہنچ چکی ہے۔ وہ وہاں سے کارڈز اٹھاتا اور ان پانچوں سلیپر سیلز

کے گھروں کے باہر موجود مخصوص 'ڈیڈ ڈراپ' پوائنٹس (جیسے کوئی ڈھیلی اینٹ یا بجلی کا میٹر) میں ایک ایک کارڈ تقسیم کر دیتا۔ اس طرح ہم میں سے کسی نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں، مگر کارڈ ہر غدار کے ہاتھ میں پہنچ جاتے تھے۔میں نے ایک سرد لہجے میں سوال کیا، "عمیر! اب یہ کارڈز ہمارے پاس ہیں، اس کا مطلب ہے کہ یہ کل پارک کے اس 'ڈیڈ ڈراپ' تک نہیں پہنچیں گے۔ اب یہ بتاؤ کہ جب تمہارا ہینڈلر دیکھے گا کہ امانت نہیں پہنچی، تو ان کا 'پلان بی' کیا ہوگا؟ وہ ان پانچ سلیپر سیلز کو کیا حکم دے گا؟"عمیر نے ایک لمبی اور گہری سانس لی، اس کے چہرے پر موجود خوف اب ایک عجیب سی بے چارگی میں بدل چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر نفی میں ہلایا۔"آغا! مجھے خدا کی قسم اس کا کچھ علم نہیں،" اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ہمیں صرف اتنا ہی بتایا جاتا ہے جتنا ہمارے کام کے لیے ضروری ہو۔ مجھے صرف یہ کارڈز وہاں پہنچانے کا حکم تھا۔ اگر وہ نہیں پہنچتے، تو آگے کیا ہوگا، وہ پانچ لوگ کیا کریں گے یا میرا ہینڈلر کیا نیا راستہ اپنائے گا۔۔۔ اس کا مجھے بالکل علم نہیں ہے۔"

رامین نے غصے سے اس کا گریبان جھٹکا، "جھوٹ مت بولو! تمہیں ضرور پتہ ہوگا کہ مشن ناکام ہونے کی صورت میں تمہارا اگلا قدم کیا تھا؟"

"یقین کریں آغا!" عمیر کی آواز میں اب گڑگڑاہٹ تھی۔ ہم سب الگ الگ خانوں میں بند مہرے ہیں۔ میری ذمہ داری صرف ان کارڈز کی ترسیل تک تھی۔ اگر زنجیر کی یہ کڑی ٹوٹتی ہے، تو میرا ہینڈلر سمجھ جائے گا کہ کچھ غلط ہوا ہے، مگر وہ اگلا قدم کیا اٹھائے گا، یہ صرف اسے یا فرانس میں بیٹھے اسکے آقاؤں کو معلوم ہے۔میں نے رامین کی طرف دیکھا اور کہا عمیر کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ دشمن نے یہ جال اتنی مہارت سے بچھا رکھا تھا کہ ایک مہرے کے پکڑے جانے سے پورا بورڈ الٹنا ناممکن تھا۔داریان نے بات اگے بڑھتے ہوئے سوال کیا۔عمیر! اسرائیل کی دشمنی تو دیوار پر لکھی تحریر کی طرح صاف ہے، وہ تہران کو خاک میں دیکھنا چاہتے ہیں "لیکن یہ فرانسیسی؟ ان کا تہران سے کیا لینا دینا؟ کیا انہیں پیرس میں بیٹھ کر تہران کے ان حساس مقامات کی فکر کھائے جا رہی ہے؟"عمیر نے ایک بوجھل سانس لیا اور ایک ایسی حقیقت اگلی جو کسی عام صحافی کی سوچ سے بھی پرے تھی۔"آغا! فرانسیسیوں کا کھیل اسرائیل سے کہیں زیادہ باریک اور خطرناک ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے انکشاف کیا۔"فرانسیسی انٹیلیجنس (DGSE) کا تہران میں اپنا ایک 'ڈیجیٹل ایجنڈا' ہے۔ وہ براہِ راست جنگ یا بمباری نہیں چاہتے، بلکہ وہ ایران کے ان حساس سسٹمز پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتے ہیں جن کا کنٹرول پہلے ان کی کمپنیوں کے پاس رہا ہے۔"رامین نے غصے سے پوچھا، "مطلب؟ کیا وہ دوبارہ یہاں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں؟""جی آغا! فرانسیسیوں نے یہ کارڈز اسرائیل کو ایک 'ٹیکنکل سودے' کے تحت فراہم کیے ہیں۔" عمیر نے ہولناک سچ سے پردہ اٹھایا۔ "اسرائیل کو 'تباہی' چاہیے، جبکہ فرانسیسیوں کو 'رسائی' (Access)۔ وہ چاہتے ہیں کہ جب اسرائیل کا سائبر حملہ ہو اور یہاں افراتفری پھیلے، تو یہ پانچوں کارڈز استعمال کر کے وہ خاموشی سے ان سرور رومز میں داخل ہو جائیں جہاں سے تہران کا ڈیٹا کنٹرول ہوتا ہے۔ وہ اس گندے کھیل میں اس لیے شامل ہیں تاکہ تہران کے راز چوری کر سکیں اور مستقبل میں اس ملک کو بین الاقوامی سطح پر 'بلیک میل' کر سکیں۔ وہ اسرائیل کے

کاندھے پر بندوق رکھ کر اپنا حصہ وصول کر رہے ہیں رامین نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا"تو یہ ہے وہ گریٹ گیم۔ ایک طرف موت کے سوداگر ہیں اور دوسری طرف معلومات کے چور، اور ان دونوں کے درمیان میرا ملک تڑپ رہا ہے۔"میں نے وہ پانچ سفید کارڈز اپنی ہتھیلی پر زور سے بھینچے، جیسے میں ان کے ذریعے اس نظام کا گلا گھونٹ رہا ہوں جس نے دنیا کو بیوقوف بنا رکھا ہے۔ "دیکھو رامین اور داریان ! یہ ان لوگوں کی اصلیت ہے جو عالمی میڈیا(Global Media) کی سکرینوں پر بیٹھ کر ہمیں اخلاقیات کا سبق پڑھاتے ہیں جو دنیا بھر میں 'انسانی حقوق' اور 'امن' کے سب سے بڑے علمدار بنے پھرتے ہیں۔"

میں نے عمیر کی طرف رخ کیا، جس کی آنکھیں اب زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ "یہ فرانسیسی، یہ مغربی قوتیں اور ان کا مہرہ تل ابیب۔۔۔ یہ سب ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ دنیا کے سامنے یہ امن کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں، خود ہی قانون بناتے ہیں، خود ہی انسانی حقوق کے چارٹر لکھتے ہیں اور پھر اندھیری راتوں میں پردوں کے پیچھے بیٹھ کر، تہران کی گلیوں میں بچھانے کے لیے ایسے ہلاکت خیز جعلی کارڈز اور سیاہ ڈیوائسز تیار کرتے ہیں!"میں نے ایک تلخ قہقہہ لگایا۔ "کتنا بڑا تضاد ہے نا؟ جب ہم اپنے حق کے لیے آواز اٹھائیں تو یہ اسے دہشت گردی (Terrorism) قرار دے کر ہم پر پابندیاں لگاتے ہیں۔

یہی فرانسیسی ہیں نہ؟ جو اقوامِ متحدہ میں بیٹھ کر بڑی شان سے جمہوریت کے گن گاتے ہیں؟ جو ذرا سی بات پر دوسرے ملکوں پر اقتصادی پابندیاں (Sanctions) لگانے کے لیے سب سے پہلے ہاتھ اٹھاتے ہیں؟"جب کشمیر لہو لہان ہو رہا ہو یا فلسطین پر ظلم، تو یہی لوگ 'ویٹو' (Veto) کا حق استعمال کر کے انصاف کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ لیکن جب ان کے اپنے مفادات کی بات آئے، تو یہ دوسرے ملکوں کے نظام کو مفلوج کرنے کے لیے تخریب کاری کو جائز قرار دیتے ہیں۔ پردے کے پیچھے یہ پیرس کے 'سینٹ ڈینس' میں بیٹھ کر ایسے ہلاکت خیز جعلی کارڈز بناتے ہیں جو دوسرے ملکوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے کام آتے ہیں۔"یہ خود ہی منصف ہیں اور خود ہی قاتل!"

میں نے لہجے میں مزید شدت پیدا کی۔ "عمیر! تم جیسے نوجوانوں کو یہ 'آزادی' کے خواب دکھاتے ہیں، جبکہ حقیقت میں یہ تمہیں اپنے گھر کو آگ لگانے والا ایندھن بنا رہے ہوتے ہیں۔ یہ عالمی میڈیا تمہیں وہی دکھاتا ہے جو تل ابیب اور مغربی قوتوں کے سٹوڈیوز میں تیار ہوتا ہے۔ یہ قانون کی بالادستی کی باتیں کرتے ہیں، مگر خود اس قانون کو پاؤں تلے روند کر دوسرے ملکوں کے پاور گرڈز اور دفاعی حصار توڑنے کی سازشیں کرتے ہیں۔ کیا یہی وہ 'ترقی یافتہ دنیا' ہے جس کے تم قصیدے پڑھ رہے تھے؟ یہ روشنی کے لبادے میں چھپے وہ اندھیرے ہیں جو صرف تباہی لانا جانتے ہیں!"عمیر جس آزادی کے تم خواب دیکھ رہے ہو، وہ فرانسیسیوں کے ان پلاسٹک کارڈز میں قید ہے، جو تمہارے ملک کو آزاد نہیں بلکہ غلامی میں دھکیلنے کے لیے بنے ہیں۔

تفتیش کے بعد گاڑی کے اندر ایک بوجھل خاموشی تھی، جسے صرف عمیر کی تیز سانسیں توڑ رہی تھیں۔ میں نے ایک آخری نظر اس پر ڈالی اور نہایت سکون سے 18 نیلے

بیجوں کا لفافہ اور یو ایس بی اس کی گود میں پھینک دی۔
"لو عمیر! اپنا سامان سنبھالو،" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم اپنے وعدے کے پکے ہیں۔ اس لیے یہ 18 بیج اور یو ایس بی تمہاری ہے۔ لیکن یاد رکھنا۔۔ وہ پانچ فرانسیسی کارڈز، دو نیلے بیج اور وہ سیاہ ڈیوائس اب ہمارے پاس بطور 'ضمانت' رہیں گے۔"عمیر نے حیرت اور راحت کے ملے جلے تاثر کے ساتھ سامان سنبھالا۔ داریان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لہجہ مزید سخت کر دیا۔ "خبردار! ہمارے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتانا۔ ہم تمہیں اس لیے زندہ چھوڑ رہے ہیں کیونکہ تم نے تعاون کیا ہے، اور مستقبل میں ہمیں تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اگر تم نے ہمارا ساتھ دیا تو تم محفوظ رہو گے، ورنہ تم جانتے ہو کہ ہماری پہنچ کہاں تک ہے۔
رامین نے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے مرر میں اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا: "ہاں عمیر صاحب! اب بتائیے، آپ کو کہاں اتارنا ہے؟ ادھر ہی اس ویرانے میں رکنا ہے یا تہران کے کسی مخصوص چوک پر چھوڑ دیں؟"رامین نے گاڑی موڑی اور ہم پہاڑی کی ڈھلوان سے نیچے تہران کی ان تپتی سڑکوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیسے ہی وہ مخصوص چوک آیا، گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔داریان نے عمیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے آخری وارننگ دی: اگر تم نے شرافت دکھائی تو تم محفوظ رہو گے، ورنہ تہران کی یہ زمین تمہارے لیے قبرستان بن جائے گی اب جاؤ عمیر نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گاڑی سے باہر قدم رکھا۔ اسے گمان تھا کہ وہ موت کے جبڑے سے نکل آیا ہے۔ جیسے ہی وہ اندھیری گلی میں غائب ہو کر اپنی اس 'نیلے دروازے' والی دکان کی طرف بڑھا، رامین نے گاڑی تھوڑی دور پارک کی اور اپنا 'فون' نکال لیا۔
رامین نے تہران کے اینٹی ٹیررازم یونٹ کا نمبر ملایا۔ اس کی آواز میں ایک پیشہ ورانہ تیزی تھی۔
"ہیلو! ایک اہم اطلاع ریکارڈ کرو۔ خیابانِ انقلاب کے پاس اس نیلے دروازے والی دکان کے اندر اس وقت ایک شخص داخل ہوا ہے جس کے پاس اسرائیلی ٹریکنگ بیجز اور حساس ڈیٹا موجود ہے۔ اگر تم اگلے دس منٹ میں وہاں نہ پہنچے، تو کل تہران کی گلیاں لاشوں سے لہو لہان ہو جائیں گی۔"رامین نے فون فوراً بند کر کے بیٹری نکال دی تاکہ لوکیشن ٹریس نہ ہو سکے۔ ہم نے دور کھڑے ہو کر دیکھا کہ عمیر نے جیسے ہی اپنی دکان کا شٹر گرایا، کچھ ہی دیر بعد تہران کی سڑکوں پر سائرن گونجنے لگے۔ پولیس کی دو گاڑیاں اور ایک سیاہ شیشوں والی ہائی لکس نہایت تیزی سے دکان کے سامنے آ کر رکیں۔
سیکیورٹی اہلکاروں نے شٹر توڑ کر اندر دھاوا بول دیا۔ چند ہی سیکنڈز بعد عمیر کو، جو اب پوری طرح بدحواس ہو چکا تھا، بالوں سے پکڑ کر باہر لایا گیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی لفافہ تھا جسے وہ اپنی 'آزادی کا پروانہ' سمجھ رہا تھا۔ اسے بے رحمی سے گاڑی میں پھینک دیا گیا۔جب پولیس کی گاڑیاں اسے لے کر دور نکل گئیں، تو گاڑی کے اندر ایک عجیب سی فاتحانہ خاموشی چھا گئی۔ میں نے، رامین اور داریان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ "ایک اور مرحلہ مکمل ہوا ذیشان!" رامین نے جوش سے کہا۔ "وعدہ بھی پورا ہوا اور غدار بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔۔ اب تہران کی انٹیلیجنس اس سے وہ سچ اگلوا لے گی جو شاید ہم کبھی نہ نکال پاتے تہران کی سڑکوں پر اب ایک عجیب سی

خاموشی چھا گئی تھی میں نے رامین اور داریان کے چہروں پر اطمینان کی لہر دیکھی، کیونکہ سب کچھ ہمارے پلان کے مطابق ہو رہا تھا ہم نے تو یہ پہلے ہی منصوبہ بنا لیا تھا کہ ہمارا کام ہونے کے بعد ہم اسے ایرانی انٹیلیجنس کے حوالے کر دیں گے کیونکہ ہمارے پاس نہ تو اتنے وسائل تھے اور نہ ہی اتنا وقت کہ ہم تہران کی گلیوں میں ان 20 لڑکوں کا پیچھا کرتے پھرتے۔ ہم محض تین لوگ تھے، ہم ان سے براہِ راست کیسے ٹکرا سکتے تھے؟ اگر ہم وہ بیج اپنے پاس رکھ لیتے، تو وہ 20 لڑکے تہران کے ہجوم میں گمنام رہتے۔ لیکن اب، وہ بیج عمیر کے پاس تھے اور عمیر انٹیلیجنس کے قبضے میں۔ اب یہ ریاست کا کام تھا کہ وہ ان بیجوں کو ٹریک کرے، چاہے وہ عمیر کو 'چارہ' بنا کر دوبارہ اسی دکان پر بھیجیں یا ان بیجوں کے ذریعے ان 20 تخریب کاروں تک پہنچیں ہم تو صرف ایک 'تیسرا ہاتھ' ہیں جو صرف راستہ دکھا سکتا ہے، پورا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ "ہم نے وہ دو نیلے بیج اور پانچ فرانسیسی کارڈز اپنے پاس صرف نشانی کے طور پر نہیں رکھے تھے۔ ہمارا ارادہ کچھ اور تھا۔ ہم ان کارڈز اور ان کی ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے مغربی لابی اور اسرائیلی نیٹ ورک کے اس حصے تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں ابھی تک تہران کی ایجنسیاں بھی نہیں پہنچ سکی تھیں۔ ہمارا مشن انٹیلیجنس کا کام کرنا نہیں تھا، بلکہ اس گند کو صاف کرنا تھا جس نے ہمارے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پولیس اپنا کام کرے گی، اور ہم اپنا۔ ہم نے اپنا راستہ الگ چنا تھا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ کبھی کبھی سسٹم کے اندر رہ کر وہ نہیں کیا جا سکتا جو سسٹم سے باہر رہ کر ممکن ہے۔ تہران کی سڑکوں پر شام کے چار بج رہے تھے۔ سورج ڈھلنے کی طرف مائل تھا اور فضا میں ایک عجیب سی بے چینی رچی ہوئی تھی۔۔ ہم گاڑی میں بیٹھے تھے، مگر میرا ذہن کسی خطرے کی بو سونگھ رہا تھا۔

"رامین! ہمیں فوراً 'پارکِ ملت' پہنچنا ہوگا،" میں نے بے چینی سے کہا۔ "اگر عمیر کے ہینڈلرز کو بھنک بھی پڑ گئی کہ وہ گرفتار ہو چکا ہے، تو وہ اپنا پورا نیٹ ورک سیکنڈوں میں لپیٹ لیں گے۔ ہمیں اس سے پہلے وہ کارڈز وہاں 'ڈیڈ ڈراپ' کرنے ہوں گے تاکہ کھیل جاری رہے لیکن ایک ڈر مسلسل ہمارے دل میں کھٹک رہا تھا۔ اگر وہ پانچ اصلی فرانسیسی کارڈز ہم نے وہاں رکھ دیے اور دشمن کو شک ہو گیا، تو ہم وہ قیمتی ثبوت ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے پھر ہم نے قریب ہی ایک چھوٹی سی اسٹیشنری کی دکان کے پاس گاڑی رکی۔ وہاں سے ہم نے پانچ ایسے کارڈز اور کاغذ لیے جو سائز اور وزن میں بالکل اصلی کارڈز جیسے تھے۔ ہم نے بڑی مہارت سے انہیں اسی طرح پیک کیا جیسے عمیر نے بتایا تھا، تاکہ بظاہر کسی کو شک نہ ہو۔ یہ 'جعلی کارڈز' ہمارا وہ چارہ تھے جو ہم نے شکاری کو پھنسانے کے لیے ڈالنے تھےاصلی کارڈز میری جیب میں رہیں گے،" میں نے رامین اور داریان کو بتایا۔ "ہم یہ پارسل وہاں رکھیں گے تاکہ دشمن کو لگے کہ مشن جاری ہے، اور ہم دور سے نظر رکھیں گے کہ اسے اٹھانے کون آتا ہے۔"

ہم پارکِ ملت پہنچے۔ پارک میں لوگوں کا رش معمول سے کم تھا، شاید شہر کے بگڑتے ہوئے حالات نے سب کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں نے اپنی پریس جیکٹ درست کی اور ایک عام سیاح کی طرح چلنے لگا۔بظاہر جوتا باندھنے کے بہانے میں اس مخصوص درخت کے پاس جھکا اور وہ جعلی کارڈز والا پارسل جھاڑیوں کے پیچھے چھپے اس سوراخ میں ڈال دیا۔ پارک سے نکلتے ہوئے میں نےاس مخصوص بجلی کے کھمبے پر چاک سے 'V' کا نشان بنایا اور ساتھ دو باریک نقطے لگا دیے جو سگنل

تھے کہ 'امانت' پہنچ چکی ہے یہ کوئی عام نشان نہیں تھا، یہ ایک خفیہ 'پاس ورڈ' تھا۔ دور سے دیکھنے والے کو لگے گا کہ شاید کسی راہگیر نے چلتے چلتے پتھر رگڑ دیا ہے، مگر اس 'صفائی والے' کے لیے یہ ایک چیختا ہوا سگنل تھا کہ 'چارہ ڈال دیا گیا ہے'۔ "ہو گیا رامین،" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ جھاڑے۔ "اب ہم ہوٹل واپس چلیں گے۔ اگر ہم یہاں زیادہ دیر رکے تو ایجنسی کے کیمرے ہماری مشکوک حرکات نوٹ کر سکتے ہیں۔ ہم نے اپنا کام کر دیا ہے، اب گیند ان کے کورٹ میں ہے۔" ہم ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ تہران کی سڑکوں پر اب شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ میرے ذہن میں مسلسل وہ پانچ جعلی کارڈز گھوم رہے تھے جو میں نے جھاڑیوں میں چھپائے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ کیاندرونی جیب کو چھوا جہاں وہ پانچ اصلی فرانسیسی کارڈز محفوظ تھے۔ "ذیشان! تمہیں کیا لگتا ہے؟ وہ صبح آئے گا؟" داریان نے پیچھے سے پوچھا۔ "اسے آنا پڑے گا داریان،" میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اسرائیل اور فرانس کے یہ مہرے اتنے بڑے مشن کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ صبح جب کچرا اٹھانے کے بہانے آئے گا، تو یہ نشان اسے پکارے گا۔ اور ہم دور کھڑے ہو کر اس کے چہرے کی وہ تصویر اتاریں گے جو ہمیں اس کے 'مین ہینڈلر' تک لے جائے گی۔" جب ہم ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے، تو تھکن ہڈیوں میں اتر چکی تھی۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے ہم نے پانی کے ایک گھونٹ کے سوا کچھ نہیں چکھا تھا۔ رامین نے فوراً نیچے فون کر کے ہوٹل سے ہی کھانا منگوایا۔ کچھ ہی دیر میں گرم نان اور کبابوں کی خوشبو کمرے میں پھیل گئی، مگر ہماری بھوک اب محض پیٹ بھرنے کے لیے نہیں بلکہ اگلے مشن کے لیے توانائی جمع کرنے کے لیے تھی۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا، کوئی بات نہیں ہوئی، صرف برتنوں کی آوازیں اس بوجھل خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔

کھانا ختم کرنے کے بعد ہم اپنی اپنی کرسیوں پر ڈھیلے پڑ کر بیٹھ گئے۔ تہران کی ٹھنڈی ہوا کھڑکی کے پردوں کو ہلا رہی تھی۔ میں نے میز کی طرف اشارہ کیا اور ہم تینوں ایک دائرے میں بیٹھ گئے تاکہ اگلے چند گھنٹوں کا لائحہ عمل طے کر سکیں۔ رامین اور داریان! سنو،" میں نے آواز دھیمی رکھتے ہوئے بات شروع کی۔ "وقت کم ہے اور دشمن بہت چالاک۔ ہمیں اپنا یہ 'تیسرا ہاتھ' پوری قوت سے استعمال کرنا ہوگا۔ پھر ہم نے یہ منصوبہ طے کیا کہ کل صبح ہم دو الگ سمتوں میں بٹ جائیں گے۔"

میں نے رامین کی طرف دیکھا، جس کی آنکھیں اب تھکن کے باوجود مشن کی تڑپ سے چمک رہی تھیں۔ "رامین! تمہاری ذمہ داری وہ تسبیحوں والی دکان ہے۔ تم صبح سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ گے۔ ہمیں نہیں پتہ کہ انٹیلیجنس والوں نے وہاں ابھی چھاپہ مارا ہے یا وہ اسے 'ہنی ٹریپ' (Honey Trap) کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ تمہیں دور سے اس دکان پر نظر رکھنی ہوگی۔ اگر دکان کھلی ہے، تو ہر آنے جانے والے کی تصویر لینی ہے، خاص طور پر ان 20 لڑکوں کی جو بیج لینے آئیں گے۔" رامین نے اثبات میں سر ہلایا پھر میں نے داریان کی طرف دیکھا۔ "داریان! تم اور میں صبح سویرے پارکِ ملت کی طرف نکلیں گے۔ ہم نے جو 'جعلی چارہ' وہاں ڈالا ہے، اسے اٹھانے والا وہ صفائی والا (میونسپلٹی ورکر) ہماری اصل منزل ہے۔" ہم نے طے کیا کہ داریان پارک کے شمالی گیٹ پر رہے گا جبکہ میں اس مخصوص بینچ اور

'L' والے نشان پر نظر رکھوں گا۔
"جیسے ہی وہ بندہ کارڈز اٹھائے گا، ہمیں اسے قابو نہیں کرنا۔ ہمیں سائے کی طرح اس کا پیچھا کرنا ہے کہ وہ کارڈز لے کر کس عمارت یا کس 'ہینڈلر' کے پاس جاتا ہے۔
داریان نے اپنی جیکٹ درست کرتے ہوئے کہا، "اور اگر وہاں انٹیلیجنس کے بندے پہلے سے موجود ہوئے تو؟""اسی لیے تو ہمیں چھپ کر کام کرنا ہے،" رامین نے جواب دیا۔ "ہمیں انٹیلیجنس کی نظروں سے بھی بچنا ہے اور دشمن کی بھی۔ ہم ان کے بیچ میں ایک ایسا 'تیسرا ہاتھ' بن کر کھیلیں گے جس کا کسی کو گمان بھی نہ ہو۔ ہم تینوں کے ذہن اس وقت جنگی میدان بنے ہوئے تھے، مگر جسم جواب دے رہے تھے۔ تھکن ہڈیوں میں کسی زہر کی طرح اتر چکی تھی۔
میں نے بتی بجھائی اور ہم اپنے اپنے بستروں پر ڈھیر ہو گئے۔ کروٹ بدلتے ہوئے میری نظریں تہران کے آسمان پر جمی تھیں جہاں اکا دکا ستارے شہر کی روشنیوں میں دم توڑ رہے تھے۔ نیند آنکھوں میں تو تھی، مگر ذہن میں وہی تسبیح والی دکان، نیلے بیج اور پارکِ ملت کے نقشے گردش کر رہے تھے۔ "کیا کل ہم کامیاب ہوں گے؟" یہ سوال ایک ہتھوڑے کی طرح میرے سر پر بج رہا تھا۔ اسی ادھورے سوال کے ساتھ کب آنکھ لگی، پتہ ہی نہ چلا۔ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی کہ تہران کی کسی قریبی مسجد سے بلند ہوتی 'اللہ اکبر' کی صدا نے میرے وجود کو جھنجھوڑ دیا۔ فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے رامین اور داریان کو جگایا۔ ہم نے وضو کیا، تہران کی ٹھنڈی ہوا اور پانی کے لمس نے ہماری ساری تھکن دھو ڈالی۔ کمرے کے ایک کونے میں جائے نماز بچھا کر باری باری نماز ادا کی۔ نماز کے بعد میں نے کافی دیر تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رکھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی ہلچل تھی۔ میں نے سرگوشی میں دعا کی: "اے مالک! ہم ایک ایسی راہ پر نکلے ہیں جہاں قدم قدم پر موت اور دھوکا ہے۔ اگر ہمارا مقصد سچا ہے، تو ہماری حفاظت فرما۔ ہمیں ان مہروں سے بچا جو انسانیت کے دشمن ہیں اور ہمارے اس 'تیسرے ہاتھ' کو وہ طاقت دے کہ ہم اس گند کو صاف کر سکیں۔دعا ختم ہوئی تو میرا سینہ ایک عجیب سے اطمینان سے بھر چکا تھا۔ میں نے
محسوس کیا کہ رامین اور داریان کے چہروں پر بھی وہی سکون تھا۔ یہ وہ طاقت تھی جو کسی اسلحے یا ٹیکنالوجی سے نہیں ملتی۔
ہم نے جلدی سے ناشتہ کیا، چائے کی آخری چسکیاں لیں اور اپنے اپنے مشن پر نکل گئے۔ رامین اس تسبیح والی دکان کی طرف روانہ ہوا، جبکہ میں اور داریان پارکِ ملت کی طرف۔رامین جب اس پرانے بازار میں پہنچا تو وہاں معمول کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی، مگر اس کی منزل—وہ تسبیحوں والی دکان—ایسی لگ رہی تھی جیسے وہاں صدیوں سے کوئی نہ آیا ہو۔ رامین نے ایک قریبی چائے خانے میں جگہ بنائی جہاں سے دکان کا شٹر صاف نظر آ رہا تھا۔ایک گھنٹہ گزرا، پھر دوسرا... رامین کی نظریں دکان کے تالے پر جمی تھیں۔ اس نے نہایت مہارت سے ارد گرد کے دکانداروں سے باتوں باتوں میں معلومات لینے کی کوشش کی۔ آس پاس کے دکانداروں کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ رات والے واقعے کے بعد ایجنسیوں نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔"
ایک بوڑھے قالین فروش نے بتایا "آغا! یہ دکان تو کل رات سے بند ہے، سنا ہے یہاں کچھ گڑبڑ ہوئی تھی اور پولیس

والے کسی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔" رامین کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے شک ہوا کہ کہیں انٹیلیجنس نے یہاں 'ہنی ٹریپ' تو نہیں لگا رکھا۔ وہ مزید دو گھنٹے وہیں رکا رہا، ہر آنے جانے والے کے چہرے کو پڑھتا رہا، ہر مشکوک گاڑی کا نمبر نوٹ کرتا رہا، مگر وہ 20 لڑکے جن کا ہمیں انتظار تھا، کہیں نظر نہ آئے۔ آخر کار اس نے ہمیں سگنل دیا کہ یہاں رکنا اب خطرے سے خالی نہیں، اور وہ ہماری طرف یعنی پارک کی سمت نکل پڑا۔ دوسری طرف،

میں اور داریان پارک کے مختلف کونوں میں پوزیشن سنبھال کر بیٹھ تھے۔ میں نے ایک اخبار ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، مگر میری نظریں اس بجلی کے کھمبے اور جھاڑیوں پر جمی تھیں جہاں ہم نے 'چارہ' ڈالا تھا پہلا گھنٹہ ہم پُرامید تھے کہ ابھی کوئی آئے گا دوسرا گھنٹہ دھوپ تیز ہونے لگی اور پارک میں لوگوں کا رش بڑھ گیا، مگر وہ 'صفائی والا' نہیں آیا۔ تیسرا گھنٹہ بے چینی میرے اندر کسی ناگن کی طرح سر اٹھانے لگی۔ ہر وہ شخص جو جھاڑیوں کے قریب سے گزرتا، میرا دل زور سے دھڑکنے لگتا۔ چار گھنٹے گزر چکے تھے، مگر وہ 'چارہ' وہیں پڑا رہا۔ نہ کوئی پارسل اٹھانے آیا، نہ کسی نے اس 'V' کے نشان کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں رامین بھی ہمارے پاس آگیا۔ وہ نہیں آئیں گے،" رامین نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے ہانپتے ہوئے کہا۔ "انٹیلیجنس نے یا تو ان کا نیٹ ورک توڑ دیا ہے یا وہ سمجھ گئے ہیں کہ عمیر کے ذریعے ان تک پہنچا جا رہا ہے۔ ہمارا یہ کارڈ اب ضائع ہو چکا ہے۔"ہم تینوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ مشن جس کے لیے ہم نے اپنی جانیں داؤ پر لگائی تھیں، وہ تہران کی اس بے رحم خاموشی میں دم توڑتا نظر آ رہا تھا۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ دشمن اب ہوشیار ہو چکا ہے اور اس نے اپنے بل بند کر لیے ہیں۔"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا،" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر ہم مزید یہاں بیٹھے رہے تو ہم خود شکار بن جائیں گے۔ چلو، واپس ہوٹل چلتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس بند گلی سے باہر نکلنے کا اب کیا راستہ ہے۔"ہم بوجھل قدموں کے ساتھ پارک سے باہر نکلے، یہ جانتے ہوئے کہ اب ہمیں کوئی نیا، زیادہ خطرناک اور غیر روایتی راستہ چننا ہوگا۔ پارکِ ملت سے ہوٹل واپسی کا سفر ہم نے خاموشی میں طے کیا۔ موبائل سروس معطل ہو گئی تھی اور سڑکوں پر فوجی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔ تہران کی سڑکوں پر مظاہرین اور پولیس کے

درمیان آنسو گیس کے گولے چل رہے تھے، مگر ہمارے اندر اس سے کہیں زیادہ دھواں بھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے، رامین نے غصے سے اپنی جیکٹ بیڈ پر پٹخی۔ کچھ تو غلط ہے!" رامین نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "دکان کا شٹر نہیں کھلا، پارک میں کوئی 'ڈیڈ ڈراپ' لینے نہیں آیا۔ پارکِ ملت میں چار گھنٹے کا وہ بے سود انتظار اور تسبیح والی دکان کا مستقل بند رہنا، یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ انٹیلیجنس ہم سے دو قدم آگے ہے۔ میں کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ نیچے سڑک پر ایک سیاہ رنگ کی گاڑی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ ایک غیر قانونی صحافی ہونے کے ناطے میری چھٹی حس مجھے مسلسل خطرے کی بو سونگھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ "خاموش رہو رامین،" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہمارا مشن ابھی ختم نہیں ہوا۔ وہ پانچ فرانسیسی کارڈز اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں دشمن تلملا رہا ہوگا کیونکہ اصل ڈیٹا ان کے پاس نہیں پہنچا۔ رامین نے غصے سے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ "لیکن ذیشان بھائی! انٹیلیجنس ہر جگہ موجود ہے ہمیں کوئی اور راستہ نکالنا ہوگا عمیر کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا پورا نیٹ ورک اب بلوں میں چھپ چکا ہوگا۔ وہ

صفائی والے ہوں یا الیکٹریشن، انہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ ان کا ساتھی پکڑا گیا ہے۔ اگر ہم اب ان کارڈز کو لے کر کسی حساس مقام کے قریب بھی پھٹکے، تو انٹیلیجنس ہمیں دبوچ لے گی۔

چھٹا باب ۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈیجیٹل محاذ

کمرے میں چھائی بوجھل خاموشی کو داریان کی دھیمی مگر پر اعتماد آواز نے توڑ دیا۔ اس نے اپنی عینک میز پر رکھی اور ہماری طرف جھک کر بولا: "دوستو! جب سامنے سے لڑنا خودکشی بن جائے، تو جنگ کا رخ بدل دیا جاتا ہے۔ تہران کی سڑکیں اس وقت بارود کا ڈھیر ہیں، لیکن اصل آگ اس وقت ڈیجیٹل دنیا میں لگی ہوئی ہے۔ ہمیں میدان میں اتر کر اپنی جان

جو کھوں میں ڈالنے کی ضرورت نہیں، ہم ایک ایسی 'خفیہ وار' شروع کریں گے جس کا مقصد تباہی نہیں بلکہ بچاؤ ہو گا۔ ہمیں ایران کے ان نوجوانوں کو اس آگ سے بچانا ہے جس میں اسرائیل فرانس اور دیگر قوتیں انہیں دھکیلنا چاہتی ہیں۔"میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہم ان کے شعور پر دستک دیں گے؟"داریان نے تائید میں سر ہلایا۔ "بالکل! حکومت نے انٹرنیٹ جام کر رکھا ہے، مگر پورا ایران اس وقت ٹیلی گرام کے خفیہ گروپس اور پراکسیز پر زندہ ہے۔ ہم ان کے موبائل فونز کے اندر گھسیں گے۔ ہم ان گروپس کا حصہ بنیں گے جہاں لاکھوں لوگ احتجاج کے نام پر جمع ہیں، اور وہیں سے حقائق بیان کر کے ان کے اندر وہ شعور بیدار کریں گے جو انہیں دشمن کا مہرہ بننے سے روک دے۔"ہم تینوں اس آئیڈیا پر غور کرنے لگے۔ ایک ریسرچر اور صحافی کے طور پر، یہ میرے لیے سب سے مقدس راستہ تھا۔ ہم نے بستر پر بیٹھ کر اپنی ڈائری کھولی اور اس نئی جنگ کا ڈھانچہ تیار کرنا شروع کیا جس کا مقصد ایران کے امن کو بچانا تھا۔"پلان یہ ہے،" میں نے پنسل سے ڈائری پر لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔ "ہم ایران کے نو بڑے شہروں کے احتجاجی گروپس میں شامل ہوں گے۔ ہمارا مقصد کسی کو ٹریس کرنا نہیں، بلکہ حقائق پیش کر کے ان لوگوں کی آنکھیں کھولنا ہے جو انجانے میں غیر ملکی ایجنڈے کا حصہ بن رہے ہیں۔"میں نے داریان اور رامین کی طرف دیکھ کر اپنی بات مکمل کی: رامین! تمہارا کام 'باغی' بننا ہو گا۔ تم گروپس میں عام شہری بن کر ایسے سوالات اٹھاؤ گے جو حکومت اور نظام کے خلاف ہوں، جو لوگوں کے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھیں

وہ سوالات کرو گے جو ہر ایرانی کی زبان پر ہیں میں نے رامین کو سمجھاتے ہوئے کہا، "تمہارا پہلا میسج کچھ اس طرح کا ہو گا:'آخر کب تک ہم اس نااہل نظام کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے؟ حکومت کی غلط معاشی پالیسیوں نے غریب کا چولہا ٹھنڈا کر دیا ہے اور اوپر سے یہ پولیس کا تشدد! کیا یہی وہ مستقبل ہے جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا؟ کیا ہماری آواز دبانے سے بھوک مٹ جائے گی؟'رامین نے اثبات میں سر ہلایا، اس کی آنکھوں میں اب اس 'کردار' کی چمک تھی۔ "صحیح! میں وہ دکھتی رگ چھیڑوں گا جس پر لوگ تڑپ اٹھیں گے۔"" بالکل!" میں نے بات آگے بڑھائی۔ جیسے ہی تم لوگوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھو گے، گروپس میں ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔لوگ تمہاری حمایت میں آئیں گے، میں اور داریان 'تجزیہ نگار' بن کر اپنا کام شروع کریں گے۔ ہم تمہاری بات کو غلط نہیں کہیں گے، بلکہ ہم اس میں ایک نیا زاویہ شامل کریں گے۔ ہم جواب دیں گے:'دوست! تمہارا غصہ بالکل بجا ہے، نظام کی خامیاں سب کے سامنے ہیں۔ لیکن ذرا غور کرو، جب ہم اپنے ہی شہروں میں آگ لگا رہے ہوتے ہیں، تو واشنگٹن،اسرائیل اور لندن میں بیٹھے لوگ کیوں جشن مناتے ہیں؟ وہ ہماری اس معاشی بدحالی کو اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

کیا اپنی ہی سڑکوں کو توڑنے اور عمارتوں کو گرانے اور اگ لگانے سے روٹی سستی مل جائے گیہمیں نظام سے لڑنا ہے، مگر اس طرح نہیں کہ دشمن ہمارے ہی گھر کو شام اور عراق بنا دے۔ ہمیں اپنا احتجاج اس غداری سے الگ کرنا ہو گا جو سرحد پار سے آپریٹ ہو رہی ہے ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم ان غداروں کو بولنے پر اکسائیں جو اس احتجاج کی آڑ میں اپنا ایجنڈا چلا رہے ہیں۔"میں نے بات جاری رکھی، "جب وہ غدار بولیں گے، تو ہمیں واضح فرق نظر آ جائے گا۔ ایک طرف وہ عام

شہری ہوں گے جن کا دکھ درد سچا ہے، جو مہنگائی اور حالات سے تنگ ہیں لیکن اپنے ملک سے پیار کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مہرے ہوں گے جو لوگوں کو جان بوجھ کر تباہی کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں۔ ان کے جوابات سے ہمیں پتہ چل جائے گا کہ کون ملک میں امن چاہتا ہے اور کون اس آگ کو مزید بھڑکانا چاہتا ہے۔" داریان نے جوش سے کہا، "یہ ہوئی نا بات! ہم نے ان کے غصے کو ختم نہیں کرنا، بلکہ اسے شعور کی طرف موڑنا ہے۔ ہم نے انہیں بتانا ہے کہ تمہاری جائز مانگوں کے پیچھے کون سے ناجائز ہاتھ چھپے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کے اندر یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنے ملک کے محافظ خود بنیں، نہ کہ کسی بیرونی سازش کا ایندھن بن کر اپنے ہی گھر کو جلائیں۔" داریان اور رامین نے اپنے لیپ ٹاپ میز پر سجا لیے، اور ایک ڈائری ساتھ رکھ لی جبکہ میں نے بھی اپنا موبائل فون نکال لیا اور
سنجیدگی سے کہا سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کل کن کن شہروں میں بڑے احتجاج ہونے جا رہے ہیں، ہم نے مختلف ذرائع اور ٹیلی گرام کے خبر رساں چینلز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ حالیہ دنوں کی صورتحال کے مطابق ہم نے ایران کے وہ نو شہر منتخب کیے جو احتجاج کا مرکز بنے ہوئے تھے: تہران، مشہد، اصفہان، تبریز، شیراز، کرج، زاہدان، سنندج اور رشت۔ ہم نے ان نو شہروں کے مقامی گروپس تلاش کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً 60 سے زائد ٹیلی گرام گروپس جوائن کر لیے۔ ہم نے ان میں سے دو بڑے شہروں—تہران اور مشہد—کو اپنے مشن کا مرکزی پوائنٹ چنا، کیونکہ وہاں سے اٹھنے والی لہر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہ محض میسجز نہیں بلکہ ایک 'نفسیاتی جنگ' ہے، اس لیے ہم نے بڑی عرق ریزی سے سوالوں کی لسٹ تیار کرنا شروع کی۔ رامین نے اپنی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے ایسے کڑے اور 'باغیانہ' سوالات وضع کیے جو کسی بھی عام ایرانی کے جذبات کو سیکنڈوں میں بھڑکا سکتے تھے۔ ہم نے بیٹھ کر سوالوں کی ایک لمبی لسٹ بنائی: حکومت کی معاشی نااہلی اور مہنگائی پر تیکھے وار۔ نوجوانوں کے مستقبل کی تاریکی اور پولیس کے سخت رویے کا ذکر۔ داریان اور میں نے مل کر ان سوالوں کے وہ جوابات بھی پہلے سے محفوظ کر لیے جو ہم نے 'تجزیہ نگار' بن کر دینے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ میں اور داریان کس طرح ان کے غصے کی تائید کریں گے لیکن آہستہ سے اس کا رخ 'قومی سلامتی' اور 'بیرونی سازش' کی طرف موڑ دیں گے تاکہ شعور کی بیدار ہو سکے۔
اس ذہنی مشق اور منصوبہ بندی میں ہم ایسے کھوئے کہ وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا کھڑکی کے باہر تہران کی روشنیاں مدہم پڑنے لگی تھیں اور گھڑی نے بتایا کہ عشاء کا وقت ہو چکا ہے۔ ہم نے کام روکا، ہوٹل سے ہی سادہ سا کھانا منگوایا اور خاموشی سے کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے وضو کیا اور کمرے کے ایک کونے میں جائے نماز بچھا کر باری باری عشاء کی نماز ادا کی۔ اس نماز میں ایک خاص قسم کا سکون تھا، کیونکہ اب ہمیں معلوم تھا کہ ہم اندھیرے میں تیر نہیں چلا رہے، بلکہ ایک منظم طریقے سے اپنے وطن اور اس خطے کے امن کے لیے لڑ رہے ہیں۔ نماز کے بعد میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دل سے بس یہی نکلا: "اے مالک! کل کا دن بہت بڑا ہے۔ تہران کی سڑکوں پر لہو بہنے والا ہے، تو ہمیں وہ طاقت دے کہ ہم اپنے لفظوں سے اس آگ کو ٹھنڈا کر سکیں اور دشمن کے مہروں کو پہچان سکیں۔ نماز اور دعا کے بعد ہم دوبارہ اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ کل کا دن بہت بھاری تھا۔ تہران کے میدانِ انقلاب میں اصل

احتجاج تو نو بجے شروع ہونا تھا، مگر ہم نے طے کیا تھا کہ ہم صبح 6 بجے سے ہی اپنا 'ڈیجیٹل وار' کا مشن شروع کر دیں گے۔ ہم چاہتے تھے کہ جب لوگ بستروں سے اٹھیں، تو ان کے فونز پر وہ سوالات موجود ہوں جو انہیں سوچنے پر مجبور کر دیں۔

"سب ٹھیک ہوگا،" داریان نے لائٹ بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔"انشاءاللہ،" رامین اور میں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

ہم نے آنکھیں موند لیں، مگر ہمارے ذہنوں میں وہ 60 گروپس اور ہزاروں لوگ گردش کر رہے تھے جن کے ضمیر پر ہمیں کل دستک دینی تھی۔ تہران کی اس خاموش رات میں، ہم تینوں ایک بڑے طوفان سے پہلے کی تیاری مکمل کر کے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

تہران کی ٹھنڈی ہواؤں میں
صبح کی اذان گونجنے لگی

تو ہم تینوں ایک نئی توانائی کے ساتھ بستروں سے اٹھے۔ وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ہم نے ہوٹل سے چائے اور نان کا ہلکا سا ناشتہ منگوایا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی ہم نے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں، پردے گرائے اور اپنے اپنے 'ہتھیار' سنبھال لیے۔ رامین نے اپنا فون پکڑا، داریان نے لیپ ٹاپ آن کیا اور میں نے اپنے آئی پیڈ پر نو شہروں کے ان 60 گروپس کی 'لائیو فیڈ' کھول لی۔گھڑی پر ٹھیک صبح کے 6 بج رہے تھے۔ ہمارا ہدف واضح تھا: اگلے 12 گھنٹے ہمیں اس ڈیجیٹل محاذ پر ڈٹے رہنا تھا۔ان ٹیلی گرام گروپس میں اس وقت عجیب سی بے چینی تھی۔ لوگ رات بھر کی جھڑپوں کی ویڈیوز شیئر کر رہے تھے اور غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ رامین نے پہلا وار کیا:"تہران والو! کیا اب بھی تمہیں سمجھ نہیں آرہا حکومت نے ہمیں بھوکا مار دیا ہے،ہمارے بچوں کا مستقبل تاریک ہے اور یہ پولیس ہمیں سڑکوں پر کچل رہی ہے۔ کیا ہم صرف مرنے کے لیے بنے ہیں؟ آخر اس نظام کی نااہلی کی سزا ہم کب تک بھگتیں گے؟"جیسے ہی رامین کا یہ میسج گروپ میں گیا، سیکنڈوں میں سیکڑوں کمنٹس آنے لگے۔ لوگ تڑپ اٹھے، وہ رامین کی بات سے اتفاق کر رہے تھے۔ غداروں اور بیرونی طاقتوں کے مہروں نے سوچا کہ یہ ان کے لیے بہترین موقع ہے۔ انہوں نے فوراً جواب لکھنا شروع کیے: "ہاں! اٹھو، توڑ پھوڑ کرو، سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دو، یہی بدلہ لینے کا وقت ہے اب ہماری باری تھی۔ میں نے اور داریان نے پہلے سے تیار شدہ 'کاؤنٹر میسجز' (Counter Messages) نکالے۔ ہم نے صرف ایک کلک کیا اور ہماری جدید ٹیکنالوجی کی بدولت وہ جواب محض 10 سیکنڈ کے اندر ان تمام 60 گروپس کے لاکھوں لوگوں تک پہنچ گیا۔ میں نے لکھا:"دوستو! رامین کی بات سچی ہے، نظام کی خامیاں سب کے سامنے ہیں۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، جب تم اپنے ہی ہسپتالوں اور اسکولوں کو آگ لگاتے ہو، تو کیا اس سے روٹی سستی ہو جاتی ہے؟ نہیں! بلکہ اس دھویں میں پیرس اور دیگر بیرونی طاقتیں اپنا الو سیدھا کرتی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم آپس میں لڑو تاکہ تمہارا ملک شام اور عراق بن جائے۔ دشمن تمہیں ہتھیار بنانا چاہتا ہے، ہوشیار رہو!" گروپس میں ہنگامہ برپا تھا۔ کچھ لوگ مشتعل ہو کر لکھ رہے تھے

کہ "آج تہران کو جلا دو!" جبکہ ہم اپنے ایک کلک سے محض 10 سیکنڈ میں لاکھوں لوگوں تک اپنا پیغام پہنچا رہے تھے۔ ہم نے غداروں کے ہر وار کو انہی پر الٹ دیا: غداروں کا میسج "یہ پولیس والے تمہارے قاتل ہیں، ان پر پتھراؤ کرو اور ان کی گاڑیاں جلا دو!" ہمارا جواب: "یاد رکھو! پولیس والا بھی اسی مٹی کا بیٹا اور تمہارا بھائی ہے۔ دشمن چاہتا ہے کہ ایرانی ہاتھ ایرانی کے خون سے رنگے جائیں۔ احتجاج تمہارا حق ہے، لیکن اپنے بھائیوں کا لہو بہا کر دشمن کے مہرے مت بنو!" اشتعال انگیز میسج: "سرکاری عمارتوں اور ہسپتالوں کو آگ لگاؤ تاکہ یہ نظام مفلوج ہو جائے!" ہمارا جواب: "یہ عمارتیں کسی حکومت کی نہیں، تمہارے ٹیکس کے پیسوں سے بنی عوامی املاک ہیں۔ انہیں جلا کر تم اپنی ہی سہولتیں ختم کرو گے۔ کیا شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا کر روٹی سستی ہو جائے گی؟
مغربی ایجنڈا: "مغرب ہماری آزادی کا حامی ہے، ہمیں ان کی مدد لینی چاہیے!" ہمارا جواب: "لیبیا، شام اور عراق کی 'آزادی' دیکھ لو۔ جو مغرب آج تمہیں اکسا رہا ہے، وہی کل تمہاری تباہی پر تالیاں بجائے گا۔ اپنی آزادی کی جنگ خود لڑو، دشمن کی بیساکھیوں پر نہیں
نظام کے خلاف وار: "یہ ملک رہنے کے قابل نہیں رہا، سب کچھ تباہ کر دو!"
ہمارا جواب: "گھر میں آگ لگ جائے تو گھر سے نہیں بھاگا جاتا، آگ بجھائی جاتی ہے۔ غداروں کو پہچانو جو تمہارے غصے کو ملک دشمنی میں بدلنا چاہتے ہیں۔ شعور پیدا کرو، تخریب کاری نہیں دوپہر کے بارہ بجے جب احتجاج عروج پر پہنچا، تو تہران اور دیگر شہروں میں صورتحال ملی جلی تھی۔ کچھ جگہوں پر توڑ پھوڑ ہو رہی تھی، انتہا پسند اور کچھ لبرل طبقہ لوگوں کو بھڑکا رہے تھے، لیکن ہمارے ڈیجیٹل وار کا اثر صاف نظر آ رہا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کے ذہنوں میں ہماری باتیں بیٹھ چکی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ ہجوم میں موجود بہت سے لوگ اب دوسروں کو روک رہے تھے: "نہیں بھائی! یہ ہمارا اپنا شہر ہے، اسے مت جلاؤ!" 2 بجے کے قریب میدانِ انقلاب سے لے کر خیابانِ ولی عصر تک ہر جگہ لوگوں کے ہجوم۔ ہم اس افراتفری کے بیچوں بیچ اپنی 'ڈیجیٹل وار' کے عروج پر تھے۔ ایک طرف دشمن کے ایجنٹ گروپوں میں آگ لگا رہے تھے: "آج موقع ہے، تہران کی دیوار سے دیوار بجا دو! یہ تمہاری آزادی کی صبح ہے!" اسکرین پر ہم دیکھ رہے تھے کہ لبرل طبقے کے نوجوان اور انتہا پسند عناصر کس طرح جنون کی حد تک بپھرے ہوئے تھے۔ خواتین سڑکوں کے بیچوں بیچ کھڑی زن، زندگی، "آزادی! آزادی!" کے نعرے لگا رہی تھیں۔ کچھ لبرل گروہ انگریزی اور فارسی میں پلے کارڈز اٹھائے عالمی میڈیا کو پکار رہے تھے، جبکہ انتہا پسندوں کا ٹولہ سرکاری گاڑیوں کو الٹا کر انہیں آگ لگا رہا تھا۔ ہر طرف دھواں، چیخ و پکار اور ٹوٹتے ہوئے شیشوں کی آوازیں تھیں۔ ہم نے فوری جوابی کارروائی شروع کی۔ رامین نے 'باغی' کے روپ میں اشتعال انگیز لہجہ اپنایا تاکہ غداروں کا رخ اپنی طرف موڑ سکے: "لوگو! دیکھو پولیس کیا کر رہی ہے، کیا ہم خاموش رہیں؟" جیسے ہی اس کے میسج پر انتہا پسندوں نے تخریب کاری کے مشورے دینا شروع کیے، میں اور داریان نے اپنے 'شعور بیدار' کرنے والے میسجز کی بوچھاڑ کر دی۔
ہماری انگلیاں کی بورڈ پر کسی مشین گن کی طرح چل رہی تھیں۔ ہم نے ایک کلک کے ساتھ لاکھوں لوگوں کے موبائلوں

پر دستک دی: "ایران کی بیٹیوں اور بیٹوں! آزادی کا نعرہ لگانے والوں کی شکلیں پہچانو۔ یہ جو آج تمہیں اپنے ہی شہر کو راکھ بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں، ان کے پاسپورٹ پیرس اور لندن کے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہی گھر کی چھت گرا دو تاکہ وہ باہر بیٹھ کر تالیاں بجائیں۔ ہوشیار رہو، یہ احتجاج تمہارا حق ہے، مگر اسے دشمن کا ہتھیار مت بننے دو!" لوگوں کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا اور پیرس و لندن سے آنے والے پیغامات انہیں مسلسل اکسا رہے تھے کہ "آج پیچھے مت ہٹنا، تہران کو راکھ بنا دو!"

لیکن اسی ہنگامے کے بیچ ایک دوسرا رخ بھی نمودار ہو رہا تھا۔ وہ لوگ جو ایران کے استحکام اور موجودہ نظام کے حق میں تھے، وہ بھی اب سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ہم نے اپنی سکرینوں پر دیکھا کہ عام شہری، بزرگ اور وہ خاندان جو اپنے ملک کو شام یا عراق بنتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، وہ ان مشتعل گروہوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔

ہماری 'ڈیجیٹل وار' ان لوگوں کے لیے ایک بڑا سہارا بن چکی تھی۔ ہم نے ٹیلی گرام گروپس میں ان 'حامیوں' کو وہ دلائل اور نقشے فراہم کیے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ اس احتجاج کی آڑ میں غیر ملکی ایجنٹ کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں

جب سورج البرز کے پہاڑوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا، تو تہران کی سڑکیں لہو، راکھ اور زہریلے دھوئیں سے اٹی ہوئی تھیں۔ فضا میں ابھی تک جلے ہوئے ٹائروں کی بو رچی ہوئی تھی، مگر وہ 'بڑی تباہی' نہیں ہوئی تھی جس کا منصوبہ تل ابیب اور پیرس کے سیف ہاؤسز میں تیار کیا گیا تھا۔ تہران کے ساتھ ساتھ مشہد، اصفہان اور تبریز جیسے شہروں میں بھی احتجاج عروج پر رہا، مگر شام ڈھلتے ہی سڑکوں پر ایک عجیب سی تھکن چھا گئی۔ کئی مقامات پر سیکیورٹی فورسز پسپائی اختیار کر رہی تھیں تو کہیں مظاہرین خود ہی تھک کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ہم نے اپنی سکرینوں پر دیکھا کہ لاکھوں نوجوانوں کے ذہنوں میں ہماری یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ احتجاج تمہارا حق ہے، مگر اپنے ہی گھر کو جلانا دشمن کی خدمت ہے۔ ہم نے مکمل طور پر تو نہیں، مگر کافی حد تک ان حالات کو ایک ہولناک خانہ جنگی میں بدلنے سے روک دیا تھا۔ واشنگٹن اور لندن کے ہیڈکوارٹروں میں بیٹھے سازشی لوگ جو آج تہران کی سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر دیکھنا چاہتے تھے، وہ آج مایوس تھے کیونکہ شعور کی دستک ان کے پروپیگنڈے سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی تھی

پورے 12 گھنٹے تک اسکرینوں پر نظریں جمائے رکھنے اور کی بورڈ پر انگلیاں چلانے کے بعد ہم تینوں اب نڈھال ہو چکے تھے۔ ہماری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور تھکن ہڈیوں میں اتر چکی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ کا ڈھکن گرایا تو کمرے میں چھائی خاموشی کسی دھماکے کی طرح محسوس ہوئی۔

"اج کا دن بہت اہم تھا،" رامین نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ "ہم نے ان لوگوں کے ضمیر پر دستک دی ہے جو دشمن کے مہرے بننے جا رہے تھے۔" داریان نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھی اور بہت دھیمی آواز میں بولا: "ہم نے آج صرف ڈیجیٹل وار نہیں لڑی، بلکہ تہران کی روح کو بچایا ہے۔ اب حالات کو دیکھنا ہو گا کہ کل سورج کیا نیا پیغام لاتا ہے، لیکن ایک بات طے ہے کہ اب دشمن کو نیا راستہ ڈھونڈنا پڑے گا۔

ساتواں باب ۔۔۔۔۔ ڈبل کراس

ہم نے ہوٹل سے کھانا منگوایا۔ وہی ایرانی کباب اور نان، مگر آج ان کا ذائقہ جیت کے سکون اور تھکن کے کرب سے ملا جلا تھا۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا، کوئی بات نہیں ہوئی، صرف برتنوں کی آوازیں اس بوجھل خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ہم دوبارہ اپنی اپنی نشستوں پر ڈھیلے پڑ کر بیٹھ گئے۔ تہران کی ٹھنڈی ہوا اب کھڑکی کے پردوں کو ہلا رہی تھی، جیسے شہر بھی اس خونریز دن کے بعد لمبی سانس لے رہا ہو۔میں نے میز پر پڑے لیپ ٹاپ اور اپنے فون کی طرف دیکھا۔ اور داریان اور رامین سے پوچھا"اب اگے کیا کیا جائے؟" یہ سوال میرے ذہن میں بار بار اٹھ رہا تھا۔ دشمن خاموش نہیں بیٹھے گا، یقیناً انہوں نے لاکھوں میسجز کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہوگی اور کر بھی رہیں گے۔ ہم ایک بند گلی میں تھے، جہاں پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا اور آگے کا راستہ دھندلا تھا۔داریان نے اپنی سرخ آنکھوں کو مسلا اور ایک کونے میں پڑے میرے اس سیاہ سفری بیگ کی طرف دیکھا، جس کے اندر وہ حساس "بلوچستان انویسٹی گیشن فائل" موجود تھی۔ "دیکھو،" داریان کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا، "تہران کی سڑکوں پر احتجاج ابھی تھما نہیں ہے۔آپ کو پتہ ہے کہ اس وقت کیا حالات ہیں؟" ایرانی انٹیلیجنس اس وقت ہر اس شخص کو ڈھونڈ رہی ہے جو ان مظاہروں کے پیچھے ہے۔ ہم نے ڈیجیٹل وار میں ان کی مدد تو کی ہے، لیکن آپ کا غیر ملکی ہونا اور آپ کے پاس یہ بلوچستان فائل ہونا، آپ کو کسی بھی وقت مشتبہ بنا سکتا ہے۔"میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "داریان، ہم نے تو ان کے نظام کو بچایاہے!"داریان نے سرد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، نظام جذبات پر نہیں، شک پر چلتا ہے اگر کسی چیک پوسٹ پر یہ فائل کھل گئی تو وہ اسے جاسوسی کا مواد سمجھیں گے، صحافتی رپورٹ نہیں۔سیکورٹی فورسز ہر مشتبہ بیگ اور ہر غیر ملکی کی تلاشی لے رہی ہیں۔ اگر یہ فائل کسی غلط ہاتھ لگ گئی، تو تمہاری صحافتی ساکھ اور ہماری زندگی، دونوں داؤ پر لگ جائیں گی۔"رامین نے، جو اب تک خاموشی سے اپنی انگلیاں میز پر تھپتھپا رہا تھا، میری طرف دیکھ کر تائید کی۔"داریان ٹھیک کہہ رہاہے۔ یہ فائل صرف کاغذ کا پلندہ نہیں،بلکہ بلوچستان کا وہ نقشہ ہے جسے دشمن ایجنسیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم بھلے صحافی ہو، مگر ایرانی انٹیلیجنس کے

لیے اس وقت ہر وہ شخص مشتبہ ہے جس کے پاس سرحد پار کی اتنی حساس معلومات ہوں۔میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم اس فائل کو تین حصوں میں تقسیم کر دیں یا اسے کسی ایسی جگہ 'ڈمپ' (Dump) کر دیں جہاں سے ہم اسے مشن مکمل ہونے کے بعد اٹھا سکیں۔" ہم نے کافی دیر بحث کی آخر کار ہم تینوں نے مل کر ایک پیشہ ورانہ منصوبہ بنایا۔ طے یہ پایا کہ اگلے تین چار دن، جب تک یہ احتجاجی لہر اور تلاشی کا عمل ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا، اس فائل کو ہوٹل کے کمرے سے نکال کر کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں کسی کا گمان بھی نہ جا سکے۔

داریان نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں لگی اس پرانی ایئر کنڈیشننگ ڈکٹ (AC Duct) کی طرف اشارہ کیا جو اب استعمال میں نہیں تھی اور دیوار کے اندر گہرائی تک جاتی تھی۔ "یہ جگہ ٹھیک ہے۔ ہم فائل کو ایک واٹر پروف اور ہیٹ پروف بیگ میں سیل کریں گے اور اسے اس ڈکٹ کے اندر کافی دور تک دھکیل دیں گے۔ تین چار دن کی بات ہے، جب شہر کے حالات معمول پر آئیں گے، ہم اسے نکال کر اپنے اگلے مشن پر نکل جائیں گے۔"

ہم نے مل کر اس منصوبے پر عمل کیا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس فائل کو پلاسٹک کی کئی تہوں میں لپیٹا اور ٹیپ سے اچھی طرح سیل کر دیا۔ رامین نے باہر راہداری میں پہرہ دیا تاکہ کوئی ملازم یا سیکورٹی والا ادھر نہ آئے۔ میں اور داریان اس پرانے اے سی یونٹ کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے فائل کو اس تاریک اور گرد آلود راستے میں کافی اندر تک پہنچا دیا اور اوپر سے لوہے کی جالی دوبارہ پیچ لگا کر بند کر دی۔ہم اپنی اپنی نشستوں پر واپس آ گئے۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے سینے سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ فائل، جو اب تک میرے اعصاب پر سوار تھی، اب اس پرانی اے سی ڈکٹ (Duct) کی اندھیری گہرائیوں میں محفوظ ہو چکی تھی۔"شکر ہے،" رامین نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "تہران کی انٹیلیجنس اس وقت بہت تپے ہوئے شیر کی طرح ہے۔ اگر وہ ہوٹل میں تلاشی کے لیے آتے بھی ہیں، تو انہیں یہاں صحافتی کاغذات کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔"داریان نے میز پر پڑا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی مگر لہجہ اب بھی اسی مخلصی سے بھرپور تھا جو اصفہان کے پہلے دن سے ہمارا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ "بھائی! آپ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ تین چار دن میں جب یہ احتجاج کی لہر ذرا مدھم پڑے گی، تو ہم پرسکون ہو کر اپنا اگلا قدم اٹھائیں گے۔"

ٹی وی سکرین پر ایران انٹرنیشنل اور بی بی سی فارسی کی سرخیاں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ تہران کے مختلف علاقوں خصوصاً 'انقلاب اسکوائر' اور 'آزادی ٹاور' کے مناظر دکھائے جا رہے تھے جہاں پولیس اور مظاہرین کے درمیان جھڑپیں جاری تھیں۔دیکھو رامین،" میں نے سکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہ لوگ کس طرح حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ ہمارا ڈیجیٹل مشن کتنا ضروری تھا، یہ آج کی خبریں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے۔"رامین نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ "یہ میڈیا وار ہے بھائی، اور ہم اس کے ہراول دستے ہیں۔"

ہم کافی دیر تک ان خبروں کا تجزیہ کرتے رہے کمرے میں ایک عجیب سی اپنائیت چھا گئی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، مگر ان کٹھن حالات نے ہمیں ایک خاندان بنا دیا تھا۔ باتوں باتوں میں کب آنکھیں بوجھل ہونے لگیں،

پتہ ہی نہیں چلا۔ "چلو اب سو جاتے ہیں،" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اللہ خیر کرے گا، کل کا دن نئی امید لے کر آئے گا۔
ہم تینوں اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے تھکن سے چور، اس انجانے خوف سے بے نیاز ہو کر گہری نیند کی وادیوں میں اتر گئے، جیسے تہران کا یہ چھوٹا سا کمرہ دنیا کا محفوظ ترین قلعہ ہو۔ تہران کی اگلی صبح ایک عجیب سی خاموشی اور تازگی کا امتزاج تھی۔ فجر کی اذانوں کی سحر انگیز آوازیں البرز کے پہاڑوں سے ٹکرا کر پورے شہر میں گونج رہی تھیں، جو روح کو ایک عجیب سا سکون بخش رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکایا تو باہر تہران کی سڑکیں ابھی بیدار ہو رہی تھیں۔ رات کی بارش نے گرد و غبار دھو دیا تھا، مگر فضا میں ابھی تک ایک ان دیکھی بے چینی رچی ہوئی تھی۔ ہم تینوں نے وضو کیا اور کمرے میں ہی نماز ادا کی۔ دعا کے بعد ایک خاموش سا عزم ہم سب کے چہروں پر تھا۔ نماز کے بعد ہم ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھ گئے آج کا دن صحافتی اعتبار سے بہت اہم ہے،" میں نے گرم چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان لوگوں کے بیچ جانا ہوگا جو سڑکوں پر ہیں، تاکہ دنیا کو وہ سچ دکھا سکیں جو مغربی میڈیا چھپا رہا ہے۔"
داریان نے اپنا کیمرہ بیگ چیک کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "بالکل بھائی! احتجاجی مقامات پر سختی ہوگی، لیکن بطور رپورٹر ہمارا وہاں ہونا ضروری ہے۔ رامین، تم نقشے پر ان مقامات کو نشان زد کر لو جہاں آج بڑے اجتماعات کی توقع ہے۔" ہم نے ناشتہ ختم کیا اور اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوٹل سے نکل پڑے۔ تہران کی سڑکوں پر پولیس اور "پاسدارانِ انقلاب" کی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔ ہم 'ولی عصر' ایونیو سے ہوتے ہوئے اس مقام کی طرف بڑھے جہاں مظاہرین جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہمارے پاس پریس کارڈز نمایاں تھے، مگر ماحول کی سنگینی ہمیں مسلسل چوکنا رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جگہ جگہ ٹائروں کے جلنے کا دھواں فضا کو بوجھل بنا رہا تھا۔ ہم نے مختلف لوگوں سے بات چیت شروع کی۔ کچھ جذباتی نوجوان تھے جو نعرے لگا رہے تھے، اور کچھ ایسے بوڑھے شہری جو خاموشی سے سائیڈ پر کھڑے اس ہنگامے کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے مائیک سنبھالا اور ایک ادھیڑ عمر شخص کا انٹرویو شروع کیا جو ایک دکان کے باہر کھڑا تھا۔ "آپ ان حالات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا یہ واقعی عوامی احتجاج ہے یا اس کے پیچھے کچھ اور بھی ہے؟" اس شخص نے گہری نظروں سے کیمرے کی طرف دیکھا اور فارسی میں جواب دیا، جس کا ترجمہ رامین ساتھ ساتھ کر رہا تھا۔ "بیٹا! احتجاج ہمارا حق ہے، مگر جب ہمارے ملک کی جائیدادوں کو آگ لگائی جاتی ہے، تو ہمیں سمجھ آ جاتی ہے کہ یہ ہاتھ ہمارے اپنے نہیں، سرحد پار بیٹھے دشمنوں کے ہیں۔" داریان مہارت سے ان مناظر کو فلمبند کر رہا تھا۔ اس کی نظریں صرف مظاہرین پر نہیں تھیں، بلکہ وہ ان مشکوک چہروں کو بھی کیپچر کر رہا تھا جو ہجوم کو اکسا رہے تھے۔ ہم دوپہر تک مختلف مقامات کا دورہ کر چکے تھے، لوگوں کے جذبات ریکارڈ کر رہے تھے اور وہ سچائی اکٹھی کر رہے تھے جو میری اس "بلوچستان فائل" کی طرح حساس اور قیمتی تھی۔ دوپہر کے وقت جب ہم 'انقلاب اسکوائر' کے قریب پہنچے، تو اچانک ہجوم میں ہلچل مچ گئی۔ آنسو گیس کے گولے فضا میں بلند ہونے لگے اور بھگدڑ مچ گئی۔ انقلاب اسکوائر' کے اطراف میں دھوئیں کے بادل اتنے گہرے تھے کہ سورج کی روشنی بھی دھندلا گئی تھی۔ رامین نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا، "بھائی! یہاں رکنا اب خطرے سے خالی

نہیں۔ پولیس نے گھیرا تنگ کر دیا ہے اور راستے بلاک ہو رہے ہیں۔"اسی دوران رامین کے فون کی سکرین روشن ہوئی۔ یہ ہمارے ہوٹل کے مینیجر کا فون تھا۔ اس کا لہجہ شدید گھبراہٹ میں تھا، "آغا! جلدی واپس آ جائیے، سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر ہم ہوٹل دو دن کے لیے مکمل بند کر رہے ہیں۔ ہمیں حکم ملا ہے کہ تمام مہمان فوری طور پر اپنا سامان سمیٹ لیں۔"ہماری پیشانیوں پر پسینہ آ گیا۔ شہر کے حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے اور اب ہمیں فوراً وہاں سے نکلنا تھا۔

جب ہم ہوٹل کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہاں جنگ کا سماں ہے۔ پولیس کی بھاری نفری نے ہوٹل کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور مظاہرین کے پتھراؤ کے جواب میں شدید شیلنگ ہو رہی تھی۔ رامین نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم ابھی اندر نہ گئے تو پولیس ہوٹل کو 'نو گو ایریا' بنا دے گی اور ہمارا سامان اندر رہ جائے گا

بھائی! یہاں سے اندر جانا خطرے سے خالی نہیں،" داریان نے میری طرف دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔ "آپ غیر ملکی صحافی ہیں، اگر پولیس نے واپسی پر یہاں روک کر تلاشی لی تو وہ 'بلوچستان فائل' ان کے ہاتھ لگ جائے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اور رامین پچھلی گلی والے طویل راستے (Back Entrance) سے اندر داخل ہونے کی کوشش کریں۔ میں یہاں مین گیٹ پر پولیس والوں کو انگیج کرتا ہوں، اگر وہ مجھے اندر جانے دیں تو میں اوپر پہنچ کر آپ کا انتظار کروں گا۔"ہمیں داریان کی بات میں وزن لگا۔ میں اور رامین مڑے اور پچھلی گلی کے اس طویل اور پیچیدہ راستے کی طرف بھاگے جہاں سے ہوٹل کا سروس گیٹ تھا۔ ہم ہانپتے ہوئے پچھلے گیٹ پر پہنچے، مگر وہاں لوہے کا بڑا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کھولو! ہم ہوٹل کے مہمان ہیں!"تقریباً پانچ منٹ بعد ایک بوڑھا گارڈ نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر خوف تھا۔ "آغا! معذرت، پولیس نے حکم دیا ہے کہ تمام ذیلی راستے فوری طور پر سیل کر دیے جائیں۔ آپ مین گیٹ کی طرف جائیں، وہاں سے شاید راستہ مل جائے۔"

ہم نے بہت بحث کی، منتیں کیں، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہمیں واپس مڑ کر مین گیٹ کی طرف آنا پڑا۔

جب ہم دوبارہ مین گیٹ کی طرف پہنچے، تو دیکھا کہ وہاں اب پولیس نے خاردار تاریں بچھا دی تھیں اور کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی ہجوم میں ہمیں داریان نظر آیا جو پولیس والوں سے بحث کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تیزی سے ہماری طرف لپکا۔"بھائی! یہاں بھی دروازہ بند ہو چکا ہے۔

پولیس نے ابھی ابھی آرڈر دیا ہے کہ ہوٹل کو مکمل 'سیل' کر دیا جائے۔ میں نے اندر جانے کی بہت کوشش کی، مگر انہوں نے دھکا دے کر باہر نکال دیا۔"

رامین نے غصے سے دیوار پر ہاتھ مارا۔ "اس کا مطلب ہے ذیشان کی فائل اور ہمارا باقی سامان اب اندر پھنس چکا ہے؟" داریان نے بوجھل آواز میں جواب دیا، "لگتا تو یہی ہے بھائی۔ اب یہاں رکنا خودکشی ہے۔ پولیس تلاشی کے لیے اوپر جا رہی ہے،اور جو ان لوگ ہیں انکو باہر نکال رہی ہے ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

ہوٹل کے سیل ہونے کے بعد ہم نے وقت ضائع نہیں کیا۔ ہم تہران کے مختلف مضافاتی علاقوں میں گھومتے رہے، جہاں احتجاج کی شدت ابھی برقرار تھی۔ داریان مہارت سے کیمرہ چلا رہا تھا اور میں مختلف طبقہ فکر کے لوگوں کے انٹرویو کر رہا

تھا۔ ہم نے خود کو عام سیاحوں کے روپ میں چھپائے رکھا تاکہ انٹیلیجنس کی نظروں میں نہ آئیں۔شام ڈھلے ہم ایک چھوٹے سے گیسٹ ہاؤس میں پناہ گزین ہوئے۔ پوری رات ہم نے اس ویڈیو مواد کو ایڈٹ کرنے اور اپنی رپورٹ مرتب کرنے میں گزاری۔ رامین نقشوں پر ان مقامات کی نشاندہی کر رہا تھا جہاں بدامنی کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ واضح تھا۔ ہم نے ایک مکمل فائل تیار کی، کھانا کھایا اور تھکن سے چور ہو کر اگلے دن کے مشن کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے سو گئے۔اگلی صبح تہران کی فضا کچھ بدلی ہوئی تھی۔ احتجاج کا زور ٹوٹ چکا تھا اور سیکیورٹی فورسز نے شہر کے مرکزی حصوں پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ہم دوپہر کے وقت ایک قریبی گلی میں کھڑے کچھ مقامی دکانداروں کے انٹرویو کر رہے تھے کہ اچانک رامین فون کی گھنٹی بجی یہ ہوٹل کے مینیجر کی کال تھی۔ "آغا حالات قابو میں ہیں اور ہوٹل دوبارہ کھول دیا گیا ہے۔ہم نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ہوٹل کا رخ کیا۔ جب ہم ہوٹل کی گلی میں داخل ہوئے، تو وہاں کا منظر ہماری توقعات سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔ ہوٹل کے سامنے والے حصے کے شیشے چور چور تھے اور لابی میں جابجا پتھر بکھرے ہوئے تھے۔
ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کی حالت دیکھ کر میرے قدم وہیں جم گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ احتجاج کرنے والوں نے اس کمرے کو خاص طور پر نشانہ بنایا تھا۔ کھڑکی کے پردے پھٹے ہوئے تھے اور فرش پر اینٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔
میری نظریں سیدھا اس اے سی یونٹ (AC Duct) کی طرف اٹھیں جہاں میں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی، وہ "بلوچستان فائل" چھپائی تھی۔ میرا دل ڈوب گیا۔وہ لوہے کی جالی، جو دیوار کے ساتھ پیوست ہونی چاہیے تھی، اب اکھڑ کر فرش کے دوسرے کونے میں بے دردی سے پھینک دی گئی تھی۔ اے سی کا اندرونی ڈھانچہ بری طرح ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے پرزے باہر کی طرف لٹک رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے بھاری ڈنڈوں یا پتھروں سے اس لوہے کی چادر کو چیرنے کی کوشش کی ہو۔ دیوار کا پلستر جھڑ کر فرش پر ملبے کی صورت پھیلا ہوا تھا۔
میں دیوانہ وار اس کھلے ہوئے سوراخ کی طرف لپکا۔ میں نے مٹی اور گرد کے بیچ اپنا ہاتھ اندر دھکیلا۔ میرا بازو اے سی کی تیز دھاتی چادر سے رگڑ کھا گیا، مگر مجھے اس وقت کسی درد کا احساس نہیں تھا۔ میں نے اس تاریک سوراخ کے آخری کونے تک ہاتھ مارا... مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔وہ واٹر پروف تھیلی، وہ برسوں کی محنت، وہ حساس "بلوچستان فائل"... سب غائب تھی۔داریان کی نظر جب اس کھلی ہوئی ڈکٹ اور فرش پر بکھرے ہوئے ملبے پر پڑی، تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "فائل... فائل کہاں گئی؟"میں نے لرزتی آواز میں کہا، "وہ غائب ہے داریان... کوئی اسے لے گیا! وہ سب کچھ لے گیا!"میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا، میرا دماغ سن ہو چکا تھا۔ اس فائل میں صرف کاغذات نہیں تھے، اس میں بلوچستان کی روح تھی۔
اس میں ان باغی گروہوں کے خفیہ ٹھکانوں کی نشان دہی تھی جو ریاست کے خلاف صف آرا ہیں۔ میں نے ایک ایک قبیلے کے معتبروں سے مل کر وہ انٹرویوز ریکارڈ کیے تھے جو ثابت کرتے تھے کہ کون غیر ملکی اشاروں پر ناچ رہا ہے اور کون وطن کا وفادار ہے۔"

۔ "اس میں وہ منفرد قبائلی معاہدے تھے جو برسوں کی محنت سے سامنے آئے تھے۔ وہ 'حساس راستے' جن کے ذریعے سرحد پار سے اسلحہ اور تخریب کار لائے جاتے ہیں... وہ سب اس میں درج تھا۔ رامین نے غصے اور بے بسی میں اپنی مٹھی دیوار پر ماری۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ "بھائی، ہم نے تہران کو بچانے کی فکر کی، مگر ساتھ ہی ذیشان کی وہ متاع کھو دی جس کی حفاظت کا حلف اٹھایا تھا۔ ہم لٹ گئے بھائی، ہم بری طرح لٹ گئے!" داریان فرش پر ڈھیر ہو گیا، اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کے کندھے لرز رہے تھے جیسے وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر پا رہا ہو۔ "اوہ خدایا! یہ کیا ہو گیا؟ میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔ کمرے میں ایک بوجھل خاموشی چھا گئی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے، مگر ہماری نظریں نیچی تھیں۔ ایک ایسا نقصان ہو چکا تھا جس کی تلافی ناممکن لگ رہی تھی۔ "اب کیا کیا جائے؟" رامین نے خالی نظروں سے فرش کو تکتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آواز میں وہ شکست خوردگی تھی جو ایک سپاہی کو اپنے ہتھیار کھونے پر ہوتی ہے۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ "پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ یہ ہوا کیسے؟ کیا یہ واقعی کسی ایجنسی کا کام ہے یا محض احتجاج کرنے والوں کی توڑ پھوڑ؟ بھائی! کیا ہم ہوٹل کے مینیجر کے پاس جا کر سی سی ٹی وی (CCTV) کیمروں کی ریکارڈنگ نہ نکلوائیں؟" میں نے ایک تجویز پیش کی۔ داریان نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کے بادل تھے۔ "بھائی، یہ رسک بہت بڑا ہے۔ اگر ہم ریکارڈنگ مانگیں گے تو ہمیں بتانا پڑے گا کہ ہم وہاں کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔ مینیجر کو شک ہو جائے گا کہ ایک غیر ملکی صحافی نے اے سی ڈکٹ کے اندر ایسا کیا چھپایا تھا؟ وہ پولیس کو بلا لے گا اور معاملہ الٹا ہمارے گلے پڑ جائے گا۔" رامین نے تائید کی۔ "داریان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اور پھر کیا پتہ مینیجر خود اس سب میں ملوث ہو؟ کیا پتہ اس نے خود وہ فائل دیکھی ہو اور خاموشی سے نکال لی ہو؟

میرے ذہن میں اب ہزاروں سوال ایک ساتھ جنم لے رہے تھے۔ "لیکن رامین، دیکھو تو سہی... یہ اے سی یونٹ جس طرح ٹوٹا ہوا ہے، یہ کسی ماہر ایجنٹ کا کام نہیں لگتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے ڈنڈوں اور پتھروں سے اسے بے دردی سے کچلا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ جب کل باہر احتجاج ہو رہا تھا، کچھ بلوائی ہوٹل کے اندر گھس آئے ہوں؟ شاید انہوں نے توڑ پھوڑ کے دوران محض تجسس میں اس جالی کو اکھاڑا ہو اور وہ فائل ان کے ہاتھ لگ گئی ہو؟"" اور اگر ایسا ہے،" داریان نے بات آگے بڑھائی، "تو شاید انہوں نے اسے قیمتی سمجھ کر رکھ لیا ہو یا پھر... یا پھر بے کار کاغذات سمجھ کر ہوٹل کے باہر سڑک پر کہیں ملبے میں پھینک دیا ہو۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی کوئی ہمارے پیچھے لگا تھا اور اسے اس جگہ کا پتہ تھا؟ یا یہ محض ایک بدقسمت اتفاق تھا کہ مظاہرین نے اسی کمرے اور اسی کونے کو نشانہ بنایا؟ تہران کی اس بوجھل دوپہر میں ہم ایک ایسی بند گلی میں کھڑے تھے جہاں ہر راستہ دھندلا تھا۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ کیا اس فلور پر کوئی اور کمرہ بھی اسی طرح تباہ ہوا ہے؟" میں نے مٹھی بھینچتے ہوئے کہا۔ "اگر صرف ہمارا کمرہ نشانہ بنا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ کسی کو ہماری لوکیشن کا پتہ تھا۔ لیکن اگر پورا ہوٹل اسی حال میں ہے، تو پھر شاید یہ محض ہجوم کا غصہ تھا۔" ہم تینوں—میں، رامین اور داریان—مختلف سمتوں میں بٹ گئے۔ رامین نے ہوٹل کی پچھلی سیڑھیوں اور لانڈری ایریا کا

رخ کیا، جبکہ داریان نے تیسری منزل کی راہداریوں میں گھومنا شروع کیا تاکہ یہ دیکھ سکے کہ آیا کسی اور کمرے کی جالی یا اے سی یونٹ کو بھی اسی طرح نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں خود سیدھا نیچے لابی کی طرف بڑھا جہاں ہوٹل کا مینیجر پریشانی کے عالم میں فون پر کسی سے الجھ رہا تھا۔

لابی کا منظر جنگ زدہ علاقے جیسا تھا۔ ٹوٹے ہوئے گلدان، جلے ہوئے قالین اور جا بجا بکھرے ہوئے کاغذات اس ہنگامے کی گواہی دے رہے تھے۔ میں نے مینیجر کے قریب جا کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔ "آغا! ہمارے کمرے کی حالت بہت بری ہے،" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہاں نہ صرف توڑ پھوڑ ہوئی ہے بلکہ دیوار میں نصب اے سی یونٹ تک اکھڑا پڑا ہے۔ یہ سب کیسے ہوا؟" مینیجر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے فارسی میں جواب دیا، جس کا مفہوم صاف تھا: "جناب! کل جب پولیس نے پیچھے ہٹنا شروع کیا تو مظاہرین کا ایک ریلا ہوٹل کے اندر گھس آیا تھا۔ انہوں نے اوپر کے فلورز پر جو کچھ ملا اسے توڑ ڈالا۔ پتھراؤ اتنا شدید تھا کہ کھڑکیاں ٹوٹ گئیں اور کئی لوگ اندر داخل ہو کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ہمیں خود اپنی جان بچانے کے لیے تہ خانے میں پناہ لینی پڑی۔ ہم آپ کے نقصان کا نوٹس لیں گے، مگر فی الحال پورا ہوٹل اسی حال میں ہے۔" میں واپس اوپر آیا تو رامین اور داریان بھی اپنے معائنے کے بعد پہنچ چکے تھے۔ ہم نے ایک بار پھر اس بکھرے ہوئے ملبے کا جائزہ لیا۔

بھائی! ایسا لگتا ہے کہ ہمارا شک غلط تھا،" رامین نے ایک ٹوٹا ہوا ڈنڈا دکھاتے ہوئے کہا جو اسے اے سی ڈکٹ کے قریب ملا تھا۔ "یہ کسی ایجنسی کا کام نہیں لگتا۔ اگر انٹیلیجنس والے آتے تو وہ صفائی سے کام کرتے، اس طرح توڑ پھوڑ نہیں مچاتے۔ لگتا ہے احتجاج کرنے والوں میں سے ہی کوئی یہاں گھسا اور اس نے قیمتی سامان کی تلاش میں اے سی یونٹ کو توڑا، اور جب اسے وہ فائل ملی تو شاید اس نے اسے بیکار سمجھ کر کہیں پھینک دیا یا ہجوم میں گم ہو گئی۔" ہماری وہ بڑی انٹیلیجنس والی تھیوری اب دم توڑ رہی تھی۔ ہمیں اب یقین ہونے لگا تھا کہ یہ کسی ماہر دشمن کی چال نہیں بلکہ اس ہولناک ہجوم کا ایک "اتفاقی حادثہ" تھا جس نے ہماری برسوں کی محنت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

داریان نے بوجھل لہجے میں کہا، "بھائی! اگر یہ ہجوم کا کام ہے تو وہ فائل اب تہران کی گلیوں کے کسی کچرے کے ڈھیر میں ہوگی۔ ہمیں اب سچائی کو قبول کرنا ہوگا کہ ہم نے وہ اثاثہ کھو دیا ہے۔" پھر ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے جانے کا فیصلہ کیا بھائی! تہران کے حالات اب بھی غیر یقینی ہیں،" رامین نے دبی آواز میں کہا۔ "ہم تینوں کا ایک ساتھ نکلنا 'ریڈ فلیگ' ثابت ہو سکتا ہے۔ پولیس اور انٹیلیجنس ہر اس گروہ پر نظر رکھے ہوئے ہے جو مشتبہ لگ رہا ہو۔" ہم نے وہیں کھڑے کھڑے ایک پیشہ ورانہ منصوبہ بنایا۔ طے پایا کہ ہم "ڈی سینٹرلائز" ہوں گے، یعنی ہم تینوں الگ الگ راستوں سے ہوٹل سے نکلیں گے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ ہمارا 'رینڈیوو پوائنٹ' (ملنے کی جگہ) تہران کا مشہور 'پارکِ ملت' مقرر ہوا، جہاں ہمیں تین گھنٹے بعد ایک مخصوص بینچ کے قریب ملنا تھا۔ ٹھیک ہے، میں پہلے نکلتا ہوں،" رامین نے ایک آخری نظر کمرے پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ بعد داریان نے اپنا کیمرہ بیگ سنبھالا، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مخلصانہ لہجے میں بولا، "حوصلہ رکھیں بھائی، اللہ بہتر کرے گا۔ میں پارک میں آپ کا انتظار کروں گا داریان کے جانے کے بعد کمرے

میں صرف میں اور وہ ٹوٹا ہوا اے سی ڈکٹ رہ گئے تھے۔ میں نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکایا، مگر جیسے ہی قدم دروازے کی طرف بڑھائے، میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک ان کہے خوف نے میرے دل پر دستک دی۔"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہجوم تہران کے اتنے بڑے ہوٹل میں گھسے اور سیدھا اس خفیہ کونے کو نشانہ بنائے؟" میرے اندر کے صحافی نے سوال اٹھایا۔میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک طرف تہران کی پولیس کا ڈر تھا اور دوسری طرف میری برسوں کی محنت کا ضیاع۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک انتہائی جرات مندانہ فیصلہ کیا۔ میں سیدھا نیچے لابی میں گیا، جہاں مینیجر اب بھی اپنے عملے کو صفائی کی ہدایات دے رہا تھا۔آغا! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے،" میں نے لہجے میں سنجیدگی اور تھوڑا سا دباؤ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ مینیجر نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "جی فرمایئے، کیا ہوا؟""دیکھیں، میں ایک انٹرنیشنل انویسٹی گیٹو جرنلسٹ ہوں،" میں نے اپنا پریس کارڈ اس کے سامنے رکھا۔ "مجھے تہران کے حالات کا اندازہ تھا، اس لیے میں نے احتیاطاً اپنے کمرے میں اے سی ڈکٹ کے پاس ایک 'وائرلیس ڈیجیٹل آڈیو ریکارڈر' چھپا کر 'آن' کر دیا تھا تاکہ میں کمرے کی سیکیورٹی مانیٹر کر سکوں۔ اب وہ ریکارڈر وہاں نہیں ہے۔ مجھے شک ہے کہ جب کل ہنگامہ ہوا تو کسی نے اسے اٹھایا ہے۔"

مینیجر کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ "آغا! ہم تو خود بہت پریشان ہیں، ہوٹل کا بہت نقصان ہوا ہے..." "اسی لیے!" میں نے اسے ایک پیشہ ورانہ لالچ دیتے ہوئے بات کاٹی۔ "اگر آپ مجھے سی سی ٹی وی (CCTV) کی ریکارڈنگ دکھا دیں، تو میں اپنی عالمی رپورٹ میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ ہوٹل کا عملہ بے قصور تھا اور یہ سب باہر سے آنے والے تخریب کاروں نے کیا۔ اس سے آپ کے ہوٹل کی ساکھ بچ جائے گی اور شاید آپ کو انشورنس کے لیے ثبوت بھی مل جائے۔" مینیجر کے چہرے پر کشمکش کے آثار ابھرے۔ ایک طرف سرکاری پابندیاں تھیں اور دوسری طرف ایک غیر ملکی صحافی کی طرف سے "کلین چٹ" ملنے کا سنہری موقع۔ آخر کار، اس نے ایک لمبا سانس لیا اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے آغا، آیئے میرے ساتھ۔ مگر یہ بات ہمارے درمیان رہنی چاہیے۔"ہم سی سی ٹی وی مانیٹرنگ روم کی طرف بڑھے۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے اپنے کانوں میں اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اس اندھیرے کمرے میں موجود وہ سکرین میری زندگی کا سب سے بڑا اور ہولناک انکشاف کرنے والی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اسکرینیں آن کیں اور مختلف اینگلز کی فوٹیج چلانا شروع کر دی۔ داخلی دروازہ... پارکنگ ایریا... کوریڈور... ہم خاموشی سے دیکھتے رہے۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے اپنے کانوں میں اس کی آواز سنائی دے رہی تھی دیکھیے آغا، یہ آپ کے فلور کا کیمرہ ہے،' مینیجر نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ میری نظریں سکرین پر گڑ گئیں۔ پہلے چند منٹ تو وہی افراتفری تھی۔ مگر پھر... ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ کوئی ہجوم نہیں تھا، کوئی بلوائی نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا۔

وہ بہت اطمینان سے، دیوار کے ساتھ لگ کر میرے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کمرے کے دروازے کے عین نیچے پہنچا، راہداری کی زرد روشنی نے اس کے نقوش واضح کر دیے۔ میرا دل جیسے سینے سے باہر نکلنے لگا۔ وہ داریان تھا۔ وہی مخلص داریان، جس نے ابھی چند منٹ پہلے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر 'اللہ بہتر کرے گا' کہا تھا سکرین پر

صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے تالا نہیں توڑا، بلکہ جیب سے ایک چابی نکالی اور بڑی مہارت سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کے اندر جاتے ہی اس کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ وہ سیدھا اس اے سی ڈکٹ (AC Duct) کی طرف لپکا جہاں میری زندگی بھر کی محنت دفن تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے جالی کو اکھاڑا—اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ جالی کا کون سا پیچ ڈھیلا ہے اور اسے کہاں سے پکڑ کر کھینچنا ہے۔ جیسے ہی جالی فرش پر گری، اس نے اپنا ہاتھ ڈکٹ کے اندھیرے غار میں ڈال دیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں وہ واٹر پروف تھیلی تھی جس میں میری 'بلوچستان فائل' موجود تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اس تھیلی کو دیکھا، اس کے چہرے پر ایک ایسی فاتحانہ مسکراہٹ ابھری جس نے میرے روح تک کو چھلنی کر دیا۔ اس نے پھرتی سے وہ فائل اپنی جیکٹ کے اندر سینے کے ساتھ لگائی اور زپ بند کر لی۔ مانیٹر کی سکرین پر اسے راہداری میں واپس مڑتے ہوئے دیکھ کر میرا خون جوش مارنے لگا۔ وہ تہران کی اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر میرا سب کچھ لوٹ چکا تھا۔ ''آغا! یہ تو آپ کا وہی ساتھی ہے نا؟' مینیجر نے حیرت اور تھوڑے شک سے میری طرف دیکھا۔ 'یہ تو اکیلا ہی اندر آیا تھا، کوئی ہجوم تو یہاں پہنچا ہی نہیں تھا۔' میرے پیروں تلے سے جیسے زمین نکل چکی ہو، مگر ایک انویسٹی گیٹو جرنلسٹ کی تربیت نے مجھے گرنے سے بچا لیا۔ میں نے فوراً اپنے چہرے کے تاثرات بدلے اور ایک گہرا، اطمینان بخش سانس لیا۔

'اوہ! تو یہ بات تھی۔' میں نے ہنستے ہوئے مینیجر کے کندھے پر ہاتھ رکھا تاکہ اسے شک نہ ہو۔ 'آغا! آپ کا بہت شکریہ۔ دراصل یہ میرا سب سے قابلِ اعتماد ساتھی ہے۔ شاید جب ہنگامہ شروع ہوا، تو میں نے ہی اسے فون کر کے کہا تھا کہ میرا قیمتی سامان محفوظ کر لے۔ میں کتنا بھلکڑ ہوں، صدمے میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے' مینیجر کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ 'خدا کا شکر ہے آغا، میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں کوئی چوری نہ ہو گئی ہو۔' میں نے مینیجر کا شکریہ ادا کیا اور مانیٹرنگ روم سے باہر نکلا۔ جیسے ہی بھاری دروازہ میرے پیچھے بند ہوا، میری مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ غصے اور صدمے کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ میں ہوٹل سے باہر نکلا تو میرے قدم منجمد ہو رہے تھے، مگر دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ 'تو یہ تھا وہ سارا کھیل!' میں نے خود کلامی کی۔ اب مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ وہ سب ایک سوچی سمجھی پلاننگ تھی۔ جب ہم کل ہوٹل کے قریب پہنچے تھے اور پولیس کی شیلنگ ہو رہی تھی، تو داریان نے کتنی ہوشیاری سے مجھے اور رامین کو پچھلے گیٹ (Back Entrance) کی طرف بھیجا تھا۔ 'آپ پچھلی گلی سے جائیں، میں یہاں پولیس کو انگیج کرتا ہوں،' اس کے وہ الفاظ اب میرے کانوں میں سیسے کی طرح اتر رہے تھے

ہم پچھلے گیٹ پر اس بوڑھے گارڈ سے دس پندرہ منٹ تک منتیں اور بحث کرتے رہے، اور ٹھیک اسی وقت داریان نے اپنا مہرہ چلا دیا تھا۔ اس نے اپنا پریس کارڈ دکھا کر پولیس کا اعتماد جیتا، 'صرف پانچ منٹ' کی اجازت لی، اندر گیا، اے سی ڈکٹ سے وہ فائل نکالی، اسے اپنی جیکٹ کے استر میں چھپایا اور واپس باہر آ گیا۔

جب ہم ہانپتے ہوئے دوبارہ مین گیٹ پر اس کے پاس پہنچے تھے، تو وہ وہاں کھڑا پولیس والوں سے 'جھوٹی بحث' کا ڈرامہ کر رہا تھا۔ تاکہ جب ہم آئیں تو وہ ہمیں وہیں ملے۔

اس نے ہمیں یہ یقین دلایا کہ وہ بھی ہوٹل کے اندر نہیں گیا پولیس نے اسے بھی نہیں جانے دیا، حالانکہ وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ کیا یہ واقعی وہی داریان ہے؟' میں نے خود سے ایک بار پھر سوال کیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل نے چاہا کہ کاش یہ کوئی مذاق ہو، کوئی ایسا امتحان جو وہ میری تلاشی کے لیے لے رہا ہو۔ مگر میرا صحافتی دماغ جانتا تھا کہ کوئی اتنا لمبا اور ہولناک مذاق نہیں کرتا۔ یہ مذاق نہیں، یہ شب خون تھا۔اب میرا ذہن رامین کی طرف گھوما۔ کیا وہ بھی اس گندے کھیل ہیں شامل تھا؟ کیا وہ مجھے پچھلے گیٹ پر الجھائے رکھنے کے لیے داریان کا آلہ کار بنا ہوا تھا؟ شک کا وہ بیج جو اصفہان میں کبھی نہیں پنپا تھا، اب تہران کی اس بند کوٹھڑی میں ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اصفہان سے تہران تک کا یہ سارا سفر، یہ دوستی، یہ ہمدردی... سب ایک ڈھونگ تھا؟ ایک لمحے کے لیے پھر مجھے لگا کہ شاید یہ کوئی مذاق ہو، لیکن ضمیر نے فوراً جھٹک دیا؛ فائل کی چوری کوئی مذاق نہیں، یہ غداری تھی۔ میں سوچنے لگا کہ رامین کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ بھی داریان کے ساتھ اس سازش کا حصہ ہے یا وہ بھی میری طرح بے خبر ہے؟میں نے وہیں ایک سخت فیصلہ کیا۔ 'فی الحال میں ان دونوں میں سے کسی پر اعتبار نہیں کروں گا۔' اگر رامین بے قصور ہوا، تو میں اسے صحیح وقت پر اپنے ساتھ ملا لوں گا، لیکن جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا، وہ بھی میرے لیے ایک سوالیہ نشان ہے۔اب مسئلہ پارکِ پہنچنے کا تھا۔ جو ہم نے طے کیا تھا کہ ہم تینوں الگ الگ راستوں سے نکلیں گے اور تین گھنٹے بعد وہاں ملیں گے۔ ابھی صرف ادھا گھنٹہ گزرا تھا، میرے پاس ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ میں نے ہوٹل کی دیوار سے لگ کر ایک گہرا سانس لیا اور اپنا نیا پلان ترتیب دیا مجھے پارک میں ان کے سامنے 'شکار' بن کر نہیں، بلکہ ایک 'شکاری' بن کر جانا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں مقررہ وقت سے پہلے پارک پہنچوں گا اور کسی دور دراز کونے میں چھپ کر ان دونوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لوں گا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ جب میں وہاں نہیں ہوتا، تو ان دونوں کے درمیان کیا کھچڑی پکتی ہے۔ میں نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا، مگر اسے پارک کی لوکیشن بتانے کے بجائے دو گلی دور کا پتہ دیا تاکہ میرا پیچھا نہ کیا جا سکے۔"

میرا رخ 'پارکِ ملت' کی طرف تھا، جہاں میرے دو 'ساتھی' میرا انتظار کر رہے تھے۔ ٹیکسی سے اترتے ہی میں نے اپنی جیکٹ کا ہڈ (Hood) آنکھوں تک جھکا لیا۔ تہران کی ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی، مگر میرے اندر غصے کا ایک تند و تیز طوفان برپا تھا۔ میں پارک کے مرکزی راستے سے گزرنے کے بجائے ایک کچی پگڈنڈی سے ہوتا ہوا گھنی جھاڑیوں کے پیچھے، ایک ایسے بینچ پر جا بیٹھا جہاں سے میں اپنے 'مقررہ مقام' پر پوری نظر رکھ سکتا تھا، مگر مجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے کہ رامین نمودار ہوا۔ وہ بے چین تھا، بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس کے ٹھیک بیس منٹ بعد داریان بھی آ پہنچا۔ وہ بہت اطمینان سے چلتا ہوا آیا اور رامین کے پہلو میں بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگے دور سے ان کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے، مگر وہ معمول کے مطابق ہی بیٹھے ہوئے تھے میں نے بڑی مہارت سے اپنے چہرے پر سکون طاری کر رکھا تھا، مگر میرا اندرونی وجود ایک عجیب سی کشمکش میں تھا۔'آخر یہ داریان کس کے لیے کام کر رہا ہے؟' میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا یہ ایرانی انٹیلیجنس کا کوئی خاص مہرہ ہے جو اپنی سرزمین کی حفاظت کر رہا ہے؟ یا پھر یہ کسی بیرونی ایجنڈے کا آلہ کار ہے؟ اور رامین کیا وہ بھی اس کھیل میں برابر کا

شریک ہے؟میری چھٹی حس مجھے بار بار پکار کر کہہ رہی تھی کہ رامین مخلص ہے، اس کی آنکھوں کی سچائی اور اب تک کی قربانیاں کسی غدار کی نہیں ہو سکتیں۔ مگر انٹیلیجنس کی دنیا میں 'جذبات' سے زیادہ 'احتیاط' کی قیمت ہوتی ہے۔ میں نے خود سے عہد کیا کہ اگر یہ دونوں ملے ہوئے ہیں، تو میں ان دونوں کے گرد ایسا گھیرا تنگ کروں گا کہ تہران کی زمین ان پر تنگ ہو جائے گی۔ اور اگر صرف داریان غدار ہے، تو اسے اپنے انجام تک پہنچنے کے لیے کسی اور کی ضرورت نہیں پڑے گی۔میں نے اپنے ذہن میں اس 'جال' کی آخری کڑی مکمل کی: ایک ایسی فرضی فائل کا لالچ، جو ان کے لیے شہد کے چھتے کی طرح ہو، جس پر یہ مکھیاں بن کر لپکیں گے اور پھر وہیں قید ہو جائیں گے

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی زندگی کا سب سے خطرناک اور بڑا پلان ترتیب دیا۔ 'چوری کا بدلہ اب صرف سچ سے نہیں، ایک بڑے جال سے لیا جائے گا،' میں نے خود سے کہامیں نے فیصلہ کیا کہ میں اب وہ پرانا، مخلص اور سادہ ذیشان نہیں بنوں گا۔ میں ایک ایسا 'ٹوٹا ہوا سوداگر' بن کر ان کے سامنے جاؤں گا جو اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر تلا ہو۔ میں ان کے سامنے ایک 'جھوٹی فائل' کا تذکرہ کروں گا—ایک ایسی فائل جس میں پاکستان کے میڈیا ہاؤسز، مخصوص انڈر گراؤنڈ پروڈکشنز اور ان کے بیرونی نیٹ ورکس کا کچا چٹھا ہو۔ میں انہیں یہ یقین دلاؤں گا کہ تہران میں اب میری جان کو خطرہ ہے اور مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے بھاری رقم کی ضرورت ہے، اس لیے میں یہ حساس ڈیٹا کسی بھی گروہ یا میڈیا نیٹ ورک کو بیچنے کے لیے تیار ہوں۔

میرا مقصد واضح تھا:

داریان کا ٹیسٹ اگر وہ غدار ہے، تو وہ اس 'ڈیٹا' کو خریدنے کے لیے اپنے آقاؤں کو فوراً حرکت میں لائے گا اور مجھے ان کے کسی 'سیف ہاؤس' یا خریدار تک لے جائے گا۔رامین کی آزمائش اگر رامین اس سودے پر مجھ سے جھگڑا کرتا ہے اور میری مخالفت کرتا ہے، تو ثابت ہو جائے گا کہ اس کا خون اب بھی سفید نہیں ہوا اور وہ مشن کے ساتھ مخلص ہے۔میں نے ایک گہرا سانس لیا اور جیکٹ کے بٹن بند کیے۔ 'آج یہ دونوں وہ ذیشان دیکھیں گے جو غداروں کو ان کے اپنے ہی جال میں زندہ دفن کرنا جانتا ہے،' میں نے سوچا اور دبے قدموں ان کی طرف بڑھا

سلام بھائیو! کیسے ہو؟" میں نے گرمجوشی سے داریان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، جیسے ہوٹل میں ہونے والا واقعہ میرے لیے محض ایک معمولی حادثہ تھا۔"وعلیکم السلام ذیشان بھائی! آپ بالکل وقت پر پہنچ گئے۔" داریان نے میری طرف حیرت سے دیکھا، شاید وہ میری اس پرسکون حالت کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ہم تو پریشان تھے کہ ہوٹل کے سیل ہونے کے بعد آپ کس حال میں ہوں گے۔""ارے بھائی، ہم صحافی ہیں، ایسے ہنگامے تو ہماری زندگی کا حصہ ہیں،" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ہم نے کچھ دیر تک عام حالات، سڑکوں پر موجود پولیس کے گشت اور اگلے ممکنہ احتجاجی مقامات کے بارے میں روایتی گفتگو کی، جیسے ہم اپنے ساتویں مشن کی تیاری کر رہے ہوں۔ اسی گفتگو کے دوران، میں نے بڑی مہارت سے رخ بدلا۔"دیکھو بھائیو، میں نے بہت سوچ لیا ہے۔ ہوٹل میں جو ہوا، وہ اتفاق نہیں تھا۔ میری

لوکیشن 'کمپرومائز' ہو چکی ہے
اگر نہیں بھی ہوئی تو پھر بھی ہمیں احتیاط ضرور کرنی چاہیے ہوٹل والی فائل کا جانا ایک بڑا جھٹکا ضرور ہے، مگر کھیل ابھی ختم نہیں ہوا،" "حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس ایک اور 'ماسٹر فائل' بھی محفوظ ہے،میں نے داریان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، جہاں ایک انجانی سی چمک ابھر رہی تھی۔ "مجھے اس وقت بھاری رقم کی ضرورت ہے اتنی رقم کہ میں تہران سے نکل سکوں۔تاکہ ہم اپنا اگلا قدم مضبوطی سے اٹھا سکیں
میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے کسی دوسرے شہر منتقل ہو جانا چاہیے، مگر اس سے پہلے مجھے اپنے پاس موجود اس 'ماسٹر فائل' کا سودا کرنا ہوگا۔ اس میں پاکستان کے میڈیا ہاؤسز، مخصوص انڈر گراؤنڈ نیٹ ورکس اور ان کی بیرونی فنڈنگ کی ایسی معلومات ہیں جو کسی بھی 'پاور فل گروہ' کے لیے سونے کی کان ثابت ہو سکتی ہیں یہ سنتے ہی رامین اچھل پڑا، "ذیشان بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ تو ضمیر کا سودا ہے!" کیا تم واقعی اپنی محنت کو بیچو گے۔اس کے لہجے کی سچی تڑپ اور غصہ میرے لیے پہلا اشارہ تھاذیشان بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" داریان نے کمالِ فنکاری سے حیرت اور دکھ کا ملا جلا تاثر اپنے چہرے پر سجایا۔ "ضمیر کا سودا؟ کیا آپ واقعی اپنی برسوں کی محنت اور اس مشن کو چند ٹکڑوں کے بدلے بیچ دیں گے؟ یہ تو ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آپ جیسا نڈر صحافی یوں ہتھیار ڈال دے گا۔"اس کے لہجے میں وہی پرانی مخلصی تھی جو اصفہان کے گلی کوچوں میں ہمارا حوصلہ بڑھاتی تھی، مگر اب مجھے اس کے الفاظ کے پیچھے چھپی منافقت صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ رامین کے ساتھ مل کر مجھے 'روکنے' کا ناٹک کر رہا تھا تاکہ مجھ پر یہ شک نہ ہو کہ وہ خود اس کھیل کا سب سے بڑا مہرہ ہے۔
میں نے ان دونوں کی طرف سنجیدگی سے دیکھا اور اپنی آواز کو مزید سخت کر لیا۔ "دیکھو بھائیو! اصفہان سے یہاں تک ہم نے کئی مشن پورے کیے۔ میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگایا، مگر ہوٹل میں جو ہوا اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ اب ہم اکیلے اس جنگ کو نہیں جیت سکتے۔ تہران میں ہمارے پاس نہ سر چھپانے کی جگہ ہے اور نہ ہی آگے بڑھنے کے وسائل۔"میں نے داریان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، "یہ ضمیر کا سودا نہیں، یہ بقا کی جنگ ہے۔ زندگی بچانے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑتا ہے۔ داریان، کیا تہران میں کوئی ایسا خریدار یا میڈیا نیٹ ورک والا گروہ مل سکتا ہے جو اس فائل کی صحیح قیمت لگا سکے؟ مجھے بھاری رقم چاہیے، اور وہ بھی فوری طور پر۔"
داریان نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا،ذیشان بھائی، اگر آپ کا فیصلہ حتمی ہے اور آپ کو لگتا ہے کہ یہی واحد راستہ ہے... تو میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔واقعی تہران میں رہنا اب ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں، اور رقم کے بغیر یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ جہاں تک خریدار کا تعلق ہے، تو ایسے گروہ اور نیٹ ورک تو ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ کچھ 'انویسٹی گیٹو ایجنسیاں' اور میڈیا نیٹ ورکس تو ایسی معلومات کے لیے تڑپتے ہیں۔ میں اپنے کچھ ذرائع سے رابطہ کرتا ہوں پھر میں نے رامین سے پوچھا رامین تم کیا کہتے ہو
رمین نے ایک گہرا سانس لیا اور بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر صدمے کے ساتھ ساتھ ایک گہری سوچ کے

آثار تھے۔ اس نے دبی آواز میں کہا:
"ذیشان بھائی! اگر آپ سچ پوچھیں تو... تہران میں ایسے گروہ اور میڈیا نیٹ ورک ڈھونڈنا ناممکن نہیں ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو حساس معلومات کی بھاری قیمت دیتے ہیں، لیکن یار... مجھے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔
اس نے تھوڑی دیر رک کر میری آنکھوں میں دیکھا، اس کے لہجے میں مخلصی اور دکھ کا امتزاج تھا۔ "ہم نے اصفہان سے یہاں تک جو سفر کیا، وہ اس سودے کے لیے تو نہیں تھا۔ ضمیر کا یہ بوجھ اٹھانا بہت مشکل ہے بھائی۔ لیکن... اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے اور آپ کو لگتا ہے کہ بقا کا یہی واحد راستہ ہے، تو چلو... پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو پھر دیکھتے ہیں کہ کوئی خریدار ملتا ہے یا نہیں۔" رامین کا یہ لہجہ میرے لیے ایک بہت بڑا اشارہ تھا۔ اس کا دل اس سودے پر آمادہ نہیں تھا، مگر وہ میری 'مجبوری' اور اب تک کی 'دوستی' کے احترام میں خاموش ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس داریان کا رویہ پیشہ ورانہ سرد مہری کا حامل تھا، وہ اب اخلاقیات سے نکل کر عملی طور پر 'خریدار' کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔اب شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور شہر کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ ہم تینوں کے درمیان گفتگو کا مرکز صرف ایک ہی تھا: اس 'ماسٹر فائل' کا خریدار۔داریان مسلسل اپنے فون پر مصروف تھا، جیسے وہ کئی تار ہلا رہا ہو۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنے دو تین پرانے جاننے والوں کو پیغام بھیج دیا ہے جو تہران کے انڈر گراؤنڈ نیٹ ورکس اور صحافتی حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ رامین خاموش تھا، اس کے چہرے سے بیزاری صاف ظاہر تھی، مگر وہ ہماری گفتگو کا حصہ بنا رہا۔
رامین نے پرامید لہجے میں کہا، "ذیشان بھائی، میں نے بھی دوستوں کو بتا دیا ہے، جیسے ہی کوئی مثبت جواب آتا ہے، ہم رابطہ کریں گے۔ فی الحال یہاں بیٹھنا مناسب نہیں، بہتر ہے کہ ہم کسی ہوٹل چلیں اور وہاں آرام کریں۔" ہم وہاں سے اٹھے اور قریبی علاقے میں ایک مناسب ہوٹل تلاش کیا۔ کمرے میں پہنچ کر ہم نے کھانا منگوایا۔ کھانے کی میز پر بھی گفتگو کا رخ وہی رہا۔ رامین اب بھی اسی کشمکش میں تھا کہ یہ سودا کرنا چاہیے یا نہیں، مگر میں اسے یقین دلا رہا تھا کہ تہران سے نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ عشاء کا وقت ہو چکا تھا جب ہم کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اچانک داریان کا فون بجا۔ اس نے تیزی سے کال سنی اور پھر جوش بھرے انداز میں ہماری طرف مڑا۔ "بھائیو! کام بن گیا ہے۔ میرے ایک بہت قریبی دوست کا فون تھا، اس نے بتایا ہے کہ تہران کے 'خیابانِ انقلاب' (Enqelab Street) کے علاقے میں ایک ایسا سیٹ اپ موجود ہے جو اس طرح کے حساس ڈیٹا اور بین الاقوامی خبروں کی خرید و فروخت میں دلچسپی رکھتا ہے۔" داریان نے مزید بتایا، "اس نے کہا ہے کہ وہاں کچھ لوگ ہیں جو اس وقت ایک 'آزاد میڈیا نیٹ ورک' کے نام پر کام کر رہے ہیں، مگر درحقیقت وہ ان معلومات کی بھاری قیمت دیتے ہیں جو عام میڈیا تک نہیں پہنچ پاتی۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ اگر ہم بھی وہاں پہنچیں تو ڈیل فائنل ہو سکتی ہے۔" ٹھیک ہے داریان، یہ تو تم کہہ رہے ہو، مگر تھوڑی تفصیل تو بتاؤ۔ تہران جیسے شہر میں، جہاں ہر موڑ پر پولیس اور خفیہ ایجنسیاں ہوتی ہیں، ہم ان سے کیسے ملیں گے؟

ہمارا رابطہ کیسے ہوگا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم انہیں پہچانیں گے کیسے؟ ایسا نہ ہو کہ ہم کسی غلط جگہ جا پھنسیں،" میں نے لہجے میں تھوڑا شک پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔
داریان نے ایک لمحے کے لیے رامین کی طرف دیکھا، جو خاموشی سے یہ سب سن رہا تھا، اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔
"ذیشان بھائی، یہ لوگ پیشہ ور ہیں۔ میرے دوست نے بتایا ہے کہ ہمیں براہِ راست کسی بڑے دفتر میں نہیں جانا۔ طریقہ یہ ہے کہ ہمیں 'خیابانِ انقلاب' کے ایک پرانے سینما ہال کے پاس پہنچنا ہوگا۔ وہاں ایک نیلی رنگ کی گاڑی کھڑی ہوگی جس کا نمبر پلیٹ کا آخری ہندسہ '7' ہوگا۔" اس نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا، "وہاں ہمیں ایک شخص ملے گا جس کا کوڈ نیم 'آرش' ہے۔ ہمیں اسے صرف یہ کہنا ہے کہ 'ہمیں تہران کی بارش پسند نہیں'۔ یہ سنتے ہی وہ ہمیں ایک قریبی نجی اسٹوڈیو میں لے جائے گا جہاں وہ 'خریدار' موجود ہوں گے۔ وہ صحافتی لبادے میں چھپے ہوئے لوگ ہیں، اس لیے وہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔""اور ادائیگی کا کیا بنے گا؟" میں نے اصل مدعے کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔"رقم نقد ہوگی یا کرپٹو کرنسی میں، جیسا آپ چاہیں،" داریان نے اعتماد سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے داریان، یہ سب تو طے پا گیا،" میں نے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "مگر یہ ملاقات ہوگی کب؟ حتمی بتاؤ تاکہ ہم ذہنی طور پر تیار رہیں۔" داریان نے اطمینان سے جواب دیا، "ذیشان بھائی! میری دوست سے ابھی بات ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کل صبح 10 بجے کا وقت سب سے بہتر ہے۔ اس وقت شہر میں چہل پہل ہوتی ہے اور کسی کو شک نہیں ہوتا۔ ہم ٹھیک 10 بجے وہاں پہنچ جائیں گے اور ڈیل مکمل کر لیں گے میں نے سر ہلایا اور پھر رامین کی طرف مڑا، جو اب تک خاموش تماشائی بنا سب دیکھ رہا تھا۔ "رامین! تم کیا کہتے ہو؟ ہم اس راستے پر قدم بڑھا رہے ہیں جہاں سے واپسی نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"
رامین نے کچھ دیر سوچا، شاید وہ میرے چہرے کے تاثرات سے میرا اصل پلان سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا، "دیکھو ذیشان! اب جب ہم یہاں تک آ ہی گئے ہیں اور کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آ رہا، تو میں سمجھتا ہوں کہ داریان بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں کل 10 بجے جا کر ان سے ملنا چاہیے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تھوڑا پراعتماد ہو کر بولا، "ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان کے ساتھ صحیح طرح سے ڈیل کریں گے۔ اگر وہ ہماری شرائط مان لیتے ہیں اور فائل کی صحیح قیمت دیتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ ہم اپنا راستہ الگ کر لیں گے اور کسی اور نیٹ ورک سے رابطہ کریں گے۔ آخر بقا کے لیے ہمیں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا۔" رامین کا یہ بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر داریان کے چہرے پر ایک فاتحانہ سکون آ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب میں اس کے بچھائے ہوئے جال میں پوری طرح آ چکا ہوں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ میری ہی بچھائے ہوئی جال میں پھنسنے جا رہا ہے بہت خوب! تو پھر طے رہا،" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کل صبح 10 بجے اس فائل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اب بہتر ہے کہ ہم تھوڑی دیر آرام کر لیں کیونکہ کل ہمیں بہت چوکنا رہنا ہوگا۔" ہم تینوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے، مگر اس چھوٹے سے کمرے میں نیند کسی کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ داریان شاید اپنے 'آقاؤں' کو اپنی کامیابی کی رپورٹ دینے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا، رامین آنے والے

خطرے سے ڈر رہا تھا، اور میں... میں اپنے ذہن میں اس 'ماسٹر فائل' کے ذریعے ان سب کو بے نقاب کرنے کا آخری نقشہ تیار کر رہا تھا۔ تہران کی ٹھنڈی صبح نے جب کھڑکی کے پردوں سے جھانک کر کمرے میں قدم رکھا، تو ہم تینوں ہی بیدار تھے۔ رات بھر کی بے چینی کے بعد فجر کی نماز نے میرے دل کو وہ سکون عطا کیا جو کسی بڑے معرکے سے پہلے ایک سپاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے میں نے اللہ سے سرخروئی کی دعا مانگی، کیونکہ آج میں اکیلا نہیں تھا، میرے ساتھ میرے ملک کی عزت اور بلوچستان کے امن کا سوال جڑا ہوا تھا۔

ناشتے کی میز پر خاموشی کا راج تھا، صرف چمچوں کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ داریان بار بار اپنے فون کی سکرین روشن کر کے وقت دیکھ رہا تھا، جبکہ رامین کے چہرے پر ابھی تک صدمے اور تفکر کے سائے منڈلا رہے تھے۔

"تیار ہو؟" میں نے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل، ذیشان بھائی۔ گاڑی پہنچنے والی ہو گی،" داریان نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ہوٹل سے نکل کر میرا پہلا رخ ایک قریبی فوٹو سٹیٹ کی دکان کی طرف تھا۔ داریان نے چونک کر مجھے دیکھا، "یہاں کیوں؟""بیوقوف مت بنو داریان،" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اتنی حساس فائل کا 'اوریجنل' میں کسی انجان خریدار کے ہاتھ میں براہِ راست نہیں دے سکتا۔ میں نے اس کی دو کاپیاں کرانی ہیں تاکہ اگر ڈیل میں کوئی گڑبڑ ہو، تو اصل ڈیٹا میرے پاس محفوظ رہے۔دکان کے اندر جا کر میں نے بڑی مہارت سے یو ایس بی (USB) نکالی اور دو الگ الگ فائلز کی فوٹو سٹیٹ کروائی۔ یہ دراصل میری اس 'ماسٹر چال' کا حصہ تھا۔ ان کاغذات پر کچھ بھی نہیں تھا، سوائے چند بے معنی رپورٹوں اور پرانی خبروں کے، مگر اوپر کی سرخیوں کو میں نے اس طرح 'ایڈٹ' کیا تھا کہ دیکھنے والا اسے ملک دشمن نیٹ ورک کا کچا چٹھا ہی سمجھے۔ میں نے وہ کاپیاں ایک بھورے لفافے میں ڈالیں اور اسے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں چھپا لیا۔ اصل فائل میرے ذہن میں تھی، اور میرا مقصد صرف ان چہروں کو دیکھنا تھا جو اس 'چارے' پر مکھیاں بن کر لپکنے والے تھےہم نے 'خیابانِ انقلاب' کی طرف جانے والی ایک ٹیکسی لی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا اژدھام تھا، مگر میری نظریں صرف اس پرانے سینما ہال کو تلاش کر رہی تھیں۔"وہ رہا!" داریان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

پرانے سینما کی بوسیدہ عمارت کے سامنے، عین فٹ پاتھ کے کنارے، ایک نیلے رنگ کی گاڑی کھڑی تھی۔ جیسے ہی ہم قریب پہنچے، میری نظریں اس کی نمبر پلیٹ پر جم گئیں۔ آخری ہندسہ واضح طور پر '7' تھا۔ گاڑی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے ہوا اور اندر سے ایک مردانہ آواز آئی: "تہران کی صبح کیسی لگی؟"میں نے قدم آگے بڑھایا، داریان اور رامین میرے پیچھے سائے کی طرح تھے۔ میں نے اس شخص کی آنکھوں میں جھانک کر وہ مخصوص کوڈ ورڈ ادا کیا جو غداروں اور وفاداروں کے درمیان لکیر کھینچنے والا تھا: "ہمیں تہران کی بارش پسند نہیں!"گاڑی کے اندر بیٹھے شخص، جس کا نام داریان نے 'آرش' بتایا تھا، کے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک آئی۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور تہران کی تنگ گلیوں میں دوڑنے لگی۔آرش' خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا، مگر اس کی نظریں مسلسل ریئر ویو مرر (شیشے) پر جمی تھیں، جیسے وہ دیکھ رہا ہو کہ کہیں کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ تہران کی مصروف

سڑکوں سے نکل کر ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں پرانی عمارتیں اور خاموش گلیاں تھیں۔ آخر کار، گاڑی ایک ایسی عمارت کے سامنے رکی جو باہر سے کسی پرانے گودام جیسی لگتی تھی، مگر اس کے آہنی دروازے پر لگی سیکیورٹی لائٹ اس کی اہمیت کا پتہ دے رہی تھی۔

"ہم پہنچ گئے،" آرش نے مختصر کہا۔ ہم گاڑی سے اترے اور اندر جانے سے پہلے، میں نے ایک لمحے کے لیے قدم روکے اور داریان اور رامین کو اپنے قریب کیا۔ میں نے اپنی آواز کو سرگوشی تک محدود رکھتے ہوئے کہا: دیکھو، یہ لوگ خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ہمیں صرف ڈیل نہیں کرنی، بلکہ ان کے چہروں کو بھی ریکارڈ کرنا ہے۔ داریان! تم اور رامین، اپنے فونز تیار رکھو۔ جیسے ہی ہم ان کے سامنے بیٹھیں، تم نے بڑی مہارت اور خاموشی سے ان لوگوں کی تصویریں لینی ہیں جن سے ہماری ڈیل ہونی ہے۔ انہیں پتہ بھی نہ چلے اور ان کے چہرے ہمارے پاس محفوظ ہو جائیں۔ باقی بات میں خود سنبھال لوں گا۔"

داریان نے ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالی، شاید وہ میری اس 'احتیاط' سے تھوڑا گھبرایا، مگر پھر اس نے سر ہلا دیا۔ رامین نے خاموشی سے اپنا فون جیب میں ٹھیک کیا، اس کی انگلیاں تھوڑی کپکپا رہی تھیں، مگر وہ میرے اشارے کو سمجھ چکا تھا۔ ہم اسٹوڈیو کے اندرونی کمرے کی طرف بڑھے، جہاں ایک بڑی شیشے کی میز کے گرد تین اشخاص بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص، جس نے مہنگا سوٹ پہن رکھا تھا اور جس کی آنکھیں بڑی گہری اور چالاک تھیں، اٹھا اور ہماری طرف ہاتھ بڑھایا۔ خوش آمدید ذیشان صاحب! ہمیں آپ کا ہی انتظار تھا۔۔ اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کی کھنک تھی، جیسے وہ فتح کا جشن منا رہا ہو۔ میں نے لفافے کو مضبوطی سے پکڑا اور میز کے گرد لگی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ داریان اور رامین میرے دائیں بائیں بیٹھ ہو گئے، اور مجھے محسوس ہوا کہ ان کے فونز کے لینز خاموشی سے ان 'خریداروں' کی طرف مڑ چکے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، کیونکہ اب اسٹوڈیو کی ان دیواروں کے بیچ حق اور باطل کا وہ معرکہ شروع ہونے والا تھا جس کی جڑیں سرحد کے اس پار تک پھیلی ہوئی تھیں۔۔ میز کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے تینوں اشخاص کے چہروں پر ایک ایسی سنجیدگی تھی جو صرف ان لوگوں کے پاس ہوتی ہے جو دنیا کے نقشے بدلنے کی سازشیں کرتے ہیں۔ درمیان میں بیٹھا شخص، جس کا نام 'آرش' نے "منصور" بتایا تھا، اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھکا اور اپنی انگلیوں کو آپس میں جوڑتے ہوئے بولا۔

ذیشان صاحب! تہران کی ان تنگ گلیوں میں آپ کا سفر کافی طویل رہا ہے۔ زہدان سے اصفہان، اور پھر اصفہان سے ہوتے ہوئے یہاں تک... آپ کی ہمت کی داد دینی پڑے گی،" منصور نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔ "شکریہ منصور صاحب،" میں نے لہجے کو سپاٹ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر میں یہاں تعریفیں سننے نہیں آیا۔ سفر جتنا طویل ہو، منزل اتنی ہی قیمتی ہونی چاہیے۔ منصور نے قہقہہ لگایا۔ "خوب! ایک سچے صحافی کی زبان۔ ہمیں آپ کی یہی بے باکی پسند آئی۔" پھر اس نے داریان کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "داریان نے بتایا ہے کہ آپ کے پاس کچھ ایسی 'معلومات' ہیں جو سرحد کے اس پار ہمارے دوستوں کے لیے بہت اہم ہیں۔"

جی بالکل،" داریان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "ذیشان بھائی نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر یہ ڈیٹا جمع کیا ہے۔ منصور نے میز پر جھک کر براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ "وہ 'ماسٹر فائل' کہاں ہے ذیشان صاحب؟"اسٹوڈیو کے اندر ماحول اب کسی تپتے ہوئے تندور جیسا ہو چکا تھا۔ منصور نے جب فائل کی بات کی تو میں نے کرسی پر ذرا ٹیک لگائی اور تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنا پتہ پھینکا۔"دیکھو منصور صاحب! فائل کی بات تو بعد میں ہوگی، پہلے میری قیمت سن لو۔ میں پاکستان سے یہاں تہران کی سڑکوں پر چنے بیچنے نہیں آیا ہوں،" میں نے لہجے کو حد درجہ سرد اور کھرہ رکھا۔ "اس فائل کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے ۔یہ سنتے ہی جیسے کمرے میں بجلی گرگئی۔ منصور کے چہرے کی ہوائیاں اڑنے لگیں اور اس کے برابر بیٹھے شخص کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ رامین اور داریان بھی ساکت رہ گئے، جیسے انہیں بھی مجھ سے اتنی بڑی رقم کے مطالبے کی توقع نہیں تھی۔

"ایک کروڑ؟" منصور نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ذیشان صاحب! آپ ہوش میں تو ہیں؟ یہ رقم بہت زیادہ ہے، اتنی بڑی ڈیل تو ہم نے کبھی..." "یہ زیادہ رقم ؟" میں نے قہقہہ لگایا جس میں طنز بھرا تھا۔ "منصور صاحب، آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ اس فائل میں کیا ہے۔ اس میں پاکستان کے انڈر گراؤنڈ پروڈکشن ہاؤسز اور بیرونی نیٹ ورکس کا وہ کچا چٹھا ہے جو اسلام آباد سے کراچی تک آگ لگا دے گا۔ آپ کو کیا لگتا ہے، میں ایسی حساس معلومات کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دوں گا؟ اگر آپ لینا چاہتے ہیں تو بتائیں، ورنہ میرے پاس خریداروں کی کمی نہیں ہے۔"

منصور نے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ ان کی حالت دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ یہ داریان کے ہی بندے ہیں اور اسی لیے میں نے جان بوجھ کر اتنی بڑی رقم مانگی تھی تاکہ ان کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ "ہمیں پہلے کچھ ثبوت چاہیے،" منصور نے تھوڑی ہمت جمع کر کے کہا۔

میں نے صبح کروائی ہوئی فوٹو سٹیٹ کا ایک 'سیمپل' میز پر پٹخا۔ "یہ دیکھو سیمپل! مگر یاد رکھنا، یہ صرف جھلکی ہے۔ اصل فائل میرے پاس ہے اور وہ میں اس وقت تک نہیں دکھاؤں گا جب تک میرا 'طریقہ کار' نہیں مانا جاتا۔ "کیا طریقہ کار؟" منصور نے بے چینی سے پوچھا۔ "سادہ سی بات ہے،" میں نے منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "پہلے 50 لاکھ روپے میرے بتائے ہوئے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرو۔ جیسے ہی رقم کنفرم ہوگی، کل اسی جگہ پر میں اصلی ڈاکومنٹس لے کر آؤں گا۔ باقی کے 50 لاکھ آپ 'کیش' لائیں گے، ادھر کیش میز پر ہوگا اور ادھر فائل آپ کے ہاتھ میں۔ "ہمیں اعتبار نہیں،" منصور کے ساتھی نے تلملا کر کہا۔ "ہم اتنی بڑی رقم بغیر فائل دیکھے کیسے دے دیں؟" "اعتبار؟" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جاسوسی کی دنیا میں اعتبار نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی منصور صاحب، یہاں صرف ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں، تو مجھے بھی آپ کی جیب پر اعتبار نہیں۔ سودا کرنا ہے تو یہی راستہ ہے، ورنہ اللہ حافظ۔

منصور نے ایک اور گہرا سوال کیا؟ذیشان صاحب، رقم کی بات تو اپنی جگہ،" "مگر ایک بات بتائیے... آپ اتنی حساس اور قیمتی چیز، جس میں آپ کے اپنے ملک کے میڈیا ہاؤسز اور نیٹ ورکس کا کچا چٹھا ہے، ہمیں دے رہے ہیں۔ کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا کہ جب یہ معلومات منظرِ عام پر آئیں گی تو آپ کی اپنی ذات کو کتنا بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ آپ کی زندگی تو

خطرے میں پڑ جائے گی، پاکستان میں آپ کا رہنا ناممکن ہو جائے گا۔"میں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا، جیسے میں اس کے ذہن کے اندر دیکھ رہا ہوں۔

"منصور صاحب، مجھے پتہ ہے کہ آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔ مگر میں اتنا نادان بھی نہیں ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ لوگ اس فائل کو ملتے ہی اخباروں میں نہیں چھپوائیں گے۔"منصور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "مطلب؟""مطلب یہ،" میں نے لہجے میں اعتماد بھرتے ہوئے کہا، "کہ یہ فائل آپ کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ آپ اسے 'خفیہ' رکھیں گے کیونکہ یہ آپ کے اپنے مفاد میں ہے۔ آپ اسے اپنے خاص مقاصد کے لیے استعمال کریں گے، بلیک میلنگ کے لیے یا کسی بڑے بیرونِ ملک ایجنڈے کو کامیاب بنانے کے لیے۔ آپ اسے فوراً شائع کر کے ضائع نہیں کریں گے بلکہ اس سے برسوں تک منافع کمائیں گے۔ رہی بات میری ذات کی، تو جب میرے پاس ایک کروڑ روپے ہوں گے، تو تہران ہو یا پاکستان، میں اپنی حفاظت کرنا بہتر جانتا ہوں۔"منصور نے جب فائل کے 'نقصان' اور قیمت پر دوبارہ شک ظاہر کیا، تو میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے کرسی تھوڑی آگے کی اور میز پر ہاتھ جما کر براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کمرے کا درجہ حرارت جیسے ایک دم گر گیا۔"منصور صاحب! ایک بات بتاؤ، تم واقعی خود کو صحافی سمجھتے ہو؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔"تمہیں فائل دیکھنی بھی آتی ہے؟ جس طرح کی تم باتیں کر رہے ہو، مجھے تو شک ہو رہا ہے کہ تمہیں میڈیا نیٹ ورک کی ابجد کا بھی پتہ نہیں۔ اگر تمہیں ان معلومات کی سنگینی کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہوتا، تو تم اس ایک کروڑ کی رقم کو 'زیادہ' نہ کہتے بلکہ اسے معمولی سمجھ کر اب تک ادائیگی کر چکے ہوتے۔"منصور ہکا بکا رہ گیا، اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ داریان نے بھی چونک کر کان کھڑے کر لیے، وہ میری اس اچانک جارحیت پر حیران تھا۔"دیکھو بھائی! یہ کوئی عام خبروں کا پلندہ نہیں ہے،" میں نے آواز میں مزید دبدبہ پیدا کیا۔ "اس میں موجود ہر سطر ایک خفیہ کوڈ ہے جس کے پیچھے پاکستان کے بڑے نیٹ ورکس اور انڈر گراؤنڈ پروڈکشن ہاؤسز کی پوری تاریخ دفن ہے۔ تم جیسے لوگوں کو تو پہلے 'جملوں کو ڈی کوڈ' کرنا سیکھنا چاہیے، پھر مجھ سے اس فائل کی اہمیت پر بات کرنا۔ جب تمہیں ڈی کوڈنگ آ جائے گی، تب تمہیں پتہ چلے گا کہ اس فائل کی اصلی 'نیت' کیا ہے اور یہ کس طرح تمہارے آقاؤں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔"میں نے ایک گہرا سانس لیا اور داریان کی طرف ایک سرد نظر ڈالی جو سہم سا گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ صرف مہرے ہیں، ان کے پاس اتنا دماغ ہی نہیں کہ وہ میری اس 'ماسٹر فائل' کے پیچھے چھپی ہوئی چال کو سمجھ سکیں۔"اگر سودا کرنا ہے تو میرے طریقے سے ہوگا، ورنہ تم جیسے اناڑیوں کے ساتھ وقت ضائع کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے،" میں نے سمپل کا لفافہ واپس کھینچتے ہوئے حتمی انداز میں کہا منصور نے گہرا سانس لیا اور بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے پاس اب بات کرنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ "ٹھیک ہے، ہمیں تھوڑا وقت چاہیے۔ ہمیں اپنے 'اوپر والے بندوں' (آقاؤں) سے مشورہ کرنا پڑے گا۔""ضرور کریں، تسلی سے کریں،" میں نے اٹھتے ہوئے بڑے سکون سے کہا۔ "مگر یاد رہے، وقت کم ہے اور فائل کی مانگ زیادہ۔"ہم وہاں سے باہر نکل آئے رامین خاموشی سے میرے پیچھے چل رہا تھا، جبکہ داریان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں بتا رہی تھیں کہ وہ اب

اپنی ہی بچھائی ہوئی بساط پر مات کھانے والا ہے۔اسٹوڈیو سے باہر نکلتے ہی تہران کی سڑکوں پر ٹریفک کا شور سنائی دیا، مگر میرے ذہن میں اس سے بھی زیادہ تیز ایک پلان چل رہا تھا۔ گاڑی میں واپسی کے سفر کے دوران میں خاموش تھا، لیکن میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں نے شیشے میں دیکھا، داریان مسلسل اپنے فون پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی بے چینی بتا رہی تھی کہ اس کی 'سکرپٹ' میں ایک کروڑ روپے کا یہ دھماکا شامل نہیں تھا۔میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ منصور اور اس کے ساتھی محض 'بوری مہرے' ہیں جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ان کی ڈوریاں تو کہیں دور بیٹھے ان آقاؤں کے ہاتھ میں تھیں ایک منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح میں جانتا تھا کہ جب مہرے پھنسنے لگیں، تو وہ اپنے 'بڑوں' سے مشورہ ضرور کرتے ہیں۔

میں جانتا تھا کہ داریان اب کسی کونے میں چھپ کر اپنے 'اصلی باس' کو فون کرے گا،

ذیشان بھائی،" داریان نے خاموشی توڑتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔ لگتا ہے وہ لوگ اپکی قیمت سن کر ڈر گئے ہیں ڈرنے دو داریان،" میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "جو ڈرتا ہے وہی قیمت چکاتا ہے۔ اگر وہ واقعی اس فائل کی اہمیت جانتے ہیں، تو وہ ایک کروڑ کیا، دو کروڑ بھی دیں گے۔ اور اگر نہیں دے سکتے، تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس وہ 'پاور' ہی نہیں جس کی ہمیں تلاش ہے۔ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی ماحول میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ داریان مسلسل ٹہل رہا تھا، اس کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جو وہ زبردستی سجانے کی کوشش کر رہا تھا۔"ذیشان بھائی! ماننا پڑے گا آپ کو،" داریان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، اس کے لہجے میں چاپلوسی صاف جھلک رہی تھی۔ "ویسے ایک کروڑ کا دھماکا کر کے آپ نے تو ان کے ہوش اڑا دیے۔ میں تو سمجھ رہا تھا آپ ڈر گئے ہیں، مگر آپ نے تو انہیں ان کی اوقات دکھا دی۔ بہت زبردست! میں تو کہتا ہوں اگر وہ ایک کروڑ دے دیں، تو پھر ہمارا تہران سے نکلنا اور آگے کا سفر بالکل شاہانہ ہوگا۔"میں نے صرف سر ہلا دیا، میں جانتا تھا کہ داریان یہ سب اس لیے کہہ رہا ہے تاکہ میں اس پر شک نہ کروں اور وہ اس 'رقم' کے بہانے فائل تک پہنچ سکے دوسری طرف رامین کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسرت تھی

ذیشان بھائی! خدا کی قسم آپ نے میرا دل جیت لیا۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید آپ واقعی ٹوٹ گئے ہیں، مگر جس طرح آپ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک کروڑ مانگا، مجھے سمجھ آگیا کہ آپ ان کے ساتھ 'شطرنج' کھیل رہے ہیں۔ ایک کروڑ کیا، میں تو کہتا ہوں ان سے دو کروڑ مانگنے چاہیے تھے۔ آپ نے بالکل صحیح کیا!"رامین کی آنکھوں کی وہ چمک اور اس کے لہجے کی سچائی میرے لیے کافی تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ رامین اس گندے کھیل کا حصہ نہیں ہے، وہ وہی مخلص ساتھی ہے جو زاہدان سے میرے ساتھ نکلا تھا ابھی مجھے رامین کو اعتماد میں لینا ہو گا ایسا نہ ہو کے بہت دیر ہو جائے

مگر ابھی داریان کا وہاں ہونا ہمارے لیے رکاوٹ تھا۔میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر داریان کو مخاطب کیا۔داریان! دیکھو، کل کی ڈیل بہت بڑی ہے اور ہمیں اپنی توانائی بچانی ہے۔ ایسا کرو، نیچے جاؤ اور بازار سے کچھ اچھا سا کھانا اور کچھ ضروری

ادویات لے آؤ، میری طبیعت میں تھوڑی بوجھل پن ہے۔داریان نے ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ دکھائی، وہ شاید ہمیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، مگر 'رقم' اور 'اعتماد' کے چکر میں وہ انکار نہ کر سکا۔ "جی ذیشان بھائی، میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔ آپ آرام کریں،" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا اور داریان کے قدموں کی آواز دور ہوئی، میں نے رامین کی طرف دیکھا۔ اب وقت تھا کہ میں اسے اس خطرناک کھیل کی اصلیت بتاؤں۔ "رامین! ادھر آؤ،" میں نے اسے قریب بلایا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ تم سچ جان لو۔ داریان جس آگ سے کھیل رہا ہے، وہ اسے اور اس کے آقاؤں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ یہ ڈیل، یہ رقم... یہ سب صرف ایک جال ہے۔"

رامین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "مطلب؟ ذیشان بھائی، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" "رامین، اب وقت آ گیا ہے کہ تم وہ سچ دیکھو جو میں نے اب تک اپنے سینے میں دفن رکھا تھا۔ تمہیں یاد ہے بلوچستان انویسٹی گیشن والی وہ اہم فائل جو ہوٹل سے پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی؟" رامین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "جی بھائی! وہ نقصان تو ہمیں بہت چبھتا ہے وہ فائل غائب نہیں ہوئی تھی رامین، وہ چرائی گئی تھی،" میں نے سرد لہجے میں کہا اور اپنا فون نکال کر ایک خفیہ فولڈر کھولا۔ "اور چرانے والا کوئی باہر کا آدمی نہیں تھا۔"

میں نے رامین کے سامنے فون رکھا اور ایک دھندلی مگر واضح ویڈیو پلے کر دی ویڈیو میں صاف دیکھا جا رہا تھا کہ کس طرح دریان نے وہ فائل چرا رہا تھارامین یہ دیکھ کر جیسے ساکت رہ گیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ "یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ داریان؟ جس نے ہمارے ساتھ اتنے مشن پورے کیے؟ جس پر ہم نے بھائیوں کی طرح بھروسہ کیا؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔جب رامین نے مکمل ویڈیو اور ثبوت دیکھے، تو اس کی حیرت غصے اور دکھ میں بدل گئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے وہ سوال کیا جس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔"ذیشان بھائی! اگر آپ کو یہ سب پہلے سے معلوم تھا، آپ کے پاس یہ ویڈیو اور ثبوت موجود تھے... تو آپ نے مجھ سے یہ سچ کیوں چھپایا؟ ہم ایک غدار کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سوتے رہے، ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے رہے۔ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کیا؟"میں نے رامین کے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر ایک ایسا جواب دیا جس نے اسے خاموش کر دیا۔ "رامین! بات بھروسے کی نہیں تھی، بات مشن کی حساسیت کی تھی۔ دیکھو، انٹیلیجنس کی دنیا کا پہلا اصول یہ ہے کہ 'جسے سچ معلوم نہ ہو، وہ جھوٹ بولتے ہوئے ہچکچاتا نہیں ہے'۔ اگر میں تمہیں پہلے بتا دیتا، تو تمہارے لہجے کی تلخی اور تمہاری آنکھوں کا غصہ داریان کو فوراً چوکنا کر دیتا۔

وہ ایک منجھا ہوا کھلاڑی ہے، وہ تمہارے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیتا کہ اس کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔"میں نے ایک لمحہ رک کر اسے مزید سمجھایا، "میں چاہتا تھا کہ داریان کو یہ یقین رہے کہ وہ اب بھی 'شکاری' ہے اور ہم 'شکار' ہیں۔ جب انسان خود کو محفوظ سمجھتا ہے، تبھی وہ سب سے بڑی غلطی کرتا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے بے خبر رکھا تاکہ تم اسٹوڈیو میں وہی فطری ردِعمل دے سکو جو ایک مخلص ساتھی کا ہوتا ہے تمہارے اسی 'سچے صدمے' نے داریان اور ان کے آقاؤں کو یقین دلایا کہ یہ ڈیل اصلی ہے۔"رامین نے ایک لمبا سانس لیا، اس کے چہرے کا تناؤ تھوڑا کم ہوا۔ "مطلب

آپ مجھے شک سے نہیں، بلکہ اس غدار کی نظروں سے بچا رہے تھے؟" "بالکل رامین! اب ہم دونوں ایک پیج پر ہیں۔ اب ہمیں مل کر وہ آخری وار کرنا ہے جس کی گونج سرحد کے اس پار تک جائے گی۔" رامین نے پھر ایک مرتبہ ندامت بھرے لہجے میں کہا کہ مجھے تو اب بھی یقینی ہو رہا کہ داریان بھی ایسا کر سکتا ہے حقیقت یہی ہے رامین،" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ اس لیے تھا تاکہ وہ ہماری ہر حرکت کو اپنے آقاؤں کو دے سکے آج اسٹوڈیو میں جو لوگ بیٹھے تھے، وہ اسی نیٹ ورک' کے کارندے ہیں جن کے ساتھ داریان کام کرتا ہے۔ میں نے ایک کروڑ کی رقم اس لیے مانگی تاکہ ان کے اعصاب ٹیسٹ کروں اور انہیں اس 'ماسٹر فائل' کے لالچ میں ایک ہی جگہ اکٹھا کر لوں۔

رامین کے چہرے پر ابھی تک اس 'بلوچستان انویسٹی گیشن فائل' کے چھن جانے کا دکھ باقی تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا، "ذیشان بھائی! سب تو ٹھیک ہے، مگر وہ اصل فائل... وہ اتنی حساس معلومات جو داریان نے چرا لیں، اس کا نقصان ہم کیسے پورا کریں گے؟ وہ تو دشمن کے ہاتھ لگ چکی ہے۔" میں نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ رامین کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا، "رامین! ایک مزے کی بات بتاؤں؟ وہ فائل جو داریان نے چوری کی تھی... وہ اصلی نہیں تھی، وہ تو محض ایک 'نقلی ڈرافٹ' تھا۔"

رامین اچھل پڑا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور لہجے میں بے یقینی تھی۔ "کیا؟ وہ نقلی تھی؟ مطلب دشمن کے پاس جو کچھ گیا، وہ سب بیکار ہے؟"" بالکل رامین!" میں نے سکون سے جواب دیا۔ "میں نے وہ نقلی فائل جان بوجھ کر اس طرح ترتیب دی تھی کہ کوئی بھی اسے اصل سمجھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں انٹیلیجنس کی دنیا میں کسی پر بھی آنکھیں بند کر کے بھروسہ نہیں کرتا۔ میں ہمیشہ اپنے پاس ایک ایسی 'قیمتی لیکن فرضی' چیز رکھتا ہوں جو دوسروں کو پرکھنے کے لیے ایک ٹیسٹ (Test) کا کام دے سکے۔" میں نے رامین کے کندھے پر ہاتھ رکھا، "میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ چلنے والے مخلص ہیں یا نہیں۔ داریان اس 'چارے' پر جھپٹ پڑا اور اس نے خود کو بے نقاب کر دیا۔ اگر وہ مخلص ہوتا، تو وہ فائل کبھی غائب نہ ہوتی۔ اس فائل کا چوری ہونا ہی اس کی غداری کا پہلا اور آخری ثبوت تھا۔"

یہ سن کر رامین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کے چہرے سے فکر کے بادل چھٹ گئے اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "شکر ہے اللہ کا! ذیشان بھائی، آپ تو کمال کے کھلاڑی ہیں۔ میں تو مفت میں کڑھتا رہا کہ ہمارا مشن ناکام ہو گیا، مگر آپ نے تو دشمن کو شروع سے ہی ایک 'کھلونے' سے بہلا رکھا تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا رامین! یاد رکھنا، بلوچی ہمارے بہن بھائی مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ بلوچستان کی سرزمین محض ایک ٹکڑا نہیں، وہ ہمارا وقار ہے۔ کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ میں اتنی حساس اور قیمتی فائل اپنے ساتھ رکھ کر دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں گا؟ کبھی نہیں!" میں نے ایک لمحہ رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں اب فخر کے آنسو چمک رہے تھے۔ "وہ اصل فائل تو بہت پہلے محفوظ ہاتھوں میں پہنچائی جا چکی ہے۔ یہ جو میں اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہوں، یہ تو صرف وہ 'چارہ' ہے جس سے بلوچستان کے خلاف اٹھنے والی ہر ناپاک سازش اور غدار کے ہاتھ کو دبوچ لیا جائے گا۔ رامین ابھی پچھلے جھٹکے سے سنبھلا ہی نہیں تھا کہ اس کے ذہن میں ایک اور سوال کوند گیا۔ اس نے جھک کر سرگوشی میں پوچھا: "ذیشان بھائی! ایک اور

بات... وہ 'ماسٹر فائل' جس کی ڈیل کے لیے ہم آج خیابانِ انقلاب گئے اور جس کی قیمت آپ نے ایک کروڑ مانگی ہے... کیا اس کی بھی کوئی حقیقت ہے؟" میں نے ایک گہرا سانس لیا اور رامین کی آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے ہوئے کہا، "رامین، اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ بھی محض ایک 'جال' ہے!" رامین کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔
"کیا؟ مطلب کل جس چیز کا سودا ہونے والا ہے، وہ بھی محض کاغذ کا ڈھیر ہے؟" "ہاں رامین!" میں نے دبی آواز میں پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "میرا مقصد کبھی وہ فائل بیچنا تھا ہی نہیں۔ میرا اصل مقصد ان سب مہروں کو ایک ہی جگہ، ایک ہی وقت پر اکٹھا کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس ایک کروڑ کے لالچ میں اپنے بلوں سے باہر نکل آئیں اور اپنے 'اصلی چہروں' کے ساتھ میرے سامنے ہوں۔ یہ 'ماسٹر فائل' صرف وہ چارہ ہے جس کی بو سونگھ کر یہ شکاری خود میرے بچھائے ہوئے جال میں قید ہونے آرہے ہیں۔" رامین کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنا سر دھنا اور والہانہ انداز میں بولا، "واہ! ذیشان بھائی، آپ تو کمال کر گئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ہم واقعی اپنا ضمیر بیچنے جارہے ہیں، مگر آپ نے تو دشمن کی پوری بساط ہی الٹ دی۔ اب تو کھیل کا اصل مزہ آئے گا! اب مجھے فکر نہیں کہ کل کیا ہوگا، کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ شکاری اب خود شکار ہونے والا ہے۔" رامین نے ایک لمبا سانس لیا، اس کی حیرت اب غصے میں بدل رہی تھی۔
"تو اب ہمارا اگلا قدم کیا ہے؟ ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ اگر اج انہوں نے واقعی پیسے بھیج دیے تو؟ پھر تو کھیل ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا نا؟" میں ہلکا سا مسکرایا اور سر نفی میں ہلایا۔
"نہیں رامین... وہ پیسے بھیجیں گے ہی نہیں۔" وہ چونک گیا۔ "کیوں؟" میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "کیونکہ ان کا سب سے بڑا مسئلہ پیسے نہیں... یقین ہے۔"
میں نے آہستہ آہستہ الفاظ چنے۔ "وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے کہ فائل واقعی اصلی ہے یا نہیں۔ ان کے لیے یہ ڈیل نہیں... رسک ہے۔" رامین غور سے سن رہا تھا۔ میں نے کہا:
"اور مزے کی بات سنو... جب تک داریان ہمارے ساتھ بیٹھا ہے، وہ لوگ کبھی جلدی نہیں کریں گے۔" "کیونکہ داریان ان کی آنکھ ہے۔" میں نے فوراً جواب دیا۔ "انہیں معلوم ہے کہ داریان ہمارے ساتھ ہے ہمارے ہر قدم، ہر بات، ہر سانس کی خبر ان تک جارہی ہے۔ اس لیے وہ جلدی نہیں کریں گے۔ وہ انتظار کریں گے... دیکھیں گے پرکھیں گے کہ داریان خود تصدیق دے۔"
میں ذرا آگے جھکا۔ "اب اصل کھیل یہاں شروع ہوتا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا: "ہم جان بوجھ کر داریان کے سامنے بار بار یہ ظاہر کریں گے کہ ہم کسی دوسرے نیٹ ورک سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" رامین نے فوراً بات پکڑ لی۔ "یعنی ہم انہیں پریشر دیں گے؟" "بالکل۔ ہم کہیں گے رابطہ ہو رہا ہے... مگر ڈیل فائنل نہیں ہو رہی۔ کبھی کوریا کا ذکر... کبھی یورپ کا... کبھی کسی پرائیویٹ چینل کا۔" میں مسکرایا۔ "ہم صرف کوشش کا تاثر دیں گے... حقیقت میں کچھ نہیں کریں گے۔" رامین اب مکمل طور پر پلان میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے انگلی اٹھائی۔ "جیسے ہی داریان کو محسوس ہوگا کہ فائل کسی اور کے ہاتھ جاسکتی ہے... وہ خود گھبرا جائے گا۔" میں نے جملہ آہستہ بولا: "اور پھر وہ فوراً اپنے

اصل بوس کو اطلاع دے گا اپنے لوگوں کو کہے گا — فائل اصلی ہے۔ یہ لوگ واقعی کسی اور سے ڈیل کرنے والے ہیں۔ ابھی رابطہ کرو۔"رامین نے گہری سانس لی۔"یعنی اسی لمحے... وہ لوگ خود ہم سے رابطہ کریں گے"ہاں۔" میں نے سر ہلایا۔کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔میں نے مزید واضح کیا:"وہ لوگ ہمارے ہر قدم سے واقف ہیں۔ داریان انہیں سب بتا رہاہے۔ اس لیے ہمیں چھپنے کی ضرورت نہیں... ہمیں دکھانے کی ضرورت ہے۔""کیا دکھانے کی؟"میں مسکرایا۔ "یہ کہ ہم بے صبر ہو رہے ہیں... اور کسی اور خریدار کی تلاش میں ہیں۔"میں نے میز پر ہاتھ رکھا۔"اصل میں ہم ڈیل کرنا ہی نہیں چاہتے رامین۔"میری آواز سخت ہو گئی۔"ہمیں پیسے نہیں چاہیے... ہمیں ان کے چھپے ہوئے مہرے چاہیے۔"رامین نے آہستہ کہا:"یعنی اصل خریدار... اصل نیٹ ورک... اور فائل کا پہلا وصول کنندہ۔"

".Exactly"

میں نے سر ہلایا۔"ہمیں یہ جاننا ہے کہ بلوچ انویسٹی گیشن فائل سب سے پہلے کس تک پہنچی... کس نے اسے آگے بڑھایا... اور یہ پوری چین کہاں ختم ہوتی ہے۔"اسی لمحے میں نے آخری ہدایت دی:"اس لیے یاد رکھو — ہم کوشش کرتے رہیں گے، رابطوں کی بات کرتے رہیں گے، ناکام ڈیلز کا ذکر کرتے رہیں گے...""اور وہ سمجھتے رہیں گے کہ کھیل ان کے کنڑول میں ہے۔"میں نے فوراً اگلا نکتہ اٹھایا۔"اب دوسری اور سب سے اہم بات۔"میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا:"آج اسٹوڈیو میں... تم نے ان تینوں لوگوں کی تصویریں لے لی تھیں نا؟"رامین نے فوراً جیب سے فون نکالا۔

"جی ذیشان بھائی۔ ویڈیو بھی ہے اور کلوز شاٹس بھی۔ کسی کو شک نہیں ہوا۔"میرے چہرے پر اطمینان آ گیا۔"بہت اچھا۔ اب ہمارا اصل کام شروع ہوتا ہے۔"میں نے آہستہ کہا:"اب ... ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ لوگ کون ہیں۔"میں انگلیوں پر گنواتے ہوئے بولا:

"وہ کہاں کے رہنے والے ہیں...

کس نیٹ ورک سے جڑے ہیں...

کس ایجنسی کے فرنٹ مین ہیں...رامین نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔"میں اپنے ذرائع استعمال کرتا ہوں۔ چہرہ ریگنیشن اور میڈیا کانٹیکٹس سے کچھ نہ کچھ نکل آئے گا۔"

"اور میں بھی اپنی طرف سے کام شروع کرتا ہوں،" میں نے کہا۔"مگر یاد رکھو — داریان کے ساتھ ہمارا رویہ بالکل ویسا ہی رہے گا جیسے اب تک ہے۔ نہ شک... نہ فاصلے... نہ تبدیلی۔"

میں نے آخری بات بہت آہستگی سے کہی:"اسے یہ محسوس ہونا چاہیے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں... اور ہم واقعی کسی دوسرے نیٹ ورک تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"رامین ہلکا سا مسکرایا۔"یعنی اسے خوش بھی رکھنا ہے... اور اندھیرے میں بھی۔""بالکل۔"میں نے کہا

اسی لمحے باہر راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی۔

داریان واپس آ رہا تھا میں فوراً بلند آواز میں بولا: "یار رامین! اگر یہ لوگ سنجیدہ نہیں ہوئے تو ہمیں ایشین نیٹ ورک سے بات کرنی پڑے گی... وقت ضائع ہو رہا ہے!" رامین نے فوراً ساتھ دیا۔ "ہاں، میں بھی کل دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" دروازہ کھلا۔ داریان اندر داخل ہوا...اور اسے اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ خود اب اس کھیل کا سب سے اہم پیغام رساں بن چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو کافی کپ اور ایک چھوٹا سا میڈیکل بیگ تھا۔

"لو ذیشان بھائی، کافی بھی لے آیا ہوں... اور درد کی دوا بھی۔ یہاں کی دوائیں کافی تیز ہوتی ہیں۔" میں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کپ تھام لیا۔ "شکریہ داریان... واقعی سر بھاری ہو رہا تھا۔" رامین نے بھی کافی اٹھائی، مگر اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے مجھ پر ٹھہریں — جیسے وہ ابھی تک ہماری گفتگو کے اثر میں ہو۔

داریان کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "تو کیا سوچا آپ لوگوں نے؟" اس نے بظاہر عام انداز میں پوچھا، مگر آواز میں چھپی بے چینی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر تھکا ہوا لہجہ اختیار کیا۔ "ابھی تو کچھ واضح نہیں... ہم نے ایک اور نیٹ ورک سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر جواب سست آ رہا ہے۔" داریان نے فوراً نظر اٹھائی۔ "دوسرا نیٹ ورک؟"

میں نے کافی کا گھونٹ لیا، جیسے بات معمولی ہو۔ "ہاں... وقت ضائع نہیں کر سکتے نا۔ اگر یہاں سے بات آگے نہ بڑھی تو ہمیں اور آپشن دیکھنے پڑیں گے۔" چند سیکنڈ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ داریان نے سر ہلایا، مگر اس کی آنکھوں میں سوچ تیز ہو چکی تھی۔

"ہاں... سمجھ سکتا ہوں۔ ایسے معاملات میں انتظار خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے موضوع فوراً بدل دیا۔ "ویسے کھانے کا کیا پلان ہے؟ صبح سے کچھ ٹھیک سے کھایا نہیں۔" داریان جیسے اسی انتظار میں تھا "نیچے ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ میں نے آرڈر کر دیا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد کمرے میں کھانے کی خوشبو پھیل گئی۔ تینوں بظاہر عام لوگوں کیطرح بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ باتیں بھی عام تھیں۔ سفر... شہر... سیکیورٹی... موسم... مگر ہر جملے کے پیچھے ایک الگ حساب چل رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے دوا پانی کے ساتھ نگل لی اور جا کے بستر پر لیٹ گیا "آ بھی آرام کرنا بہتر ہوگا۔ میں نے کہا

داریان نے گھڑی دیکھی اور کہا

واقعی ہمیں آرام کر لینا چاہیے۔ کل کا دن مصروف ہوگا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "بالکل... کل بہت کچھ دیکھنا ہے۔" رامین پہلے اپنے بستر کی طرف گیا۔

داریان نے لائٹس مدھم کر دیں۔

چند لمحوں بعد ہم تینوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے تھے۔

بظاہر سب سو رہے تھے... مگر اصل میں ہر ذہن اگلے دن کے نقشے ترتیب دے رہا تھا اگلی صبح ہوٹل کے پردوں سے گزرتی دھوپ نے کمرے کو آہستہ آہستہ روشن کیا۔ میں سب سے پہلے اٹھا۔ فون چیک کیا... چند خفیہ نوٹیفکیشنز آ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد رامین اور داریان بھی جاگ گئے۔ ناشتہ مختصر رکھا گیا۔ اسی دوران ہم نے اگلے مرحلے کا منصوبہ طے کیا۔ میں نے میز پر

جھکتے ہوئے کہا: "آج ہم اکٹھے نہیں نکلیں گے۔ ہر ایک الگ کام کرے گا۔" داریان نے فوراً پوچھا،
"یعنی الگ الگ موومنٹ؟"
"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "شام کو یہی ہوٹل... مگر واپسی کے اوقات مختلف ہوں گے۔" رامین نے نوٹ کرتے ہوئے کہا، "رابطہ صرف نیٹ ورک کے ذریعے رہے گا۔ براہِ راست کم۔" میں نے سر ہلایا۔ "اور اگر ملاقات ضروری ہوئی تو پبلک مقامات پر۔" منصوبہ واضح تھا۔ ہم تینوں بظاہر رپورٹنگ اور ذاتی مصروفیات کے نام پر شہر کے مختلف حصوں میں نکلنے والے تھے۔ مگر میرا اور رامین کا اصل مقصد صرف ایک تھا— کل ملنے والے تین افراد کی مکمل شناخت۔ کچھ دیر بعد ہم الگ الگ وقت پر ہوٹل سے نکلے۔
ہم تینوں الگ الگ سمتوں، کی طرف روانہ ہوئے، جن لوگوں سے گزشتہ روز ملاقات ہوئی تھی...اب ان کی اصل شناخت نکالنی تھی۔ میں نے فون نکالا اور کل لی گئی تصاویر دوبارہ دیکھیں۔ چہرے واضح تھے۔
چند منٹ بعد وہ تصاویر میرے قابلِ اعتماد رابطوں کو بھیج دی گئیں۔ پیغام مختصر تھا:
"فوری تصدیق درکار — مکمل بیک گراؤنڈ۔" ادھر رامین نے بھی اپنے ذرائع متحرک کر دیے تھے۔ میڈیا، پرائیویٹ ڈیٹا چینلز اور پرانے رپورٹر رابطے — سب استعمال ہو رہے تھے۔
دوپہر تک ابتدائی ردعمل آنا شروع ہو گیا۔ کسی نے ایک چہرہ پہچانا... کسی نے شہر کا نام بتایا... کسی نے ممکنہ وابستگی کی طرف اشارہ کیا
شام تک صورتحال واضح ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں میں اور رامین وقفے وقفے سے نیٹ ورک کے ذریعے ایک دوسرے کو اپڈیٹس دیتے رہے، مگر براہِ راست رابطہ محدود رکھا۔
ہر اطلاع احتیاط سے شیئر ہو رہی تھی۔ عصر کے قریب تینوں افراد کے بارے میں ابتدائی پوچھ گچھ مکمل ہو چکی تھی۔ کچھ نام سامنے آ رہے تھے۔ کچھ روابط جڑنے لگے تھے۔ اور سب سے اہم بات—
تصاویر مختلف حلقوں میں پہنچتے ہی تصدیق کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی شہر کی گہما گہمی میں ایک خاموش تناؤ بھر گیا تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر رک کر اپنا فون نکالا اور رامین کو ایک انکرپٹڈ میسج بھیجا ہماری دن بھر کی رپورٹنگ بظاہر الگ الگ تھی، لیکن ہم ایک ہی مشن کے دو رخ تھے۔
میں نے ٹائپ کیا: "رامین، میں اب ہوٹل کی طرف نکل رہا ہوں۔ تم وہیں رکنا جہاں ہو، جب تک میرا سگنل نہ ملے۔ میں پہلے پہنچوں گا تاکہ داریان کو یہ لگے کہ میں اکیلا ہی اپنے کام سے فارغ ہو کر آیا ہوں۔ اگر ہم دونوں ایک ساتھ داخل ہوئے تو اسے شک ہو سکتا ہے کہ ہم کہیں مل کر منصوبہ بندی کر رہے تھے۔" رامین کا جواب فوراً آیا: "سمجھ گیا۔ میں تمہارے اشارے کا انتظار کروں گا۔" میں نے ایک اور میسج میں اسے اس اہم فیصلے سے آگاہ کیا جو میں نے راستے میں سوچا تھا: "ایک اور بات سنو۔ آج رات ہمیں ان تینوں مشکوک چہروں کی رپورٹ پر کھل کر بات کرنی ہے، لیکن داریان کا جاگنا ہمارے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ میرے پاس وہ مخصوص دوا موجود ہے جو کسی کو بھی چند گھنٹوں کے لیے گہری اور

بے ہوش جیسی نیند سلا سکتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اسے کھانے یا پانی میں ملا کر داریان کو دے دیں گے۔ اس کے سوتے ہی ہمارے پاس اپنی فائلیں ڈسکس کرنے کا محفوظ وقت ہوگا۔" رامین نے اس پلان کی تائید کی: "بہترین ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کیونکہ وہ ہماری ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے۔" میں نے فون جیب میں رکھا اور ہوٹل کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ذہن میں نقشہ بالکل واضح تھا۔ داریان کو یہ دکھانا تھا کہ ہم تھک چکے ہیں اور اب صرف آرام چاہتے ہیں، جبکہ اصل کام تو اب شروع ہونا تھا۔ جب میں ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا، تو میری نظریں چاروں طرف گھومیں تاکہ یہ تسلی کر سکوں کہ کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا میں کمرے میں داخل ہوا اور ابھی صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ پانچ منٹ بعد داریان بھی آگیا۔ اس نے حسبِ معمول سلام دعا کی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ "کیسی رہی آج کی رپورٹنگ؟ کچھ خاص ہاتھ لگا؟" اس نے بڑے تجسس سے پوچھا۔ میں نے بہت نارمل لہجے میں جواب دیا، "بس ٹھیک ہی تھی، وہی پرانی بھاگ دوڑ۔ تم سناؤ، تمہارا دن کیسا گزرا؟" ابھی ہماری یہ رسمی گفتگو جاری تھی کہ دس منٹ بعد رامین بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔

ہم تینوں بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر تک تھکن اور شہر کے حالات پر باتیں کرتے رہے۔ پھر طے پایا کہ کھانا نیچے سے منگوا لیا جائے۔ جب کھانا آگیا اور میز پر سج گیا، تو پلان کے مطابق کارروائی کا وقت شروع ہوا۔ داریان ہاتھ دھونے کے لیے واش روم گیا، تو میں نے موقع غنیمت جانا۔ میرے پاس وہ دوا پہلے سے تیار تھی۔ میں نے جلدی سے جگ کے پانی میں وہ دوا ملا دی، جبکہ رامین نے پھرتی سے اپنے اور میرے لیے دو الگ گلاس بھر کر سائیڈ پر رکھ دیے تاکہ ہم وہ 'خاص' پانی نہ پی لیں۔ داریان واپس آیا اور ہم سب کھانا کھانے لگے۔

کھانا کے دوران میں نے جان بوجھ کر مرچوں والے سالن کی تعریف کی تاکہ داریان کو پیاس لگے۔ "یار، سالن تو واقعی تیز ہے،" داریان نے لقمہ توڑتے ہوئے کہا اور ہاتھ بڑھا کر اسی جگ سے اپنا گلاس بھرا جس میں، میں نے دوا ملائی تھی۔ میں اور رامین خاموشی سے اپنا اپنا گلاس (جو ہم نے پہلے ہی الگ بھر لیے تھے) پینے لگے، جبکہ داریان نے دو تین بڑے گھونٹ اس 'خاص' پانی کے بھر لیے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اب الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے

۔ ہم دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہے اور اپنا الگ رکھا ہوا پانی پیتے رہے۔ کھانے کے بعد ہم تقریباً آدھا گھنٹہ باتیں کرتے رہے۔ داریان ہمیں اپنی 'فرضی' رپورٹنگ کے قصے سنا رہا تھا کہ وہ کسی پارک میں گیا تھا، حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ رامین نے اس کا پیچھا کیا تھا اور وہ پارک میں نہیں بلکہ اپنے کسی مشکوک ساتھی سے ملنے گیا تھا جس کی تصویریں رامین نے پہلے ہی اتار لی تھیں۔

دوا نے آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ داریان کی آواز بوجھل ہونے لگی۔ "پتا نہیں... آج سر بہت بھاری ہو رہا ہے،" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے بھی بات جاری رکھتے ہوئے اسے جتایا کہ میں کہاں گیا تھا، تاکہ اسے شک نہ ہو۔ چند ہی منٹوں میں اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ہم سمجھ گئے کہ اب میدان صاف ہے۔ میں نے رامین کی طرف دیکھا اور سر کے اشارے سے تصدیق کی۔ اب داریان بے خبر سو رہا

تھا اور ہمارے پاس وہ وقت تھا جس میں ہم نے اپنا اصل اور حتمی پلان ترتیب دینا تھا داریان کے خراٹوں کی باقاعدہ آواز اس بات کی تصدیق تھی کہ دوا اپنا کام کر چکی ہے۔ میں اور رامین کرسیاں قریب کر کے میز پر جھک گئے۔ اب آوازیں دھیمی تھیں مگر گفتگو کی شدت کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

"تو اب بتاؤ،" میں نے رامین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا، "تمہارے ذرائع کیا کہتے ہیں؟ ان تینوں کا کیا سراغ ملا؟" رامین نے اپنا فون آن کیا اور ایک انکرپٹڈ فائل کھولتے ہوئے بولا، "ذیشان بھائی، کچھ کڑیاں جڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ میں آج ان جگہوں پر گیا جہاں ان لوگوں کے ٹھکانے ہو سکتے تھے۔ میں نے دو تین پرانے صحافیوں سے اور مقامی ذرائع سے ملاقاتیں بھی کیں۔ میں نے ان تصویروں کے بارے میں بہت احتیاط سے پوچھا۔ کچھ کڑیاں تو مل رہی تھیں، مگر تصویر ابھی تک دھندلی تھی۔"

ہمیں یہ تو لگ رہا تھا کہ یہ لوگ کسی بڑے نیٹ ورک کا حصہ ہیں، مگر یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کا اصل 'بوس' کون ہے اور یہ فائل کس کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔"

ہم ابھی اسی بحث میں الجھے ہوئے تھے اور مختلف امکانات پر غور کر رہے تھے کہ اچانک رامین کے فون کی سکرین روشن ہوئی۔ ایک مخصوص نوٹیفکیشن کی آواز آئی۔ رامین نے فون اٹھایا اور جیسے ہی میسج پڑھا، اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ رامین نے فون میری طرف نہیں کیا بلکہ کپکپاتی آواز میں بولا، "ذیشان بھائی... یہ تو میرے تصور سے بھی باہر کی بات ہے۔ میرے ایک بہت ہی قابلِ اعتماد جاننے والے نے ابھی ابھی ان تصاویر کی تصدیق بھیجی ہے۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، جیسے الفاظ جمع کر رہا ہو۔ "اس نے بتایا ہے کہ جس بندے سے ہم نے کل ملاقات کی تھی، جس کا نام منصور ہے... اس کا تعلق یہاں سے نہیں ہے۔ وہ بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی کا رہنے والا ہے!" میں کرسی سے اچھل پڑا۔ "کیا؟ دہلی سے؟" میری آواز حیرت سے بلند ہوئی مگر میں نے فوراً خود پر قابو پایا تاکہ داریان جاگ نہ جائے۔

جی ذیشان بھائی،" رامین نے فون کی سکرین میری طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "باقی دو افراد کی شناخت ابھی مکمل نہیں ہوئی، مگر یہ منصور... یہ سیدھا دہلی کا رہنے والا ہے

۔ "رامین، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم تو اسے مقامی نیٹ ورک کا حصہ سمجھ رہے تھے۔ میں تو یہ گمان کر رہا تھا کہ شاید یہ ایرانی انٹیلی جنس کا کوئی مہرہ ہے یا پھر اس کا تعلق اسرائیلی یا فرانسیسی ایجنسیوں سے ہو گا... مگر یہ تو سیدھا سرحد کے اس پار کا نکلا؟""جی ذیشان بھائی،" رامین کی آواز میں بھی وہی سنجیدگی تھی۔ "منصور یہاں کاروبار کے سلسلے میں مقیم ہے، مگر درحقیقت وہ انڈین نیٹ ورک کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ اس 'بلوچ انویسٹی گیشن فائل' کو حاصل کرنے کے لیے ایک پل کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کا کام صحافیوں اور مقامی مخبروں کے درمیان رابطہ کاری ہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔" میں نے ایک لمبا سانس لیا۔ کھیل ہماری سوچ سے کہیں زیادہ بڑا اور خطرناک ہو چکا تھا۔ "تو اس کا مطلب ہے کہ داریان جس 'بوس' کو رپورٹ کر رہا ہے، وہ براہِ راست دہلی سے آپریٹ ہو رہا ہے؟ یہ تو سراسر ریاست کے خلاف ایک بڑی سازش

ہے جس میں صحافت کا لبادہ اوڑھ کر معلومات چوری کی جا رہی ہیں۔"ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ منصور کی شناخت نے پورے کیس کا رخ موڑ دیا تھا۔ اب ہمیں نہ صرف ان باقی دو لوگوں تک پہنچنا تھا، بلکہ یہ بھی دیکھنا تھا کہ اس نیٹ ورک کی جڑیں اس ملک میں اور کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔"اب اگلا قدم کیا ہے؟" رامین نے پوچھا منصور کے دہلی کنکشن نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب یہ محض کوئی صحافتی رپورٹنگ نہیں تھی، بلکہ ایک خطرناک جاسوسی کھیل بن چکا تھا۔ میں نے کرسی پیچھے کی اور ایک گہرا سانس لیا۔ میری نظریں سوئے ہوئے داریان پر پڑیں، جس کے ذریعے ہمیں اس جال کے آخری سرے تک پہنچنا تھا۔"رامین، اب ہمیں اپنی تیاری بدلنی ہوگی،" میں نے دھیمی مگر پختہ آواز میں کہا۔ "کھیل اب خطرناک ہو چکا ہے۔ ہمیں اپنی حفاظت کے لیے کچھ کرنا ہوگا ہمیں کل یا پرسوں جب بھی ان لوگوں کے سامنے جانا ہے، ہم خالی ہاتھ نہیں جا سکتے۔"رامین نے تشویش سے پوچھا، "آپ کا کیا مطلب ہے ذیشان بھائی؟""ہمیں ایک پستول کی ضرورت ہے،" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ "جب ہم ان مشکوک مہروں سے ٹکرائیں گے، تو ہمیں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار پاس رکھنا ہوگا رامین نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا، "ٹھیک ہے، یہاں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کے ذریعے ہم قانونی یا غیر قانونی طور پر پستول کا انتظام کر سکتے ہیں۔ یہاں کی ایجنسیاں اور لوکل نیٹ ورک یہ کام منٹوں میں کر دیتے ہیں۔ مگر..." وہ رکا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا مگر ذیشان بھائیکیا آپ اسے سنبھال لیں گے؟ میرا مطلب ہے، کیا آپ کو اسلحہ چلانے کا تجربہ ہے؟"

میں نے ایک پُر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ رامین کی طرف دیکھا۔ "رامین، تم شاید بھول رہے ہو کہ میں کس تربیت سے گزرا ہوں۔ میں تقریباً ہر قسم کا جدید ہتھیار چلانا جانتا ہوں اور ضرورت پڑنے پر میرا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ یہ پستول ہمارے پاس ایک 'بیک اپ' کے طور پر ہوگا، جس کا علم داریان کو ہر گز نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اسے پتہ چلا تو وہ اپنے آقاؤں کو خبردار کر دے گا اور ہمارا پورا پلان مٹی میں مل جائے گا۔"رامین نے تائید میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، میں کل صبح نکلتے ہی اپنے ایک پرانے ذریعے سے رابطہ کروں گا۔ ہم نے طے کیا کہ کل بھی ہم اسی طرح الگ الگ رپورٹنگ کے نام پر نکلیں گے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ رامین اسلحے کا انتظام دیکھے گا اور میں ان کڑیوں کو جوڑوں گا جو ہمیں منصور کے اصل ٹھکانے تک لے جا سکیں۔ پلان مکمل ہو چکا تھا۔ ہم نے ایک آخری نظر سوئے ہوئے داریان پر ڈالی اور پھر بظاہر پرسکون ہو کر اپنے اپنے بستروں کی طرف بڑھ گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی، مگر ہمارے ذہنوں میں آنے والے طوفان کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اب بس اگلی صبح کا انتظار تھا۔ تہران کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی صبح کی اذان نے سکوتِ شب کو توڑ دیا۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی کمرے میں زندگی کی پہلی لہر بیدار ہوئی۔ میں سب سے پہلے بستر سے اٹھا، وضو کیا اور کھڑکی کے پاس جائے نماز بچھا دی۔ تہران کی گلیوں سے آتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے درمیان میں نے اللہ کے حضور سر جھکا دیا۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھائے تو دل سے ایک ہی دعا نکلی: "یا رب، اس کٹھن سفر میں ہمیں ثابت قدم رکھنا اور ملک دشمنوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کی ہمت عطا کرنا۔" میری دعا میں وہی تڑپ اور جذبہ تھا جو ایک سچے مجاہد کا خاصہ ہوتا ہے۔تب تک رامین اور داریان بھی جاگ گئے انہوں نے وضو کیا اور پھر نماز ادا کی کچھ دیر بعد ہم تینوں

ناشتے کی میز پر جمع ہوئے تو بظاہر ماحول وہی تھا تین صحافی جو اپنے دن بھر کے کام کا نقشہ ترتیب دے رہے ہیں۔ مگر میز کے نیچے دو ذہن کسی تیسرے ہی منصوبے پر کام کر رہے تھے۔"آج کا کیا پروگرام ہے؟" داریان نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ میں نے میز پر انگلی رکھتے ہوئے کہا، "میرا خیال ہے میں آزادی چوک (Azadi Tower) کی طرف جاؤں گا۔ وہاں آج کچھ عوامی ہلچل کی توقع ہے، شاید کوئی اچھی اسٹوری مل جائے۔ رامین، تم تہران کے ان پارکوں کا رخ کرو جہاں اکثر سیاسی بحثیں اور چھوٹے موٹے احتجاج ہوتے رہتے ہیں۔"رامین نے تائید میں سر ہلایا، "ٹھیک ہے، میں شمالی حصوں کے پارک دیکھ لوں گا۔" یہ سب داریان کو چکمہ دینے کے لیے تھا، کیونکہ ہمارا اصل رخ تو ان خفیہ کڑیوں کی طرف تھا جو منصور کے گرد بنی تھیں۔ میں نے ناشتے کے دوران بڑے نارمل انداز میں داریان سے پوچھا، "ویسے داریان، کل تم کہہ رہے تھے کہ کسی اور نیٹ ورک سے بات چل رہی ہے؟ کیا اس فائل کے حوالے سے کوئی تازہ اپڈیٹ ملی؟"داریان نے لقمہ توڑتے ہوئے جواب دیا، "ہاں ذیشان بھائی، ایک دو پرائیویٹ چینلز سے رابطہ ہوا ہے، وہ اس ماسٹر فائل میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اگر بات پکی ہوئی تو میں آپ کو فوراً مطلع کروں گا۔"ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے—ایک ایسی مسکراہٹ جس کا مطلب صرف میں اور رامین جانتے تھے۔

داریان اب بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمیں اندھیرے میں رکھ رہا ہے، جبکہ ہم اس کے ہر جھوٹ کو اپنی اگلی چال کی بنیاد بنا رہے تھے۔ناشتہ ختم ہوا تو ہم نے اپنا اپنا سامان سنبھالا۔ ہم بالکل اسی طرح گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے بہترین دوست ہوں، لیکن ہر قدم پر ایک نیا امتحان ہمارا منتظر تھا۔ ہوٹل سے نکلتےوقت ہمارے ارادے پختہ تھے: آج صرف رپورٹنگ نہیں ہونی تھی، آج اس دہلی والے منصور کے نیٹ ورک پر کاری ضرب لگانے کی پہلی بڑی تیاری ہونی تھی۔

میں نے ٹیکسی لی اور بظاہر آزادی چوک کی طرف نکلا، مگر تھوڑی دور جا کر راستہ بدل لیا۔ میرا رخ اس کاروباری مرکز کی طرف تھا جہاں منصور کے کاروبار کے بارے معلومات لے سکتا تھا جو وہ صحافت کے پس پردہ کر رہا تھا رامین کے بھیجے ہوئے اس خاکے اور معلومات نے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا تھا جہاں سے منصور اپنا 'کاروبار' آپریٹ کرتا تھا۔ میں نے ایک قریبی کیفے میں بیٹھ کر نظریں اس عمارت پر جما دیں اور اپنے آن لائن ذرائع سے اس کی تجارتی سرگرمیوں کا کچا چٹھا کھنگالنا شروع کیا۔ مجھے معلوم کرنا تھا کہ یہ 'دہلی والا' یہاں کن مقامی لوگوں کی آڑ میں چھپا ہوا ہے۔اس دوران میں نے اپنے کچھ پرانے روابط سے ان باقی دو افراد کے بارے میں بھی رابطہ کیا جن کا کل اسٹوڈیو میں سامنا ہوا تھا۔ میں نے ان کی تصاویر دوبارہ انکرپٹڈ چینلز پر بھیجیں اور بے چینی سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔دوسری طرف رامین تہران کے ان گنجان علاقوں کی طرف نکل گیا تھا جہاں کی تنگ گلیوں میں ہر چیز بکتی تھی۔ وہ اپنے ایک پرانے اور بااعتماد ذریعے سے وہاں پہنچا۔ رامین نے بڑی رازداری سے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ وہاں اس نے نہ صرف منصور کے بارے میں مزید معلومات لیں، بلکہ اپنے اصل مقصد یعنی پستول کی خریداری کے لیے سودا بھی کیا۔ یہ ایک 'کلین' ہتھیار تھا جس کا ریکارڈ کہیں موجود نہیں تھا۔ رامین نے پستول کو بڑی مہارت سے اپنے سامان میں چھپا لیا، کیونکہ یہ وہ ہتھیار تھا جو ضرورت پڑنے پر ہماری زندگی اور مشن کی ضمانت بن سکتا تھا۔ادھر داریان اپنے تئیں ہمیں بے

وقوف بنا رہا تھا۔ وہ تہران کے ان پارکوں اور عوامی مقامات پر موجود تھا جہاں اسے بھیجا گیا تھا۔ دن میں ایک دو بار اس کا میسج موصول ہوا: "ذیشان بھائی، یہاں آزادی چوک کے قریب ماحول گرم ہے، میں کوریج کر رہا ہوں۔ آپ سنائیں؟" میں نے بھی اسے ویسا ہی جواب دیا تاکہ اسے ذرا برابر بھی شک نہ ہو کہ ہم اس کی ہر چال سے واقف ہیں۔ ہماری فون پر بات چیت بالکل ویسی ہی رہی جیسے عام ساتھیوں کے درمیان ہوتی ہے، مگر پسِ پردہ ہم اسے اس کے اپنے ہی جال میں پھنسا رہے تھے وقت گزرتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے عصر کا وقت ہو گیا۔ سورج ڈھلنے لگا تھا اور تہران کی بلند و بالا عمارتوں کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ شام تک میرے پاس منصور کے کاروباری روابط کی ایک لمبی فہرست آ چکی تھی اور رامین نے بھی اپنا 'خاص سامان' حاصل کر لیا تھا۔ اب مرحلہ تھا واپس ہوٹل پہنچنے کا، جہاں ہمیں ایک بار پھر داریان کے سامنے وہ پرانا 'رپورٹر' والا روپ دھارنا تھا، جبکہ ہمارے پاس اب وہ طاقت (پستول) بھی تھی جو اس مشن کو کسی بھی وقت خونی موڑ دے سکتی تھی۔ تہران کی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور شہر کی ٹریفک کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک محفوظ گلی کی نکڑ پر رک کر رامین کو آخری میسج بھیجا: "رامین، اب وقت آ گیا ہے۔ تم فوراً ہوٹل پہنچو اور وہ پستول اور دوسرا سامان ایسی جگہ چھپا دو جہاں داریان کا وہم و گمان بھی نہ جا سکے۔ میں داریان کو میسج کر کے اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں گا تاکہ اسے شک نہ ہو کہ ہم الگ الگ کیا کھچڑی پکا رہے تھے۔" رامین کا جواب صرف ایک لفظ تھا: "اوکے۔" میں نے فوراً داریان کو میسج کیا: "یار داریان، میں ابھی آزادی چوک سے فارغ ہوا ہوں، تم کہاں ہو؟ چلو ساتھ ہی ہوٹل چلتے ہیں، تھکن سے برا حال ہے۔" داریان نے فوراً حامی بھر لی اور ہم ایک طے شدہ مقام پر ملے اور اکٹھے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں، میں نے جان بوجھ کر ایک 'شکاری' کی طرح جال بچھانا شروع کیا۔ "داریان، ایک بڑی خبر ہے،" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "آج میرے ایک پرانے نیٹ ورک سے رابطہ ہوا ہے۔ وہ اس ماسٹر فائل میں نہ صرف دلچسپی لے رہے ہیں بلکہ منہ مانگی قیمت پر اسے آج رات ہی خریدنے کے لیے تیار ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی داریان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور بے چینی آ گئی۔ "واقعی ذیشان بھائی؟ کون لوگ ہیں وہ؟ کیا وہ بھروسے مند ہیں؟""ہاں، بہت بڑا نیٹ ورک ہے،" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں ابھی ملنا چاہیے یا نہیں۔ تم کیا کہتے ہو؟" داریان کی تو جیسے ہوا میں اڑنے کی باری آ گئی تھی۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ یہ فائل واقعی اصلی ہے اور اگر ہم نے کسی اور کو بیچ دی تو اس کے آقاؤں (منصور وغیرہ) کے ہاتھ سے یہ ڈیل نکل جائے گی۔ دریان نے بس مختصر سا جواب دیا کہ چلو پھر ہوٹل چل کر رامین سے مشورہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں وہ کیا کہتا ہے جب ہم ہوٹل پہنچے تو رامین پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس نے بڑی صفائی سے پستول کو اپنی پہنچ میں مگر چھپا کر رکھ دیا تھا۔ جیسے ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے، داریان کا اضطراب بڑھتا گیا۔ وہ بمشکل پانچ منٹ بیٹھا ہو گا کہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ذرا واش روم ہو کر آتا ہوں،" اس نے جلدی سے کہا۔

واش روم کا دروازہ بند ہوتے ہی میں نے رامین کو اشارہ کیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ واش روم ہاتھ دھونے نہیں بلکہ اپنے

ساتھی (منصور) کو 'ایمرجنسی الرٹ' بھیجنے گیا ہے کہ خریدار میدان میں آچکے ہیں، جلدی کرو! سب کچھ ہمارے پلان کے مطابق ہو رہا تھا داریان واش روم سے واپس آیا اور صوفے پر آکر بیٹھ گیا، مگر اس کے چہرے پر موجود اضطراب اس کی تیز ہوتی دھڑکنوں کا پتہ دے رہا تھا۔ ہم اسے شک میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے، اس لیے میں اور رامین بڑے آرام سے تہران کے موسم اور گزشتہ روز کی رپورٹنگ پر گپ شپ کرنے لگے۔ داریان بھی اس گفتگو میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اس کی نظریں بار بار میز پر رکھے فون کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ تقریباً دس منٹ اسی کشمکش میں گزرے ہوں گے کہ اچانک میرے موبائل کی سکرین روشن ہوئی۔ منصور کی کال تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور کال اٹھا کر اسپیکر پر ڈال دی۔ "ہیلو ذیشان صاحب دوسری طرف سے منصور کی وہی جچی تلی آواز آئی۔ "ہم نے آپ کی پیشکش پر غور کر لیا ہے۔ ہمیں وہ 'فائل' ہر قیمت پر چاہیے۔" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، "اتنی جلدی یاد آگئی ہماری؟ مجھے لگا شاید آپ ابھی تک سوچ بچار میں ہی مصروف ہیں۔" "وقت کم ہے،" منصور نے دو ٹوک کہا۔ "ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم ابھی سودا فائنل کریں گے۔ ایک کروڑ کی ڈیل طے ہوئی تھی، پچاس لاکھ ہم ابھی ٹرانسفر کر رہے ہیں تاکہ آپ کو ہمارا یقین ہو جائے۔ باقی رقم فائل کی وصولی پر دی جائے گی۔ بس اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیج دیں اس لمحے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا اور شاید اسی افراتفری میں مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ میں نے اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیجنے کے بجائے نادانستہ طور پر وہ نمبر بھیج دیا جو داریان کا تھا۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ داریان کے فون پر میسج کی گھنٹی بجی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون اٹھایا اور اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "ذیشان بھائی! پچاس لاکھ... یہ تو میرے اکاؤنٹ میں آگئے ہیں!" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے موت جیسی خاموشی چھا گئی۔ رامین نے تشویش سے میری طرف دیکھا، وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ایک بہت بڑی چوک ہو گئی ہے کیونکہ داریان خود ان کا ساتھی تھا۔ یہ صورتحال ہمارے مشن کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی مگر اس لمحے حواس پر قابو رکھنا لازمی تھا۔ میں نے چہرے پر سکون طاری کیا اور ایک گہرا سانس لے کر داریان کی طرف دیکھا۔ "چلو، پیسے آگئے یہ اچھی بات ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس ڈیل کے لیے سنجیدہ ہیں۔ اب یہ رقم تمہارے پاس ہو یا میرے پاس، فی الحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مشن ابھی باقی ہے۔" میں نے بات کو نارمل رکھنے کے لیے فوراً اگلا نکتہ اٹھایا۔ "اب اصل کام یہ ہے کہ باقی کی رقم کب اور کہاں ملے گی۔ پچاس لاکھ تو محض بیعانہ (Advance) ہے۔ ہمیں اپنی پوزیشن مضبوط رکھنی ہو گی تاکہ اگلی ملاقات میں ہم بازی جیت سکیں داریان ابھی تک پیسوں کے اثر میں تھا، مگر میری باتوں نے اسے دوبارہ مشن کی طرف متوجہ کر دیا۔ رامین خاموش تھا، مگر میں جانتا تھا کہ اس کا دماغ اب اس رقم کو محفوظ بنانے کے متبادل راستے سوچ رہا ہے

پچاس لاکھ کی رقم داریان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہونے کے بعد جہاں وہ حیرت اور جوش میں تھا، وہیں میرے اور رامین کے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ ہم جانتے تھے کہ داریان کے جاگتے رہتے ہم اگلا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ اب وہ صرف ایک مہرہ نہیں بلکہ اس بھاری رقم کا امین بھی بن چکا تھا۔ "یار، آج تو واقعی دن بہت لمبا تھا،" میں نے تھکن سے چور لہجے میں کہا۔ "کیوں نہ کھانا کمرے میں ہی منگوا لیا جائے؟ کل کا دن آج سے بھی زیادہ اہم

ہے۔" داریان، جو ابھی تک اپنے فون کی سکرین کو گھور رہا تھا، فوراً مان گیا۔ "ہاں ذیشان بھائی، آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ کھانا کھا کر آرام کرتے ہیں۔" ہم نے کل والے منصوبے کو ہی دہرانے کا فیصلہ کیا۔ جب کھانا آیا، تو میں نے پہلے ہی موقع پا کر بڑی مہارت سے وہی خواب آور گولیاں پانی میں ملا دیں۔ رامین نے اپنی پیاس کا بہانہ کر کے پہلے ہی اپنے لیے الگ سے پانی کا انتظام کر رکھا تھا تاکہ ہم اس 'خاص' پانی سے محفوظ رہیں کھانا کھاتے ہوئے ہم نے بظاہر وہی عام سی باتیں کیں، مگر ہماری نظریں داریان کی پلکوں پر جمی تھیں کھانا کھا لینے کے تقریباً بیس منٹ بعد، میں نے دیکھا کہ داریان کی پلکیں بوجھل ہو رہی ہیں۔ دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ "پتہ نہیں... اتنی تھکن کیوں ہو رہی ہے..." داریان نے بمشکل الفاظ ادا کیے اور اس کا سر صوفے کی پشت سے ٹک گیا پتہ نہیں... اتنی تھکن کیوں ہو رہی ہے..." داریان نے بمشکل الفاظ ادا کیے اور گہری نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔ میں نے رامین کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں اب سکون کی جگہ مشن کی سنجیدگی آ چکی تھی۔

ہم نے داریان کو سہارا دے کر بستر پر لٹایا۔ اب کمرہ صرف ہمارا تھا اور ہمارے پاس وہ وقت تھا جس میں ہم نے یہ طے کرنا تھا کہ کل اس دہلی والے منصور کے سامنے کیسے جانا ہے۔ داریان بستر پر بے خبر سو رہا تھا، لیکن میرے اور رامین کے ذہنوں میں اگلی صبح کا نقشہ بڑی تیزی سے ترتیب پا رہا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ کل کا سورج ہمارے مشن کا سب سے خطرناک موڑ ثابت ہونے والا ہے۔ میں نے رامین کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر سنجیدگی اور عزم کی جھلک تھی۔ "رامین،" میں نے دبی آواز میں بات شروع کی، "کل ہم کوئی خطرہ مول نہیں لیں گے۔ میری جیکٹ کے اندرونی خانے میں پستول ہر وقت لوڈڈ رہے گی۔ جیسے ہی ہم منصور کے بتائے ہوئے اس پرانے گودام میں داخل ہوں گے، ہمیں اپنی پوزیشن کا علم ہونا چاہیے۔" رامین نے تائید میں سر ہلایا۔ "ذیشان بھائی، مجھے فکر اس بات کی ہے کہ اگر منصور اور اس کے دو ساتھی بھی مسلح ہوئے تو کیا ہوگا؟ وہ لوگ پیشہ ور ہیں، وہ خالی ہاتھ نہیں آئیں گے۔" "میں نے اس بارے میں سوچا ہے،" میں نے جواب دیا۔ "ہمیں عددی برتری کے بجائے نفسیاتی برتری حاصل کرنی ہوگی۔ ہمارا سب سے بڑا ہتھیار 'داریان' ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ وہ ان کا مہرہ ہے، لیکن کل وہ ہماری ڈھال بنے گا۔ ہم اسے اپنی گفتگو کے ذریعے منصور کے بالکل سامنے بٹھائیں گے۔" میں نے پلان مزید واضح کیا: "جیسے ہی بات چیت شروع ہوگی، میں بجلی کی تیزی سے پستول نکال کر سیدھا داریان کی کنپٹی پر رکھ دوں گا۔ اس کا اپنا بندہ ہمارے قبضے میں ہوگا، تو منصور اور اس کے ساتھی ہتھیار چلانے سے پہلے دس بار سوچیں گے۔ میں انہیں باور کروا دوں گا کہ اس گودام کے باہر ایرانی انٹیلی جنس کا گھیرا ہے اور ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔" رامین نے اپنی جیب سے وہ رسی دکھائی جو ہم نے پہلے ہی حاصل کر لی تھی۔ "جیسے ہی آپ انہیں ساکت کریں گے، میں ایک ایک کر کے ان کے ہاتھ کرسیوں سے جکڑ دوں گا۔" ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ منصور نے ہمیں ابھی اس لیے نقصان نہیں پہنچایا کیونکہ اسے وہ 'خفیہ فائل' ہر قیمت پر چاہیے تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ کھیل اس کے کنٹرول میں ہے، مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہم اس کے 'دہلی نیٹ ورک' کی جڑیں کاٹنے کی پوری تیاری کر چکے ہیں۔ ہم نے ایک آخری بار اپنے ہتھیار اور سامان کو چیک کیا۔ کمرے میں خاموشی تھی، مگر

ہمارے ارادے پہاڑوں کی طرح مضبوط تھے۔ پلان فائنل کرنے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ صبح کی اس عظیم جنگ کے لیے ہمارے اعصاب مکمل طور پر تیار ہوں۔
ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا؛ الفاظ کی اب ضرورت نہیں تھی، صرف عزم تھا۔ ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے، مگر نیند کوسوں دور تھی چھت کو گھورتے ہوئے میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا: "کل کا سورج یا تو ہماری کامیابی کی نوید لائے گا، یا پھر یہ ہماری آخری صبح ہوگی۔" تہران کی اس خاموش رات میں ہر گزرتا لمحہ کسی بھاری بوجھ کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ رامین بھی پہلو بدل رہا تھا، شاید اس کے ذہن میں بھی وہی پستول، وہی گودام اور وہی دہلی والا منصور گھوم رہے تھے۔ اسی کشمکش میں نہ جانے کب تھکن غالب آئی اور ہم چند گھنٹوں کے لیے گہری نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔
صبح تہران کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی فجر کی اذان نے ہمیں بیدار کیا۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور جائے نماز بچھا لی۔ اس لمحے اللہ کے حضور دعا مانگتے ہوئے دل میں ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ نماز کے بعد رامین بھی تیار ہو چکا تھا۔ ہم نے داریان کو جگایا، جو ابھی تک دوا کے اثر سے کچھ بوجھل سا تھا۔
ناشتہ مختصر تھا اور میز پر خاموشی طاری تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں نے گھڑی دیکھی، آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے فون اٹھایا اور منصور کو ایک آخری کال ملائی۔ "ہیلو! ہم نکل رہے ہیں۔ نو بجے تک اس پرانے گودام پر پہنچو، ہم بھی وہیں پہنچ رہے ہیں۔ ڈیل اپنے وقت پر ہونی چاہیے۔" دوسری طرف سے منصور کی سرد آواز آئی، "ٹھیک ہے، ہم انتظار کریں گے۔" میں نے فون جیب میں رکھا اور رامین کو اشارہ کیا۔ داریان اب پوری طرح چوکنا ہو چکا تھا، اس کے ذہن میں وہی پچاس لاکھ گھوم رہے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس ڈیل کے لیے جا رہا ہے، وہاں اس کی حیثیت کیا ہونے والی ہے۔ "چلو، وقت ہو گیا ہے،" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ہم نے اپنا سامان سنبھالا اور ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازہ بند کرتے وقت مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ایک باب ختم کر دیا ہے اور اب اگلا قدم سیدھا آگ کے دریا میں ہوگا۔ ہم ہوٹل سے نکلے اور رامین کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی نشست پر تھا، رامین گاڑی چلا رہا تھا اور داریان پچھلی نشست پر بیٹھا بڑے اطمینان سے تہران کی سڑکوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں موجود منصوبے کی تہیں بھی کھل رہی تھیں۔
ہم نے جان بوجھ کر داریان کے سامنے ایک بالکل 'سادہ' اور 'کمزور' سا پلان دہرانا شروع کیا۔ یہ ہماری حکمتِ عملی کا حصہ تھا تاکہ داریان اپنے آقاؤں کو جو بھی رپورٹ دے، وہ ہمیں ایک آسان شکار سمجھیں۔
"دیکھو داریان،" میں نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا، "پلان بالکل صاف ہے۔ ہم گودام میں داخل ہوں گے، منصور اور اس کے بندوں سے ملیں گے جیسے ہی وہ باقی کی رقم دکھائیں گے، ہم فائل ان کے حوالے کر دیں گے۔ کوئی جھگڑا نہیں، کوئی پیچیدگی نہیں۔ بس سیدھا سا سودا ہے۔" رامین نے بھی اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے حامی بھری، "ہاں، ہمیں بس اپنے پیسوں سے مطلب ہے۔ پچاس لاکھ پہلے ہی آ چکے ہیں، باقی کی رقم ملتے ہی ہمارا کام ختم۔" داریان نے اطمینان سے

سر ہلایا، "فکر نہ کریں ذیشان بھائی، منصور صاحب بھی یہی چاہتے ہیں۔ سب کچھ سکون سے ہو جائے گا۔" اصل میں ہم نے داریان کے سامنے یہ 'بھولا پن' اس لیے برقرار رکھا ہوا تھا تاکہ وہ اپنے نیٹ ورک کو یہ بتا سکے کہ ہم کسی بڑے ایکشن یا مزاحمت کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ فی الحال وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، کیونکہ داریان ہمارے ذریعے سے اب بھی بہت سی خفیہ معلومات اکٹھی کر رہا تھا اور اسے ہمارے ساتھ رہنے میں فائدہ نظر آ رہا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ منصور اور اس کے لوگوں نے اپنا کوئی الگ منصوبہ ضرور بنایا ہوگا، مگر ہم نے انہیں یہ تاثر دیا کہ ہم ان کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ گاڑی تہران کے پر ہجوم علاقوں کو پیچھے چھوڑ کر اس ویران صنعتی زون کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں وہ گودام واقع تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ کے اندر موجود پستول کو ایک بار پھر محسوس کیا۔ داریان سمجھ رہا تھا کہ ہم فائل بیچنے جا رہے ہیں، جبکہ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ ہم اس کے 'دہلی نیٹ ورک' کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلے ہیں۔ چند منٹ بعد ہم اب مضافاتی علاقے 'شور آباد' (Shorabad) کے ایک ویران صنعتی زون میں داخل ہو رہے تھے رامین نے گاڑی ایک پرانے اور زنگ آلود لوہے کے گیٹ والے گودام کے سامنے روکی۔ یہ وہی جگہ تھی جس کا انتخاب منصور نے کیا تھا۔ ہم گاڑی سے اترے تو فضا میں ایک عجیب سی خاموشی اور بو پھیلی ہوئی تھی۔ داریان کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جبکہ میں اور رامین اپنی سانسوں کو قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ رامین نے میری طرف دیکھا اور ہم نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو پوزیشن سمجھائی۔
گودام کے اندر داخل ہوئے تو دھول اور مدھم روشنی کے درمیان سامنے ایک بڑی میز لگی ہوئی تھی۔ منصور اور اس کا ایک ساتھی پہلے سے وہاں موجود تھے، جیسے ہمارا ہی انتظار کر رہے ہوں۔ "خوش آمدید ذیشان صاحب،" منصور نے اپنی مخصوص سرد آواز میں سلام کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں میز کی ایک طرف بیٹھ گئے اور دوسری طرف منصور اپنے ساتھی کے ساتھ جم گیا۔ آمنے سامنے آتے ہی فضا میں تناؤ کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے وہ 'خفیہ فائل' میز پر رکھی، مگر میرا ہاتھ اس کے اوپر ہی رہا۔ "سلام دعا تو ہوتی رہے گی منصور صاحب،" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، "پہلے ڈیل کی بات کی جائے۔ ہم وقت ضائع کرنے کے عادی نہیں ہیں۔" منصور نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے برابر بیٹھے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک کالا چمڑے کا بیگ میز پر رکھا اور اسے کھول کر ہماری طرف گھما دیا۔ بیگ کے اندر نوٹوں کی کڑکتی ہوئی گڈیاں تہوں میں سجی ہوئی تھیں۔ "پورے پچاس لاکھ ہیں،" منصور نے ایک فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "پچاس لاکھ آپ کے اکاؤنٹ میں پہلے ہی پہنچ چکے ہیں۔ اب یہ فائل ہماری ملکیت ہونی چاہیے۔" رامین نے خاموشی سے رقم کا جائزہ لیا، مگر اس کی ایک نظر منصور اور اسکے ساتھی پر بھی تھی جو کسی بھی لمحے حرکت میں آنے کے لیے تیار تھا۔ "رقم تو ٹھیک ہے منصور صاحب،" میں نے فائل کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ "لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ محض کاغذ کے ٹکڑے نہیں ہیں۔ اس فائل کے اندر وہ راز ہیں جو آپ کی اور آپ کے آقاؤں کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی ہیں۔ کیا آپ واقعی اس کے لیے تیار ہیں؟" منصور کے چہرے کے تاثرات ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ اسے لگ رہا تھا کہ ڈیل مکمل ہو چکی ہے اور وہ جیت چکا ہے، مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ یہ پچاس لاکھ

اس کے لیے ایک موت کا پھندا ثابت ہونے والے ہیں منصور نے ایک تضحیک آمیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "ذیشان صاحب، آپ کے سامنے تہران کی کڑکتی ہوئی کرنسی موجود ہے۔ اب اس فائل کو زیادہ دیر ہاتھ میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سودا صاف ہے، اب ہمیں یہ فائل دے دیں۔" میں نے فائل پر اپنی گرفت تھوڑی اور سخت کی اور منصور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا: "منصور صاحب کیا آپ کو واقعی لگتا ہے کہ اتنی بڑی چیز اتنی آسانی سے آپ کے حوالے کر دی جائے گی؟" منصور کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے غصہ جھلکا۔ "ہم نے آپ کی مانگی ہوئی رقم ادا کر دی ہے ذیشان صاحب! زیادہ ہوشیاری آپ کے لیے مہنگی پڑ سکتی ہے۔" "ہوشیاری وہ نہیں ہوتی جو پیسوں سے خریدی جائے،" میں نے جواب دیا۔ "ہوشیاری وہ ہے جو دشمن کی اگلی چال کو پہلے سے بھانپ لے۔" ابھی منصور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے تیزی سے اپنی جیکٹ کے اندرونی خانے سے پستول نکالی اور منصور کے سامنے بیٹھے داریان کی کنپٹی پر رکھ دی۔ گودام میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ داریان کی آنکھیں پھٹ گئیں اور اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا منصور اور اسکے کارندے نے چونک کر آگے بڑھنے کی کوشش کی، مگر میں نے غرا کر کہا، "خبردار! ادھر ہی رک جاؤ، ورنہ اس کا بھیجا اڑانے میں مجھے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگے گا!" رامین نے بھی فوراً پوزیشن سنبھالی اور بلند آواز میں وارننگ دی، "ہاتھ وہیں روک لو! ایک قدم بھی آگے بڑھے تو تمہاری کھوپڑی میں وہ کھڑکیاں کھول دوں گا کہ یہاں تڑپنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" داریان کی روح جیسے فنا ہو چکی تھی، وہ ہکلاتے ہوئے بولا، "ذیشان بھائی... یہ... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" "داریان! ہلنے کی کوشش بھی کی تو تمہارا یہ پچاس لاکھ والا اکاؤنٹ کسی کام کا نہیں رہے گا،" میں نے پستول کا دباؤ تھوڑا اور بڑھایا۔ پھر منصور کی طرف دیکھ کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا: منصور! اپنے اس مہرے کو کہو کہ اپنی جگہ بیٹھا رہے ہماری خوش قسمتی تھی کہ تم لوگ فی الحال مسلح نہیں ہو، مگر میرے پاس وقت کم ہے۔ باہر میرے بندے ایک سگنل کے منتظر ہیں، جیسے ہی میں اشارہ کروں گا، تہران کی انٹیلی جنس یہاں داخل ہو جائے گی۔ اب تمہارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں: یا تو خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو، یا پھر اپنے اس دوست داریان کی لاش اٹھاؤ۔" منصور کا چہرہ سپید پڑ چکا تھا اور اس کے کارندا پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب بازی پلٹ چکی ہے اور شکاری خود جال میں پھنس چکا ہے۔ داریان ہکلاتے ہوئے بولا، "ذیشان بھائی... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں... میں تو آپ کا دوست ہوں، آپ کا ساتھی ہوں!" میں نے ایک تلخ مسکراہٹ چہرے پہ سجائی، اور کہا "دوست؟ داریان، تم نے دوستی کا لبادہ اوڑھ کر جو کھیل کھیلا ہے، میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تمہارے دہلی والے پورے نیٹ ورک سے واقف ہوں، مجھے تمہارے ایک ایک مہرے کی خبر ہے!" داریان کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "ہم جان بوجھ کر تمہارے ساتھ رہے تاکہ تمہارے اس مکروہ کھیل کا پردہ چاک کر سکیں۔ ہمیں تمہارے ہر قدم، ہر ملاقات اور ہر جھوٹ کا علم تھا۔ اب یہ 'دوستی' کا ڈرامہ بند کرو!"

اسی لمحے رامین نے اپنی وہی مضبوط رسی نکالی جو ہم نے پہلے ہی حاصل کر رکھی تھی۔ منصور اور اس کا ساتھی، جو ابھی تک صدمے کی حالت میں تھے، رامین کے فولادی ہاتھوں کے سامنے بے بس ہو گئے۔ رامین نے ایک ایک کر کے ان

دونوں کو کرسیوں کے ساتھ چپکایا اور رسی کے اتنے مضبوط پیچ ڈالے کہ ان کا ہلنا بھی محال ہو گیا۔ جب وہ پوری طرح جکڑے گئے، تو

پھر داریان کو بھی جکڑ لیا رامین نے ایک فاتحانہ نظر مجھ پر ڈالی۔ اب میدان مکمل طور پر ہمارے ہاتھ میں تھا

جیسے ہی رامین پیچھے ہٹا، میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پستول کو اپنے ہاتھ میں ہی رکھا جس کی سیاہ نالی باری باری ان تینوں کے چہروں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ گودام میں چھائی ہوئی موت جیسی خاموشی صرف ان کی تیز ہوتی ہوئی سانسوں سے ٹوٹ رہی تھی۔اب کھیل کے قوانین بدل چکے ہیں،" میں نے اپنی آواز کو جتنا ممکن ہو سکا سپاٹ اور خطرناک رکھا۔ "سوالات کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ جس نے بھی مجھ سے جھوٹ بولنے کی جرات کی، یا بات گھمانے کی کوشش کی... یاد رکھنا، گولی بولنے میں دیر نہیں لگائے گی اور ادھر ہی اس کا کام تمام ہو جائے گا۔"داریان، آغاز تم سے ہی کرتے ہیں،" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہلا سوال داغا۔"منصور کے ساتھ تمہارا پہلا رابطہ کب اور کہاں ہوا؟ اور یہ ماسٹر فائل' دہلی پہنچانے کے بدلے تمہیں کتنا بڑا 'انعام' ملنے والا تھا؟"داریان نے تھوک نگلا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر میں نے پستول کا رخ اس کے ماتھے کے بالکل قریب کر دیا۔ "یاد رکھنا... صرف سچ۔ میرے پاس تمہارے جھوٹ پر ضائع کرنے کے لیے ایک سیکنڈ بھی نہیں ہے۔"داریان کی نظریں منصور کی طرف اٹھیں، جیسے وہ اس سے مدد مانگ رہا ہو، مگر منصور خود اپنی موت کے سامنے بے بس بیٹھا تھا۔"بولو!" میں نے گرج کر کہا۔

داریان کی آنکھوں میں اب وہ چالاکی باقی نہیں رہی تھی جو چند منٹ پہلے تک موجود تھی۔ اس کے چہرے پر خوف صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہنا شروع کیا:

"ذیشان بھائی... میں سچ کہہ رہا ہوں... مجھے اصل فائل یا نیٹ ورک کا کچھ نہیں پتہ... مجھے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ آپ لوگوں کے ساتھ رہوں...ڈیل مکمل کرواؤں... باقی چیزیں منصور کے لوگ سنبھالیں گے... میں تو صرف رابطہ تھا..."

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔چند لمحے گزرے۔ پھر میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔"یعنی تمہیں صرف استعمال کیا جا رہا تھا؟"داریان نے فوراً کہا، "جی... جی بالکل... مجھے بھی مکمل پلان نہیں بتایا گیا تھا..."

میں نے بغیر کچھ کہے رخ موڑا اور منصور کے کارندے کے سامنے جا کر رک گیا۔پستول کی سیاہ نالی اب اس کے چہرے کے عین سامنے تھی۔

"تم بتاؤ۔ داریان کہہ رہا ہے اصل معلومات تم لوگوں کے پاس ہیں۔ فائل کس کے حکم پر منگوائی گئی؟"وہ گھبرا کر۔ بولا، "مجھے نہیں معلوم مجھے تو صرف یہاں بھیجا گیا تھا...

میں ایک قدم اور آگے بڑھا۔

"آخری بار پوچھ رہا ہوں۔"اس نے دانت بھینچ لیے۔"میں نہیں بتاؤں گا... جو کرنا ہے کر لو۔"

گودام میں ایک لمحے کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔

پھر —ٹھاہ!!! گولی کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر گونج اٹھی۔اس کا سر جھٹکے سے پیچھے گیا اور جسم کرسی کے ساتھ ہی ڈھیلا ہو کر لٹک گیا خون فرش پر پھیلنے لگا۔اب گودام میں صرف دو زندہ لوگ باقی تھے۔منصور...اور داریان۔
دونوں کے چہروں پر موت کا سایہ واضح تھا۔داریان کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں جبکہ منصور پہلی بار نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔اب انہیں پوری طرح یقین ہو چکا تھا—یہ کوئی دھمکی نہیں، کوئی نفسیاتی کھیل نہیں... یہاں جھوٹ کی سزا فوراً دی جا رہی تھی۔
میں نے آہستہ سے پستول گھمائی اور دوبارہ منصور کے سامنے آ کھڑا ہوا۔"اب شاید تم دونوں کو سمجھ آ گئی ہو گی..."میں نے دھیمی مگر خوفناک آواز میں کہا،شاید یہ لوگ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی عام ڈیل ہے...
شاید انہیں لگا ہو گا ہم رقم بڑھانے کی کوشش کریں گے...
یا مزید معلومات لینے کے بعد سودا طے کریں گے...وہ شاید یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا۔کہ کوئی شخص ان کے سامنے واقعی گولی چلا دے گا۔
لیکن بعض اوقات... گولی چلانا معلومات لینے کے لیے نہیں ہوتا۔بلکہ یقین دلانے کے لیے ہوتا ہے۔خوف قائم کرنے کے لیے۔یہ احساس پیدا کرنے کے لیے کہ یہاں دھمکیاں نہیں دی جاتیں...یہاں انجام فوراً لکھ دیا جاتا ہے۔میں جانتا تھا— جب جان آنکھوں کے سامنے تڑپتی ہے،تو بڑے سے بڑا نیٹ ورک بھی چند منٹ میں ٹوٹ جاتا ہے۔اور اب یہی ہو رہا تھا۔
منصور اور داریان دونوں بدل چکے تھے۔ان کی آنکھوں میں اب حساب کتاب نہیں...صرف زندہ بچنے کی خواہش باقی تھی۔"دہلی نیٹ ورک کا براہ راست اصل کنٹرولر کون ہے؟"
نام... اور عہدہ۔"منصور نے فوراً جواب دیا، جیسے دیر کرنا خطرناک ہو۔"میں کبھی دہلی نہیں گیا... براہِ راست رابطہ نہیں تھا..."میں نے دوسرا سوال پوچھا"پھر ہدایات کہاں سے آتی تھیں؟"اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔"مشہد سے..."میں خاموش رہا۔وہ خود بولنے لگا۔"وہاں ہمارا ایک رابطہ ہے... نام کاظم ... اصل کنٹرول وہی سنبھالتا تھا... ہم معلومات اسی کو دیتے تھے..."پھر اگلا سوال کیا"معلومات کس شکل میں؟"منصور بولا"ڈیجیٹل فائلیں... سافٹ ویئر ڈیٹا لوکیشن رپورٹس... جو بھی اکٹھا ہوتا... ہم آگے منتقل کر دیتے تھے...""تم اس سے کیسے ملتے تھے؟""وہ پتھر صاف کرنے اور ایکسپورٹ کے کاروبار کی آڑ میں کام کرتا ہے... قیمتی پتھروں کی پراسیسنگ... اسی بہانے ملاقاتیں ہوتی تھیں کبھی تہران... کبھی مشہد..."
رامین نے نظریں اٹھائیں منصور بولتا گیا۔"سات سال سے یہی کور استعمال ہو رہا ہے... کسی کو شک نہیں ہوتا..."
"فائل مشہد پہنچنے کے بعد کیا ہونا تھا؟"منصور نے سر جھکا لیا۔"ہمیں نہیں بتایا جاتا... ہمارا کام صرف پہنچانا تھا... آگے کیا ہوتا... ہمیں واقعی معلوم نہیں..."میں نے رخ داریان کی طرف موڑا۔اب اس کی باری تھی۔میں نے بغیر غصے کے، مگر مکمل یقین کے ساتھ پوچھا:"داریان...میری بلوچ انویسٹیگیشن فائل کس نے چرائی تھی؟"اس کا جسم ایک دم ساکت ہو

گیا۔چند سیکنڈ خاموشی رہی۔پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا:"میں... میں نہیں جانتا وہ آگے کہاں گئی..."میں نے فوراً بات کاٹ دی۔"میں نے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں گئی۔میں یہ پوچھ رہا ہوں...چوری کس نے کی؟"
داریان کی سانس تیز ہو گئی۔
اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ مجھے پہلے ہی سب معلوم ہے۔
آخرکار اس نے سر جھکا دیا۔
"...میں نے لی تھی۔"گودام میں خاموشی مزید گہری ہو گئی۔
رامین نے مٹھی بھینچ لی۔میں نے اگلا سوال کیا۔"کیوں؟
پیسوں کے لیے... یا کسی ایجنڈے کے لیے؟"داریان نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا:
"مجھے کہا گیا تھا کہ آپ کے ذریعے بہت اہم معلومات مل رہی ہیں... خاص طور پر وہ رپورٹس جو مغربی نیٹ ورکس اور اسرائیلی سرگرمیوں کے خلاف تھیں..." "یعنی تم ہماری تحقیق ان تک پہنچا رہے تھے؟"وہ آہستہ سے بولا:"جی... معلومات آگے منتقل ہو رہی تھیں...""کس کو دہلی؟"
"نہیں... پہلے مشہد... پھر آگے
"مشہد میں کون وصول کرتا تھا؟"داریان نے فوراً جواب دیا:
"کاظم ... وہی مرکزی رابطہ تھا... ہم سمجھتے تھے اصل کنٹرول اسی کے پاس ہے..."
"تمہیں معلوم تھا اس کے بعد کیا ہونا ہے؟""نہیں... ہمیں صرف ڈیٹا دینا ہوتا تھا... آگے پلان ہمیں نہیں بتایا جاتا تھا..."میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔اب تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی... مگر آخری تصدیق باقی تھی۔میں نے سیدھا سوال کیا:"داریان...
جو معلومات ہم نے اسرائیل کے خلاف اکٹھی کی تھیں...ان کے خفیہ رابطے... ان کے نیٹ ورک... ان کی سرگرمیوں کی رپورٹس..."میں ایک لمحہ رکا۔
"اور وہ تمام فائلیں جو فرانسیسی رابطوں اور ان کے آپریشنل کارڈز سے متعلق تھیں...کیا وہ سب تم نے آگے منتقل کر دی تھیں؟"داریان نے آنکھیں بند کر لیں۔چند سیکنڈ بعد اس کی آواز نکلی۔"...ہاں۔"
گودام میں خاموشی اور بھاری ہو گئی۔وہ بولتا گیا۔"جو بھی ڈیٹا آپ لوگ اکٹھا کر رہے تھے رپورٹس... بیک اپ فائلیں سافٹ ویئر ایکسٹریکٹ... سب مشہد چینل کے ذریعے آگے بھیج دیا جاتا تھا..."رامین نے غصے سے مٹھی دیوار پر مار دی۔میں جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا:"بھارتیوں کے لیے کام کر رہے تھے تم؟" داریان کی سانس رک گئی۔چند لمحے وہ خاموش رہا۔پھر آہستہ سے بولا:"...ہاں... مگر میرا براہِ راست کوئی رابطہ نہیں تھا۔"
میں نے دھیمی مگر خطرناک آواز میں پوچھا:"داریان...
تم لوگوں نے ہماری بلوچ انویسٹیگیشن فائل لے لی..."

میں نے انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا۔"اسرائیل کے خلاف جمع کیا گیا کوڈ ڈیٹا...فرانسیسی نیٹ ورک رپورٹس...ہمارا سافٹ ویئر ایکس... حتیٰ کہ مکمل آپریشنل بیک اپ بھی تم لوگوں تک پہنچ چکا تھا..."میں ایک لمحہ رکا۔پھر سیدھا سوال داغ دیا۔"تو پھر...ہمیں زندہ کیوں چھوڑا گیا؟"ہمیں ایرانی ایجنسیوں کے حوالے کیوں نہیں گیا؟گودام میں مکمل خاموشی چھا گئی۔
داریان نے پہلی بار میری طرف سیدھا دیکھا۔اس کے چہرے پر خوف کے ساتھ شکست بھی تھی چند لمحے بعد وہ بولا:
"...کیونکہ آپ لوگ ابھی بھی ہمارے لیے قیمتی تھے۔"رامین فوراً آگے بڑھا۔"وضاحت کرو!"
داریان جلدی جلدی بولنے لگا۔
"اوپر والوں کا حکم تھا کہ رابطہ ختم نہ کیا جائے...آپ لوگ مسلسل نئی معلومات تک پہنچ رہے تھے...اگر آپ ختم ہو جاتے تو سورس بند ہو جاتا..."
میں نے سرد لہجے میں کہا:
"یعنی ہم تمہارے لیے چلتی پھرتی فائل تھے؟"اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔"...جی۔"میں نے پستول کی نالی داریان کے ماتھے کے قریب لا کر روک دی۔
آواز دھیمی تھی... مگر فیصلہ کن۔"تم بار بار مشہد کے رابطے کا نام لے رہے ہو..."میں جھکا۔
"اگر ہمیں اس تک پہنچنا ہو...
تو کیسے پہنچیں گے؟"داریان خاموش رہا۔میں نے پستول کا دباؤ بڑھایا۔"غلط جواب دیا...
یا جھوٹ بولا...تو نتیجہ تم سامنے دیکھ ہی چکے ہو۔"
میری نظر ایک لمحے کے لیے فرش پر پڑی لاشوں کی طرف گئی۔داریان کی سانس بے ترتیب ہو گئی۔"بول۔"داریان جلدی سے بولا:"وہ... وہ براہِ راست کسی سے نہیں ملتا..."میں خاموش رہا۔وہ خود تفصیل دینے لگا۔
"مشہد میں وہ قاضی آباد صنعتی علاقے میں رہتا ہے... مگر اصل رہائش ظاہر نہیں کرتا... رابطہ ہمیشہ تیسرے آدمی کے ذریعے ہوتا ہے..."
میں نے فوراً اگلا سوال کیا۔
"رابطہ کیسے شروع ہوتا ہے؟"
"ایک پتھر ایکسپورٹ آفس ہے... کور بزنس... وہاں مخصوص کوڈ لفظ استعمال کیا جاتا ہے..."رامین نے تیزی سے پوچھا:"کون سا کوڈ؟"
داریان ہچکچایا۔میں نے ٹرگر پر انگلی سخت کر دی۔"...'نیلا سنگِ مرمر' کہنا ہوتا ہے... تب وہ سمجھ جاتے ہیں کہ بندہ نیٹ ورک سے ہے..."میں سیدھا کھڑا ہوا۔"پھر؟"پھر وہ لوگ خود رابطہ کرتے ہیں...لوکیشن بدلتی رہتی ہے... کبھی گودام... کبھی ورکشاپ... کبھی باہر شہر..."میں نے سرد لہجے میں پوچھا:"یعنی بغیر ان کی اجازت کوئی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا؟""جی... اگر کوئی خود پہنچنے کی کوشش کرے تو وہ غائب ہو جاتا ہے..."اب میں نے رخ منصور کی طرف موڑا۔وہ

پہلے ہی پسینے میں بھیگا بیٹھا تھا۔میں اس کے سامنے جا کر رکا۔"منصور...
داریان سچ بول رہا ہے؟"منصور نے فوراً سر ہلا دیا۔"جی... یہی طریقہ ہے... براہِ راست ملاقات بہت کم ہوتی ہے..."میں نے اگلا سوال کیا۔"تم آخری بار مشہد والے رابطے سے کب ملے تھے؟"
منصور نے جواب دیا:"دو مہینے پہلے... تہران کے باہر... پتھر سپلائی کے بہانے...""اور اگر ہمیں فوری رابطہ کرنا ہو؟"
منصور نے ہچکچاتے ہوئے کہا:
"آپ کو پہلے سگنل دینا ہوگا...
فائل یا ڈیٹا ہونے کا تاثر دینا پڑے گا... تبھی وہ سامنے آئے گا..."میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔اب اگلا سوال سب سے خطرناک تھا۔کیونکہ اصل خطرہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ دشمن کہاں ہے...بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کتنا جانتا ہے۔میں نے آہستہ سے منصور کے سامنے قدم روکے۔
پستول ابھی بھی میرے ہاتھ میں تھی۔"ایک بات بتاؤ..." میری آواز بالکل سپاٹ تھی۔
"مشہد والا رابطہ...وہ کاظم
وہ ہمارے بارے میں کیا جانتا ہے؟"منصور نے نظریں چرائیں۔
میں نے فوراً سخت لہجے میں کہا:"سوچ کر جواب دینا۔یہ سوال زندگی اور موت کے درمیان کھڑا ہے۔"اس نے تھوک نگلا۔پھر بولا:"... مکمل معلومات تھیں۔"میں خاموش رہا۔"تفصیل سے بتاؤ۔"منصور نے کہنا شروع کیا:"وہ جانتا تھا کہ تم ایران میں قانونی طریقے سے نہیں آئے...اور یہاں ریسرچ کے نام پر سرگرم ہو..."
رامین کی نظریں تیز ہو گئیں۔
منصور بولتا گیا۔"وہ یہ بھی جانتا تھا...کہ تم لوگ صرف تحقیق نہیں کر رہے...بلکہ نیٹ ورک کی اندرونی ساخت تک پہنچنے کی کوشش میں ہو۔"
میں نے آہستہ سے رامین کی طرف دیکھا۔چند لمحے ہماری نظریں ملیں۔پھر میں نے سرد لہجے میں پوچھا:"اب بتاؤ رامین... ان دونوں کا کیا کیا جائے؟"انٹیلیجنس کے حوالے کرو گے... یا خود فیصلہ کرو گے؟"داریان اور منصور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ بات اب پوچھ گچھ سے آگے نکل چکی ہےرامین آہستہ سے بولا:"اگر انہیں انٹیلیجنس کے حوالے کیا...تو داریان ایک لمحہ بھی نہیں لگائے گا۔یہ ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ہر نام... ہر رابطہ... ہر مشن۔"
۔رامین نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا"وہی ہوگا...جو ہمیشہ غداروں کا انجام ہوتا ہے۔"یہ وہ لمحہ تھا جہاں فیصلے لفظوں سے نہیں... تجربے سے کیے جاتے ہیں رامین کے الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔
ٹرگر پر انگلی پہلے ہی تیار تھی۔ٹھاک...! ٹھاک...!دو فائر مسلسل گونجے۔منصور کو شاید یقین ہی نہیں آیا کہ فیصلہ اتنی تیزی سے ہوگا۔اگلے ہی لمحے وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔اسی لمحے رامین آگے بڑھا۔

اس نے داریان کی گردن دونوں ہاتھوں سے جکڑی—اور ایک سخت، فیصلہ کن جھٹکا دیا۔
ایک خشک سی آواز ابھری...
چٹخ۔ جیسے ہڈی نے آخری مزاحمت چھوڑ دی ہو۔داریان کا جسم فوراً ڈھیلا پڑ گیا۔ سر ایک طرف لٹک گیا...آنکھیں کھلی رہ گئیں...اور وہ اسی کرسی پر بے حرکت جھول گیا۔
رمین نے ہاتھ چھوڑا، ایک لمحہ اسے دیکھا، پھر سرد لہجے میں بولا: "اب یہ کبھی کسی کے لیے نہیں بولے گا۔" تہران کے اس زنگ آلود گودام میں بارود کی بو اب بھی فضا میں معلق تھی، لیکن اب وہاں ہمارا ایک لمحہ رکنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ منصور کی لاش کرسی پر ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور داریان، جس کی گردن رامین کے فولادی ہاتھوں نے مروڑ دی تھی، اپنی کھلی آنکھوں سے اپنی غداری کا عبرتناک انجام دیکھ رہا تھا۔

آٹھواں باب ۔۔۔۔۔ سنگِ آریا کا معرکہ

گھڑی کی سوئیاں صبح کے دس بجا رہی تھیں۔سب ٹھیک ہے رامین، اب یہاں سے نکلنا ہوگا،" میں نے دھیمی مگر پختہ آواز میں کہا۔رامین نے خاموشی سے گودام کا بھاری لوہے کا دروازہ باہر سے لاک کیا اور ہم اپنی گاڑی کی طرف بڑھے جو باہر دھوپ میں کھڑی تھی۔ دن کے اجالے میں تہران کے اس صنعتی علاقے میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی، دور کہیں کسی فیکٹری کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔رامین نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم خاموشی سے اس ویران گلی سے نکل کر مرکزی سڑک پر آ گئے۔ اب چیلنج تہران کی ٹریفک اور دن کی روشنی میں لگی چیک پوسٹیں تھیں۔ شہر کا حال ابتر تھا۔

سڑکوں پر عام ٹریفک کے ساتھ ساتھ پاسدارانِ انقلاب کی گاڑیاں کثرت سے نظر آ رہی تھیں۔ حال ہی میں ہونے والے اسرائیل کے حملوں اور اندرونی احتجاجوں نے تہران کے اعصاب چٹخا دیے تھے۔ جگہ جگہ دیواروں پر تازہ نعرے لکھے ہوئے تھے اور لوگ گروہوں کی صورت میں سڑکوں کے کناروں پر کھڑے بے چینی سے موبائل فونز پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ "ذیشان، ناکہ بندی سخت لگ رہی ہے،" رامین نے اسٹیئرنگ تھامے ہوئے سامنے کا منظر دیکھ کر کہا۔ ایک چوک پر باسیج کے جوان ہر گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے۔ ہم نے خاموشی سے ایک متبادل راستہ اختیار کیا جو ہوٹل کی طرف جاتا تھا تھوڑی دیر بعد ہم ہوٹل کے قریب پہنچ گئے

رامین نے گاڑی کو ہوٹل سے تھوڑا پیچھے ایک مصروف بازار کے قریب پارک کیا۔ "تم جاؤ، میں انجن بند نہیں کر رہا،" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ میں گاڑی سے اترا اور عام راہگیروں کے ہجوم میں شامل ہو کر ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا۔ دن کے اس وقت ہوٹل میں کافی چہل پہل تھی۔ میں نے نظریں نیچی رکھیں اور تیزی سے سیڑھیوں کے ذریعے اپنے کمرے میں پہنچا میں نے الماری سے اپنا بیگ نکالا، جس میں ہمارا لیپ ٹاپ اور دیگر ضروری چیزیں موجود تھیں۔ میں نے میز پر پڑا پانی کا گلاس پیا اور ایک لمحے کے لیے شیشے سے باہر تہران کے افق کو دیکھا جہاں دھویں کے بادل ابھی بھی کہیں کہیں نظر آ رہے تھے واپس گاڑی میں پہنچا تو رامین میرا انتظار کر رہا تھا۔ "نکلو یہاں سے،" میں نے بیٹھتے ہی کہا۔

رامین نے گاڑی کو ٹریفک کے بہاؤ میں شامل کر لیا۔ اب ہمارا رخ مشہد کی طرف تھا۔ جیسے جیسے شہر کی گنجان آبادیاں پیچھے چھوٹ رہی تھیں، سڑک کھلی اور ویران ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنا فون نکالا اور ان خبروں کا مطالعہ شروع کیا جو مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ خلیج کو گہرا کر رہی تھیں۔ رامین، جو اب تک صرف گاڑی چلا رہا تھا، میری اسکرین دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ رامین، یہ صرف کمنٹس نہیں ہیں، یہ بارود کے گولے ہیں۔ یہ دیکھو!" میں نے ایک ویڈیو دکھائی جس میں صدام حسین کی پھانسی کے وقت کی مبینہ فوٹیج کو آج کے حالات سے جوڑ کر دوبارہ وائرل کیا گیا تھا۔ جسکے اوپر عربی میں لکھا گیا تھا: 'دیکھو عراقیو! تمہارے فاتح کو ایرانیوں نے کیسے انجام تک پہنچایا، اب بدلہ لینے کا وقت ہے۔' اب اس کے نیچے کی 'وار زون' دیکھو۔ اب اس کے نیچے کمنٹس کا سیلاب دیکھو یہ دیکھو ایک عراقی بن کر لکھ رہا ہے کہ 'ایرانیوں نے ہمارا ملک برباد کیا'، تو نیچے سے ایک ایرانی اکاؤنٹ اسے 'صدام کا کتا' کہہ کر گالی دے رہا ہے۔ لیکن کسی کو اندازہ نہیں کہ یہ دونوں اکاؤنٹس ایک ہی بلڈنگ سے بیٹھ کر چلائے جا رہے ہیں جن کا مقصد صرف نفرت پھیلانا ہے۔"""اور اس سب کے پیچھے کون ہے؟" رامین نے غصے سے پوچھا۔ وہی پرانے کھلاڑی! اسرائیل کا سادہ سا فارمولا ہے: مسلمانوں کو اتنا الجھا دو کہ وہ فلسطین کو بھول کر ایک دوسرے کے گلے کاٹنا شروع کر دیں۔ وہ عربوں کو ڈراتا ہے کہ ایران تمہیں کھا جائے گا، اور ایرانیوں کو کہتا ہے کہ عرب تمہارے دشمن ہیں۔

میں نے ایک لائیو ٹرینڈ دکھایا جہاں فرانسیسی اور مغربی نیٹ ورکس 'لبرلزم' کا تڑکا لگا رہے تھے۔ فرانسیسی تھنک ٹینکس کا ایجنڈا سب سے خطرناک ہے۔ وہ ایک طرف لبرل ازم اور 'آزادیِ اظہار' کا نعرہ لگا کر تہران کی سڑکوں پر نوجوانوں کو

اکسا رہے ہیں کہ مذہب تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، اور دوسری طرف وہی نیٹ ورک انتہا پسند گروہوں کو فنڈنگ دے رہا ہے تاکہ وہ لبرلز پر حملے کریں جب مولوی اور لبرل آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں، تو مغرب کا 'سیکولرزم' کا تڑکا کام کر جاتا ہے کہ دیکھو! مذہب صرف خون خرابہ لاتا ہے۔" اور دوسری طرف سے 'آزادیِ خیال' کے نام پر مذہب کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ نوجوان نسل یہ سوچے کہ 'یار یہ مذہب تو ہے ہی فساد کی جڑ، اس سے بہتر ہے کہ ہم لبرل بن جائیں'۔"میں نے بلوچستان کے بارڈر والے حصے کو زوم کیا۔ "اور یہاں دیکھو، یہ سب سے خطرناک کھیل ہے۔ ادھر سے انڈیا کے آئی ٹی سیلز سرگرم ہیں۔ وہ بلوچستان میں علیحدگی پسندی کی ویڈیوز کو اس طرح ایڈٹ کر کے پھیلاتے ہیں کہ پاکستانیوں کو لگے یہ ایران کروا رہا ہے، اور ایرانیوں کو لگے کہ پاکستان ان کے دشمنوں کو پناہ دے رہا ہے۔ مقصد؟ تاکہ سی پیک (CPEC) رک جائے، گوادر اور چابہار کے درمیان دشمنی پیدا ہو، اور ایران و پاکستان ایک دوسرے کے خلاف سرحد پر فوجیں کھڑی کر دیں تاکہ اسرائیل اور مغرب کا راستہ صاف ہو جائے

رامین نے غصے سے اپنا ہاتھ اسٹیئرنگ پر مارا۔ "یعنی یہ لوگ ہماری مذہبی وابستگیوں اور فرقہ واریت کو استعمال کر کے ہمیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا رہے ہیں؟""بالکل! وہ جانتے ہیں کہ مسلمان کو مارنے کے لیے گولی کی ضرورت نہیں، بس اسے دوسرے مسلک کے خلاف اکسا دو، وہ خود ہی اپنا گھر جلا لے گا۔ یہ جو لبرل ازم کا تڑکا ہے، یہ ان نوجوانوں کے لیے ہے جو مذہب سے دور ہیں۔ انہیں دکھایا جاتا ہے کہ 'دیکھو تمہارے مولوی تو صرف لڑنا جانتے ہیں، اس لیے مغرب کی نقالی کرو'۔ اس طرح وہ ہمیں دو حصوں میں بانٹ رہے ہیں: ایک وہ جو آپس میں لڑ رہے ہیں، اور دوسرے وہ جو اپنے دین سے ہی بیزار ہو رہے ہیں۔"تہران کے احتجاج ہوں یا بلوچستان کی بدامنی، ان کے ڈورے کہیں اور سے ہل رہے ہیں۔"تہران کی دم گھٹتی فضاؤں سے نکلے ہوئے ہمیں اب کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ رامین خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا، لیکن اس کے ذہن میں وہی سوالات گردش کر رہے تھے جو میں نے اسکرین پر اٹھائے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف پھیلے ہوئے بنجر پہاڑ اور ویران زمین بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی جیسے امتِ مسلمہ کے درمیان پیدا کی گئی یہ مصنوعی خلیج——خاردار اور بے جان۔ سورج ڈھل رہا تھا اور افق پر نارنجی اور گہری نیلی رنگت چھا رہی تھی۔ مغرب کا وقت قریب تھا جب ہم سمنان (Semnan) کے علاقے سے گزر رہے تھے۔"ذیشان، مغرب ہو رہی ہے۔ کہیں رک کر نماز پڑھ لیتے ہیں اور تھوڑا آرام بھی،" رامین نے ایک چھوٹے سے قصبے کے قریب اشارہ کیا۔ ہم نے سڑک کنارے ایک پرانے سے پیٹرول پمپ اور اس کے ساتھ بنی چھوٹی سی مسجد کے پاس گاڑی روکی۔ وضو کرتے ہوئے ٹھنڈا پانی جب چہرے پر لگا تو تہران کی تھکن کچھ کم ہوئی۔ نماز کے بعد ہم وہیں ایک چھوٹے سے ڈھابے پر بیٹھ گئے جہاں سے دور تک پھیلی ہوئی شاہراہ نظر آ رہی تھی۔ دیکھو رامین،" میں نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے بات وہیں سے شروع کی جہاں ٹوٹی تھی۔ "یہ جو ہم مشہد جا رہے ہیں، یہ صرف ایک سفر نہیں ہے۔ وہاں جو ہم نے علماء اور دانشوروں سے ملنا ہے، انہیں یہی بتانا ہے کہ اسرائیل براہِ راست جنگ سے زیادہ اس 'سائبر جنگ' پر یقین رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایران کے اندر احتجاج اتنے شدید ہو جائیں کہ ریاست کمزور ہو جائے اور پھر وہ تہران یا ان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر سکے۔ رامین نے

سر ہلایا۔ "اور اس کا راستہ وہ ان کمنٹس اور ویڈیوز سے بناتا ہے جو ہم ابھی دیکھ رہے تھے۔""" بالکل! جب پاکستان اور ایران کے عام لوگ سوشل میڈیا پر ایک دوسرے کو گالیاں دیں گے، تو کوئی حکومت بھی ایک دوسرے کی مدد کو نہیں آئے گی۔ یہی وہ وقت ہوگا جب دشمن اپنا وار کرے گا۔ ہمیں مشہد پہنچ کر یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ تمام نفرت 'امپورٹڈ' ہے۔

رات کے 10 بج رہے تھے جب ہم شاہرود (Shahroud) کے قریب پہنچے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور تھکن ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ رامین کی آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔ "آگے کا سفر اب صبح کریں گے،" میں نے سامنے ایک روشن سائن بورڈ دیکھ کر کہا جس پر ایک مسافر خانے کا نشان تھا۔ "یہاں رک جاتے ہیں میں نے کہاہم نے ایک معمولی سے ہوٹل میں کمرہ لیا۔ کمرہ چھوٹا تھا لیکن پر سکون۔ شاہرود کا وہ چھوٹا سا ہوٹل تہران کے ہنگاموں سے دور ایک پر سکون جزیرہ لگ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی رامین تو تھکن سے چور ہو کر فوراً بستر پر ڈھیر ہو گیا، لیکن میرے اعصاب ابھی تک تنے ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا؛ باہر شاہرود کی ٹھنڈی رات اور خاموش سڑکیں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی بستر پر لیٹ گیا رات کے کسی پہر میری آنکھ لگی، اور پھر صبح صادق کے وقت مسجد سے ابھرتی اذان کی آواز نے ہمیں بیدار کیا۔ شاہرود کی صبح کی ہوا میں ایک خاص قسم کی تازگی اور خنکی تھی۔ ہم نے ہوٹل کی چھوٹی سی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی، جہاں مقامی ایرانیوں کے چہروں پر وہی سکون تھا جو سیاست اور سوشل میڈیا کی نفرتوں سے کوسوں دور تھا۔ ذیشان، ناشتہ گاڑی میں ہی کر لیں گے، ہمیں سورج نکلنے سے پہلے شاہراہ پر ہونا چاہیے،" رامین نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ہم نے ہوٹل کے قریب ایک چھوٹی سی بیکری سے گرم 'نونِ بربری' (ایرانی روٹی) اور پنیر لیا اور دوبارہ مشہد کی جانب اپنا سفر شروع کر دیا۔ تہران سے شاہرود تک کا 410 کلومیٹر کا سفر پیچھے رہ گیا تھا، اور اب اگلے 500 کلومیٹر کا مرحلہ درپیش تھا جیسے ہی سورج طلوع ہوا، سڑک کے مناظر بدلنے لگے۔ دائیں بائیں لق و دق صحرا اور دور نظر آتے پہاڑ دھوپ کی سنہری چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ رامین نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ راستے میں میامی (Mayamey) اور پھر سبزوار (Sabzevar) کے علاقے آئے۔ سبزوار کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ موبائل سگنلز مضبوط ہو رہے تھے اور سوشل میڈیا پر وہی منظم پروپیگنڈا اب بھی عروج پر تھا۔ تقریباً 11 بجے کے قریب ہم نیشاپور۔

(Nishapur) کے قریب پہنچے۔ یہاں کی فضا میں ایک عجیب سی تاریخ رچی ہوئی تھی۔ ہم نے وہاں قیام نہیں کیا کیونکہ ہمارا ہدف جلد از جلد مشہد پہنچنا تھا۔ نیشاپور سے نکلتے ہی سڑک پر ٹریفک کا دباؤ بڑھنے لگا۔ بڑے بڑے ٹرک اور زائرین کی بسیں اب مشہد کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ شاہرود کی خاموش شاہراہوں سے نیشاپور کے تاریخی منظروں تک کا یہ طویل سفر اب اپنے روحانی اختتام کے قریب تھا۔ جیسے ہی مشہد کی حدود شروع ہوئیں، گاڑی کے شیشے سے باہر نظر آنے والے 'خوش آمدید' کے بورڈز نے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ یہ صرف ایک شہر نہیں تھا، یہ کروڑوں مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز تھا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بج رہے تھے جب دور افق پر سورج کی تپش میں تپتا ہوا وہ سنہری گنبد نظر آیا۔ "ذیشان، دیکھو! مولا رضاؑ کا روضہ،" رامین کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کی نظریں اسٹیئرنگ سے ہٹ کر ایک

لمحے کے لیے اس سنہری چمک پر جم گئیں۔ میرے سینے میں ایک عجیب سی ہلچل مچی۔ تہران کی وہ دھواں دھار سڑکیں، وہ نفرت بھرے کمنٹس، وہ فرقہ وارانہ زہر اور سرحدوں پر کھینچی گئی نفرت کی لکیریں—وہ سب اس ایک جھلک کے سامنے ہیچ ہو گئیں۔ گاڑی جوں جوں حرم کے قریب پہنچ رہی تھی، سڑکوں پر زائرین کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہاں پاکستان سے آئے ہوئے کاندھوں پر مشکیزے اٹھائے زائرین بھی تھے، عراق کے سیاہ پوش بھی اور مقامی ایرانی بھی۔ سب کے قدم ایک ہی مرکز کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ہم نے گاڑی باب الرضاؑ کے قریب ایک پارکنگ میں کھڑی کی۔ جیسے ہی میں گاڑی سے اترا، ہوا میں عطر اور صندل کی وہ جانی پہچانی خوشبو لہرائی جو صرف مشہد کے در و دیوار سے آتی ہے۔ میرے ہاتھ میں وہ لیپ ٹاپ بیگ اب بھی تھا جس میں دشمن کی سازشوں کا کچا چھٹا تھا، لیکن اس وقت میرا دل صرف سکون چاہتا تھا۔ ہم نے جوتے استانی (Shoe-keep) پر جمع کرائے اور سنگِ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے 'صحنِ جامع رضوی' میں داخل ہوئے

السلام علیک یا علی ابنِ موسیٰ الرضاؑ۔۔" رامین اور میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے سلام پیش کیا۔ وہ منظر دیدنی تھا۔ وہاں کوئی شیعہ تھا، کوئی سنی، کوئی عرب تھا تو کوئی عجمی، لیکن سب کی آنکھیں نم تھیں اور سب کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا سر ان سنہری جالیوں سے ٹکا دیا، اور بند آنکھوں کے پیچھے ایک بستی، ایک پرانا گھر اور ایک ممتا بھرا چہرہ لہرانے لگا۔ میری ماں، جو کبھی اسکول نہیں گئی تھیں، جنہیں کتابی لفاظی اور فلسفوں کی الف بے بھی نہیں معلوم تھی، لیکن جن کے سینے میں اہل بیتِ رسول ﷺ کی محبت کا وہ سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا جس کی گہرائی ناپنا شاید کسی عالم کے بس میں نہ تھا۔

"بیٹا! یہ وہ لوگ ہیں جن کے پسینے کی خوشبو سے گلشنِ مدینہ مہکتا ہے،" ماں کے وہ ٹوٹے پھوٹے لیکن تاثیر سے بھرپور الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ جب گھر میں تذکرہ کرتیں تو ان کی زبان لڑکھڑانے لگتی، آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ اپنے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہتیں: "ہم تو گنہگار ہیں بیٹا ذیشان، بس ان شہزادوں کے دامن سے لپٹے رہنا، یہی پار لگائیں گے۔" آج جب میں امام علی رضاؑ کے اس عالی شان روضے پر کھڑا تھا، تو مجھے لگا جیسے وہ ان پڑھ ماں مجھ سے جیت گئی تھی۔ ان کی وہ سادہ سی باتیں آج میرے لیے معرفت کا سب سے بڑا درس بن گئی تھیں۔ وہ جو بچپن میں انگلی پکڑ کر مجھے "اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پیاروں" کی کہانیاں سناتی تھیں، آج ان کہانیوں کا جیتا جاگتا نور میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

میری ہچکی بندھ گئی۔ میں نے سوچا، دشمن کتنا نادان ہے جو سمجھتا ہے کہ وہ چند جعلی ویڈیوز، چند زہریلے کمنٹس اور سوشل میڈیا کے پروپیگنڈے سے اس محبت کو ختم کر دے گا جو ہماری ماؤں نے ہمیں لوریوں میں پلائی ہے۔ وہ 'ڈیجیٹل وار' جیتنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اس 'عشق' کا مقابلہ کیسے کریں گے جو نسل در نسل ہمارے خون میں منتقل ہوتا آیا ہے؟ "امی! دیکھو آپ کا بیٹا آج اسی 'موسیٰ کاظم کے لعل' کی چوکھٹ پر ہے جس کا نام لیتے ہی آپ کے چہرے پر ایک تقدس چھا جاتا تھا،" میں نے بے اختیار دیوار کو چوما۔۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا مشن صرف ان اسرائیل نواز یا مغربی ایجنٹوں کو بے نقاب

کرنا نہیں ہے، بلکہ اس 'سادہ اور سچی محبت' کا تحفظ کرنا ہے جو میری ماں جیسی لاکھوں ماؤں نے اپنے بچوں کے دلوں میں بوئی ہے۔ میں نے سنہری جالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، "یا اللہ! سوشل میڈیا پر بیٹھے وہ لوگ جو ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بتاتے ہیں، کاش وہ یہاں آ کر دیکھیں۔ یہاں تو عشقِ رسول ﷺ کا وہ سمندر ہے جس میں ہر مسلک کا رنگ گھل کر ایک ہو گیا ہے۔" میں نے وہیں ایک کونے میں بیٹھ کر تلاوت کی اور ان تمام مسلمانوں کے لیے دعا کی جو اس وقت دشمن کی 'ڈیجیٹل سازش' کا شکار ہو کر ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ میرے بیگ میں موجود وہ لیپ ٹاپ اب مجھے ایک بھاری ذمہ داری لگ رہا تھا۔ مجھے اس 'محبت کے مرکز' سے ہی وہ پیغام عام کرنا تھا جو دشمن کے اس زہریلے پروپیگنڈے کو کاٹ سکے کہ "ایران صرف ایک مسلک کا ہے" "سنیوں کے لیے یہاں جگہ نہیں"۔ ہم جب 'صحنِ آزادی' میں داخل ہوئے تو مجھے وہاں اپنی ہی طرح کے کئی چہرے نظر آئے۔

سندھ کے مرید، پنجاب کے عقیدت مند اور سرحد کے پختون— جن کے سروں پر مخصوص پگڑیاں اور ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں۔ یا اللہ! مدینے والے کے اس شہزادے کے صدقے، اس امت کو بکھرنے سے بچا لے،" میں نے کانپتے ہاتھوں سے ادھر کھڑے ہو کر دعا کی۔ "دشمن ہمارے موبائلوں میں نفرت بھر رہا ہے، وہ ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رہا ہے، لیکن یہاں تو تیری رحمت برس رہی ہے۔ یہاں تو عرب، عجمی، شیعہ اور سنی سب ایک ہی صف میں کھڑے تیرے حبیب ﷺ کے گھرانے کے صدقے سے تجھ سے خیرات مانگ رہے ہیں۔" رامین نے جب میرا کندھا تھپتھپایا تو میں جیسے کسی دوسری دنیا سے واپس آیا۔ ذیشان، دیکھو،" رامین نے سرگوشی کی۔ "سوشل میڈیا پر بیٹھے وہ ایجنٹ جو کہتے ہیں کہ ایران میں سنیوں کے لیے جگہ نہیں، کاش وہ اس وقت تمہیں یہاں دیکھ لیں۔ تمہاری آنکھوں کی یہ عقیدت ان کے تمام جھوٹے کمنٹس اور ایڈیٹڈ ویڈیوز کو جلا کر راکھ کرنے کے لیے کافی ہے۔" میں نے اپنا بیگ مضبوطی سے تھاما۔ اب میرا مشن صرف ایک 'ڈیٹا' پہنچانا نہیں تھا، بلکہ اس عشق اور اتحاد کی حفاظت کرنا تھا جس کا مشاہدہ میں نے اس مقدس صحن میں کیا تھا۔ مجھے لگا جیسے امام علی رضاؑ کی خاموش نگاہیں مجھ سے کہہ رہی ہوں: "اے مسافر! جو سچ تم نے یہاں دیکھا ہے، اسے دنیا تک پہنچانا تمہارا قرض ہے۔"

حرم کے آداب بجا لاتے ہوئے جب میں الٹے قدموں باہر نکلا، تو میرا دل ایک عجیب سے سکون اور جرات سے بھر چکا تھا۔ تہران سے مشہد تک کا 900 کلومیٹر کا سفر اب مجھے بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ اب مجھے اس 'سائبر فتنے' کے سر کچلنے تھے جو اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتا تھا۔ جب ہم باہر کی سڑک پر آئے تو دھوپ میں وہ تپش نہیں تھی جو جسم جھلسائے، بلکہ ایک عجیب سی حدت تھی جو روح کو گرماتی تھی۔ مشہد کی سڑکیں زائرین کے ہجوم سے آباد تھیں۔ قدم قدم پر سبیلیں لگی تھیں اور فضا میں پسی ہوئی الائچی اور زعفران کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میری نظر سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے سٹال پر پڑی جہاں ایک ضعیف العمر بزرگ، جن کے ماتھے پر سجدوں کا نشان تھا، تبرک کے طور پر 'نبات' (زعفرانی مصری) اور 'جیبی جائے نماز' فروخت کر رہے تھے۔ رامین نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ہم ان کی طرف بڑھ گئے۔ "سلام علیکم پدرِ بزرگوار! (سلام ہو آپ پر اے بزرگ باپ!)" میں نے نہایت ادب سے کہا۔

ان بزرگ نے سر اٹھایا تو ان کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جو صرف ان لوگوں کے پاس ہوتی ہے جن کی عمر امام رضاؑ کی ہمسائیگی میں گزری ہو۔ انہوں نے جواب میں جو فارسی بولی، وہ کسی شیرینی کی طرح میرے کانوں میں گھلنے لگی۔ "سلام بر زائرِ آقا! خوش آمدید۔۔۔" (آقا کے زائر پر سلام! خوش آمدید۔۔۔) ان کا لہجہ اتنا میٹھا اور آواز اتنی دھیمی تھی کہ مجھے لگا جیسے شہد بہہ رہا ہو۔ اگر کوئی مشہد آ کر یہاں کے لوگوں کی اس مخصوص نرم فارسی کی مٹھاس نہ چکھے، تو اس نے مشہد کو شاید پھر دیکھا ہی نہیں۔ میں نے ان سے کچھ 'نبات' اور سبز تسبیحیں خریدیں۔ میں نے جیب سے ایرانی تومان نکال کر ان بزرگ کی طرف بڑھائے۔ انہوں نے روایتی ایرانی 'تعارف' کے طور پر پہلے میرا ہاتھ ہلکا سا روکا اور دھیمی آواز میں کہا، 'مہمانِ آقا ہستید، بفرمایید' (آپ آقا کے مہمان ہیں، رہنے دیں)۔

میں جانتا تھا کہ یہ ان کی محبت بھری روایت ہے، ورنہ ان کا گھر بار اسی سٹال سے چلتا تھا۔ میں نے مسکرا کر دوبارہ پیسے پیش کیے اور اصرار کیا تو انہوں نے دعا دیتے ہوئے پیسے تھام لیے۔ لیکن جب وہ نبات (زعفرانی مصری) کا پیکٹ بنا رہے تھے، تو انہوں نے اس میں دو اضافی ڈلیاں ڈال دیں اور ایک چھوٹی سی خوشبو والی تسبیح الگ سے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ 'این ہدیہ برای شما، پسرِ گلم' (یہ تمہارے لیے تحفہ ہے، میرے پیارے بیٹے)۔

میں نے وہیں کھڑے کھڑے وہ تبرک اور تسبیحیں وہاں سے گزرنے والے بچوں اور زائرین میں تقسیم کرنا شروع کر دیں۔ ایک چھوٹے سے ایرانی بچے کو جب میں نے تسبیح دی، تو اس نے معصومیت سے میرے ہاتھ چوم لیے۔ بچے کے جانے کے بعد میں کچھ دیر وہیں ساکت کھڑا رہا۔ رامین نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، "ذیشان! چلو، مغرب سے پہلے ہمیں اپنا ٹھکانہ ڈھونڈنا ہے۔" ہم ادھر سے نکل کر 'فلکہ آب' (Falak-e-Ab) کی طرف پیدل چلنے لگے۔ یہ مشہد کا وہ دل ہے جہاں زائرین، ریڑھی والے اور دکاندار ایک عجیب سے شور میں گم ہوتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے لوگ چھوٹی چھوٹی انگوٹھیاں، عطر کی شیشیاں اور جائے نمازیں بیچ رہے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہاں کے دکانداروں کی فارسی میں وہ مخصوص 'شیینی' (مشہدی لہجہ) کی مٹھاس تو تھی، لیکن ان کی گفتگو کا رخ بدل چکا تھا۔

ہم ایک چھوٹے سے قہوہ خانے (Teahouse) کے پاس سے گزرے جہاں لکڑی کے پرانے تختوں پر کچھ مقامی بزرگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے سامنے پڑے اخبار کی سرخی

جلی حروف میں لکھی تھی: "خلیج فارس میں امریکی بیڑے کی نقل و حرکت میں اضافہ"۔ میں نے اپنا قدم ہولے سے روکا اور ایک صحافی کی جبلت کے تحت ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔ ایک بزرگ دوسرے سے کہہ رہا تھا یہ جو تم سڑکوں پر 'آزادی' کے نعرے سن رہے ہو، ان کے پیچھے بارود کی بو ہے۔ ہمارے پڑوسی عرب بھائیوں کے ملکوں میں جو امریکی اڈے بنے ہیں، وہاں سے اڑنے والے پرندے (ڈرونز) ہماری فضاؤں کو گندہ کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں، جبکہ وہ خود تل ابیب اور واشنگٹن کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ ہم سے ہم اگے نکلے حرم کے باہر کی وہ روحانی مٹھاس اب پیچھے رہ چکی تھی اور میری جگہ ایک 'مفرور' کی فطری بے چینی نے لے لی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایران کی سیکیورٹی ایجنسیاں اس وقت ہائی الرٹ پر ہیں، اور میرے پاس نہ تو کوئی قانونی ویزا تھا اور نہ ہی کوئی

سرکاری دستاویز۔ رامین نے میرے اضطراب کو بھانپ لیا تھا۔ "ذیشان! مین روڈ کے بڑے ہوٹلوں کا رخ کرنا خودکشی ہوگی۔ وہاں پاسپورٹ کی سکیننگ براہِ راست پولیس کے ڈیٹا بیس سے جڑی ہوتی ہے،" رامین نے سرگوشی میں کہا۔
ہم حرم کے پیچھے 'خیابانِ طبرسی' کی طرف جانے والی ایک تنگ اور پیچیدہ گلی میں مڑ گئے۔ یہاں کی دیواریں پرانی تھیں اور ہوا میں نمی اور پرانی لکڑی کی بو بسی ہوئی تھی۔ تھوڑی دور جا کر ہمیں ایک چھوٹا سا بورڈ نظر آیا جس پر دھندلے لفظوں میں 'مسافر خانہ' لکھا تھا۔ یہ ایک دو منزلہ پرانی عمارت تھی جس کا صدر دروازہ لکڑی کا اور بھاری تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا کاؤنٹر تھا جہاں ایک ادھیڑ عمر شخص، جس کی ناک پر موٹا چشمہ ٹکا تھا، ایک پرانے رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ رامین آگے بڑھا اور فارسی میں اس سے بات شروع کی۔ اس نے کسی مقامی لہجے میں اسے یقین دلایا کہ ہم صرف ایک رات (24 گھنٹوں) کے لیے ٹھہرنا چاہتے ہیں اور صبح سویرے نکل جائیں گے۔
اس شخص نے ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھا، لیکن رامین کی پراعتماد فارسی اور کچھ اضافی تومانوں (ایرانی کرنسی) نے اس کے ماتھے کی شکنیں دور کر دیں۔ اس نے بغیر کسی شناختی کارڈ یا پاسپورٹ کے مطالبے کے، ایک زنگ آلود چابی ہمارے حوالے کر دی۔ ہمارا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لکڑی کے فرش سے آنے والی چرچراہٹ میرے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ تال میل کھا رہی تھی۔ کمرہ چھوٹا اور حبس زدہ تھا۔ دیوار پر لگی پینٹ ادھڑ رہی تھی، کونے میں دو لوہے کے بستر تھے جن پر پرانی چادریں بچھی تھیں، اور ایک چھوٹی سی میز جس پر گرد کی تہیں جمی تھیں۔ ذیشان، ہم محفوظ ہیں،" رامین نے اپنا بیگ بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔ تہران کے اس زنگ آلود گودام کی یاد ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھی—وہاں ہونے والے دو فائر اور داریان کی گردن چٹخنے کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔
رامین،" میں نے آواز اتنی دھیمی رکھی کہ شاید دیوار کے اس پار بیٹھا شخص بھی نہ سن سکے۔ "کاظم کوئی گلی محلے کا بدمعاش نہیں ہے۔ داریان اور منصور کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا نیٹ ورک پورے ایران میں کسی مکڑی کے جال کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ تہران کی گلیوں سے لے کر مشہد کے ان صنعتی علاقوں تک، اس کے کارندے ہر جگہ موجود ہیں۔" رامین نے سر ہلاتے ہوئے میری بات کی تائید کی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو ذیشان۔ اسی لیے ہمیں اپنا ارادہ بدلنا ہوگا۔ اگر ہم 'نیلا سنگِ مرمر' کا کوڈ ورڈ لے کر اس کے دفتر کے اندر گئے، تو ہم خود اپنے پاؤں پر چل کر موت کے منہ میں جائیں گے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کے دو مہرے (داریان اور منصور) غائب ہو چکے ہیں۔ وہ کسی بھی نئے آنے والے پر شک کرے گا۔" "ہم اسے ختم نہیں کر سکتے، کم از کم ابھی نہیں۔ ہمارا کام صرف ریکی (Reconnaissance) ہے۔ ہمیں چپکے سے اس کے گرد گھیرا ڈالنا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم وہاں جائیں گے کس روپ میں؟" میں کچھ دیر خاموش رہا، پھر اپنی واسکٹ کی طرف دیکھا جو گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ "ہم وہاں 'صحافی' بن کر نہیں جائیں گے، اور نہ ہی 'تاجر' بن کر۔ کل صبح جب قاضی آباد کی۔ فیکٹریوں کا دھواں آسمان کی طرف اٹھے گا، تو ہم وہاں ان سینکڑوں مزدوروں کی بھیڑ میں شامل ہوں گے جو روزانہ دیہاڑی کی تلاش میں وہاں کے چوکوں پر جمع ہوتے ہیں۔" "مزدور؟" رامین کی آنکھوں میں چمک آئی۔ "ہاں،" میں نے تفصیل بتائی۔ "میلے کپڑے، بکھرے ہوئے بال، اور چہرے پر تھکن۔ ہم یہ ظاہر

کریں گے کہ ہم زاہدان سے آئے ہیں اور کسی بھی قسم کی محنت مزدوری کے لیے تیار ہیں۔ قاضی آباد میں جہاں 'پتھر ایکسپورٹ آفس' ہے، اس کے قریب ہی وہ جگہ ہے جہاں مزدور کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم وہاں بیٹھ جائیں گے۔ اگر کوئی ہمیں کام کے لیے لے گیا تو ٹھیک، ورنہ ہم وہاں بیٹھے بیٹھے اس دفتر کی ہر حرکت پر نظر رکھیں گے۔میں نے موبائل نقشے پر ایک پوائنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس دفتر کے سامنے ایک چھوٹا سا چائے کا کھوکھا ہے۔ ہم وہاں باری باری بیٹھیں گے۔ ہماری نظریں اس بات پر ہوں گی کہ وہاں کون سی گاڑیاں آ رہی ہیں، کون لوگ اندر جا رہے ہیں، اور کیا وہاں دہلی (India) سے آنے والے پتھروں کے نام پر کوئی اور 'سامان' منتقل ہو رہا ہے۔
اور ان کا تہران اور بلوچستان کے سلیپر سیلز سے کیا رابطہ ہے۔ ہمیں اس کی سپلائی لائن ٹریس کرنی ہے۔ ایک بار جب ہمیں اس کے نیٹ ورک کی پوری ساخت (Structure) معلوم ہو جائے گی، تو ہم یہ سارا ڈیٹا انٹیلیجنس کو خاموشی سے ڈیلیور کر دیں گے۔ پھر ریاست خود اس کا حساب کرے گی۔"ٹھیک ہے ذیشان۔ کل صبح کا سورج ہمیں ایک نئی شناخت دے گا۔ ہم مزدور بن کر اس دشمن کی جڑوں تک پہنچیں گے جسے ہم صحافی بن کر نہیں چھو سکتے تھے۔"منصوبہ طے پا چکا تھا کمرے کی مدھم روشنی میں ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے، لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ باہر مشہد کی گلیوں میں کبھی کبھار کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز آتی یا دور کہیں کتا بھونکتا، تو میرے کان کھڑے ہو جاتے۔میں چھت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وزیر آباد کی پرسکون گلیوں سے نکل کر میں ایران کے اس صنعتی بارود خانے تک کیسے پہنچ گیا۔ رامین کی سانسوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ بھی جاگ رہا ہے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ کل کا دن یا تو ہمیں کامیابی دلائے گا یا پھر ہمیں ہمیشہ کے لیے گمنام کر دے گا۔ اسی کشمکش میں نہ جانے کب تھکن نے غلبہ کیا اور میری آنکھ لگ گئی۔فجر کی پہلی اذان کی گونج مشہد کی خاموش گلیوں میں پھیلی تو رامین نے میرے بستر کو جھنجھوڑا۔ "ذیشان، اٹھو! وقتِ نماز ہے۔"ہم نے وضو کیا اور اس چھوٹے سے مسافر خانے کے کمرے میں ہی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ہم نے اللہ سے خیر کی دعا مانگی دعا کے بعد ہم نے ہوٹل کے قریب ہی ایک چھوٹی سی دکان سے 'نون اور پنیر' کا مختصر ناشتہ کیا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھے جو ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ایک محفوظ جگہ پارک تھی۔"ذیشان، قاضی آباد یہاں سے تقریباً 20 کلومیٹر دور ہے،" رامین نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم گاڑی براہِ راست اس 'ایکسپورٹ آفس' کے سامنے نہیں لے جائیں گے۔ ہم اسے قاضی آباد سے تھوڑا پہلے ایک پبلک پارک یا کسی پرہجوم مارکیٹ کی پارکنگ میں کھڑا کر دیں گے۔ اگر حالات بگڑے تو ہمیں بھاگنے کے لیے اپنی سواری کی ضرورت پڑے گی۔"صبح کی سپیدی ابھی پھیل رہی تھی اور سڑکوں پر ٹرکوں کا شور بڑھنے لگا تھا
جیسے ہی ہم قاضی آباد کے صنعتی علاقے کے قریب پہنچے، رامین نے گاڑی ایک پرانی پارکنگ لاٹ میں خاموشی سے کھڑی کر دی۔اب یہاں سے ہم پیدل چلیں گے،" رامین نے گاڑی لاک کرتے ہوئے کہا۔ہم تھوڑا فاصلہ طے کر کے ایک مقامی بازار کی طرف بڑھے جو فجر کے ساتھ ہی کھل جاتا ہے۔ وہاں پرانے کپڑوں (لنڈا بازار) کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہم نے وہاں سے دو گھسی ہوئی میلی واسکٹیں، نیلے رنگ کی وہ مخصوص قمیضیں جو ایرانی مزدور پہنتے ہیں، اور سیمنٹ کی

گرد سے اٹی ہوئی پرانی پتلونیں خریدیں۔ ساتھ ہی ہم نے ربڑ کے بھاری اور میلے جوتے بھی لیے۔اب مرحلہ تھا کپڑے تبدیل کرنے کا۔ ایران میں جگہ جگہ 'حمام' (عوامی غسل خانے) اور 'سرویسِ بہداشتی' (عوامی بیت الخلا) بنے ہوتے ہیں جو بہت صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ہم ایک قریبی پارک کے عوامی واش روم میں داخل ہوئے۔ وہاں کے بڑے سے آئینے میں میں نے آخری بار اپنا 'صحافتی عکس' دیکھا اور پھر وہ پرانے کپڑے پہننا شروع کر دیے۔جب میں باہر نکلا تو رامین مجھے دیکھ کر چونک گیا۔ "خدا کی قسم ذیشان! اب تم پاکستان کے پڑھے لکھے صحافی نہیں، بلکہ زاہدان سے مزدوری کے لیے آئے ہوئے 'ایک مزدور' لگ رہے ہو۔

" رامین نے بھی اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی مٹی اور ہاتھوں پر کالا تیل ملا ہوا تھا، جیسے وہ ابھی کسی گیراج سے کام کر کے نکلا ہو۔اب ہماری چال ڈھل، ہمارے کپڑے اور ہمارا انداز ایک عام مزدور کا تھا۔ ہم اس بھیڑ میں شامل ہو گئے جو بسوں سے اتر کر فیکٹریوں کی طرف جا رہی تھی۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دو مزدوروں کے سینے میں کتنے بڑے راز اور جیب میں دہلی (India) تک پہنچنے والے ثبوتوں کی تلاش کا جنون چھپا ہے۔ تقریباً 15 منٹ کی پیدل مسافت کے بعد، ہم قاضی آباد کے اس چوک پر پہنچ گئے جہاں 'سنگِ آریا ایکسپورٹ' کا لوہے کا بھاری گیٹ نظر آ رہا تھا۔ ہم خاموشی سے فٹ پاتھ پر پڑے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئے، جیسے کسی ٹھیکیدار کے منتظر ہوں۔ قاضی آباد کے اس مرکزی چوک پر دھول کی ایک مستقل تہہ جمی ہوئی تھی جو ہر گزرتے ٹرک کے ساتھ ہمارے چہروں اور کپڑوں پر بیٹھ رہی تھی۔۔ میرے پیروں میں وہ بھاری ربڑ کے جوتے اب چبھنے لگے تھے، لیکن مجھے ایک 'مزدور' کی طرح دکھنا تھا، اس لیے میں نے خاموشی سے جوتا اتار کر اس میں سے کنکری نکالنے کا ناٹک کیا اور دوبارہ پہن لیا۔ ہمارے دائیں بائیں آٹھ دس مقامی مزدور بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ اپنے پرانے چمڑے کے تھیلوں سے روٹی نکال کر کھا رہے تھے، اور کچھ صرف خالی نظروں سے سڑک کو تک رہے تھے۔ فضا میں تیزاب اور جلے ہوئے ڈیزل کی کڑوی بو رچی ہوئی تھی۔

"آغا! آج کام کم لگ رہا ہے،" ایک درمیانی عمر کے مزدور نے، جس کی واسکٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، رامین کی طرف دیکھ کر مشہدی لہجے میں کہا۔ رامین نے اپنی ٹوپی تھوڑی نیچی کی اور دھیمی آواز میں جواب دیا، "جی، ہم تو زاہدان سے آئے ہیں۔ سنا تھا یہاں فیکٹریوں میں دیہاڑی اچھی مل جاتی ہے۔" اس مزدور نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔ "قسمت کی بات ہے۔ جب سے یہ سرحدوں پر تناؤ بڑھا ہے اور تہران میں ہنگامے شروع ہوئے ہیں، بڑے سیٹھوں نے اپنا مال روک لیا ہے۔ یہ سامنے والا 'سنگِ آریا' کا دفتر دیکھ رہے ہو؟ پہلے یہاں دن بھر ٹرکوں کی قطار لگی رہتی تھی، اب صرف مخصوص گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ سنا ہے ان کے مالکان کے تعلقات 'باہر' والوں سے ہیں، اس لیے ان کا کام بند نہیں ہوتا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بس خاموشی سے اپنی واسکٹ کے بٹن کو تھوڑا درست کیا تاکہ کیمرہ اس دفتر کے گیٹ کی طرف رہے۔ وقت رینگ رہا تھا۔ سورج سر پر آ چکا تھا میرے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا جو گرد کے ساتھ مل کر کیچڑ بن رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے لگا کہ میں واقعی ایک مزدور بن چکا ہوں۔ بھوک اور پیاس نے پیٹ میں مروڑ اٹھانا

شروع کیے تو رامین نے قریب ہی ایک ٹھیلے سے 'فلافل' کے دو سستے سے سینڈوچ خریدے۔ ہم وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اسے کھانے لگے، بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے ارد گرد بیٹھے باقی لوگ کھا رہے تھے۔اچانک، سڑک کے دوسری طرف سے ایک پرانا شور مچاتا ہوا مزدا ٹرک آیا اور 'سنگِ آریا' کے گیٹ کے پاس رک گیا۔ ڈرائیور نے ہورن بجایا تو گیٹ کا ایک حصہ کھلا کوئی کالی گاڑی نہیں آئی، بس ایک عام سا ٹرک تھا، لیکن رامین نے کہنی سے مجھے ہلکا سا اشارہ کیا۔اس ٹرک کی نمبر پلیٹ مشہد کی نہیں تھی، بلکہ وہ سیستان بلوچستان کے علاقے کی لگ رہی تھی۔ ٹرک سے ایک شخص اترا جس نے کندھے پر ایک کالا کپڑا ڈال رکھا تھا اس نے گارڈ سے کچھ کہا اور ایک چھوٹا سا کاغذ دکھایا۔اسکے بعد دروازہ کھلا اور ٹرک اندر چلا گیا۔میں اور رامین وہیں فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے رہے، جیسے ہم واقعی کسی کام کے ملنے کی آخری امید لگائے بیٹھے ہوں۔اسی دوران ایک نیلی جیپ ہمارے سامنے آکر رکی۔ ڈرائیور نے شیشہ نیچے کیا اور تھکے ہوئے لہجے میں چلایا، "چار بندے چاہیے، گودام میں سیمنٹ کی بوریاں شفٹ کرنی ہیں۔" چوک پر بیٹھے کچھ مزدور جو ہم سے زیادہ مستعد تھے، فوراً لپک کر گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ ہم بھی اپنی جگہ سے ہلے، لیکن تھوڑی 'سستی' دکھائی۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے جوتے کے تسمے درست کرنے کا ناٹک کیا اور جب تک ہم گاڑی کے قریب پہنچے، وہ ڈرائیور چار بندے پورے کر کے جیپ بھگا چکا تھا۔ رامین نے ایک لمبی آہ بھری، جیسے اسے کام نہ ملنے کا بہت افسوس ہوا ہو، حالانکہ ہم دونوں کے دلوں کو سکون ملا تھا کہ ہم اس 'سنگِ آریا' کے دفتر کے سامنے سے ہٹے نہیں۔ ہمارے برابر میں بیٹھا ایک ادھیڑ عمر مزدور، جو اپنی میٹھی چائے کا آخری گھونٹ بھر رہا تھا، ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ یہاں کام کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ "لگتا ہے قسمت آج تمہارے ساتھ نہیں ہے بیٹا۔ یہاں اس 'سنگِ آریا' والے دفتر میں ہی کام مل جائے تو سکون ہے۔ رامین نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا، "جی بس، ہم تو سمجھے تھے اس 'سنگِ آریا' والے دفتر میں شاید کوئی بوجھ اٹھانے کا کام مل جائے۔"

اس مزدور نے سامنے والے گیٹ کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "ہاں، یہاں کام تو بہت ہے، لیکن ان کے پاس اپنے پرانے بندے زیادہ ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر پتھر کی کٹنگ اور لوڈنگ کا کام کرتے ہیں۔ عام فیکٹریوں کی طرح یہاں بھی ٹرکوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے، کبھی تہران سے مال آتا ہے، کبھی بندر عباس کی طرف جاتا ہے۔ بس وہی روٹین ہے جو دوسری فیکٹریوں کی ہوتی ہے۔"

میں نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا، "کیا یہاں مزدوروں کو اندر رہنے کی اجازت ہوتی ہے؟

"ہاں کیوں نہیں،" اس نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ "جن کے گھر دور ہیں یا جو دوسرے شہروں سے آئے ہیں، وہ وہیں اندر بنے کوارٹرز میں رہتے ہیں۔ کھانا پینا بھی وہیں مل جاتا ہے اور وہیں سو جاتے ہیں۔ صبح پھر کام شروع۔ ان کا کام چوبیس گھنٹے چلتا ہے، شفٹوں میں۔ بس ایک بڑی فیکٹری ہے جہاں پتھر کا کاروبار ہوتا ہے۔" سورج اب عمارتوں کے پیچھے چھپ رہا تھا اور آسمان پر نارنجی اور سرمئی رنگ گھلنے لگے تھے۔ کارخانوں کی چھٹی کے سائرن بجنا شروع ہوئے تو سڑک پر موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں کا ریلا امڈ آیا۔ چوک پر بیٹھے مزدور بھی اب آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے؛ کچھ ناکامی کا بوجھ

لیے بس اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے اور کچھ اپنی روٹیاں سمیٹ رہے تھے۔
ہم بھی وہیں بیٹھے رہے جب تک کہ اندھیرا گہرا نہیں ہو گیا۔ رامین نے میری طرف دیکھا، اس کا چہرہ اب مکمل طور پر گرد سے اٹا ہوا تھا اور آنکھوں میں تھکن واضح تھی۔
"ذیشان، شام ہو گئی ہے۔ اب یہاں مزید بیٹھنا شک پیدا کر سکتا ہے،" اس نے دبی آواز میں کہا۔میں نے 'سنگِ آریا' کے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں اب صرف ایک زرد بلب روشن تھا اور گارڈز کی تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ ٹرک جو دوپہر کو اندر گیا تھا، ابھی تک اندر تھا
"چلو رامین،" میں نے اٹھتے ہوئے اپنی واسکٹ جھاڑی۔ "آج کے لیے اتنا مشاہدہ کافی ہے۔ ہمیں یہ پتہ چل گیا کہ یہاں کا نظام کیا ہے ہم نے دن بھر وہیں بیٹھے رہ کر یہ جان لیا تھا کہ:
فیکٹری کا ماحول بالکل عام اور نارمل ہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔اندر رہائش کا انتظام ہے، جو کسی بھی بڑی فیکٹری میں ایک عام بات ہوتی ہے ٹرکوں کی آمد و رفت بالکل ویسے ہی ہے جیسے کسی بھی ایکسپورٹ بزنس میں ہوتی ہے۔
یہی وہ "نارمل" چہرہ تھا جس کے پیچھے وہ خطرناک نیٹ ورک چھپا ہوا تھا۔ہم نے بس اسٹاپ کی طرف جانے کے بجائے وہیں قریب ہی ایک سستی سی 'مسافر خانہ' نما سرائے تلاش کی۔ یہ ایک بوسیدہ سی عمارت تھی جہاں دور دراز سے آئے ہوئے مزدور پانچ چھ کے گروہ میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، لیکن ہم نے کچھ اضافی رقم دے کر ایک چھوٹا سا الگ کمرہ لے لیا تاکہ اپنی شناخت اور گفتگو کو محفوظ رکھ سکیں۔کمرے میں ایک پرانی چٹائی اور دو میلے سے بستر تھے جن سے سیمنٹ کی بو آ رہی تھی۔ ہم نے قریب ہی ایک ڈھابے سے 'خوراک' (ایران کا روایتی سستا کھانا) لیا اور کمرے کی دبی دبی روشنی میں بیٹھ گئے۔ رامین نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کھڑکی کے پردے گرا دیے۔
"ذیشان، تہران سے جو خبریں آ رہی ہیں وہ ہولناک ہیں،" رامین نے اخبار سرخیوں اور انٹرنیٹ کے خفیہ فورمز سے حاصل کردہ معلومات بتاتے ہوئے کہا۔ میں نے سر ہلایا اور موبائل سے ایک نقشہ نکالا۔ "صرف تہران نہیں رامین، اصفہان کی ایٹمی تنصیبات کے گرد ڈرونز دیکھے گئے ہیں اور تبریز میں بھی احتجاج کی آڑ میں تخریب کاری شروع ہو چکی ہے۔ یہ سب اتفاق نہیں ہے۔۔ہم نے ان حقائق پر غور کرنا شروع کیا کہ یہ جنگ کیوں ہونے والی ہے رامین نے کہا صاف ظاہر ہے اسرائیل جانتا ہے کہ ایران کا ایٹمی اور میزائل پروگرام اس کے وجود کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ وہ براہِ راست جنگ سے ڈرتا ہے، اس لیے اس نے 'سائبر وائرس' اور 'اندرونی بغاوت' کا سہارا لیا ہے تاکہ ایران کی طاقت کو اندرونی خلفشار میں الجھا دے اور امریکہ اپنی چودھراہٹ برقرار رکھنا چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ خلیجِ فارس اور تیل کی سپلائی لائن پر اس کا مکمل کنٹرول ہو۔ ایران کی آزادانہ خارجہ پالیسی ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایران کی معیشت کو پابندیوں اور اندرونی ہنگاموں سے اتنا توڑ دیں کہ وہ ان کی شرائط پر سمجھوتہ کر لے یہاں ایک ایسی حکومت آئے جو امریکہ کے اشاروں پر چلے۔اور ذیشان، اس کھیل میں دہلی (India) کا کردار سب سے خطرناک ہے۔ وہ اسرائیل کے ساتھ مل کر ایران کے مشرقی حصے، یعنی سیستان بلوچستان میں آگ لگانا چاہتے ہیں۔ ان کا

فائدہ دوہرا ہے سی پیک (CPEC) کی تباہی بھارت جانتا ہے کہ اگر ایران اور پاکستان کے سرحدی حالات خراب رہے، تو 'سی پیک' اور گوادر کی بندرگاہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔ وہ بلوچستان میں علیحدگی پسند گروہوں کو فنڈنگ اور اسلحہ دے کر ایران کے اندر تک تخریب کاری کروانا چاہتے ہیں تاکہ یہ پورا خطہ عدم استحکام کا شکار رہے۔بھارت کا آئی ٹی سیل اس وقت ایسی ویڈیوز وائرل کر رہا ہے جن سے ایرانی سیکیورٹی فورسز اور بلوچ عوام کے درمیان نفرت بڑھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تہران اپنی پوری فوجی طاقت بلوچستان کے بارڈر پر لگا دے، تاکہ اسرائیل کو مغربی سمت سے حملہ کرنے کا کھلا راستہ مل جائے۔"جب ایران اپنے ہی لوگوں سے لڑنے میں مصروف ہوگا، تب اسرائیل کے لیے اصفہان اور تہران پر فضائی حملے کرنا آسان ہو جائے گااور یورپ کے لیے تو ویسے بھی ایران کا موجودہ اسلامی نظام ایک 'کھلی بغاوت' ہے۔ وہ یہاں 'سیکولر لبرل ازم' لانا چاہتے ہیں تاکہ یہ ملک بھی ان کی ثقافتی اور معاشی کالونی بن جائے۔"میں نے موبائل پر مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ کھولا اور ان خونی لکیروں کی نشاندہی کی جو گزشتہ دہائیوں میں کھینچی گئی تھیں۔ "دیکھو رامین، یہ ان کی 'ڈیوائڈ اینڈ رول' (تقسیم کرو اور حکومت کرو) کی پالیسی کا کمال ہے۔ انہوں نے عراق، شام اور یمن میں ایسی آگ لگائی کہ آج ایک عام عراقی یا شامی، ایران کو اپنا ہمدرد سمجھنے کے بجائے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسرائیل اور امریکہ نے سائبر پروپیگنڈے کے ذریعے یہ تاثر عام کر دیا ہے کہ ایران کا عروج باقی عرب دنیا کا زوال ہے اس 'خوف کی سیاست' کے نتیجے میں کئی عرب ممالک نے اسرائیل کے ساتھ ہاتھ ملا لیے اور ایران کو خطے میں اکیلا چھوڑ دیا اور کچھ ایران کی اپنی سخت گیر پالیسیاں اور کچھ دشمن کا بچھایا ہوا 'سائبر جال' جس نے ایران کی جائز دفاعی کوششوں کو بھی 'جارحیت' بنا کر پیش کیا۔آج ایران کو سمجھ آ رہی ہے کہ اتحاد کے بغیر بقا ممکن نہیں،" میں نے رامین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لیکن افسوس یہ ہے کہ باقی اسلامی دنیا ابھی تک اس 'سائبر ہپناٹزم' کا شکار ہے جہاں انہیں اپنا بھائی دشمن اوراصل دشمن (اسرائیل/امریکہ) ہمدرد نظر آ رہا ہے۔

وہ ہمیں ٹکڑوں میں بانٹ کر باری باری شکار کرنا چاہتے ہیں۔کاظم کا یہ 'پتھر ایکسپورٹ آفس' بھی دراصل اسی نفرت کی سپلائی لائن کا حصہ تھا۔ یہاں سے وہ فنڈز جا رہے تھے جو تہران میں بیٹھے لبرل کو 'مذہب' کے خلاف اور بغداد کابل میں بیٹھے اہلسنت نوجوان کو 'ایران' کے خلاف اکسا رہے تھے۔رات کی اس طویل گفتگو کے بعد، جس میں ہم نے عالمی بساط پر بکھرے ہوئے مہروں کا تجزیہ کیا تھا، اب عمل کا وقت تھا۔ذیشان، باہر سے تو ہم نے کافی معلومات اکٹھی کر لی ہیں،" رامین نے اپنی آواز کو سرگوشی کی حد تک نیچا رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اصل سچ اس 'سنگِ آریا' کے دفتر کی چار دیواری کے اندر چھپا ہے۔ کل ہمیں صرف فٹ پاتھ پر نہیں بیٹھنا، بلکہ کسی نہ کسی بہانے اس گیٹ کے پار قدم رکھنا ہے۔ ہمیں وہاں کے اندرونی نظام کی تصاویر اتارنی ہیں اور وہ شواہد جمع کرنے ہیں جو ثابت کر سکیں کہ اس پتھر کے کاروبار کی آڑ میں کون سا ڈیجیٹل اور فزیکل نیٹ ورک کام کر رہا ہے ہم نے طے کیا کہ کل ہم پہلے اسی 'مزدوروں والے اڈے' پر جائیں گے اور پھر کسی ٹھیکیدار کے زریعے لوڈنگ کے بہانے اندر داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ ہمارا مقصد واضح تھا: اندر کے کام کی نوعیت دیکھنا اور یہ جاننا کہ وہاں کون سے مخصوص لوگ موجود ہیں۔

پلان مکمل ہو چکا تھا۔ ہم اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے اب جسم کو آرام کی ضرورت تھی تاکہ کل کے کٹھن دن کے لیے حواس بیدار رہ سکیں۔ بستر کی سخت چادر اور سیمنٹ کی بو اب مجھے اجنبی نہیں لگ رہی تھی۔ رامین کی باقاعدہ سانسوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ گہری نیند کی وادیوں میں جا چکا ہے۔ میں نے بھی آنکھیں موند لیں، اور تھوڑی ہی دیر میں تھکن نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں ایک ایسی گہری اور بے خبر نیند میں چلا گیا جس میں نہ تہران کے ہنگامے تھے اور نہ ہی سرحدوں پر منڈلاتے جنگ کے سائے—صرف ایک خاموشی تھی، جو کسی بڑے طوفان کے آنے سے پہلے کی آخری مہلت تھی۔ مشہد کی فجر کا ٹھنڈا جھونکا جب کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا، تو میری آنکھ خود بخود کھل گئی۔ رامین بھی بیدار ہو چکا تھا۔ ہم نے وضو کیا اور اس چھوٹے سے مسافر خانے کے کمرے میں ہی نماز ادا کی، جس میں اللہ سے اس کٹھن دن کی خیر مانگی۔ ناشتے میں 'نان اور پنیر' کے چند نوالے لیے اور اپنی واسکٹوں پر تھوڑی گرد مل کر دوبارہ وہی 'زاہدان کے مزدور' بن گئے۔ قاضی آباد کے اس چوک پر، جہاں مزدوروں کا میلہ لگتا تھا، ہم خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ ہمارے ارد گرد بیسیوں مزدور تھے، جن کے چہروں پر غربت اور ہاتھوں پر مشقت کی لکیریں واضح تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا، ہم عام مزدوروں کی طرح ادھر ادھر کی گپ شپ لگاتے رہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔اچانک ایک سفید رنگ کی پک اپ گاڑی 'سنگِ آریا' کے گیٹ سے نکلی اور ہمارے پاس آکر رکی۔ ایک بھاری بھرکم شخص، جس کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی اور ایک رجسٹر تھا، نیچے اترا۔ "پانچ بندے چاہیے، سنگِ مرمر کی سلیبیں لوڈ کرنی ہیں اور اندر صفائی کرنی ہے۔ دیہاڑی تگڑی ملے گی، ہے کوئی تیار؟" اس نے اونچی آواز میں پکارا۔ میں اور رامین سب سے پہلے لپکے۔ "آغا! ہم تیار ہیں۔" ہمارے ساتھ تین اور مقامی مزدور بھی شامل ہوگئے۔ ٹھیکیدار نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور اشارہ کیا کہ گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار ہو جاؤ۔ جیسے ہی گاڑی 'سنگِ آریا' کے وزنی لوہے کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی، میرے اندر کا صحافی جاگ اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ دیواروں کے اوپر نوکیلی تاریں اور جدید ترین سی سی ٹی وی کیمرے نصب تھے۔ اندر کا منظر کسی عام فیکٹری جیسا ہی تھا—پتھر کٹنے کی مشینوں کا شور اور فضا میں اڑتی ہوئی سفید گرد۔ ہمیں ایک بڑے گودام کے پاس اتارا گیا جہاں سنگِ مرمر کے بڑے بڑے بلاکس پڑے تھے۔ "تم دونوں ادھر آؤ،" ٹھیکیدار نے میری اور رامین کی طرف اشارہ کیا۔ "اس آفس بلاک کے پیچھے جو کچرا اور پتھروں کا ملبہ پڑا ہے، اسے صاف کر کے ٹرالی میں ڈالو۔" ٹھیکیدار کے اشارے پر ہم نے بیلچے اٹھائے اور اس بھاری بھرکم لوہے کی ٹرالی کی طرف بڑھے جو ملبے سے بھرنی تھی۔ سورج اب پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور فضا میں اڑتی ہوئی سنگِ مرمر کی باریک گرد سانس لینا دشوار کر رہی تھی۔ "رامین، بازوؤں میں جان ڈالو، ہمیں بالکل ویسا ہی دکھنا ہے جیسے یہ باقی لوگ ہیں،" میں نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی اور پتھروں سے بھرا ایک بھاری بیلچہ ٹرالی میں الٹ دیا۔ ہماری کمریں جھک گئی تھیں اور پسینہ واسکٹوں سے رستا ہوا جوتوں تک جا رہا تھا۔ ہم نے تندہی سے ٹرالی بھری اور پھر اسے دھکیلتے ہوئے گودام کے عقبی حصے کی طرف لے گئے۔ وہاں کام کی رفتار عجیب تھی۔ ایک طرف بڑی مشینیں پتھر کاٹ رہی تھیں، لیکن میری نظریں اس 'آفس بلاک' کی کھڑکیوں پر جمی تھیں جہاں سے کمپیوٹرز کی نیلی روشنی باہر جھانک رہی تھی۔اسی دوران میری نظر اس لڑکی پر

پڑی جو گہرے رنگ کا ایپرن پہنے خاموشی سے برآمدے میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی صفائی کر رہی تھی، اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے کام میں مگن لگ رہی تھی ہم ٹرالی لے کر اس کے قریب سے گزرے تو پتھروں کے آپس میں ٹکرانے کا زوردار شور ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا اور ہماری طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں ایک عجیب سی گہرائی تھی، جیسے وہ ان میلی واسکٹوں اور گرد آلود چہروں کے پیچھے چھپے اصل انسانوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ جھاڑو لگاتے ہوئے ہمارے قریب آئی، جہاں کچھ کچرا بکھرا پڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے وہ کچرا سمیٹا اور ایک بار پھر میری اور رامین کی طرف دیکھا۔ مگر اگلے ہی پل اس نے پلکیں جھکا لیں اور دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ وہ ایک عام صفائی والی لگ رہی تھی، لیکن اس کا وہ ایک لمحے کا دیکھنا میرے ذہن میں نقش ہو گیا دوپہر ڈھل رہی تھی جب اچانک فیکٹری کے مرکزی گیٹ پر ہلچل ہوئی۔ ایک مہنگی سیاہ گاڑی (SUV) اندر داخل ہوئی اور سیدھی آفس بلاک کے سامنے جا کر رکی۔ ڈرائیور نے تیزی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا تو ایک شخص باہر نکلا۔ درمیانہ قد، کھچڑی بال اور آنکھوں پر مہنگا چشمہ — یہ کاظم تھا۔ اس کے چلنے کے انداز میں ایک عجیب سا تکبر تھا۔ اس نے دفتر میں داخل ہونے سے پہلے ایک لمحہ رک کر مزدوروں کی طرف دیکھا، جیسے وہ انسان نہیں بلکہ اس کی مشینری کا کوئی معمولی حصہ ہوں۔ ہم اس وقت ایک بڑے ملبے کے ڈھیر کے پیچھے کام کر رہے تھے اور ہم نے اپنے چہروں پر نیلے رنگ کے کپڑے (ماسک کے طور پر) لپیٹ رکھے تھے تاکہ پتھروں کی باریک گرد ناک اور حلق میں نہ جائے۔ کاظم کی نظریں ہم پر پڑیں تو ضرور، لیکن اسے صرف مٹی میں اٹے ہوئے دو معمولی مزدور نظر آئے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جن شکاریوں کو تہران کی گلیوں اور اصفہان کے خفیہ ٹھکانوں میں ڈھونڈ رہا ہے، وہ اس وقت اس کی اپنی فیکٹری کے اندر، اس کے قدموں کی دھول بنے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی فرعونیت میں ڈوبا ہوا سیدھا دفتر کے اندر چلا گیا، یہ جانے بغیر کہ موت کا جال اب اس کے اپنے گھر کے اندر بچھ چکا ہے۔

شام کے پانچ بج چکے تھے جب ٹھیکیدار نے سیٹی بجائی۔ "اوئے زاہدان والو! بس کرو آج کے لیے۔" ہم ہاتھ پاؤں جھاڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ اس نے رجسٹر پر کچھ لکھا اور ہماری دیہاڑی نکال کر دی۔ "کام ابھی بہت باقی ہے۔ کم از کم تین دن کی مزدوری اور نکل آئے گی۔ اگر چاہو تو ادھر ہی گودام کے کمرے میں رک سکتے ہو، ورنہ صبح ٹھیک آٹھ بجے یہاں پہنچ جانا۔" رامین نے میری طرف دیکھا۔ ہم جانتے تھے کہ آج رات یہاں رکنا خطرناک ہو سکتا ہے کیونکہ ہمارے پاس ابھی اندر کا پورا نقشہ نہیں تھا۔ "شکریہ آغا، لیکن ہم شہر میں اپنے جاننے والے کے پاس رکیں گے۔ صبح انشاء اللہ وقت پر پہنچ جائیں گے،" رامین نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ہم فیکٹری سے باہر نکلے تو جسم ٹوٹ رہا تھا، لیکن ذہن بیدار تھا۔ ہم نے خاموشی سے وہی راستہ لیا جو ہمارے ہوٹل کی طرف جاتا تھا۔ آج ہم نے کاظم کو دیکھ لیا تھا اور فیکٹری کے حفاظتی نظام کا اندازہ بھی کر لیا تھا مشہد کی سڑکوں پر ٹریفک تو تھی، لیکن گاڑیوں کی رفتار میں ایک انجانی افراتفری تھی۔ ہم خاموشی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ رامین نے موبائل آن کیا تو تہران سے آنے والی خبروں نے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ "اسرائیلی فضائیہ کے طیارے سرحدوں کے قریب دیکھے گئے ہیں... سپریم لیڈر کی طبیعت سے متعلق

افواہوں نے پورے ملک میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے... گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے مجھے وہ تمام وجوہات یاد آنے لگیں جو اس بڑی جنگ کا پیش خیمہ بن رہی تھیں۔ یہ صرف سرحدی تنازع نہیں تھا، بلکہ ایک گہری عالمی بساط تھی اسرائیل ایران کے ایٹمی پروگرام کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے آخری حد تک جانے کو تیار تھا۔ ہم اپنے چھوٹے سے مسافر خانے پہنچے تو وہاں کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ لوگ ٹی وی کے گرد جمع تھے جہاں جنگی ترانے اور دفاعی الرٹس چل رہے تھے۔ ہم نے جلدی سے نان اور گوشت کا کھانا کھایا، لیکن لقمے حلق میں پھنس رہے تھے۔ موبائل فون پر انٹرنیٹ کی رفتار سست تھی، مگر جو خبریں مل رہی تھیں وہ ہولناک تھیں—اصفہان اور تہران میں خطرناک ہنگاموں کی اطلاعات تھیں۔ پھر ہم نے اگلے دن کا مختصر سا پلان بنایا۔ ہمیں معلوم تھا کہ کل فیکٹری میں سیکیورٹی مزید سخت ہوگی، لیکن 'نیلا سنگِ مرمر' کے پیچھے چھپا سچ نکالنا اب صرف ہمارا مشن نہیں تھا، بلکہ اس خطے کو بڑی تباہی سے بچانے کا واحد راستہ تھا تھوڑی دیر بعد ہم اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے اور پھر کب نیند کی اغوش میں چلے گئے پتہ بھی نہیں چلا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مشہد کے بلند میناروں سے اذان کی آواز گونجی۔ نمازِ فجر کے بعد ہم نے اللہ سے اس مشن کی کامیابی اور اپنی حفاظت کی دعا مانگی۔ ناشتے میں 'نان اور پنیر' کے چند لقمے لیے، وہی میلی واسکٹیں پہنیں اور اپنے چہروں پر گرد مل کر دوبارہ وہی 'زاہدان کے مزدور' بن گئے۔ جب ہم قاضی آباد کی طرف روانہ ہوئے تو سڑکوں کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ تہران اور اصفہان میں ہونے والے حالیہ دھماکوں کے بعد ایران بھر میں 'ریڈ الرٹ' جاری ہو چکا تھا۔ مشہد کی شاہراہوں پر عام ٹریفک کم تھی، لیکن فوجی ٹرکوں (Military Convoys) کی قطاریں تیزی سے سرحدوں کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ جا بجا سیکیورٹی فورسز (پاسدارانِ انقلاب) کی چوکیاں قائم تھیں اور ہر مشکوک گاڑی کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ فضا میں ایک ایسی خاموشی تھی جو صرف بڑی جنگوں سے پہلے محسوس ہوتی ہے فیکٹریوں سے اٹھتا ہوا دھواں اب بارود کی بو میں گھل چکا تھا۔ 'سنگِ آریا' کے وزنی لوہے کے گیٹ کے پاس پہنچے تو وہاں بھی سیکیورٹی پہلے سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ گیٹ پر موجود گارڈ کے ہاتھ میں اب ایک خودکار رائفل تھی اور اس کی نظریں ہر آنے جانے والے کا بغور معائنہ کر رہی تھیں۔ "رک جاؤ!" گارڈ نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔ "تمہارا کارڈ کہاں ہے؟" رامین نے اطمینان سے اپنی میلی واسکٹ کی اندرونی جیب سے وہ پیلے رنگ کا پلاسٹک کا ٹوکن نکالا جو کل شام ٹھیکیدار نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے دیا تھا۔ یہ ٹوکن اس بات کی علامت تھا کہ ہم فیکٹری کے رجسٹرڈ دیہاڑی دار مزدور ہیں۔ گارڈ نے ٹوکن کو ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر ایک نظر ہمارے دھول سے اٹے چہروں اور ربڑ کے جوتوں پر ڈالی۔

"ٹھیک ہے، اندر جاؤ۔ لیکن یاد رکھنا، صرف اپنے کام والی جگہ پر رہنا۔ ادھر ادھر گھومنے کی ضرورت نہیں،" اس نے سخت لہجے میں تنبیہ کی اور چھوٹا آہنی دروازہ کھول دیا۔ ہم سر جھکا کر اندر داخل ہو گئے۔ فیکٹری کے صحن میں ٹرکوں کی گھڑگھڑاہٹ اور پتھر کاٹنے والی آریوں کا شور کل سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ ہم سیدھے اس شیڈ کے نیچے پہنچے جہاں ٹھیکیدار اپنا بڑا سا رجسٹر کھولے بیٹھا مزدوروں کی حاضری لگا رہا تھا۔ "آ گئے زاہدان کے سورماؤ؟" ٹھیکیدار نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھا۔ "مجھے لگا شاید جنگ کے ڈر سے تم لوگ بھاگ گئے ہو۔" "نہیں آغا، پیٹ کی آگ جنگ

سے زیادہ بڑی ہوتی ہے،" رامین نے تجربہ کار مزدوروں کی طرح جواب دیا۔ ٹھیکیدار نے سر ہلایا اور آفس بلاک کی طرف اشارہ کیا۔ "وہی کام ہے، ملبہ ابھی آدھا باقی ہے۔ آج وہ پورا صاف ہونا چاہیے اور ٹرالیوں کو پچھلے گیٹ کے باہر خالی کرنا ہے۔ جاؤ، کام شروع کرو!" ہم نے خاموشی سے اپنے بیلچے اٹھائے اور دوبارہ اسی آفس بلاک کے پیچھے پہنچ گئے جہاں سے ہمیں 'نیلا سنگِ مرمر' کے راز تک پہنچنا تھا۔ گرد و غبار میں اٹی ہوئی وہی جگہ، وہی بھاری پتھر، لیکن آج ہمارے ارادے کل سے زیادہ پختہ تھے کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ان دیواروں کے اندر جو فائلیں ہیں، وہ اس ملک اور خطے کی تقدیر بدل سکتی ہیں۔ دو گھنٹے بیت چکے تھے اور سورج کی تپش نے ہمارے ماتھوں پر جمی گرد کو کیچڑ میں بدل دیا تھا۔ میں اور رامین تندہی سے اس آفس بلاک کی پچھلی دیوار کے ساتھ ملبہ ٹرالی میں ڈال رہے تھے، مگر ہماری نظریں مسلسل اس وزنی دروازے پر جمی تھیں جہاں سے ہر تھوڑی دیر بعد کوئی اہلکار فائلیں پکڑے گزرتا۔ اسی دوران وہی کل والی لڑکی ہاتھ میں جھاڑو اور کچرے کا ڈبہ لیے برآمدے کی صفائی کرتی ہوئی ہماری طرف بڑھنے لگی۔ وہ بہت مہارت سے فرش رگڑ رہی تھی، لیکن اس کے قدموں کی چاپ میں ایک خاص مقصدیت تھی۔ جب وہ ہمارے بالکل قریب پہنچ کر کچرا سمیٹنے لگی، تو اس نے سر جھکائے جھکائے ایسی دھیمی آواز میں بات شروع کی جو صرف ہم دونوں ہی سن سکتے تھے۔ ذیشان صاحب! یہ بیلچہ آپ کے ہاتھوں میں جچ نہیں رہا،" میں ایک لمحے کے لیے منجمد ہو گیا۔ میرا نام؟ اس نے میرا نام کیسے جانا؟ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اس نے رامین کی طرف دیکھ کر دوسرا دھماکہ کر دیا۔ "اور رامین صاحب! اصفہان کے اتنے منجھے ہوئے صحافی کو مشہد کی اس گرد آلود فیکٹری میں مزدوری کرتے دیکھ کر دکھ ہوا۔ ہم دونوں کے ہاتھ ساکت ہو گئے اور دل کی دھڑکنیں کنٹرول سے باہر ہونے لگیں۔ رامین نے فوراً بیلچہ زمین پر مارا جیسے کوئی پتھر توڑ رہا ہو اور دبی آواز میں پوچھا، "تم کون ہو؟ اور ہمیں کیسے جانتی ہو؟" اس نے چہرے پر پڑا سکارف تھوڑا درست کیا، ادھر ادھر ایک محتاط نظر ڈالی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا اعتماد تھا۔ "میرا نام زکیہ ہے۔ فی الحال اتنا جان لیں کہ میں آپ کی دشمن نہیں ہوں۔ آپ کے چہرے پر جمی یہ دھول اور مزدوروں کا یہ حلیہ کاظم کو تو دھوکہ دے سکتا ہے، لیکن مجھے نہیں میں نے آپ دونوں کی تصویریں کاظم کے آفس کی ان 'خفیہ فائلوں' میں دیکھی ہیں جنہیں وہ عام لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھتا ہے۔" میں نے غصے اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہم تم پر اعتبار کیوں کریں؟ ہو سکتا ہے تم کاظم کی بچھائی ہوئی کوئی چال ہو؟"

زکیہ نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور جھاڑو مارتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ "اعتبار کرنے یا نہ کرنے کا آپشن اب آپ کے پاس بچا ہی نہیں ہے ذیشان صاحب۔ اگر میں چاہوں تو ایک سیٹی بجا کر یہاں موجود گارڈز کو بلا سکتی ہوں، لیکن میرا مقصد کچھ اور ہے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر گودام کے کونے میں موجود ایک پرانے زنگ آلود جنریٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "آج شام پانچ بجے، جب شفٹ ختم ہو جائے، تو اس پرانے جنریٹر کے پیچھے والے شیڈ میں آ جانا۔ وہاں ہم تفصیل سے بات کریں گے۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی سوال کرتے، فیکٹری کے مرکزی ہال سے کسی اہلکار کے چلانے کی آواز آئی اور زکیہ تیزی سے کچرا سمیٹتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ رامین نے میری طرف دیکھا، اس کے

ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔"ذیشان، یہ لڑکی یا تو ہماری نجات کا راستہ ہے یا پھر موت کا پھندا،" رامین نے سرگوشی کی۔ ہم نے خاموشی سے دوبارہ بیلچے اٹھا لیے، لیکن اب پانچ بجنے کا انتظار کسی قیامت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ دوپہر کے سائے ڈھل کر طویل ہونے لگے اور ہمارے جسم مشقت سے ٹوٹنے لگے۔ ہر گزرتا منٹ کسی بھاری پتھر کی طرح محسوس ہو رہا تھا، کیونکہ ہماری نظریں مسلسل اس پرانے زنگ آلود جنریٹر پر جمی تھیں۔ آخر کار، پانچ بجے کی سیٹی گونجی۔ مزدوروں کی قطاریں ٹھیکیدار کے پاس لگنے لگیں، جہاں وہ رجسٹر پر انگوٹھے لگوا کر دیہاڑی بانٹ رہا تھا۔ ہم نے بھی اپنی مزدوری لی اور گرد جھاڑتے ہوئے خاموشی سے اس پچھلے شیڈ کی طرف مڑ گئے جہاں وہ پرانا جنریٹر نصب تھا۔ وہاں تیل اور پرانے لوہے کی بو بسی ہوئی تھی اور مشینوں کے بند ہونے کے بعد ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ ابھی ہم وہاں پہنچے ہی تھے کہ زکیہ نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی بھی صفائی والا ڈبہ تھا، تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔"آپ لوگ یہاں محفوظ نہیں ہیں،" اس نے چاروں طرف ایک محتاط نظر ڈال کر سرگوشی کی۔ "کاظم کا بڑا بھائی آج رات یہاں کسی اہم میٹنگ کے لیے پہنچ رہا ہے، اور سکیورٹی چیک کرنے کے لیے وہ گوداموں کا چکر بھی لگا سکتے ہیں۔"میں نے بے چینی سے پوچھا، "تم نے ان 'خفیہ فائلوں' کا ذکر کیا تھا، ان کا کیا معاملہ ہے؟"زکیہ نے جلدی سے اپنے لباس کے اندر چھپایا ہوا ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا جس پر فارسی میں 'سفراہ خانہِ سنتی - طوس'(Sofreh Khaneh Sonati - Toos) لکھا تھا۔"یہ فیکٹری سے باہر نکل کر بائیں جانب والی گلی میں، صنعتی علاقے کے اختتام پر ایک روایتی ریستوران اور قہوہ خانہ ہے۔ یہاں سے محض دس پندرہ منٹ کی پیدل مسافت پر ہے۔آپ لوگ ابھی یہاں سے نکلیں اور ٹھیک دو گھنٹے بعد وہاں پہنچیں۔ میں اپنی شفٹ ختم کر کے وہیں آؤں گی، وہیں میں آپ کو بتاؤں گی کہ کاظم نے آپ کے بارے میں کیا منصوبہ بنا رکھا ہے۔رامین نے پوچھا، "کیا ہم آج رات فیکٹری کے اس کمرے میں نہیں رک سکتے جو ٹھیکیدار نے ہمیں آفر کیا تھا؟"زکیہ نے سختی سے سر ہلایا۔ "ہرگز نہیں! اگر آپ یہاں رکے تو آپ کاظم کے جال میں ہوں گے۔ یہاں سے نکلنا ہی آپ کے لیے بہتر ہے۔رامین نے پھر پوچھا، "کیا ہم وہاں محفوظ رہیں گے؟"زکیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، وہاں کا ماحول ایسا ہے کہ کوئی کسی کے نجی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ آپ وہاں جا کر ایک 'تخت' (لکڑی کا روایتی بیڈ) بک کریں اور قہوہ کا آرڈر دیں۔تب تک وہاں میں بھی پہنچ جاؤں گی۔ اپنا اسکارف اس طرح لوں گی جیسے میں کوئی عام طالبہ ہوں، تاکہ فیکٹری کا کوئی بندہ پہچان نہ سکے۔ہم نے وہ پرچی لی اور خاموشی سے فیکٹری کے پچھلے چھوٹے گیٹ سے باہر نکل آئے۔شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور قاضی آباد کی سڑکوں پر کام ختم کر کے گھروں کو لوٹتے مزدوروں کا ہجوم تھا۔ہم بھی پیدل چل رہے تھے جسم ٹوٹ رہا تھا لیکن ذہن میں زکیہ کے انکشافات کا تجسس تھا۔ہم سیدھے اپنے اسی پرانے مسافر خانے پہنچے جو فیکٹری کے قریب ہی واقع تھا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم نے سب سے پہلے وہ میلی واسکٹیں اور مٹی سے اٹی ہوئی قمیضیں اتاریں۔ گرم پانی سے ہاتھ منہ دھویا تو جسم کی تھکن کچھ کم ہوئی، مگر ذہن اب بھی اسی مشن میں الجھا ہوا تھا۔ ہم نے مزدوروں کا حلیہ چھوڑ کر ایک عام ایرانی طالب علم (Student) کا لباس اپنایا—سادہ جینز اور ہلکی جیکٹ۔ میں نے اور رامین نے اپنے چہروں پر نیلے رنگ کے سرجیکل ماسک (Masks) لگا لیے تاکہ

گرد و غبار سے بچنے کا بہانہ بھی رہے اور کاظم کا کوئی بندہ ہمیں پہچان نہ سکے۔ جب ہم مسافر خانے سے باہر نکلے تو ہم بالکل بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔ ہم نے پیدل ہی 'سفراہ خانہِ طوس' کی طرف چلنا شروع کیا۔ سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس جل چکی تھیں اور قاضی آباد کی فضا میں تلے ہوئے کھانے اور ڈیزل کے دھوئیں کی ملی جلی بو رچی ہوئی تھی۔ فوجی ٹرکوں کی گونج اب بھی کہیں دور سے سنائی دے رہی تھی، جو آنے والے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی پیدل مسافت کے بعد ہم قہوہ خانے کے صدر دروازے پر پہنچ گئے۔ اندر قدم رکھتے ہی روایتی ایرانی موسیقی کی مدھم دھنوں نے ہمارا استقبال کیا۔ لکڑی کے تختوں پر قالین بچھے تھے اور ہر طرف خاندان اور دوستوں کی محفلیں جمی تھیں۔ ہم نے ایک گوشے میں بچھا ہوا تخت چنا جہاں سے ہم پوری جگہ پر نظر رکھ سکتے تھے، مگر خود لوگوں کی نظروں سے دور تھے۔"دو قہوہ اور تھوڑی کھجوریں،" رامین نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو سات بج رہے تھے۔ ہم نے زکیہ سے ساڑھے سات (7:30) بجے کا وقت طے کیا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ کسی صدی کی طرح طویل لگ رہا تھا۔ ہم نے اپنے موبائل فون نکال لیے جیسے ہم عام طالب علم ہوں جو سوشل میڈیا پر مگن ہیں، لیکن اصل میں ہماری نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ہر بار جب دروازہ کھلتا اور کوئی نئی شخصیت اندر داخل ہوتی، ہمارا دل زور سے دھڑکنے لگتا۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ جیسے ہی زکیہ آئے گی، ہم اسے ایک عام جان پہچان والے کی طرح خوش آمدید کہیں گے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ قہوہ کی بھاپ اٹھ رہی تھی اور ہماری بے چینی عروج پر تھی، کیونکہ آج کی یہ ملاقات ہماری اگلی چال کا فیصلہ کرنے والی تھی ساڑھے سات بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے جب قہوہ خانے کا بھاری لکڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک دبلی پتلی لڑکی اندر داخل ہوئی جس نے گہرے رنگ کا لمبا کوٹ (مانٹو) پہنا ہوا تھا اور اسکارف کو بڑے سلیقے سے ماتھے تک لیا ہوا تھا۔ یہ زکیہ تھی، مگر اب وہ 'صفائی والی' نہیں بلکہ ایک ذہین طالبہ لگ رہی تھی۔ اس نے ایک محتاط نظر پورے ہال پر ڈالی اور سیدھی ہمارے تخت کی طرف آئی۔"سلام،" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا اور ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ ہم نے جواب دیا تو اس نے بلا تمہید فارسی میں گفتگو شروع کی: "ذیشان اور رامین صاحب، آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا، "تم نے ہمیں پہچانا کیسے؟ کاظم کی فائلوں تک ایک صفائی کرنے والی لڑکی کیسے پہنچ سکتی ہے؟"

زکیہ نے قہوہ کا پیالہ تھامتے ہوئے انکشاف کیا: "میرا کام صرف باہر صفائی کرنا نہیں ہے، میں شام کے وقت ان کے پرسنل آفس کی صفائی بھی کرتی ہوں جہاں کسی اور کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔

بات دراصل پرسوں سے شروع ہوئی تھی،" اس نے یادوں کی دھول جھاڑتے ہوئے کہا

وہاں ایک فائل میز پر پڑی تھی جس پر 'ہدف' (Target) لکھا تھا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اسے کھولا تو اندر آپ دونوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے جلی حروف میں آپ دونوں کے نام—ذیشان اور رامین—لکھے ہوئے تھے۔ اس وقت تو میں نے اسے ایک عام سی ہٹ لسٹ سمجھا اور فائل بند کر کے اپنے کام میں لگ گئی۔"وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی: "کل جب میں نے پہلی بار آپ دونوں کو اس ملبے کے

ڈھیر کے پاس دیکھا، تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہی چہرے، وہی نقوش! میں نے سوچا کہ کیا یہ محض میرا وہم ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ جن دو 'خطرناک دشمنوں' کے نام کاظم کی ڈیسک پر پڑے ہوں، وہ اتنی آسانی سے اس کے سامنے مزدوری کر رہے ہوں؟ کل پورا دن میں اسی تذبذب میں رہی، اسی لیے میں نے آپ سے بات نہیں کی کہ کہیں میرا اندازہ غلط نہ ہو۔"زکیہ نے ایک گہری سانس لی۔ "کل شام جب میں گھر پہنچی، تو تجسس نے مجھے سونے نہ دیا۔ میں نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور سب سے پہلے رامین صاحب کا نام سرچ کیا۔ چند ہی سیکنڈز میں اصفہان کے اس نڈر صحافی کا پورا کچا چٹھا میرے سامنے تھا۔ ان کے کالمز، ان کی ویڈیوز اور ان کی انویسٹی گیٹو رپورٹس دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ بندہ تو کوئی عام مزدور ہو ہی نہیں سکتا۔"پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "لیکن ذیشان صاحب! آپ کا معاملہ بالکل مختلف نکلا۔ میں نے ادھی رات تک انٹرنیٹ کی خاک چھانی، آپ کے نام سے ہر ممکنہ ڈیٹا بیس کھنگالا، آپ کا حلیہ اور آپ کے ممکنہ روابط ہر جگہ ڈھونڈے، مگر انٹرنیٹ پر آپ کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ آپ کی یہ 'خاموشی' ہی میرے لیے سب سے بڑا ثبوت بن گئی کہ آپ رامین صاحب کے ساتھ کسی ایسے مشن پر ہیں جسے دنیا کی نظروں سے چھپایا گیا ہے۔"آج صبح جب میں فیکٹری آئی اور دور سے آپ لوگوں کو کام کرتے دیکھا، تو میں نے دور کھڑے ہو کر کافی دیر تک آپ کے چلنے کے انداز اور ایک دوسرے سے بات کرنے کے طریقے کو غور سے مانیٹر کیا۔ اس بار مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ آپ وہی دو شکاری ہیں جو کاظم کی فائل سے نکل کر اس کے گھر تک پہنچ چکے ہیں۔ اسی لیے میں نے ہمت کی اور آپ کے قریب آ کر وہ اشارہ دیا، تاکہ اس سے پہلے کہ کاظم کو آپ کے اصل روپ کا پتہ چلے، میں آپ تک پہنچ سکوں۔

" رامین نے قہوہ کا پیالہ میز پر رکھا، اس کی آنکھیں اب شک اور احتیاط سے سکڑ گئی تھیں۔ اس نے میز پر تھوڑا جھک کر دھیمی مگر سخت آواز میں پوچھا: "زکیہ! تم ایک ذہین لڑکی ہو اور حالات کی نزاکت کو سمجھتی ہو۔ اور تمہارے پاس یہ معلومات ہیں، تو تم نے ہمیں ابھی تک گارڈز کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ تمہارا اپنا مفاد کیا ہے؟زکیہ کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھری، پھر اس کی آنکھوں میں وہ کرب لہرایا جو برسوں کی تکلیف کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو میز کے نیچے چھپایا اور جواب دیا: "مفاد؟ رامین صاحب، میرا مفاد کوئی دولت یا عہدہ نہیں، میرا مفاد انتقام ہے۔ آپ جس کاظم کو ایک سمگلر یا نیٹ ورک آپریٹر سمجھ رہے ہیں، میرے لیے وہ میرے باپ کا قاتل ہے۔ میرے والد، جو تہران کے ایک نڈر صحافی تھے، وہ کاظم کے اس 'نیلے سنگِ مرمر' والے پردے کو چاک کرنے ہی والے تھے کہ ایک رات انہیں روڈ ایکسیڈینٹ میں مروا دیا گیا۔"اس نے ایک لمبی سانس لی اور بات جاری رکھی: "پولیس نے اسے ایک حادثہ قرار دے کر فائل بند کر دی، مگر میں جانتی تھی کہ یہ قتل ہے۔ میں نے یہاں جھاڑو اس لیے نہیں اٹھایا کہ مجھے مزدوری کی ضرورت تھی، بلکہ اس لیے کہ میں اس درندے کے اتنے قریب پہنچنا چاہتی تھی جہاں سے اس کی شہ رگ پر وار کیا جا سکے۔ میں اکیلی کچھ نہیں کر سکتی تھی، مجھے ایسے لوگوں کی تلاش تھی جو اس کے سسٹم کو اندر سے جانتے ہوں اور جن کا مقصد بھی وہی ہو جو میرا ہے۔ میرا مفاد صرف یہ ہے کہ جس آگ میں میرا گھر جلا ہے، اسی آگ میں کاظم کی یہ کالی سلطنت بھی راکھ ہو جائے۔"رامین نے حیرانگی سے پوچھا

زکیہ، تم تہران کی رہنے والی ہو، پھر تم تہران سے اتنی دور مشہد کے اس صنعتی جہنم میں کیسے پہنچ گئیں؟ کیا کاظم تمہارے خاندان کو نہیں جانتا؟ کیا اس نے تمہارا ریکارڈ چیک نہیں کیا؟"زکیہ نے ایک گہری سانس لی اور اپنی خاندانی پس منظر کی گرہیں کھولنا شروع کیں: "کاظم میرے والد کو جانتا تھا، مگر وہ ہم دونوں بہنوں کے وجود سے تقریباً بے خبر ہے۔ میری والدہ لبنانی ہیں، میرے والد نے برسوں پہلے لبنان میں ان سے شادی کی تھی۔ میری بڑی بہن کی شادی بھی وہیں بیروت میں میرے ماموں کے گھر ہو چکی ہے اور وہ اب وہیں مقیم ہے۔ میری والدہ تہران کے ایک بڑے کالج میں اب بھی لیکچرار ہیں اور میرا بھائی وہیں ایک کمپنی میں گرافک ڈیزائننگ کرتا ہے۔"اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بات جاری رکھی: "جب میرے والد کا 'حادثہ' ہوا، اس وقت میں یونیورسٹی میں آئی ٹی کے آخری سمسٹر میں تھی۔ میرے والد صاحب کاظم کے نیٹ ورک کی اس کڑی تک پہنچ چکے تھے جہاں سے وہ سرحد پار پاکستان تک دہشت گردی کی فنڈنگ کر رہا تھا۔ کاظم کو جب خطرہ محسوس ہوا تو اس نے انہیں راستے سے ہٹا دیا اور شاید یہ سمجھا کہ ایک بیوہ پروفیسر اور ایک ڈیزائنر بیٹا اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی فائلوں میں چھپی وہ 'آئی ٹی کی طالبہ' ایک دن اس کی جڑوں میں بیٹھ جائے گی۔"

"تو تم نے یہاں جاب کیسے حاصل کی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔"میں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑی اور اپنی پہچان بدل کر یہاں مشہد آ گئی۔ میں نے یہاں ایک معمولی جعلی سی وی (CV) جمع کرائی جس میں خود کو زاہدان کی ایک غریب لڑکی ظاہر کیا جسے نوکری کی سخت ضرورت تھی۔ فیکٹری کے باہر کئی دن تک عام مزدوروں میں بیٹھ کر اس ٹھیکیدار کی منتیں کیں، یہاں تک کہ اس نے مجھے 'کم تنخواہ' پر صفائی کے لیے رکھ لیا۔رامین نے اپنی عینک درست کی اور گہری نظروں سے زکیہ کو دیکھتے ہوئے وہی سوال کیا جو ایک تجربہ کار صحافی کے ذہن میں کھٹک رہا تھا: "لیکن زکیہ، تم تو آئی ٹی کی ماہر ہو۔ تم چاہتیں تو کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں، کسی کلرک یا ڈیٹا انٹری آپریٹر کے طور پر بھی تو گھس سکتی تھیں؟ اس گرد آلود فیکٹری میں یہ صفائی والی کا بھیانک روپ ہی کیوں اپنایا؟"زکیہ نے ایک سرد آہ بھری اور میز پر بچھے قالین کے دھاگے کو اپنی انگلی سے سہلانے لگی۔ "رامین صاحب! کاظم کو ان لوگوں سے ڈر لگتا ہے جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں یا جن کے پاس کمپیوٹر کی ڈگری ہو۔ اگر میں آئی ٹی کے شعبے میں اپلائی کرتی تو وہ میری سات نسلوں کی جانچ پڑتال کرواتا، میرا پورا ریکارڈ کھنگالا جاتا اور میں پہلے ہی دن پکڑی جاتی۔"کاظم جیسے لوگ صفائی کرنے والوں کو 'انسان' نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے ہم صرف وہ سائے ہیں جو فرش صاف کرتے ہیں اور خالی کوڑے دان اٹھا کر چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے اپنی میز پر بیٹھ کر فون پر لاکھوں ڈالر کی ڈیل کرتا ہے، حساس فائلیں کھلی چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ یہ 'ان پڑھ لڑکی' جس کے ہاتھ میں جھاڑو ہے، اسے کچھ سمجھ نہیں آئے گا۔"میں اسی 'نادیدنی' (Invisibility) کا فائدہ اٹھاتی ہوں۔ جب میں اس کے کیبن میں جھاڑو لگا رہی ہوتی ہوں، تو میری آنکھیں ان فائلوں کو سکین کر رہی ہوتی ہیں جنہیں وہ تالوں میں بند رکھنا بھول جاتا ہے۔ میں نے آئی ٹی اس لیے پڑھی تھی کہ سافٹ ویئر ہیک کر سکوں، مگر میرے والد کے قتل نے مجھے سکھایا کہ انسانوں کو 'ہیک' کرنے کے لیے کبھی کبھی جھاڑو

بھی اٹھانا پڑتا ہے۔
میں نے اگلا سوال کیا کیا تمہارے گھر والوں کو تمہارے اس کام کے بارے میں پتہ ہے ؟
زکیہ کے لہجے میں اب ایک عجیب سی کاٹ تھی: "میری والدہ کو بخوبی علم ہے کہ میں یہاں کس حال میں رہ رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے دعا دے کر رخصت کیا تھا کہ 'بیٹی! اس درندے کے گھر میں جھاڑو اس طرح مارنا کہ اس کے تخت کی مٹی اکھڑ جائے'۔ ہم سب بہن بھائیوں کے سینے میں جو آگ لگی ہے، اسے بجھانے کے لیے میرا یہاں ہونا ضروری تھا۔
میری والدہ، میرا بھائی میری بہن اور میں نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا۔"اس نے اپنے کوٹ کی آستینوں پر جمی گرد کو جھاڑتے ہوئے کہا: "ہم نے طے کیا کہ ہم میں سے کوئی ایک کاظم کے اتنے قریب پہنچے گا جہاں اسے شک بھی نہ ہو۔ تو اس 'سانپ کے بل' میں ہاتھ ڈالنے کے لیے میرا انتخاب کیا گیا۔""کیوں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ کیونکہ کاظم میرے بھائی اور والدہ کو جانتا ہےاور میری بڑی بہن شادی شدہ ہےاس لیئے میرا انتخاب ہوا۔میں یہاں صرف کوڑا نہیں اٹھاتی، میں کاظم کے ہر قدم کی چاپ ریکارڈ کرتی ہوں۔"رامین نے قہوہ کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے تفتیشی انداز میں اگلا سوال کیا، "زکیہ! تمہیں اس فیکٹری میں یہ صفائی کا کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ بیت چکا ہے؟"زکیہ نے ایک لمبی سانس لی اور انگلیوں سے میز پر جمی دھول کو کریدنے لگی۔ "تقریباً چار مہینے ہو چکے ہیں رامین صاحب۔ ان چار مہینوں کا ایک ایک پل میں نے اس خوف میں گزارا ہے کہ کہیں میری اصل شناخت ظاہر نہ ہو جائے۔" رامین نے فوراً اگلا سوال داغا، "چار مہینے بہت ہوتے ہیں۔ کیا ان چار مہینوں میں تمہارے ہاتھ کوئی ٹھوس ثبوت لگا ہے؟ کوئی ایسی چیز جسے تم قانون کے سامنے پیش کر سکو یا جس سے کاظم کا گھیرا تنگ کیا جا سکے؟"زکیہ کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک کوئی اتنا ٹھوس ثبوت ہاتھ نہیں لگا جسے میں 'حتمی' کہہ سکوں۔ کچھ مبہم تصویریں ہیں جو میں نے صفائی کے دوران چھپ کر لی تھیں، مگر وہ اتنی طاقتور نہیں کہ کاظم جیسے مگرمچھ کو جال میں پھنسا سکیں۔ وہ بہت چالاک ہے، وہ اپنی بڑی ڈیلز اور حساس فائلیں صرف تب سامنے لاتا ہے جب اس کے سب سے معتمد لوگ پاس ہوں۔"بہت سی ایسی باتیں جو میں نے دروازوں کے پیچھے سنی ہیں، مگر ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اسی لیے میں خاموش تھی اور کسی ایسے موقع یا ایسے لوگوں کا انتظار کر رہی تھی جو اس ڈیجیٹل تالے کو توڑ سکیں جسے میں اکیلی نہیں کھول سکتی۔"
میں نے مداخلت کی، "یعنی تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تم نے اب تک پولیس یا انٹیلیجنس کو اس لیے رپورٹ نہیں کیا کہ تمہارے پاس ثابت کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے؟"زکیہ نے تلخی سے جواب دیا، "بالکل! اور دوسرا یہ کہ کاظم کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اگر میں کچے ثبوتوں کے ساتھ باہر نکلتی، تو کچھ ہونے سے پہلے میرا حال بھی وہی ہوتا جو میرے باپ کا ہوا تھا۔ میں صرف ایک 'رپورٹ' نہیں لکھنا چاہتی، میں اس پورے نیٹ ورک کو جڑ سے اکھڑتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"رامین نے اپنی بھنویں سکیڑیں اور ایک بہت ہی منطقی سوال داغ دیا: "زکیہ! ایک طرف تم کہہ رہی ہو کہ کاظم بے حد محتاط ہے

اور اپنی حساس فائلیں کسی کے سامنے نہیں لاتا، تو دوسری طرف تم یہ دعویٰ کر رہی ہو کہ تم نے اس کے کیبن میں ہمارا نام اور تصویریں دیکھ لیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا اس کے دفتر میں سیکیورٹی اور سی سی ٹی وی کیمرے نہیں ہیں؟" زکیہ نے قہوہ کا پیالہ میز پر رکھا اور ایک گہری سانس لی۔ "رامین صاحب! آپ کی بات درست ہے، وہاں قدم قدم پر کیمرے نصب ہیں اور ہر حرکت مانیٹر کی جاتی ہے۔ لیکن یہی تو میرا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ کاظم کا ایک اصول ہے کہ جب وہ دفتر میں نہ ہو، تو اس کے کمرے میں میرے علاوہ کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی— حتیٰ کہ اس کے خاص گارڈز کو بھی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک 'ان پڑھ صفائی والی' ان فائلوں کا کیا بگاڑ لے گی جو ہائی ٹیک کوڈز میں چھپی ہیں۔" اس نے اپنی آواز کو مزید دھیما کر لیا۔ کاظم کے کیبن تک پہنچنا جتنا ناممکن لگتا ہے، حقیقت میں اتنا ہی آسان بھی ہے۔ وہاں مسلح گارڈز کا پہرہ ہے، لیکن انسانی فطرت ایک عجیب چیز ہے۔ "میں پچھلے چار مہینوں سے روزانہ وہی نیلا ایپرن پہن کر، ہاتھ میں جھاڑو اور بالٹی لیے ان گارڈز کے سامنے سے گزرتی ہوں۔ پہلے چند ہفتوں میں انہوں نے میری تلاشی بھی لی اور مجھ پر نظر بھی رکھی، لیکن اب میں ان کے لیے فیکٹری کی دیواروں یا مشینوں کی طرح ایک 'عادت' بن چکی ہوں۔ جب وہ مجھے کیمرے میں روزانہ وہی کام کرتے دیکھتے ہیں، تو ان کی نظریں مجھ پر ٹھہرتی تو ہیں مگر دماغ الرٹ نہیں ہوتا جب میں وہاں جھاڑو لگا رہی ہوتی ہوں یا میز پر جمی دھول جھاڑنے کے لیے 'تاکی' (ڈسٹر) مارتی ہوں، تو کیمرے میں صرف ایک محنتی مزدور لڑکی نظر آتی ہے۔ میں صفائی کے بہانے میز پر پڑی فائلوں کو ہولے سے کھولتی ہوں، ایک نظر ڈالتی ہوں اور پھر فوراً بند کر دیتی ہوں۔ کیمرے کی فوٹیج دیکھنے والے کو لگتا ہے کہ میں صرف کاغذات ترتیب دے رہی ہوں۔"

اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "پرسوں جب کاظم ایک ہنگامی کال سنتے ہوئے باہر نکلا، تو وہ اپنی میز پر موجود وہ نیلی فائل بند کرنا بھول گیا۔ میں نے صفائی کے بہانے اس پر کپڑا مارتے ہوئے اسے کھولا اور وہیں پہلی بار آپ دونوں کے نام اور تصویریں دیکھیں۔ اگر میں کوئی آئی ٹی افسر بن کر وہاں جاتی تو کیمرے مجھ پر نظر رکھتے، مگر ایک 'بے نام سائے' کی طرح کام کرنے نے مجھے وہ رسائی دے دی ہے جو کسی بڑے سے بڑے جاسوس کے پاس بھی نہیں ہو سکتی۔" زکیہ کا لہجہ اب پر اعتماد ہو چکا تھا۔ "وہاں سیکیورٹی سخت ہے، مگر انسان کی اپنی 'فرعونیت' اکثر اسے اندھا کر دیتی ہے۔ کاظم کی یہی غلطی اسے لے ڈوبے گی۔" میں نے کہا سب کچھ ٹھیک ہے زکیہ، لیکن ایک آخری اور سب سے اہم سوال۔۔۔ ہم تم پر اعتبار کیوں کریں؟ تم نے ہمیں پہچان لیا، ہمیں یہاں بلایا اور اتنی تفصیلات بتا دیں، لیکن کیا پتہ یہ سب کاظم کا بچھایا ہوا ایک نیا جال ہو؟ کیا پتہ تم ہمیں کسی ایسی دلدل میں اتارنا چاہ رہی ہو جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو؟ اگر تم اس کی ایجنٹ ہو تو ہمارے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ زکیہ نے آہستہ سے سر اٹھایا اور براہِ راست ہماری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

"ذیشان صاحب! آپ کا شک کرنا حق بجانب ہے۔ آپ جس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں کسی پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں۔۔۔ اگر مجھے آپ کو پھنسوانا ہوتا یا میں کاظم کی

ایجنٹ ہوتی، تو مجھے اتنی لمبی چوڑی کہانی سنانے اور آپ کو اس قہوہ خانے میں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟"میں فیکٹری کے گیٹ پر کھڑے مسلح گارڈز کو صرف ایک اشارہ کرتی اور آپ دونوں اب تک اس کے عقوبت خانے میں لٹک رہے ہوتے۔ مجھے آپ کو 'پھنسانے' کے لیے کسی ڈرامے کی ضرورت نہیں تھی، آپ تو خود چل کر شکاری کے گھر کے اندر ملبہ اٹھا رہے تھے۔"

زکیہ نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے موبائل نکالا اور ایک پرانی، مڑی تڑی تصویر نکالی اور ہمارے سامنے کر دی "یہ میرے والد کی تصویر ہے، ان کی میت کی، جو ہسپتال کے مردہ خانے میں لی گئی تھی۔ کاظم نے اسے 'حادثہ' کہا تھا، لیکن ان کی گردن پر موجود وہ نشان چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ انہیں پہلے مارا گیا اور پھر گاڑی کے نیچے پھینکا گیا۔ میرا یقین یہ تصویر ہے، میرا درد میرا ثبوت ہے۔ میرا 'مفاد' وہ دولت نہیں جو کاظم دے سکتا ہے، میرا مفاد وہ سکون ہے جو اس کی تباہی سے میرے باپ کی روح کو ملے گا۔"زکیہ کا لہجہ اب جذباتی ہو چکا تھا مگر اس کی منطق فولادی تھی: ذیشان صاحب شک تو تب کیا جاتا ہے جب انسان کے پاس بچنے کے بہت سے راستے ہوں سچ تو یہ ہے کہ اس وقت آپ کے پاس مجھ پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ یا تو آپ مجھ پر بھروسہ کر کے اس سرور روم تک پہنچیں جہاں سے آپ کو وہ ثبوت ملیں گے جو پاکستان اور ایران کو بچا سکتے ہیں، یا پھر کل دوبارہ وہی بیلچہ اٹھا کر ملبہ صاف کریں اور انتظار کریں کہ کب کاظم کی نظریں آپ کے ماسک کے پیچھے چھپے اصل چہروں کو پہچان لیں۔"میں آپ کو وہ چابی دے رہی ہوں جو اس پنجرے کو کھول سکتی ہے، اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اسے 'جال' سمجھتے ہیں یا 'نجات' کا راستہ۔"میں نے تھوڑا پیچھے ہوتے ہوئے زکیہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا، میری نظروں میں اب بھی گہرا ارتداد تھا۔ "زکیہ! تمہاری باتیں منطقی تو ہیں، مگر کیا پتا یہی تمہاری اصل چال ہو چلو مان لیا کہ تم کاظم کی ایجنٹ نہیں ہو، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم سچی ہو۔ ہو سکتا ہے تم کسی تیسرے ہاتھ کا مہرہ ہو؟ کوئی اور گروہ یا کوئی اور ایجنسی جو کاظم کا تخت الٹنا چاہتی ہو اور تمہیں 'چارے' کے طور پر استعمال کر رہی ہو؟ تم ہمارے ذریعے اپنا کام نکلوانا چاہتی ہو اور جب ہم ثبوت نکال کر باہر آئیں، تو تم ہمیں بھی ختم کر دو اور ڈیٹا بھی لے اڑو۔ ہم ایک ایسی لڑکی پر اپنی زندگی کی بازی کیوں لگائیں جس کا اپنا کوئی ٹھوس وجود ہمارے سامنے نہیں ہے؟"زکیہ کے چہرے پر ایک ٹھہری ہوئی مسکراہٹ آئی، جیسے اسے اس سوال کی توقع پہلے سے تھی۔

"ذیشان صاحب! اگر مجھے آپ سے کچھ اگلوانا ہوتا یا آپ کو پکڑوانا ہوتا، یا کسی ایجنسی سے تعلق ہوتا تو اب تک قاضی آباد کی پولیس یہاں پہنچ چکی ہوتی۔آپ مجھ پر اس لیے اعتبار کریں گے، کیونکہ اگر میں غدار ہوتی تو اج رات ہونے والی اہم میٹنگ کا کبھی نہ بتاتی اور جب سکیورٹی چیکنگ والے گودام میں اتے تو اپ وہاں پھنس جاتےاگر میں کاظم کی وفادار ہوتی، تو میں آپ کو یہ کبھی نہ بتاتی کہ اس فائل میں آپ کے نام کے آگے 'صرف 48 گھنٹے' کا وقت لکھا ہوا ہے۔اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی یو ایس بی (USB) نکالی اور اسے میز پر رکھ دیا۔"اس میں وہ ادھوری آڈیو ریکارڈنگ ہے جس میں کاظم کا بندہ میرے والد کو دھمکا رہا ہے۔ اسے سن لیں، اگر میرے باپ کی وہ آخری چیخیں آپ کو یقین نہ

دلا سکیں تو کل صبح فیکٹری مت آیئے گا۔۔۔ کیونکہ پھر آپ کی موت کا ذمہ دار میں نہیں، آپ کا اپنا شک ہو گا۔" ذیشان صاحب، آپ کی شک کرنے کی عادت ہی آپ کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے، اور یہ اچھی بات ہے۔ لیکن اگر میں کسی 'تیسرے ہاتھ' کا مہرہ ہوتی، تو میرے پاس یہ ریکارڈنگ نہ ہوتی۔" اس نے یو ایس بی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: اسمیں ایک اور آڈیو فائل ہے جو میں نے اپنی جان پر کھیل کر ریکارڈ کی ہے۔ ایک شام جب کاظم اپنے دفتر میں کسی سے فون پر بات کر رہا تھا، میں نے صفائی کے بہانے دروازے کے باہر اپنے موبائل میں ریکاڈنگ کی جب وہ وہ اپنے ایک 'بھارتی ہینڈلر' سے کسی کے قتل کی 'فیس' مانگ رہا ہے ۔، اگر میں کسی اور کے لیے کام کر رہی ہوتی، تو میں یہ ریکارڈنگ کب کی انٹیلیجنس کو بیچ چکی ہوتی۔ میں یہ آپ کو اس لیے دے رہی ہوں کیونکہ آپ کے پاس وہ 'نیٹ ورک' ہے جو اس آواز کو بین الاقوامی سطح پر ثبوت کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔" یہ ریکارڈنگ میرا سب سے بڑا ثبوت بھی۔ اسے سن لیں، اگر میرے باپ کے قاتل کی آواز آپ کا دل نہ پگھلا سکے، تو کل صبح ہمیں بھول جایئے گا۔"

رامین نے بے چینگی سے کہا

سب کچھ ٹھیک ہے زکیہ، لیکن تم نے ہم پر اتنی آسانی سے بھروسہ کیسے کر لیا؟ ہم صحافی ضرور ہیں، لیکن اس خطرناک کھیل میں مہرے بدلے بھی جا سکتے ہیں۔ کیا پتا ہم یہ ڈیٹا لے کر کاظم سے ڈیل کر لیں؟ یا اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں اس کے حوالے کر دیں؟ تم نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی فائل دو اجنبیوں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ذرا بھی نہیں سوچا؟" زکیہ کے چہرے پر ایک تلخ اور پرسکون مسکراہٹ آئی۔ اس نے اپنے اسکارف کا کونہ درست کیا اور دھیمی مگر اٹل آواز میں جواب دیا:

"رامین صاحب! میں نے آپ پر بھروسہ 'آسانی' سے نہیں کیا، بلکہ بہت سخت حساب کتاب کے بعد کیا ہے۔ ایک شکاری جب جال بچھاتا ہے تو وہ خود اس جال کے اندر بیٹھ کر ملبہ نہیں اٹھاتا۔ اگر آپ کاظم کے آدمی ہوتے یا اس سے ڈیل کرنا چاہتے، تو آپ مشہد کی اس خاک آلود فیکٹری میں مزدور کا حلیہ اپنا کر اپنی کمر نہ تڑواتے۔ غدار ہمیشہ آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر سودے بازی کرتے ہیں، وہ آپ کی طرح جوتوں میں کنکریاں چھپا کر گرد نہیں پھانکتے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر میری طرف دیکھا۔ "اور ذیشان صاحب! جس انسان کا انٹرنیٹ پر کوئی ڈیٹا نہ ہو، آپ کی سوشل میڈیا آئی ڈی تو تھی، مگر اس کے پیچھے کوئی 'ڈیجیٹل فٹ پرنٹ' (Digital Footprint) نہیں تھا۔ پچھلے تین سالوں میں آپ کی کسی لوکیشن کا ریکارڈ نہیں تھا، آپ کی آئی پی (IP) ایڈریسز بار بار وی پی این (VPN) کے پیچھے چھپ رہے تھے، اور سب سے بڑی بات۔۔۔ آپ کی وہ تصویریں جو فیس بک پر تھیں، ان کے 'میٹا ڈیٹا' (Metadata) کو اس قدر صفائی سے صاف کیا گیا تھا کہ کوئی سافٹ ویئر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اصل میں کہاں لی گئی ہیں۔ ایک عام انسان اتنی محنت سے اپنی ڈیجیٹل پہچان کو 'انکرپٹ' (Encrypt) نہیں کرتا

صرف دو ہی صورتوں میں 'ایسا ہوتا ہے: یا تو وہ بہت بڑا مجرم ہے، یا پھر وہ کسی بہت ہی خفیہ اور مقدس مشن پر ہے۔ آپ کی یہی 'صفائی' میرے لیے سب سے بڑا ثبوت بن گئی کہ آپ اس وقت ایک ایسے مشن پر ہیں جہاں آپ کی اصل

پہچان ہی آپ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔"آپ کی آنکھوں میں موجود وہ بے چینی اور رامین صاحب کا اصفہان سے یہاں تک کا سفر مجھے بتا رہا تھا کہ آپ کا مقصد وہی ہے جو میرا ہے۔"
زکیہ نے میز پر ہاتھ رکھ کر لہجے میں مزید وزن پیدا کیا: "سچی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس بھی اب کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ میں اکیلی اس ہاتھی کو نہیں گرا سکتی تھی، مجھے ان ہاتھوں کی ضرورت تھی جو ہتھیار چلانا بھی جانتے ہوں اور قلم بھی۔ اگر آپ مجھے دھوکہ دیں گے، تو آپ صرف مجھے نہیں بلکہ اس آخری امید کو دھوکہ دیں گے جو اس خطے کو ایک بڑی جنگ سے بچا سکتی ہے۔ میرا جوا آپ پر نہیں، آپ کے اس کردار پر ہے جو آپ کو یہاں تک کھینچ لایا ہے۔"رامین نے ایک آخری، تیکھا سوال زکیہ کے سے کیا: " تمہاری سب باتیں ٹھیک، مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم کاظم کے ہی خاص بندے ہوں؟ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں مزدور بنا کر اس لیے بھیجا ہو کہ وہ فیکٹری کے اندر چھپے ہوئے 'غداروں' (جیسے کہ تم) کو پکڑنا چاہتا ہو؟ ہم غدار ڈھونڈنے والے شکاری بھی تو ہو سکتے ہیں؟ تم نے یہ جوا کیسے کھیل لیا؟"زکیہ اس کی آنکھوں میں اب کوئی خوف نہیں تھا، بلکہ ایک سرد فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی فون سے ایک چھوٹا سا فولڈر نکالا اور اسے ہمارے سامنے کر دیا"رامین صاحب! کاظم کے شکاری 'گوگل سرچ' اور 'ڈیجیٹل ہسٹری' سے پاک نہیں ہوتے،" اس نے بہت دھیمی مگر کاٹ دار آواز میں کہا۔ "اگر آپ کاظم کے آدمی ہوتے، تو آپ کے موبائل کا 'آئی پی ایڈریس' (IP Address) گزشتہ دو دن سے ان ویب سائٹس اور انکرپٹڈ فورمز کو ہیک کرنے کی کوشش نہ کر رہا ہوتا جن کا تعلق کاظم کے بھارتی ہینڈلرز سے ہے۔ دوسری بات "کاظم اپنے غداروں کو ڈھونڈنے کے لیے اصفہان کے کسی نامور صحافی کو مزدور بنا کر ملبہ اٹھانے نہیں بھیجے گا۔ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ ایک کال پر پوری فورس بلا سکتا ہے

میں اور رامین ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو گئے۔ رامین کا ہاتھ لرز کر پیالے سے ٹکرایا۔
زکیہ نے بات جاری رکھی: "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آئی ٹی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ جس دن آپ فیکٹری میں داخل ہوئے، میں نے اسی رات اس وائی فائی نیٹ ورک کا ڈیٹا اسکین کیا تھا جو آپ کے موبائل سے جڑا تھا۔ کاظم کے وفادار کبھی اپنے ہی مالک کے خلاف ثبوت نہیں ڈھونڈتے۔ وہ ان فائلوں کو ڈیلیٹ کرتے ہیں، انہیں ڈیکوڈ (Decode) کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔"اس نے ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں دیکھا، اس کا لہجہ اب برف کی طرح ٹھنڈا تھا: "اور دوسری بات ذیشان صاحب۔۔۔ کاظم کے شکاری سوٹ پہن کر مہنگی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ آپ کی واسکٹ پر لگی وہ مٹی اصلی ہے، وہ کسی ڈرامے کا حصہ نہیں ہو سکتی۔ میں نے آپ کے ہاتھوں کے چھالے دیکھے ہیں، وہ قلم پکڑنے والوں کے ہاتھوں پر تبھی آتے ہیں جب وہ کسی بہت بڑے مقصد کے لیے بیلچہ اٹھاتے ہیں۔ میرا بھروسہ آپ کی باتوں پر نہیں، آپ کی اس 'مجبوری' پر ہے جو آپ کو تہران سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ آپ کے پاس کھونے کے لیے اب کچھ نہیں بچا، اور جس کے پاس کھونے کو کچھ نہ ہو، وہ کاظم کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے ہم لاجواب ہو چکے تھے۔ زکیہ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ صرف ایک جذباتی لڑکی نہیں بلکہ ایک ایسی سائبر واریئر ہے جس نے ہمیں ملنے سے پہلے ہی 'اسکین'

کر لیا تھا۔زکیہ کی آنکھوں میں موجود سچائی اور اس کے باپ کی وہ کربناک تصویر دیکھ کر میرا اور رامین کا شک پگھلنے لگا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے وہ یو ایس بی میز سے اٹھالی۔ رامین نے اپنے موبائل سے زکیہ کے والد کی اس تصویر کی کاپی بنالی، جو مستقبل میں کاظم کے خلاف ایک بڑا ثبوت ثابت ہونے والی تھی۔اب زکیہ کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ "رامین صاحب کے بارے میں تو میں سب جانتی ہوں، مگر ذیشان صاحب۔۔۔ اب تو بتا دیں کہ آپ کا اصل تعلق کہاں سے ہے؟"

میں نے ایک لمحہ تامل کیا، پھر دھیمی مگر سنجیدہ آواز میں جواب دیا: "زکیہ! فی الحال اتنا جاننا کافی ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں اور رامین کے ساتھ ایک مشترکہ مشن پر یہاں آیا ہوں۔ ہم دونوں صحافت اور تحقیق کے نام پر ان نیٹ ورکس کو بے نقاب کر رہے ہیں جو سرحد کے دونوں پار معصوم لوگوں کا خون بہا رہے ہیں۔میرا مختصر مگر نپا تلا تعارف سن کر زکیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے شاید پہلے ہی اندازہ تھا، مگر میری زبان سے 'پاکستانی' ہونے کی تصدیق نے اسے ایک عجیب سا حوصلہ دیا۔پھر میں نے اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں پوچھا، "زکیہ! اب تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں مشہد میں کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟ کیا تم فیکٹری کے اندر ہی رہتی ہو یا باہر کہیں تمہارا ٹھکانہ ہے؟"

زکیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، فیکٹری کے اندر رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میں نے قاضی آباد کے اسی صنعتی علاقے کے قریب ایک لیڈیز ہاسٹل میں کمرہ لیا ہوا ہے۔ وہاں بہت سی دوسری خواتین بھی رہتی ہیں جو مختلف فیکٹریوں میں کام کرتی ہیں، اس لیے وہاں کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوتا۔ میں وہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں اکیلی رہتی ہوں، جہاں میرا لیپ ٹاپ اور والد کی وہ ادھوری فائلیں محفوظ ہیں۔"ذیشان صاحب! اپنا نمبر بتایئے، میں آپ کو ایک میسج کرتی ہوں جس میں میرے ہاسٹل کا پتہ اور میری لوکیشن ہوگی۔"میں نے اپنا نمبر اسے لکھوایا۔ زکیہ کی انگلیاں تیزی سے اسکرین پر چلیں اور اگلے ہی لمحے میرے موبائل کی اسکرین روشن ہوگئی۔ اس نے مجھے ایک انکرپٹڈ میسج (Encrypted Message) بھیجا تھا جس میں قاضی آباد کے ایک ورکنگ ویمن ہاسٹل کا پتہ درج تھا۔ اس نے میرا نمبر بھی اپنے پاس محفوظ کر لیا۔"میں نے آپ کو تمام تفصیلات بھیج دی ہیں،" زکیہ نے موبائل دوبارہ جیب میں ڈالتے ہوئے سرگوشی کی۔ "لیکن یاد رہے، اس نمبر پر صرف انتہائی ہنگامی صورتحال میں ہی رابطہ کرنا ہے۔ ہم کال پر بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے کیونکہ کاظم کے پاس کال ٹریس کرنے اور آواز پہچاننے والے جدید ترین سافٹ ویئر موجود ہیں۔ میرا یہ نمبر بھی صرف اس مشن کے لیے ہے، جسے میں کسی بھی وقت ضائع کر سکتی ہوں۔"رامین نے سر ہلا کر تصدیق کی کہ ہم احتیاط برتیں گے۔ زکیہ! اب بے چین ہونا چھوڑ دو۔ میں نے کہا

تم نے اپنا کام کر دیا ہے، اب باری ہماری ہے۔ یہ یو ایس بی (USB) اب صرف ایک فائل نہیں، بلکہ تمہارے باپ کے خون کا قرض ہے جو ہمیں چکانا ہے۔ ہم تمہیں اور تمہارے اس بھروسے کو کبھی مایوس نہیں کریں گے۔ اب تم اکیلی نہیں ہو، ہم اس جال کے آخری سرے تک تمہارے ساتھ ہیں۔"

رامین نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ "فکر نہ کرو ایک صحافی جب اپنی آئی ڈی (ID) اور قلم چھوڑ کر بیلچہ اٹھالے، تو

وہ دشمن کو مٹانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ کل کا سورج کاظم کے لیے ایک نیا پیغام لے کر طلوع ہو گا۔"زکیہ کے لبوں پر ایک ہلکی سی، مگر پر اعتماد مسکراہٹ آئی۔ اس نے "شکریہ" کے انداز میں اپنا سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود وہ سالوں کی پیاس جیسے لمحہ بھر کو شانت ہو گئی۔

"اب آپ لوگ یہاں سے نکلیں اور اس یو ایس بی کو سنیں،" ۔ لکل صبح فیکٹری میں اسی ملبے والے مقام پر ملاقات ہو گی۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو،وہ اپنی چادر درست کرتی ہوئی اٹھی اور لکڑی کے تختوں کے درمیان بنے راستے سے ہوتی ہوئی صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ریستوران کے ہجوم میں ایک عام طالبہ کی طرح گھل مل گئی اور چند لمحوں میں باہر کی اندھیری گلی میں اوجھل ہو گئی۔ہم بھی چند منٹ وہیں بیٹھے رہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ پھر میں نے رامین کو اشارہ کیا اور ہم الگ الگ راستوں سے اپنے مسافر خانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ مشہد کی رات اب پہلے سے کہیں زیادہ پر اسرار لگ رہی تھی، جبکہ میرے موبائل میں موجود وہ 'میسج' کسی ٹائم بم کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

راستے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی، بس دبی دبی قدموں کی چاپ تھی اور ذہن میں زکیہ کے کہے ہوئے وہ جملے گردش کر رہے تھے۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی رامین نے کنڈی چڑھائی اور میں نے کھڑکی کے پردے برابر کر دیے۔ اب وقت تھا اس امانت کو کھولنے کا جو زکیہ نے اپنی جان پر کھیل کر حاصل کی تھی۔ ہم نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور وہ نیلی یو ایس بی(USB) اس میں لگا دی۔ چند لمحے کی پروسیسنگ کے بعد جب فائل کھلی تو کمرے میں ایک بھاری سی خاموشی چھا گئی ریکارڈنگ سننے کے بعد رامین اور میں ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ زکیہ سچ کہہ رہی تھی۔ کاظم صرف ایک سمگلر نہیں، ایک دہشت گرد نیٹ ورک کا سرغنہ تھا جو ہمارے ملک کے امن کو آگ لگانے والا تھا۔ ہم نے فوراً ڈیٹا ڈی کوڈ (Decode) کیا اور اسے ایک محفوظ کلاؤڈ سرور پر اپ لوڈ کر دیا تاکہ اگر ہمیں کچھ ہو بھی جائے تو یہ ثبوت ضائع نہ ہوں۔"ذیشان، اب کل کا دن فیصلہ کن ہے،" رامین نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے لائٹ آف کی اور اپنے اپنے بستروں پر ڈھیر ہو گئے۔ جسم تھکن سے چور تھا اور ذہن بوجھل، مگر جیسے ہی آنکھیں موندیں، بے خبری کی ایسی نیند نے آ لیا کہ پھر ہوش ہی نہ رہا۔مشہد کی فجر کا ٹھنڈا جھونکا جب کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا تو میری آنکھ خود بخود کھل گئی۔ رامین بھی بیدار ہو چکا تھا۔ ہم نے وضو کیا اور اس چھوٹے سے مسافر خانے کے کمرے میں ہی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد کچھ دیر سجدے میں رہا—— ذہن میں زکیہ کی باتیں گردش کر رہی تھیں، دل میں وہ USB کا بوجھ تھا جو اب ہمارے کلاؤڈ سرور پر محفوظ تھا۔ناشتے میں وہی نان اور پنیر—— مسافر خانے کے چھوٹے سے دالان میں بیٹھ کر ہم نے چائے کے گھونٹ لیے۔ باہر سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی، کوئی ایرانی نیوز چینل چل رہا تھا۔ خبریں سن کر دل بھاری ہو گیا—— اسرائیلی وزیراعظم نے اقوامِ متحدہ میں صاف کہہ دیا تھا کہ ایران کا ایٹمی پروگرام ناقابلِ قبول ہے۔

رامین نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور آہستہ کہا: "ذیشان، ہمارے پاس وقت کم ہے۔ جب بڑی جنگ چھڑی تو مشہد میں رہنا ممکن نہیں رہے گا۔" میں نے سر ہلایا۔ "آج فیکٹری میں جانا ضروری ہے — لیکن آج ہمارا مقصد صرف آنکھیں کھلی رکھنا ہے۔ کاظم کے دفتر کے ارد گرد کا نقشہ ذہن میں پختہ کرنا ہے۔"

ہم نے وہی میلی واسکٹیں پہنیں، چہروں پر گرد ملی اور دوبارہ قاضی آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ 'سنگِ آریا' کے گیٹ پر آج کچھ مختلف تھا۔ وہی مسلح گارڈ تھا، لیکن اس کے ساتھ ایک اور نیا چہرہ کھڑا تھا — سیاہ جیکٹ، تیز نظریں اور کان میں ایک باریک سا وائرلیس سیٹ۔ رامین نے اطمینان سے ٹوکن دیا۔ اس نئے آدمی نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھا — ایک ایسی نگاہ جو صرف مزدور نہیں دیکھ رہی تھی، کچھ اور پرکھ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رک گئی، لیکن میں نے چہرے پر تھکان کا وہی تاثر برقرار رکھا جو ایک مزدور کا ہونا چاہیے۔

"اندر جاؤ۔" اس نے مختصراً کہا۔ ٹھیکیدار نے آج ہمیں ایک نئی جگہ کام دیا — آفس بلاک کے سامنے والے حصے میں پتھروں کی صفائی۔ یہ جگہ کل سے کہیں بہتر تھی — یہاں سے کاظم کے دفتر کا مرکزی دروازہ صاف نظر آتا تھا۔ ہم اس مقام پر پہنچے اور بیلچے اٹھا لیے۔ گرد و غبار اڑ رہا تھا، لیکن ہماری نظریں مسلسل اس برآمدے کو ڈھونڈ رہی تھیں جہاں زکیہ کو ہونا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد، وہ نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھا، مگر اس کی چال میں آج ایک عجیب سی تیزی تھی۔ وہ صفائی کرتے ہوئے ہمارے اتنے قریب آئی کہ اس کے جوتوں کی رگڑ ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ اس نے سر جھکائے جھکائے دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا: "آج کاظم نہیں آئے گا۔ لیکن ان کے ایک قریبی پارٹنر فرید کا آج یہاں چکر لگنے والا ہے — معائنے کے لیے۔ اور کوئی مال بھی آنے والا ہے آج۔"

بس اتنا کہا اور آگے بڑھ گئی۔

رامین نے میری طرف دیکھا — ہم دونوں نے بغیر کچھ کہے سمجھ لیا کہ آج کا دن مختلف ہوگا۔ کاظم کی غیر حاضری میں فیکٹری کا ماحول تھوڑا سست لگ رہا تھا، لیکن اس نئے آدمی کی موجودگی نے ایک اور قسم کا دباؤ پیدا کر دیا تھا۔ دوپہر کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ رامین نے بیلچہ چلاتے ہوئے آہستہ کہا: "ذیشان امریکی وزیرِ خارجہ کا بیان، اسرائیلی طیاروں کی اڑانیں — ایران کے نوجوان سڑکوں پر ہیں، مذہبی اور سیکولر آپس میں لڑ رہے ہیں — یہ سب خود سے نہیں ہو رہا۔ کسی نے بہت سوچ سمجھ کر یہ آگ لگائی ہے۔" میں نے ایک لمبی سانس لی اور کہا: "سعودی عرب؟ ترکی؟ کوئی ساتھ نہیں دے رہا۔ شام میں ایرانی فوج کا کردار — وہاں کے لوگوں کے دلوں میں جو زخم ہے، وہ ابھی تازہ ہے۔ دشمن نے یہ حساب بڑی چالاکی سے کیا ہے — پہلے مسلمانوں کو آپس میں لڑاؤ، پھر کمزور پڑنے پر وار کرو۔" سورج اب سر پر آ چکا تھا۔ ہم صبح سے لگاتار کام کر رہے تھے — پتھر اٹھاؤ، ٹرالی میں ڈالو، دھکیلو، واپس آؤ۔ یہی چکر بار بار۔ سنگِ مرمر کے یہ بھاری بھرکم ٹکڑے اٹھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پاس ہی چند مقامی مزدور اپنے اپنے کام میں لگے تھے۔ ایک بوڑھا مزدور بڑی مشین کے پاس کھڑا پتھر کی کٹائی دیکھ رہا تھا — اس کے بالوں پر سفید گرد جمی تھی اور آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔ دو نوجوان لڑکے بڑے بڑے سنگِ مرمر کے بلاکس کو رسیوں سے باندھ رہے تھے، ان کے

بازوؤں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور پسینہ گردن سے بہتا ہوا کالر میں اترتا جا رہا تھا۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا، کوئی بحث نہیں، کوئی شکایت نہیں — بس کام۔ یہی ان کی زندگی تھی اور یہی ان کا دن۔

میں نے بیلچہ ایک طرف ٹکایا اور پانی کی بوتل اٹھائی۔ پانی حلق سے اترا تو جسم کو تھوڑی راحت ملی۔ رامین بھی میرے پاس آ گیا۔ اس کی واسکٹ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔

"ذیشان،" اس نے آہستہ کہا، "وہ دیکھو — گودام کے پچھلے دروازے پر آج نیا تالہ لگا ہوا ہے۔ کل یہ کھلا تھا۔" میں نے نظر اٹھائی — واقعی کچھ بدلا ہوا تھا۔ گودام کے پچھلی طرف دو گارڈ بھی تعینات تھے جو کل نہیں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور نظریں مسلسل ادھر ادھر گھومتی رہتی تھیں۔ ہم نے خاموشی سے پانی پیا اور دوبارہ کام شروع کر دیا۔ ملبہ اٹھاتے اٹھاتے میں ادھر ادھر چکر لگاتا رہا — کون سا دروازہ کہاں جاتا ہے، کیمرے کس کس زاویے پر نصب ہیں، گارڈ کا چکر کتنے منٹ میں مکمل ہوتا ہے۔ یہ سب میں ذہن کے کینوس پر نقش کر رہا تھا۔

آفس بلاک کے اندر سے کمپیوٹرز کی نیلی روشنی اب بھی جھانک رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی اہلکار فائلیں اٹھائے تیزی سے اندر باہر ہوتا — نہ دائیں دیکھتا، نہ بائیں، بس اپنے کام میں مگن۔ ٹھیک بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب مرکزی گیٹ پر ایک سیاہ گاڑی آ کر رکی۔ ڈرائیور نے فوری طور پر اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔

ایک درمیانی عمر کا شخص باہر نکلا — صاف ستھرا گہرے نیلے رنگ کا کوٹ، پاؤں میں چمکتے جوتے اور چہرے پر وہ تاثر جو اس شخص کا ہوتا ہے جو ہر چیز اپنی شرائط پر کرتا ہو۔ یہ فرید تھا۔ میں نے سر جھکائے رکھا اور ملبہ اٹھاتا رہا۔ فرید نے گیٹ پر کھڑے گارڈ سے مختصر بات کی اور پھر رک گیا۔ اس کی نظریں فیکٹری کے اندر گھومنے لگیں مشینوں پر، مزدوروں پر، گوداموں پر۔ وہ کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو بس دیکھنے آیا ہو — اس کی آنکھوں میں ایک حساب تھا۔ فیکٹری کے اندر کا منظر ہمیشہ کی طرح اپنی پوری آب و تاب سے جاری تھا۔ بڑی بڑی آریاں سنگِ مرمر کے بھاری بلاکس کو چیر رہی تھیں — ایک لمبی چیختی ہوئی آواز کے ساتھ جو کانوں میں سوئی کی طرح چبھتی تھی۔ کٹے ہوئے پتھر کی باریک سفید گرد ہوا میں تیرتی رہتی اور سانس کے ساتھ اندر جاتی۔ مزدور اپنے منہ پر کپڑے لپیٹے کام کر رہے تھے۔ ایک طرف بڑے بڑے کچے بلاکس کرین کے ذریعے اٹھائے جا رہے تھے — ہر بلاک اتنا بھاری کہ زمین پر رکھتے وقت دھمک محسوس ہوتی۔

دوسری طرف پالش مشینیں کٹے ہوئے پتھروں کو چمکا رہی تھیں — کھردرا پتھر مشین میں جاتا اور دوسری طرف سے آئینے کی طرح چمکتی سلیب نکلتی۔ پانی کی موٹی دھاریں مسلسل پتھروں پر بہتی رہتی تھیں تاکہ مشینیں ٹھنڈی رہیں۔

گودام کے ایک کونے میں تیار مال ترتیب سے رکھا ہوا تھا — سفید، سیاہ اور سبز رنگ کی سنگِ مرمر کی سلیبیں، ہر ایک پر چاک سے نمبر لکھے ہوئے۔ ایک مزدور ہر سلیب کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا اور دوسرا رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔

فرید نے یہ سب دیکھا — لیکن اس کی نظریں مزدوروں پر زیادہ دیر نہیں ٹھہریں۔ جیسے ہم اس کے لیے مشینری کا حصہ تھے، انسان نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ آئے آدمی سے کچھ کہا، وہ آدمی تیزی سے آفس بلاک کی طرف گیا اور چند لمحوں بعد ٹھیکیدار باہر نکل آیا — ہاتھ میں رجسٹر تھامے، چہرے پر وہ مسکراہٹ جو صرف بڑے آدمی کے سامنے آتی ہے۔

دونوں نے مختصر بات کی، رجسٹر پر کچھ دیکھا اور پھر فرید سیدھا آفس بلاک کے اندر چلا گیا۔میں اور رامین خاموشی سے ملبہ اٹھاتے رہے — لیکن ہماری آنکھیں ہر حرکت ریکارڈ کر رہی تھیں۔ تقریباً دو گھنٹے بعد آفس بلاک کا دروازہ کھلا اور فرید باہر نکلا۔ اب اس کے چہرے پر پہلے والا تکبر نہیں تھا — ایک سنجیدگی تھی، جیسے کوئی اہم فیصلہ ہو چکا ہو۔ اس نے ٹھیکیدار کو ایک نظر دیکھا، مختصر سا اشارہ کیا اور سیدھا گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ نہ کسی سے بات، نہ کوئی ہدایت — بس خاموشی سے گاڑی میں بیٹھا اور گیٹ سے نکل گیا۔میں نے رامین کو آہستہ سے کہا: "آیا، دیکھا اور چلا گیا — جیسے کوئی چیز چیک کرنے آیا ہو۔"

رامین نے سر ہلایا لیکن کچھ نہیں بولا۔وقت آگے سرکتا رہا۔ فیکٹری کا شور جاری رہا — مشینوں کی گھرگھراہٹ، پتھروں کی کھنکھناہٹ، مزدوروں کی دبی دبی باتیں۔ ہم کام کرتے رہے۔پھر شام پانچ بجے کے قریب سیٹی بجی۔

مزدوروں نے اپنے اوزار رکھے، کپڑے جھاڑے اور قطار میں لگ گئے۔ ہم بھی ان کے ساتھ ٹھیکیدار کے پاس پہنچے — اس نے رجسٹر پر نشان لگایا اور دیہاڑی دی۔اسی دوران زکیہ صفائی کا سامان اٹھائے برآمدے سے نکلی۔ ہم اس کے قریب سے گزرے — اس نے ایک لمحے کے لیے ہماری طرف دیکھا، بس اتنا کہا: "ٹھیک ہے۔" اور آگے بڑھ گئی۔وہ باقی مزدوروں کے ساتھ گیٹ سے نکل گئی۔میں نے رامین کو دیکھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔

ہم ٹھیکیدار کے پاس واپس گئے۔ رامین نے کہا: "آغا، آج رات ادھر ہی رہنا چاہتے ہیں — کل صبح جلدی کام شروع کریں گے۔" ٹھیکیدار نے ایک لمحہ سوچا، پھر پاس کھڑے ایک مزدور کو اشارہ کیا۔ "حسین، ان کو وہ کمرہ دکھا دو۔" حسین ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر آدمی تھا — چہرے پر گرد کی پرت اور آنکھوں میں مستقل تھکان۔ وہ ہمیں گودام کے پیچھے لے گیا، ایک تنگ راہداری سے گزرے اور ایک چھوٹے سے کمرے کے سامنے رک گیا۔"یہاں رہتے ہیں ہم لوگ،" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔کمرے میں چار چارپائیاں تھیں — دو پہلے سے بچھی ہوئیں، دو خالی۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانی الماری تھی جس کا ایک دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔اوپر ایک مدھم بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں کمرے کے کونے ڈھنگ سے نظر نہیں آتے تھے۔ سیمنٹ کی بو اور پتھر کی گرد — یہی اس کمرے کی پہچان تھی۔ حسین کمرہ دکھا کر چلا گیا۔

ہم دونوں چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں خاموشی تھی — باہر سے فیکٹری کی مشینوں کی دھیمی گھرگھراہٹ آ رہی تھی جو ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور دو مزدور اندر آئے — وہی جو یہاں رہتے تھے۔ دونوں تھکے ہوئے تھے، چہروں پر گرد اور آنکھوں میں نیند۔ انہوں نے ہمیں دیکھا، مختصر سا سلام کیا اور اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔رامین نے فارسی میں پوچھا: "آج کا کھانا کہاں سے ملے گا؟" پہلے مزدور نے سر اٹھایا: "کنٹین میں — گودام کے بائیں طرف۔ رات دس بجے تک کھلی رہتی ہے۔" ہم اٹھے اور کنٹین کی طرف چلے گئے۔

کنٹین ایک لمبا سا کمرہ تھا جس میں لوہے کی میزیں اور بنچ لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں بڑا سا پتیلا چولہے پر چڑھا ہوا تھا

جس میں دال پک رہی تھی — اس کی بھاپ پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ساتھ میں ایک ٹوکری میں نان رکھے تھے۔ ایک موٹا سا باورچی بڑے کرچھے سے دال پلیٹوں میں ڈال رہا تھا۔ ہم نے بھی پلیٹیں لیں اور ایک کونے کی میز پر بیٹھ گئے۔ کھانا سادہ تھا لیکن دن بھر کی مشقت کے بعد ہر لقمہ قیمتی لگ رہا تھا۔ آس پاس کچھ اور مزدور بھی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے — کوئی خاموشی سے، کوئی آپس میں دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے۔ ہم نے بھی ان سے تھوڑی گپ شپ لگائی — کہاں سے آئے ہو، کتنے عرصے سے یہاں ہو، گھر کب جاؤ گے۔ عام مزدوروں کی عام باتیں۔ ایک نے بتایا کہ وہ بلوچستان کی سرحد کے قریب کے گاؤں سے ہے، دوسرے نے کہا کہ وہ چھ مہینے سے یہاں ہے اور ابھی تک گھر نہیں گیا۔ ان کے چہروں پر نہ کوئی شکایت تھی، نہ کوئی سوال — بس زندگی تھی جو چل رہی تھی۔

کھانے کے بعد ہم واپس کمرے میں آ گئے۔ وہ دونوں مزدور بھی کچھ دیر بعد آ گئے اور اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک کا نام علی تھا — تبریز کے قریب کے کسی گاؤں سے تھا، پچھلے دو سال سے یہاں کام کر رہا تھا۔ دوسرے کا نام مہدی تھا — کم بولنے والا، لیکن جب بولتا تو سیدھی بات کرتا علی نے پہلے بات شروع کی: "تم لوگ پہلی بار یہاں رکے ہو؟""ہاں،" رامین نے کہا۔ "مسافر خانے کا کرایہ بچانا تھا۔" علی نے ہنستے ہوئے سر ہلایا۔ "سمجھ آتی ہے — یہاں کی دیہاڑی اتنی بھی نہیں کہ کرایہ بھی بھرو اور گھر بھی بھیجو۔""دیہاڑی کم ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔"کیا بتاؤں،" علی نے ایک لمبی سانس لی۔ "پہلے ٹھیکیدار نے کہا تھا مہینے کے اتنے ملیں گے — لیکن پھر کہتا ہے کاٹ لیا، وہ کاٹ لیا۔ آخر میں ہاتھ میں آتا کیا ہے؟"

مہدی نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا: "چھوڑو یہ باتیں — یہاں سب یہی سوچتے ہیں لیکن کوئی کچھ نہیں کرتا۔"

باتیں آگے بڑھتی رہیں — کام کی مشکلات، ٹھیکیدار کا رویہ، گھر والوں کی یاد۔ علی نے بتایا کہ اس کے تین بچے ہیں اور بیوی اکیلے گھر سنبھالتی ہے۔ "ہر مہینے پیسے بھیجتا ہوں — جتنے بچتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں واپس چلا جاؤں، لیکن پھر سوچتا ہوں وہاں کیا کروں گا؟" تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر علی نے موبائل نکالا اور کہا: "یہ دیکھو — تہران میں پھر فساد ہو گیا ہے۔"اس نے سکرین ہماری طرف کی — ایک ویڈیو چل رہی تھی جس میں نوجوان سڑکوں پر تھے، دھواں اٹھ رہا تھا۔"یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟" رامین نے پوچھا — جیسے ایک عام آدمی پوچھتا ہے۔ علی نے کندھے اچکائے: "پتہ نہیں۔ کوئی کہتا ہے حکومت غلط ہے، کوئی کہتا ہے باہر والے بھڑکا رہے ہیں۔ ہم غریب لوگوں کو کیا پتہ؟ ہم تو بس کام کرتے ہیں۔"مہدی نے سر کھجاتے ہوئے کہا: "جنگ ہوئی تو سب سے پہلے ہم مریں گے — امیر لوگ تو بچ نکلیں گے۔"وقت گزرتا رہا۔ علی اور مہدی کی باتیں دھیمی پڑتی گئیں۔ نو بجے کے قریب علی نے جمائی لی اور کہا: "یار، ہم تو سوتے ہیں — صبح چھ بجے اٹھنا ہے۔"مہدی پہلے ہی لیٹ چکا تھا۔ میں نے رامین کو دیکھا اور کہا: "یار، مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے — کنٹین ابھی کھلی ہوگی؟"

رامین نے کندھے اچکائے: "چلو دیکھتے ہیں۔"ہم آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔

رات کو فیکٹری کا ماحول دن سے بالکل مختلف تھا — لیکن بند نہیں تھی۔ یہ فیکٹری چوبیس گھنٹے چلتی تھی، بس رات کو

رفتار کم ہو جاتی تھی۔
دن میں جو بڑی آریاں پورے زور سے چل رہی تھیں، اب ان میں سے صرف ایک چل رہی تھی — اس کی آواز دن کے مقابلے میں رات کی خاموشی میں زیادہ دور تک جا رہی تھی۔ گودام کے اندر دو مزدور بڑے بڑے کچے بلاکس کو رسیوں سے باندھ رہے تھے — صبح کی لوڈنگ سے پہلے تیاری ہو رہی تھی۔ ہر بلاک اتنا بھاری تھا کہ دو آدمی مل کر بھی اسے ہلا نہیں سکتے تھے صرف کرین یا فورک لفٹ ہی کام آتی تھی۔ رسیاں مضبوطی سے باندھی جا رہی تھیں، ہر گرہ کو بار بار جانچا جا رہا تھا۔
ایک کونے میں تیار مال کی قطاریں لگی ہوئی تھیں — سفید، سیاہ اور سبز رنگ کی چمکتی ہوئی سلیبیں۔ رات کی روشنی میں وہ اور بھی چمکتی تھیں۔ ہر سلیب پر چاک سے نمبر لکھے ہوئے تھے اور کونے میں ایک رجسٹر رکھا تھا جس میں ہر سلیب کا حساب درج تھا۔ فورک لفٹ آہستہ آہستہ گودام کے اندر گھوم رہی تھی — ایک جگہ سے سلیب اٹھاتی، دوسری جگہ رکھتی۔ اس کی روشنی کبھی اِدھر پڑتی، کبھی اُدھر۔ ہم گودام کے کنارے کنارے چلتے رہے — بالکل اطمینان سے، جیسے دو مزدور رات کو بس ٹہلنے نکلے ہوں۔ گارڈز تین تھے — دن کے مقابلے میں ایک زیادہ۔ گیٹ کے پاس والا گارڈ کبھی کبھی اپنی جگہ ہلتا اور چاروں طرف نظر دوڑاتا۔ گودام کے سامنے والا بالکل ساکت کھڑا تھا — رائفل سینے کے سامنے، آنکھیں مسلسل گھومتی ہوئیں۔ آفس بلاک کے دروازے پر تیسرا گارڈ ہر دس پندرہ منٹ بعد ایک چھوٹا سا چکر لگاتا اور واپس اپنی جگہ آ جاتا۔ میں نے ان کی حرکات ذہن میں نقش کر لیں — کون کب کہاں ہوتا ہے، کس وقت کہاں سے گزرنا ممکن ہے۔ آفس بلاک کی ایک کھڑکی میں روشنی ابھی بھی جل رہی تھی۔ اندر سے کمپیوٹر کی نیلی روشنی باہر جھانک رہی تھی — رات کے اس وقت بھی کوئی وہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔
ہم نے ایک مکمل چکر لگایا — آہستہ، حساب کے ساتھ۔ دس بجے ہم واپس کمرے کی طرف مڑ گئے۔ علی اور مہدی گہری نیند میں تھے۔ ہم بھی چارپائیوں پر لیٹ گئے — جسم تھکا ہوا تھا۔ کب آنکھ لگی پتہ ہی نہ چلا۔ صبح فجر کی اذان کی آواز نے آنکھ کھول دی۔ کمرے میں ابھی اندھیرا تھا — علی اور مہدی ابھی سو رہے تھے۔ ہم نے آہستہ سے اٹھے، وضو کیا اور اسی کمرے میں نماز ادا کی۔ نماز کے بعد کچھ دیر بیٹھے رہے — ذہن میں آج کے دن کا حساب چل رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد علی بھی اٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا: "ناشتہ کرنا ہو تو کنٹین میں چلو — چھ بجے سے پہلے جاؤ ورنہ بھیڑ ہو جاتی ہے۔"
ہم تینوں کنٹین کی طرف چل پڑے۔ مہدی ابھی بھی سو رہا تھا۔ کنٹین میں صبح کا ناشتہ سادہ تھا — نان، مکھن اور چائے۔ چند مزدور پہلے سے آ کر بیٹھے تھے، کوئی خاموشی سے کھا رہا تھا، کوئی آپس میں دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ ہم نے بھی پلیٹیں لیں اور ایک کونے میں بیٹھ گئے۔
ناشتہ کرتے کرتے باہر سے آوازیں آنے لگیں — مزدور آنا شروع ہو گئے تھے۔ چھ بجے کے قریب فیکٹری کا شور دوبارہ شروع ہو گیا — مشینیں جاگ گئیں، آریاں چلنے لگیں۔

ہم کنٹین سے نکلے تو ٹھیکیدار ابھی نہیں آیا تھا۔ اس کی جگہ ایک نوجوان لڑکا رجسٹر لیے کھڑا تھا — شاید ٹھیکیدار کا کوئی آدمی۔ اس نے ہمیں دیکھا اور کہا: "وہی کام ہے — آفس بلاک کے پیچھے ابھی ملبہ باقی ہے۔" آج چوتھا دن تھا۔

ہم نے بیلچے اٹھائے اور اپنی جگہ پر پہنچ گئے — وہی ملبہ، وہی ٹرالی، وہی کام۔ لیکن آج جسم پہلے دنوں سے زیادہ بھاری لگ رہا تھا۔ تین دن کی مسلسل مشقت نے ہڈیوں میں اتر کر بیٹھ گئی تھی — کمر کھنچ رہی تھی، ہتھیلیوں کے چھالے پک چکے تھے اور گردن موڑنے پر ہلکا درد اٹھتا تھا۔ لیکن رکنے کا سوال نہیں تھا۔

رامین نے بیلچہ چلاتے ہوئے آہستہ کہا: "ذیشان، طبیعت ٹھیک ہے؟" "ہے،" میں نے مختصر جواب دیا اور پتھر اٹھاتا رہا۔ فیکٹری کا معمول آج بھی وہی تھا — مشینوں کا شور، گرد، پسینہ۔ مزدور اپنے اپنے کام میں لگے تھے، کوئی کسی کے معاملے میں نہیں پڑتا تھا۔ تین دنوں میں ہم نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا — فیکٹری میں کل کتنے مزدور تھے، کون کہاں کام کرتا تھا، کون سا گارڈ کس وقت کہاں ہوتا تھا، آفس بلاک میں کتنے لوگ آتے جاتے تھے، کیمرے کس کس زاویے پر تھے۔ یہ سب ذہن میں پختہ ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد زکیہ بھی آ گئی — آج وہ برآمدے کی بجائے گودام کی طرف سے آئی تھی۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا، بالکل معمول کی طرح۔ نہ ہماری طرف دیکھا، نہ کوئی اشارہ کیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزرا۔ پھر وہ ملبے کے ڈھیر کے قریب آئی اور جھاڑو لگاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا: "شام کو وہی جگہ — حتمی پلان بنائیں گے۔ آج کا دن اہم ہے۔" میں نے سر ہلایا — بس اتنا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

دوپہر کے قریب ٹھیکیدار آیا۔ اس نے رجسٹر دیکھا، مزدوروں کو دیکھا اور ہمارے پاس آ کر رک گیا۔ "کام کیسا چل رہا ہے؟"

"ٹھیک ہے آغا،" رامین نے جواب دیا۔ ٹھیکیدار نے ملبے کے ڈھیر کو دیکھا: "آج شام تک یہ ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر کام پورا ہو گیا تو کل کے لیے اور کام نکلوا دوں گا — ابھی فیکٹری میں کافی کام باقی ہے۔ رامین نے موقع دیکھ کر کہا: "آغا، آج ہمارا چوتھا دن ہے — آپ نے کہا تھا تین چار دن کا کام ہے۔ کل بھی کوئی کام ہو گا؟" ٹھیکیدار نے ایک لمحہ سوچا، پھر کہا: "دیکھو، کام تو ہے — لیکن ابھی پکا نہیں کہہ سکتا۔ آج شام پانچ بجے بتاؤں گا کہ کل کے لیے کچھ نکلتا ہے یا نہیں۔ امید تو ہے، کام نکل آئے گا — لیکن اگر نہ ہوا تو پھر ایک دو دن بعد آ کر پتہ کر لینا، میں بتا دوں گا۔ تم لوگ محنتی ہو، کام ٹھیک کر رہے ہو۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہم دوبارہ اپنے کام میں لگ گئے۔ بیلچہ، پتھر، ٹرالی — یہی چکر۔ جسم تھکا ہوا تھا لیکن ہاتھ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ شام پانچ بجے کے قریب سیٹی بجی۔ مزدوروں نے اوزار رکھے اور قطار میں لگ گئے۔ ہم بھی ٹھیکیدار کے پاس پہنچے۔ اس نے رجسٹر پر نشان لگایا اور دیہاڑی دیتے ہوئے کہا: کل کام نہیں ہے — کل جمعہ ہے، ہلکا دن ہوتا ہے۔ ہفتے والے دن آ جانا، پھر لگاتار کام ہو گا۔ اگر ادھر رہنا چاہتے ہو تو بے شک رہو — اور اگر کہیں باہر جانا ہو تو بھی ٹھیک ہے، ہفتے کو صبح آ جانا۔" پھر چھ دن تک مسلسل کام ہے رامین نے کہا: "جی آغا، ہفتے کو آ جائیں گے۔ آج رات ہم باہر جائیں گے — شہر میں کچھ کام ہے۔" ٹھیکیدار نے سر ہلایا اور دوسرے مزدوروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم نے دیہاڑی جیب میں ڈالی اور فیکٹری سے باہر نکل آئے۔ گیٹ سے نکلتے

ہی رامین نے سکھ کا سانس لیا۔ چار دن کی مسلسل محنت کے بعد کھلی ہوا میں سانس لینا اچھا لگا۔ہم پیدل چلتے رہے — پہلے مسافر خانے گئے، وہاں ہاتھ منہ دھویا، کپڑے بدلے اور تھوڑا آرام کیا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا لیکن آج رات زکیہ سے ملنا ضروری تھا — آج حتمی پلان بننا تھا۔ سات بجے کے قریب ہم 'سفراہ خانہِ طوس' کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہی پرانا راستہ، وہی تنگ گلیاں، وہی قہوہ خانے کی لکڑی کا دروازہ۔ اندر داخل ہوتے ہی وہی مدھم روشنی اور زعفران کی خوشبو نے استقبال کیا۔ ہم نے وہی کونے کا تخت لیا اور قہوے کا آرڈر دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ انتظار کے بعد دروازہ کھلا۔ زکیہ داخل ہوئی — آج اس نے سادہ سا اسکارف اوڑھا ہوا تھا، چہرے پر تھکان تھی لیکن آنکھوں میں وہی پختگی تھی۔ اس نے پورے قہوہ خانے پر ایک نظر ڈالی اور ہمارے تخت کی طرف آ گئی۔

زکیہ ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ سلام دعا ہوئی، قہوہ آیا۔ چند لمحے عام باتیں ہوئیں — پھر آہستہ آہستہ اصل موضوع پر آ گئے۔ زکیہ نے پوچھا: "کل کا پروگرام کیا ہے؟" رامین نے کہا: "کل نہیں آ سکتے۔" زکیہ نے حیرت سے دیکھا: "کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے کہا: "ٹھیکیدار نے خود منع کیا — کہا کل جمعہ ہے، کام ہلکا ہے، ہفتے کو آنا۔ اگر ہم کل بھی وہاں پہنچ گئے تو شک ہوگا — مزدور کبھی چھٹی نہیں چھوڑتے لیکن بلائے بغیر نہیں آتے۔"

زکیہ نے سر ہلایا: "ٹھیک ہے، سمجھ آئی۔" پھر میں نے بات آگے بڑھائی: "زکیہ، چار دنوں میں ہم نے جو دیکھا وہ سنو۔ گارڈز تین ہیں — گیٹ پر ایک، گودام کے سامنے ایک، آفس بلاک کے دروازے پر ایک۔ ان کا چکر پندرہ منٹ کا ہے۔ پچھلی طرف والا گارڈ سب سے زیادہ غافل رہتا ہے — خاص طور پر رات کو۔ کیمرے اس طرف چھ ہیں، لیکن آفس بلاک کی پچھلی کھڑکی کے زاویے پر کوئی کیمرہ نہیں ہے۔ بجلی کی مرکزی سپلائی لائن گودام کی بائیں دیوار کے ساتھ جاتی ہے — وہاں ایک بڑا سوئچ بورڈ ہے جو باہر سے نظر آتا ہے۔۔ زکیہ نے الجھن اور تھوڑی بیزاری سے میری بات کاٹی: "ذیشان! یہ سب تفصیل مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ اگر وہاں اتنی سختی ہے اور تم لوگ وہاں جا ہی نہیں سکتے، تو اس فضول معلومات کا میں کیا کروں؟ مقصد کی بات کرو کہ کرنا کیا ہے۔ میں نے مسکرا کر رامین کی طرف دیکھا اور پھر زکیہ سے کہا: "مقصد یہ ہے کہ ہم نے اسی سخت پہرے کے درمیان سے 'بجلی کی مین سپلائی' کاٹنی ہے۔ وہ سوئچ بورڈ باہر دیوار پر ہے۔ زکیہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ہمیں دیکھا: "تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟ تم لوگ تو آفس بلاک کی طرف جا ہی نہیں سکتے — مزدوروں کا ادھر کوئی کام نہیں ہے۔"

میں نے تحمل سے جواب دیا: "زکیہ، یہی تو تم نہیں سمجھ رہیں۔ ہمیں آفس بلاک کے 'اندر' جانا ہی نہیں ہے۔ ہم تو صرف اس بیرونی دیوار کے پاس سے کچرا اٹھانے کے بہانے گزریں گے جہاں کیمرے کی آنکھ نہیں پہنچتی۔ ہمارا کام صرف ایک سیکنڈ کا ہے، باہر سے سوئچ گرانا۔ لیکن اندر کیمرے اور لائٹس بند ہوتے ہی جو اصل کام شروع ہوگا، وہ صرف تم کر سکتی ہو کیونکہ تم پہلے سے اندر موجود ہوگی۔ اب سمجھیں کہ یہ ساری تفصیل تمہارے لیے کیوں ضروری تھی؟" زکیہ کے چہرے پر اب بات سمجھ آنے کے تاثرات ابھرے، جیسے اسے اندازہ ہوا ہو کہ اس مشن کی اصل کنجی وہی ہے۔ زکیہ نے پوچھا آگے کیا کرنا ہے میں نے کہا تم روز صفائی کے لیے آفس بلاک میں جاتی ہو — کوئی تم پر شک نہیں

کرتا۔ جب بھی جانے لگو، پہلے ہمیں میسج کر دینا۔ ہم اسی وقت سوئچ بورڈ پر جائیں گے اور سپلائی لائن کا کنکشن کاٹ دیں گے — ادھر نہ کوئی کیمرہ ہے، نہ گارڈ۔ جیسے ہی بجلی جائے گی، کیمرے بھی اسی کنکشن سے ہیں — خود بخود بند ہو جائیں گے۔ تم اسی لمحے کاظم کے پرسنل روم کے اندر داخل ہو جانا۔"زکیہ نے کہا: "اور اندر جا کر؟"رامین نے کہا: "وہ تمہیں ہم سے بہتر پتہ ہے — تم چار مہینے سے وہاں ہو۔ جو اہم فائلیں ہیں، جن کے بارے میں تمہیں یقین ہے، وہی اٹھانا۔ جیکٹ میں چھپا لینا اور فوری معمول کی طرح باہر آ جانا — جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہم کنکشن کاٹ کر واپس اپنی جگہ آ جائیں گے۔"زکیہ نے سر ہلایا۔ پھر رامین نے پوچھا: "ایک بات بتاؤ — بجلی کتنی دیر بند رہتی ہے؟"زکیہ نے کہا: "کئی بار دیکھا ہے — زیادہ سے زیادہ تین چار منٹ۔ اندر جنریٹر اور انورٹر لگے ہیں، بجلی جاتے ہی الیکٹریشن فوری آتے ہیں۔ بہت کم وقت ہوتا ہے۔"بھاری مشینیں چل رہی ہوتی ہیں

میں نے کہا: "تین چار منٹ کافی ہیں۔"زکیہ نے ایک لمحہ سوچا اور کہا: "یہ پلان مجھے ٹھیک لگ رہا ہے۔ ہفتے کو دس سے بارہ کے درمیان جب بھی موقع ملے کر لیں گے۔"رامین نے کہا: "اور اگر موقع نہ ملا؟"

زکیہ نے کہا: "تو جلد بازی نہیں کرنی — اگلا موقع دیکھیں گے۔

سفراہ خانہِ طوس اس وقت بھرا ہوا تھا۔ کونے کونے میں لوگ بیٹھے تھے — کوئی چائے پی رہا تھا، کوئی قہوہ، کوئی آپس میں باتیں کر رہا تھا

۔ایک ویٹر ہاتھ میں زعفرانی قہوے کی کیتلی لیے میزوں کے درمیان سے تیزی سے گزر رہا تھا۔ باہر گلی میں کسی ریڑھی والے کی آواز آ رہی تھی باورچی خانے سے زعفران اور الائچی کی خوشبو آ رہی تھی

تینوں کونے کے تخت پر بیٹھے اگلے پلان کی باتیں کر رہے تھے

اسی دوران قہوہ خانے کے کونے میں لگے ٹی وی پر خبروں کا رخ بدلا۔ رپورٹر کی آواز بلند ہوئی: "اسرائیلی وزیرِاعظم نے امریکی وزیرِ خارجہ سے ملاقات کے بعد سخت بیان جاری کر دیا ہے۔ ایران پر براہِ راست حملے کے خطرات بڑھ گئے ہیں، جبکہ امریکی بحری بیڑے بحیرہ عرب کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔"میں نے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زکیہ سے کہا: "دیکھو زکیہ! حالات کس تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ادھر اسرائیل دھمکیاں دے رہا ہے، ادھر امریکی وزیرِ خارجہ خطے کے ملکوں کے دورے کر رہا ہے۔ یہ سب محض اتفاق نہیں ہے۔ وہ 'اندرونی انتشار' کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ حملہ کر سکیں۔ اگر ہم نے کاظم کے نیٹ ورک سے وہ فائلیں نہ نکالیں، تو وہ لوگ بلوچستان اور تہران میں ایسی آگ لگائیں گے کہ پھر کوئی اتنی اسانی سے اسے بجھا نہیں پائے گا۔زکیہ نے ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے ہوئے کہا: "یعنی ہماری یہ ایک چوری، ان کی جنگی حکمتِ عملی کو کافی نقصان پہنچا سکتی ہے؟میں نے اثبات میں سر ہلایا: "بالکل! کیونکہ ان فائلوں میں ان 'غداروں' کے نام ہیں جو اسرائیل اور امریکہ کے لیے زمین تیار کر رہے ہیں۔ جب تک ہمیں وہ ثبوت نہیں ملیں گے، ہم دنیا کو نہیں بتا پائیں گے کہ دشمن نے کس طرح حق اور باطل کے مقدس نام کو اپنے ناپاک مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ ایک منظم سائبر پروپیگنڈا ہے جس کا مقصد ہماری صفوں میں موجود اپنوں کو ہی ہمارے خلاف کھڑا کرنا

ہے۔" رامین نے دبی آواز میں کہا: پلان فائنل ہے۔ ہفتے کی صبح ٹھیک ساڑھے دس بجے، جب فیکٹری کا شور عروج پر ہو گا، زکیہ اندر ہو گی اور ہم باہر۔ ہمیں صرف ایک موقع ملے گا۔ اگر ناکام ہوئے تو مشہد کی ان گلیوں سے ہماری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔" ہم تینوں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ باہر کی چہل پہل اب ہمیں ایک سراب لگ رہی تھی۔ اس خاموشی میں میرے اندر صرف ایک ہی عزم تھا: "سرحد کے اس پار (پاکستان) کی حفاظت، یہاں موجود گند کو صاف کرنے سے ہی ممکن ہے۔ ٹی وی پر خبریں بدل گئیں — اب کسی اور شہر کے احتجاج کی تصویریں آ رہی تھیں۔ نوجوان سڑکوں پر تھے، دھواں اٹھ رہا تھا۔ قہوہ خانے میں بیٹھے لوگوں نے بھی ٹی وی کی طرف دیکھا — چند لمحے خاموشی چھا گئی، پھر سب دوبارہ اپنی اپنی باتوں میں لگ گئے۔ جیسے یہ خبریں اب معمول بن چکی تھیں — کوئی حیرت نہیں، کوئی سوال نہیں۔ ہمارا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا زکیہ نے ایک آخری بار ہم پر نظر ڈالی، گویا وہ ہماری صورتیں اپنے ذہن میں نقش کر رہی ہو، اور پھر خاموشی سے اٹھ کر ہجوم میں گم ہو گئی۔ ہم نے بھی مزید وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا۔ رامین نے میز پر پیسے رکھے اور ہم 'سفراہ خانہِ طوس' کے بھاری لکڑی کے دروازے سے باہر نکل آئے۔ رات کی خنکی بڑھ چکی تھی۔ مشہد کی گلیاں اب سنسان ہو رہی تھیں، صرف اکا دکا گاڑیاں دور سے گزرتی سنائی دیتی تھیں۔ ہم دونوں خاموشی سے اپنے مسافر خانے کی طرف چلنے لگے۔ چار دن کی فیکٹری کی مشقت اور پھر یہ اعصاب شکن منصوبہ بندی— تھکن اب جسم کے ایک ایک جوڑ میں سرایت کر چکی تھی۔ مسافر خانے پہنچتے ہی ہم نے کپڑے بدلے اور بستروں پر گر گئے۔ نیند اتنی گہری تھی کہ جیسے ہی آنکھیں بند کیں، دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گئے۔

اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو سورج کی پہلی کرنیں کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اندر جھانک رہی تھیں۔ میں نے ایک انگڑائی لی اور رامین کو دیکھا جو پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا۔ آج جمعہ تھا، کام سے چھٹی تھی، اور یہی ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی تھی۔ اگر ہمیں آج بھی کام پر جانا پڑتا تو شاید ہم اپنے ذہن کو اس طرح ترتیب نہ دے پاتے۔ ہم نے ناشتہ کیا اور پھر سے اپنے 'وار روم' یعنی اسی چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ "ذیشان، کل دس بجے کا وقت ہے،" رامین نے سنجیدگی سے کہا۔ "آج ہمیں ایک بار پھر اس علاقے کا چکر لگانا ہو گا، لیکن مزدور بن کر نہیں، بلکہ عام راہگیر بن کر۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا ہم نے فیصلہ کیا کہ آج ہم دور سے فیکٹری کا مشاہدہ کریں گے۔ یہ وقت ہمارے لیے بونس تھا— ایک ایسا دن جہاں ہم اپنی ہر غلطی کی گنجائش کو ختم کر سکتے تھے۔ جمعہ کی دوپہر ہم نے فیکٹری کا رخ کرنے کے بجائے مشہد کے مشہور 'بازارِ رضا' کے قریبی گلیوں کا رخ کیا۔ ہمارا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ عام ایرانی شہری کے ذہن میں کیا چل رہا ہے اور کیا ہمیں وہاں سے 'کاظم نیٹ ورک' کی کوئی اور کڑی مل سکتی ہے۔

ہر نکڑ پر لگے ٹی وی سکرینوں اور لوگوں کے ہاتھوں میں موجود سمارٹ فونز سے ایک ہی طرح کی سنسنی خیز ویڈیوز نشر ہو رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہجوم ایک بڑے ڈیجیٹل بورڈ کے پاس جمع تھا جہاں دکھایا جا رہا تھا کہ کیسے تہران میں 'عوامی بغاوت' شروع ہو چکی ہے۔ میں نے رامین کے کان میں سرگوشی کی: "دیکھو رامین! یہ ویڈیوز اصل نہیں ہیں۔ یہ سب 'آرٹیفیشل انٹیلیجنس' (AI) کا کمال ہے۔ اسرائیل ابھی براہِ راست حملہ نہیں کرے گا، وہ پہلے ہمیں ذہنی طور پر

مغلوب کر رہا ہے۔ وہ دکھا رہے ہیں کہ حکومت گر چکی ہے تاکہ لوگ خود سڑکوں پر نکل آئیں اور ملک کے اندر خانہ جنگی شروع ہو جائے۔"

ہم ایک پرانے قہوہ خانے کے باہر کھڑے ہوئے جہاں کچھ نوجوان جوش و خروش سے بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس وہ مخصوص 'ٹیلی گرام' گروپ کھلا تھا جس کا ذکر زکیہ نے کیا تھا۔

"آغا! دیکھو، خبر آئی ہے کہ تہران کے بینکوں نے ادائیگیاں بند کر دی ہیں،" ایک نوجوان چلایا۔ میں قریب ہوا اور عربی آمیز فارسی میں پوچھا: "کیا یہ خبر کسی سرکاری ذریعے سے آئی ہے؟" اس نے شک بھرے انداز میں مجھے دیکھا اور کہا: "نہیں، لیکن یہ ویڈیو دیکھو، اس میں مرکزی بینک کا گورنر خود اعتراف کر رہا ہے۔" میں نے دور سے ہی بھانپ لیا کہ وہ ویڈیو 'ڈیپ فیک' تھی۔ آواز اور ہونٹوں کی جنبش میں معمولی سا فرق تھا جو صرف ایک آئی ٹی ماہر ہی پکڑ سکتا تھا۔ رامین نے میرا ہاتھ دبایا، جس کا مطلب تھا کہ ہم صحیح جگہ پر ہیں۔ یہ وہی 'سائبر سیل' تھا جس کی ڈوریاں کاظم جیسے لوگ ہلا رہے تھے۔ ابھی سپریم لیڈر محفوظ تھے، لیکن یہ پروپیگنڈا ان کی ساکھ کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اسی دوران قہوہ خانے کے میں لگی سکرین پر ایک ہنگامی خبر نشر ہوئی: "اسرائیلی وزیرِ اعظم نے اعلان کیا ہے کہ ایران کی جوہری تنصیبات اب ان کے نشانے پر ہیں اور کسی بھی وقت بڑا ایکشن لیا جا سکتا ہے۔" لوگوں کے چہروں پر غصہ اور خوف کا ملا جلا تاثر تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ اندرونی غداری ہے، تو کوئی اسرائیل کے 'سائبر حملے' کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا دو دکاندار آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا، "آغا۔ کل رات سے جو ویڈیوز آ رہی ہیں، وہ سپاہِ پاسداران اور عوام کو آمنے سامنے کھڑا کر رہی ہیں۔ اسرائیل نے ہمیں اپنوں سے ہی لڑوا دیا ہے۔" میں نے رامین کے کان میں سرگوشی کی: "دیکھا رامین! یہی وہ 'سائبر پروپیگنڈا' ہے جس کی فائلیں موساد کے پاس ہیں۔ انہوں نے پہلے سپریم لیڈر کے حوالے سے جھوٹی خبریں پھیلائیں، پھر ایڈیٹڈ ویڈیوز کے ذریعے لوگوں کو سڑکوں پر نکالا اور اب اسی افرا تفری کا فائدہ اٹھا کر اسرائیل براہِ راست میزائل داغنے کی تیاری کر رہا ہے۔"

مغرب (خصوصاً فرانس اور برطانیہ) کی طرف سے آنے والے بیانات نے اس پوری سازش کو ایک 'سفارتی کور' (Diplomatic Cover) فراہم کر دیا تھا۔ جب ہم بازار کے ایک الیکٹرانکس اسٹور کے باہر رکے تو وہاں لگی بڑی سکرین پر بی بی سی (BBC) اور فرانس 24 کی سرخیاں چل رہی تھیں۔ برطانوی وزیرِ خارجہ کا بیان سکرین پر نمودار ہوا: "ایران کے اندرونی حالات تشویشناک ہیں۔ اگر تہران نے اپنے عوام پر تشدد نہ روکا تو عالمی برادری خاموش نہیں رہے گی۔ ہم اسرائیل کے 'دفاعی حق' کی حمایت کرتے ہیں۔" اسی دوران پیرس سے فرانسیسی صدر کی پریس کانفرنس کا ایک کلپ چلا، جس میں وہ کہہ رہے تھے: "ہمیں اطلاعات ملی ہیں کہ ایران کی جوہری تنصیبات خطے کے لیے خطرہ بن چکی ہیں۔ ہم اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر 'سرجیکل سٹرائیک' (Surgical Strike) کے آپشن پر غور کر رہے ہیں۔" میں نے رامین کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر غصہ واضح تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا: "دیکھا رامین! یہ مغرب کا پرانا طریقہ ہے۔ پہلے وہ اپنے 'سائبر سیلز' کے ذریعے ملک کے اندر احتجاج اور انتشار پھیلاتے ہیں، پھر ان کا میڈیا اسے 'انسانی

حقوق کی پامالی' کا نام دیتا ہے، اور آخر میں برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک اسرائیل کے حملے کو 'جائز' قرار دینے کے لیے میدان تیار کرتے ہیں۔" یہ بیانات محض الفاظ نہیں تھے، بلکہ اس بڑے حملے کا پیش خیمہ تھے جو اگلے چند دنوں میں ہونے والا تھا۔ پیرس اور لندن میں بیٹھے یہ 'جمہوریت کے علمبردار' دراصل اسی کاظم نیٹ ورک کی پشت پناہی کر رہے تھے تاکہ تہران سے لے کر بلوچستان تک کے پورے خطے کو عدم استحکام کا شکار کر کے اپنے مفادات حاصل کیے جا سکیں۔

اب ہمارے پاس شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ عالمی طاقتیں مہرے سیٹ کر چکی تھیں، اور ہمارا مقابلہ صرف ایک فیکٹری کے گارڈز سے نہیں، بلکہ اس پورے مغربی ایجنڈے سے تھا جو ایران اور پاکستان کو قبرستان بنانے پر تلا ہوا تھا۔ ہم الیکٹرانکس مارکیٹ سے نکلے تو فضا میں

F-4 فینٹم طیاروں کی بھاری گونج سنائی دے رہی تھی۔ یہ پرانے مگر خوفناک آواز والے طیارے مشہد کی فضائی حدود کی نگرانی کر رہے تھے۔ سڑکوں پر بسیج کی وردی والے اہلکار جگہ جگہ ناکے لگا چکے تھے۔ تھکن اب ہمارے جسم کے ریشے ریشے میں سرایت کر چکی تھی۔ کئی دنوں کی ذہنی تناؤ اور آج کی طویل پیدل مسافت نے قدموں کو من من بھر کا کر دیا تھا۔ ہم خاموشی سے اپنی چھوٹی سی پناہ گاہ میں داخل ہو گئے۔ کمرہ سونا پڑا تھا، صرف دیوار پر لگی پرانی گھڑی کی 'ٹک ٹک' سنائی دے رہی تھی۔ ہم نے زمین پر بیٹھ کر وہی خشک روٹی اور پنیر کھائی۔ یہ ایک جاسوس کا نہیں بلکہ ان دو مزدوروں کا کھانا تھا جو اپنے ملک کی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اندھیرے میں صرف ہماری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ذہن میں ایک طرف کل کا مشن تھا اور دوسری طرف اپنے گھر والوں کے چہرے—وہ جن کی حفاظت کی خاطر ہم اس آگ کے دریا میں اترے تھے۔ تھکن غالب آتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم بے ہوشی کی نیند سو گئے۔

ہفتے کی صبح مشہد کا سورج بادلوں کی اوٹ سے نکلا تو فضا میں ایک عجیب سی سنسنی تھی۔ ہم نے مسافر خانے کے قریب ایک چھوٹے سے کھوکھے سے جلدی میں ناشتہ کیا اور آٹھ بجے کے قریب فیکٹری کے بڑے لوہے کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ آج سیکیورٹی پہلے کی طرح معمول پر تھی، گارڈز ہر مزدور کی جیبیں ٹٹول رہے تھے۔ ہم گیٹ سے گزر کر سیدھا ٹھیکیدار کے پاس پہنچے۔ وہ آج کچھ زیادہ ہی غصے میں لگ رہا تھا اور مسلسل فون پر کسی سے بحث کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے ایک لمبا سانس لیا اور پاس پڑے ہوئے لوہے کے بھاری پائپوں اور اینگلز کی طرف اشارہ کیا آج تم لوگوں کا کام بدلی (ملبہ اٹھانا) نہیں ہے،" ٹھیکیدار نے کرخت لہجے میں کہا۔ "آج یہ تمام پائپ گودام کی پچھلی دیوار کے ساتھ جو نئی شیڈ بن رہی ہے، وہاں پہنچانے ہیں۔ جلدی کرو، وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ۔"

ہمارے لیے یہ خوش قسمتی تھی۔ جس شیڈ کا اس نے ذکر کیا، وہ عین اسی جگہ تھی جہاں بجلی کا وہ مرکزی سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا جس کا کنکشن ہمیں کاٹنا تھا۔ ہم نے خاموشی سے پائپ اٹھائے اور کام شروع کر دیا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب، جب فیکٹری کا شور اپنے عروج پر تھا، میں نے دیکھا کہ زکیہ کچرا اٹھانے والی ٹرالی لیے ہماری طرف آ رہی ہے۔ اس کے چہرے

پر تناؤ تھا لیکن آنکھوں میں وہی پرانی پختگی۔ وہ ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکی، جیسے ٹرالی کا پہیہ ٹھیک کر رہی ہو۔ "سب اوکے ہے،" اس نے دبی آواز میں سرگوشی کی۔ "معمول کے مطابق تلاشی ہو چکی ہے۔ میں اندر جا رہی ہوں۔ پہلے لابی کی صفائی، پھر راہداری اور ٹھیک دس بجے میں کاظم کے کیبن کے بالکل باہر ہوں گی۔ جونہی میں وہاں پہنچوں گی، تمہیں سگنل دوں گی۔ تم لوگ بس تیار رہنا۔" میں نے پائپ کندھے پر درست کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور سر کے اشارے سے اطمینان دلایا۔ نو بج کر پچپن منٹ پر میری نظریں بار بار کلائی پر بندھی گھڑی اور جیب میں رکھے فون پر جا رہی تھیں۔ ہم نے لوہے کے چار پانچ پتلے پائپ اپنے کندھوں پر لادے اور آہستہ آہستہ اسی مخصوص دیوار کی طرف بڑھنے لگے جہاں مین سوئچ بورڈ نصب تھا۔ ہمارا ہر قدم نپا تلا تھا، ہم جان بوجھ کر اپنی رفتار اتنی دھیمی رکھے ہوئے تھے کہ ٹھیک دس بجے ہم اس ہدف کے بالکل قریب ہوں۔

جونہی ہم دیوار سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچے، میری جیب میں موجود فون ہلکا سا تھرتھرایا۔ زکیہ کا میسج آ چکا تھا: "میں پہنچ گئی ہوں۔ اب تمہاری باری ہے۔" میں نے کنکھیوں سے رامین کی طرف دیکھا، جس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ میں نے اسے سر کے ہلکے سے اشارے سے سگنل دیا، "ابھی!" ہم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کندھے سے پائپوں کو عین سوئچ بورڈ کے نیچے پٹخ دیا۔ ایک بھاری اور تیز دھاتی آواز گونجی جو مشینوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔ وہاں کوئی گارڈ موجود نہیں تھا، بس دور کہیں کچھ مزدور اپنے کام میں مگن تھے جن کی توجہ ہماری طرف بالکل نہیں تھی۔ دیوار کے ساتھ لگے اس زنگ آلود سوئچ بورڈ کا دروازہ پہلے ہی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، جیسے الیکٹریشن اسے بند کرنا بھول گیا ہو۔ رامین فوراً پائپ اٹھانے کے بہانے سوئچ بورڈ کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کے پاس ربڑ کے دستانے اور وہ مخصوص پلاس (Pliers) پہلے ہی تیار تھا۔ رامین نے سوئچ بورڈ کا زنگ آلود دروازہ کھولا

اندر تاروں کا ایک جال تھا، لیکن رامین کی نظریں اس مین سرامک فیوز پر تھیں جو پورے آفس بلاک کی بجلی کنٹرول کر رہا تھا۔ رامین نے پلاس (Pliers) سے اس بھاری فیوز کو ایک جھٹکے سے باہر کھینچا۔ ایک ہلکی سی چنگاری نکلی اور پورے آفس بلاک کی روشنیاں ایک دم گل ہو گئیں۔ اندر سے مشینوں کے رکنے کی دبی دبی آوازیں آئیں اور پھر ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ رامین نے فیوز کو وہیں نیچے کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیا تاکہ اگر کوئی چیک بھی کرے تو اسے لگے کہ 'وولٹیج زیادہ ہونے کی وجہ سے فیوز اڑ گیا ہے'۔ یہ ایک عام ٹیکنیکی خرابی لگ رہی تھی، کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ تخریب کاری ہے۔ "چلو یہاں سے!" میں نے رامین کو اشارہ کیا۔ ہم نے دوبارہ پائپ اٹھائے اور معمول کے مطابق شیڈ کی طرف بڑھنے لگے، جیسے ہمیں معلوم ہی نہ ہو کہ بجلی کیوں گئی ہے۔ اب ان کے پاس جنریٹر چلانے کے لیے صرف تین سے چار منٹ تھے، اور یہی وہ وقت تھا جس میں زکیہ کو کاظم کے کمرے سے وہ فائلیں نکالنی تھیں۔ بجلی کٹنے کے اس ایک سیکنڈ نے پورے آفس بلاک میں کھلبلی مچا دی تھی۔ جیسے ہی باہر رامین نے فیوز کھینچا، اندر کمپیوٹرز کی سکرینیں کالی ہو گئیں تھیں یہی وہ لمحہ تھا جس کا زکیہ کو انتظار تھا۔ اس نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور اپنی ٹرالی وہیں راہداری میں چھوڑی اور دبے قدموں کاظم کے پرسنل کیبن کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر گھپ اندھیرا نہیں تھا، کیونکہ کھڑکی کے پردوں سے دن کی

تھوڑی سی روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی جو ایک تجربہ کار آنکھ کے لیے کافی تھی۔ اس نے براہِ راست کاظم کی میز کا رخ کیا۔ اس کا دل کسی ہتھوڑے کی طرح سینے میں بج رہا تھا، لیکن ہاتھوں میں کمال کی تیزی تھی۔اس نے پہلا دراز کھولا—— وہاں صرف عام کاغذات تھے۔دوسرا دراز لاک تھا، لیکن تیسرے دراز کو جیسے ہی اس نے کھینچا، وہ کھل گیا۔ وہاں فائلوں کا ایک ڈھیر تھا، لیکن زکیہ کی نظریں اس مخصوص براؤن فائل پر جا ٹھہریں جس پر جلی حروف میں "پراجیکٹ سن رائز" لکھا تھا۔اس نے فائل کو کھول کر وقت ضائع نہیں کیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس صرف چند سیکنڈز ہیں۔ اس نے فوراً وہ فائل نکالی، اور ساتھ ہی دراز میں پڑے وہ تین چار اہم کاغذات بھی اٹھائے جن پر الگ سے مہر لگی ہوئی تھی۔ اس نے وہ کاغذات بھی اسی فائل کے اندر اڑسے اور پوری فائل کو اپنی جیکٹ کے اندرونی حصے میں، اپنی کمر کے ساتھ اس طرح مضبوطی سے چپکا کر چھپا لیا کہ باہر سے دیکھنے پر ذرا سا بھی ابھار محسوس نہ ہو۔ابھی اسے اندر گئے بمشکل دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ وہ الٹے قدموں باہر آئی، اپنا جھاڑو سنبھالا اور راہداری میں اس طرح جھک کر صفائی کرنے لگی جیسے وہ پچھلے دس منٹ سے وہیں موجود ہو۔

ٹھیک اسی لمحے، فیکٹری کے باہر جنریٹر کے اسٹارٹ ہونے کی زوردار آواز آئی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ لائٹیں دوبارہ جل اٹھیں، کمپیوٹرز کی بیپ سنائی دی اور کیمروں کی سرخ بتیاں دوبارہ روشن ہو گئیں۔ الیکٹریشن اور گارڈز کا شور بڑھ چکا تھا، لیکن زکیہ اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے جھاڑو مارتی ہوئی گودام کے عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگی باہر کھڑے ہمیں جب لائٹیں جلتی نظر آئیں تو رامین نے میری طرف دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ ہماری خوشی کی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا؛ ہمیں معلوم تھا کہ اگر زکیہ وقت پر باہر آ گئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مشن کامیاب ہو گیا ہے۔ ہم نے پائپوں کو ایک آخری ترتیب دی اور معمول کے مطابق اپنے اگلے کام کی طرف بڑھ گئے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ہم نے پورا دن مشقت جاری رکھی تاکہ کسی کے ذہن میں شک کا معمولی سا بیج بھی نہ پنپ سکے۔ فیکٹری کا ماحول اب معمول پر آ چکا تھا، لیکن ہمارے سینوں میں ایک طوفان چھپا تھا۔ دوپہر کے وقت زکیہ ایک بار پھر کچرے والی ٹرالی لے کر ہمارے قریب سے گزری اور ایک معنی خیز نظر ہم پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ "شکار" محفوظ ہے۔ اس نے اہستہ سے کہا شام سات بجے، 'ریستورانِ فردوسی میں ملاقات کرینگے

شام کے پانچ بجے جب فیکٹری کا سائرن گونجا، تو تمام مزدور تھکے ہارے قدموں سے مرکزی گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم بھی لائن میں لگ گئے۔ ٹھیکیدار اپنی کرسی پر بیٹھا ایک ایک کر کے سب کی دہاڑی تقسیم کر رہا تھا۔ "یہ لو تم دونوں کی مزدوری،" ٹھیکیدار نے ہمارے ہاتھ میں ایرانی ریال تھماتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اب وہ پہلے والا غصہ نہیں تھا، شاید کام وقت پر ختم ہونے کی خوشی تھی۔ "کل صبح ٹھیک آٹھ بجے یہاں پہنچ جانا، ابھی بہت کام باقی ہے۔"

"جی صاحب، بالکل،" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔حالانکہ ہم جانتے تھے کہ یہ فیکٹری اب ہماری منزل نہیں رہی۔

مرکزی گیٹ پر تلاشی کا عمل بہت سخت تھا۔ گارڈز مردوں کے جوتوں تک کو ٹٹول رہے تھے، لیکن خواتین کی تلاشی کا معیار قدرے مختلف تھا۔ زکیہ نے اپنی چادر اور ڈھیلے ڈھالے لباس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ فائل اپنی کمر کے ساتھ اس

مہارت سے باندھی تھی کہ وہ اس کے وجود کا حصہ لگ رہی تھی۔ اسے ایک ضعیف العمر خاتون کے ساتھ گیٹ سے نکلتے دیکھ کر میرے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔ عورتوں کی تلاشی لینے والی اہلکار نے صرف سرسری سا ہاتھ پھیرا اور اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

زکیہ نے ہمیں پہلے ہی میسج کر دیا تھا کہ وہ "ہوٹل مہران" کے قریب واقع ایک پرانے مگر معروف روایتی ریستوران "قہوہ خانہِ فردوسی" میں ہمارا انتظار کرے گی۔ یہ جگہ نہ تو بہت مہنگی تھی کہ تیکھی نظروں میں آتی اور نہ ہی اتنی سستی کہ وہاں سیکیورٹی کا مسئلہ ہوتا۔ یہاں زائرین اور مقامی تاجروں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اس لیے اجنبی چہرے یہاں بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے۔ہم فیکٹری سے نکل کر پہلے اپنے عارضی ٹھکانے پر پہنچے، حلیہ تبدیل کیا اور پھر مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ریستورانِ فردوسی کی طرف روانہ ہوئے۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے

ٹھیک سات بجے، جب مشہد کی سڑکیں نیون لائٹس سے جگمگا رہی تھیں، ہم اس ریستوران میں داخل ہوئے۔ فضا میں بھنے ہوئے کبابوں اور ایرانی قہوے کی خوشبو بسی ہوئی تھی بالائی حصے میں لکڑی کے اونچے تخت بنے ہوئے تھے، جن کے سامنے بھاری مخملی پردے لٹک رہے تھے۔ زکیہ پہلے ہی بائیں ہاتھ کے آخری کیبن میں ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ہم خاموشی سے اندر داخل ہوئے اور رامین نے فوراً وہ بھاری پردہ آگے کر دیا۔ اب ہم تینوں اس چھوٹی سی جگہ میں محصور تھے جہاں باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ کٹ چکا تھا۔ باہر سے صرف برتنوں کے ٹکرانے اور لوگوں کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں، لیکن پردے کے اندر ایک ایسی خاموشی تھی جس میں صرف ہماری سانسوں کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔"شکر ہے تم لوگ خیریت سے پہنچ گئے،" زکیہ نے سرگوشی کی اور اپنا بڑا سا بیگ میز پر رکھ دیا۔ہم نے فوراً کھانے کا آرڈر دیا تاکہ ویٹر کا کام ختم ہو جائے اور ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ جیسے ہی ویٹر نے کباب اور گرم روٹیاں میز پر رکھیں اور پردہ گرا کر واپس گیا، زکیہ نے بیگ کے خفیہ خانے سے وہ فائل نکالی اور ہمارے سامنے رکھ دی ایک طرف کبابوں سے اٹھتا دھواں تھا اور دوسری طرف وہ انکشافات جن سے ہمارے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔

میں نے پہلا صفحہ پلٹا۔ وہاں سب سے اوپر جلی حروف میں ایک نام لکھا تھا: "ذاکر شمس"۔

اس نام کے ساتھ کچھ اعداد و شمار درج تھے جنہیں دیکھ کر میں رک گیا۔ یہ کسی ادائیگی یا فنڈنگ کی تفصیل لگ رہی تھی۔ نیچے درج تھا کہ اس شخص کو ایک خطیر رقم منتقل کی گئی ہے۔ میرے ذہن میں پہلا سوال یہی ابھرا کہ یہ 'شمس' آخر ہے کون؟ اور ایک فیکٹری کے ریکارڈ میں اس کا نام کیا کر رہا ہے؟ہم نے خاموشی سے کھانا شروع کیا، لیکن ذہن ان اعداد و شمار کو ڈی کوڈ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ رامین نے ایک کاغذ پر انگلی رکھی جہاں کاظم کے دستخط تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ رقم لکھی تھی جو شمس کو دی گئی تھی۔"کاظم کا ایک ذاکر سے کیا لینا دینا؟" رامین نے دبی آواز میں پوچھا۔ "ایک طرف یہ فیکٹری مینیجر ہے اور دوسری طرف یہ مذہبی شخصیت۔ ان کا آپس میں یہ مالیاتی تعلق سمجھ سے باہر ہے۔"میں نے فائل کے اگلے صفحات دیکھے تو وہاں کچھ مزید نام بھی تھے، لیکن وہ فی الحال ثانوی لگ رہے تھے۔ اصل معمہ یہی 'ذاکر شمس' تھا جسے کاظم کے ذریعے فنڈنگ ہو رہی تھی۔زکیہ نے 'پراجیکٹ سن رائز' والی فائل کے ساتھ وہ تین چار اضافی کاغذات

میرے سامنے رکھے جو اس نے کاظم کے دراز کے خفیہ حصے سے نکالے تھے۔ ان پر کوئی جلی عنوان نہیں تھا، بس کچھ تکنیکی فہرستیں اور نقشے سے بنے ہوئے تھے۔ میں نے پہلا کاغذ اٹھایا۔ یہ الیکٹرانک پرزوں کی ایک ایسی فہرست تھی جس کا اس پتھر کی فیکٹری سے بظاہر کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ یہاں تو بھاری پتھر کاٹے اور تراشے جاتے تھے، پھر یہ سرکٹس اور سینسرز یہاں کیا کر رہے تھے؟ اس کاغذ کا اصل مقصد یہ تھا کہ پتھروں کی بڑی بڑی سلیبوں (Slabs) کے اندر مخصوص جگہ بنا کر یہ خفیہ سامان چھپایا جا رہا ہے۔ یہ وہ الیکٹرانک آلات تھے جو ریموٹ کنڑول دھماکوں میں استعمال ہوتے ہیں اور انہیں پتھروں کے درمیان رکھ کر اسمگل کرنا سب سے محفوظ طریقہ تھا۔

اور حیران کن بات یہ تھی کہ عام طور پر فیکٹری کا مال دکانوں یا مارکیٹ میں جاتا ہے، لیکن اس کاغذ کے مطابق وہ مال مشہد کے باہر کچھ خفیہ گوداموں میں جا رہا ہے پھر میں نے دوسرا کاغذ دیکھا۔ یہ ان گاڑیوں اور ٹرکوں کی لسٹ تھی جو روزانہ فیکٹری سے تیار شدہ پتھر لے کر نکلتے تھے۔ اس کاغذ کی اہمیت یہ تھی کہ ان میں سے کچھ مخصوص ٹرک ایسے تھے جن کے نمبروں کے آگے ستارے کا نشان بنا تھا۔ یہ وہ ٹرک تھے جن میں عام پتھروں کے ساتھ وہ "خاص مال" بھی لدا ہوتا تھا۔ ان ڈرائیوروں کے ناموں کے سامنے ان کی منزلیں درج تھیں، جو ظاہر کرتی تھیں کہ یہ لوگ کاظم کے خاص مہرے ہیں۔ اگر ہمیں کسی گاڑی کا پیچھا کرنا ہو یا کسی ڈرائیور کو پکڑ کر کچھ اگلوانا ہو تو یہ کاغذ اس میں کام آئے گا

تیسرا کاغذ ایک خفیہ نقشہ تھا جس میں مشہد کے پہاڑی راستوں اور پتھروں کی کانوں (Quarries) سے گزرنے والے کچے راستوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نقشے کا مقصد ان راستوں کو واضح کرنا تھا جہاں سے یہ بھاری ٹرک سیکیورٹی ایجنسیوں کی نظروں میں آئے بغیر سرحد تک پہنچ سکتے تھے۔ ان کچے راستوں پر بظاہر تو پتھر ڈھونے والی گاڑیاں چلتی تھیں، اس لیے کسی کو ان پر شک نہیں ہوتا تھا۔ رامین نے میرے اور زکیہ طرف دیکھا اور پھر دبی آواز میں اس پورے نیٹ ورک کا نچوڑ بیان کیا: "دیکھو ذیشان! اب تصویر واضح ہے۔ پہلا کاغذ: کیا جا رہا ہے؟ (خفیہ سامان) اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ مال کہاں جا رہا ہے دوسرا کاغذ: کون لے جا رہا ہے؟ (مخصوص ڈرائیور اور گاڑیاں)

تیسرا کاغذ: کہاں سے لے جا رہا ہے؟ (خفیہ راستہ)

ان تینوں کو ملا کر ہمارے پاس اس پوری سازش کا عملی ڈھانچہ آ گیا ہے۔"

ہم نے ان تمام کاغذات کی تصویریں لیں۔ اب نقشہ صاف تھا ہمارے پاس ثبوت موجود تھے۔ اب صرف ان مہروں کو اپنی چال سے گرانا باقی تھا۔

ہمیں اس پردہ دار کیبن میں بیٹھے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کھانا اب ختم ہو چکا تھا، لیکن میز پر پھیلی ہوئی وہ فائلیں اور کاغذات ہماری زندگی کا سب سے بڑا بوجھ بن چکے تھے۔ رامین نے ایک بار پھر چادر ہٹا کر باہر کا جائزہ لیا، راہداری ابھی پرسکون تھی۔ میں نے فوراً وہ دونوں فائلیں اور اضافی کاغذات سمیٹے اور انہیں اپنی جیکٹ کے اندرونی خفیہ خانے میں اس طرح پیوست کر لیا کہ باہر سے ذرا بھی ابھار محسوس نہ ہو۔

"زکیہ! تم آئی ٹی کی سٹوڈنٹ ہو،" میں نے دبی آواز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ذرا اس ذاکر شمس کا کچا چٹھا تو

نکالو۔ دیکھو تو سہی یہ شخص ڈیجیٹل دنیا میں کہاں کھڑا ہے؟" زکیہ نے فوراً اپنا فون نکالا۔ اس کی انگلیاں سکرین پر تیزی سے چلنے لگیں۔ اس نے کچھ مخصوص ہیکنگ ٹولز اور مقامی سرورز کا استعمال کرتے ہوئے اس نام کو کھنگالنا شروع کیا۔ چند منٹ کے گہرے سکوت کے بعد اس نے فون ہماری طرف گھمایا۔

"یہ رہا،" زکیہ نے سرگوشی کی۔ "اس کا پورا نام آغا شمس الدین ہے، لیکن یہ 'ذاکر شمس' کے نام سے کام کرتا ہے۔ یہ مشہد کی قدیم بستی 'نوغان' کی ایک گمنام سی امام بارگاہ میں اپنا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ یہ کوئی بہت بڑا یا عالمی سطح پر مشہور ذاکر نہیں ہے، لیکن اس کا حلقہ اثر مخصوص بستیوں میں بہت گہرا ہے—بالکل ویسا ہی جیسا کسی 'سلیپر سیل' کا ہوتا ہے۔" دیکھو،" زکیہ نے فون میز کے درمیان میں رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اس نے کچھ کالم لکھے ہیں اور کچھ حالیہ پوسٹس کی ہیں۔ یہ بہت ہی امن پسندانہ باتیں کر رہا ہے، لیکن کہیں کہیں یہ حکومت کی پالیسیوں پر بڑی باریک تنقید بھی کرتا ہے۔ یہ براہِ راست کسی کے خلاف نہیں بولتا، بلکہ 'عوام کے حقوق' اور 'مظلومیت' کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کے جذبات سے کھیل رہا ہے۔" ہم نے اس کے کچھ ویڈیو کلپس دیکھے۔ وہ کسی عالیشان سٹیج پر نہیں، بلکہ مشہد کی عام بستیوں میں سادہ لوح لوگوں کے درمیان بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ ان ویڈیوز میں وہ کہیں بزرگوں کے ہاتھ چوم رہا تھا تو کہیں نوجوانوں کو 'حق کی خاطر قربانی' دینے کا درس دے رہا تھا۔ اس کی باتوں میں ایک ایسی لغزش تھی جو بظاہر تو ٹھیک لگتی تھی، لیکن ایک تربیت یافتہ ذہن کو یہ کھٹک رہی تھی کہ یہ شخص خاموشی سے لوگوں کو نظام کے خلاف تیار کر رہا ہے۔۔کچھ خاص سراغ تو نہیں مل رہا،" رامین نے ایک ویڈیو کلپ دیکھ کر کہا، جس میں شمس ایک بازار میں لوگوں سے مل رہا تھا۔ "یہ تو ایک عام سا مذہبی سماجی رہنما لگ رہا ہے۔ نہ کوئی اشتعال انگیز تقریر ہے اور نہ ہی کوئی ایسی بات جس پر اسے پکڑا جا سکے۔"

"یہی تو اس کا اصل کمال ہے،" میں نے فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو میری جیکٹ میں چھپی تھی۔ "انٹرنیٹ پر یہ امن کا فرشتہ ہے، لیکن کاظم کی فائل میں اس کے نام کے آگے لکھی ہوئی رقم بتا رہی ہے کہ اس 'امن' کی قیمت دہلی سے ادا کی جا رہی ہے۔ یہ شخص جو کچھ دکھا رہا ہے، وہ حقیقت نہیں ہے۔ہمیں وہاں سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو اسے براہِ راست مجرم ثابت کرتی، بلکہ اس کا بیانیہ بہت ہی الجھا ہوا اور ہوشیارانہ تھا۔ لیکن اس کے پراسرار انداز اور کاظم سے ملنے والی فنڈنگ نے ہمارے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ ہم اس کے ڈیجیٹل عکس کے پیچھے نہیں بھاگیں گے، بلکہ خود 'نوغان' کی اس بستی میں جائیں گے جہاں یہ شخص موجود ہے۔ ہمیں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا تھا کہ وہ ان بند کمروں اور تنگ گلیوں میں کیا کھچڑی پکا رہا ہے۔ میں نے زکیہ کی طرف دیکھا اور دبی آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ "شکریہ زکیہ! تم ہماری امیدوں پر پورا اتری ہو۔ یہ فائلیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا، تم نے اپنی جان داؤ پر لگا کر وہ مہرہ تلاش کر لیا ہے جس کی ہمیں تلاش تھی۔"

زکیہ نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکایا، لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی بھی وہی سنجیدگی تھی۔ "شکریہ کی ضرورت نہیں ہے ذیشان،" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا، "ہم سب اپنے ملک کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا، اگر میں آج یہ نہ کرتی تو شاید کل ہمیں پچھتانے کا موقع بھی نہ ملتا۔" رامین نے پھر پوچھا، "تو کل کا کیا پروگرام

ہے؟ کیا ہم دوبارہ فیکٹری جا رہے ہیں؟"
ہمارا کام اس فیکٹری میں ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمیں وہاں دوبارہ قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ آج تو کاظم فیکٹری میں نہیں تھا، لیکن کل جب وہ آئے گا اور اپنا دراز خالی پائے گا تو مشہد کے اس صنعتی علاقے میں ایک خاموش زلزلہ آ جائے گا۔"رامین نے تشویش سے پوچھا، "کیا وہ اپنے ساتھیوں کو اطلاع نہیں کرے گا؟"
ہرگز نہیں،" میں نے جواب دیا، "کاظم خود ایک کالے دھندے کا حصہ ہے۔اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی بھنک نہیں لگنے دے گا،" میں نے رامین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اسے معلوم ہے کہ اس جیسے لوگوں کی دنیا میں کمزوری کی سزا موت ہوتی ہے۔ اگر اس نے اپنے اوپر بیٹھے ہینڈلرز کو بتایا کہ اس سے اتنی اہم فائل گم ہو گئی ہے، تو وہ اسے نااہل سمجھ کر راستے سے ہٹا دیں گے۔ وہ اس معاملے کو اپنی حد تک 'اندرونی سطح' پر ہی حل کرنے کی کوشش کرے گا۔"
رامین نے سر ہلا کر میری بات کی تائید کی۔ " صحیح کہہ رہے ہو۔ وہ خود کیمروں کی ریکارڈنگ چیک کرے گا، اور خاص طور پر اس بجلی کے شارٹ سرکٹ والے مقام کا معائنہ کرے گا۔ وہ کسی پر شور مچائے بغیر خاموشی سے اپنے شک کا دائرہ تنگ کرے گا۔"" بالکل،" میں نے بات آگے بڑھائی۔ "وہ سب سے پہلے ان لوگوں کو نشانہ بنائے گا جو آفس بلاک میں داخل ہو سکتے تھے—یعنی صفائی والا عملہ اور وہ مزدور جو اس وقت وہاں کام کر رہے تھے۔ اسی لیے زکیہ، تمہیں کل کے بعد بہت محتاط رہنا ہوگا۔ وہ تم پر یا کسی اور پر براہِ راست الزام نہیں لگائے گا، بلکہ اپنی مخصوص عقابی نظروں سے سب کا مشاہدہ کرے گا۔ اسے لگے گا کہ چور ابھی فیکٹری کے اندر ہی ہے اور شاید اسے بلیک میل کرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ یہی وہ وقت ہوگا جب وہ سب سے زیادہ خطرناک اور الرٹ ہوگا۔"اسے معلوم ہے کہ فائل چوری ہو چکی ہے، لیکن وہ اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پائے گا۔ وہ بار بار اپنا دراز کھولے گا، صوفے کے نیچے دیکھے گا، الماریوں کی تلاشی لے گا—
صرف اس امید میں کہ شاید وہ فائل کہیں ادھر ادھر ہو گئی ہو۔رامین نے میز پر جھکتے ہوئے اضافہ کیا، "اور یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہو گی اسے یقین ہے کہ جس نے بھی فائل چرائی ہے، وہ اس سے رابطہ کرے گا، اسے بلیک میل کرے گا یا بھاری رقم کا تقاضا کرے گا۔ وہ اسی انتظار میں بیٹھا رہے گا اور یہی خاموشی اسے پاگل کر دے گی۔ بالکل،" میں نے بات جاری رکھی، "جب انسان اس قدر ذہنی دباؤ میں ہوتا ہے، تو وہ غلطیاں کرتا ہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے فون کالز کرے گا، مشکوک لوگوں سے ملے گا اور شاید خود ہی ان خفیہ ٹھکانوں کا رخ کرے گا جن کا تذکرہ اس فائل میں تھا۔ وہ اپنے ہی سائے سے ڈرے گا اور اپنوں پر شک کرے گا۔ ہمیں بس اس کے ان 'غلط قدموں' کا انتظار کرنا ہے۔ اس کی بوکھلاہٹ ہمیں اس سازش کے اگلے مہرے تک خود لے جائے گی۔"ہم نے طے کیا کہ ہم کاظم کو اس کے اپنے خوف کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ زکیہ فیکٹری میں اس کی بدلتی ہوئی نفسیات پر نظر رکھے گی، جبکہ ہم باہر رہ کر اس کے اگلے قدم کا شکار کریں گے۔میں نے زکیہ کی طرف دیکھا اور اسے کہا "اسی لیے تمہارا وہاں ہونا ضروری ہے۔ تم معمول کے مطابق جاتی رہنا، اگر تم اچانک غائب ہوئیں تو اس کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ اسے لگنے دو کہ غدار ابھی فیکٹری کے اندر ہی ہے۔ جب تک وہ اپنے اندرونی لوگوں میں الجھا رہے گا، ہمیں باہر اپنا کام کرنے کے لیے وقت مل جائے گا۔

ایران کے موجودہ حالات، جہاں پچھلے ایک ہفتے سے سپریم لیڈر کے حوالے سے افواہیں گردش کر رہی ہیں اور سڑکوں پر تناؤ ہے، ہمارے لیے ایک ڈھال بھی تھے اور ایک خطرہ بھی۔

فوج کی نقل و حرکت کی وجہ سے کاظم کے لیے بھی زیادہ ہاتھ پاؤں مارنا مشکل تھا۔زکیہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر میری بات کاٹتے ہوئے بولی، "کاظم کا تو آپ کو معلوم ہے، وہ اتوار کو فیکٹری نہیں آتا۔ اتوار اس کی پکی چھٹی ہوتی ہے، چاہے کتنا ہی بڑا مسئلہ کیوں نہ ہو، وہ یہ دن اپنے مخصوص 'کاموں' کے لیے رکھتا ہے۔ اس لیے کل وہ فیکٹری میں تو نہیں ہوگا، اور ویسے بھی آپ لوگوں نے اب وہاں دوبارہ قدم نہیں رکھنا۔"

رامین نے میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا، "تو پھر کل کا دن 'آغا شمس الدین' کے نام رہا؟"" بالکل،" میں نے سنجیدگی سے سر ہلایا، "کل ہم 'نوغان' کی ان تنگ گلیوں میں اس کا پیچھا کریں گے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ مجلس کے پردے میں کیا زہر گھول رہا ہے۔"زکیہ کی آنکھوں میں ایک دم چمک آئی۔ "اگر آپ لوگ کل وہاں جا رہے ہیں، تو میں بھی ساتھ چلوں گی! میں کل فیکٹری سے چھٹی کر لوں گی، ویسے بھی اتوار کو کاظم وہاں نہیں ہوتا تو میرا نہ ہونا زیادہ محسوس نہیں کیا جائے گا۔ نوغان کی اس پرانی امام بارگاہ میں کل شام مجلس ہے، اور ایک عورت کے لیے وہاں خواتین کے حصے میں بیٹھ کر ماحول کو سمجھنا اور معلومات نکالنا مردوں کے مقابلے میں زیادہ آسان ہوگا۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ آغا شمس الدین کتنا بڑا اداکار ہے۔"

رامین نے تجسس سے پوچھا، "لیکن ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ وہ کل وہیں ہوگا؟ ابھی تو ہم نے اس کا نام فائل میں دیکھا ہے، مشہد جیسے بڑے شہر میں اسے ڈھونڈنا اتنا آسان تو نہیں ہوگا۔"شاید وہ کہیں گیا ہوا ہو ادھر نہ ہو

زکیہ نے اپنے موبائل کی طرف اشارہ کیا اور کہا جس کا ڈیٹا ہم نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہیک کیا تھا۔ اور ابھی جب میں اس کے فون کی ہسٹری اور سوشل میڈیا پیجز دیکھ رہی تھی، تو مجھے اس کا کل کا شیڈول مل گیا۔ اس نے اپنی تازہ ترین پوسٹ میں کل شام کا اشتہار لگا رکھا ہے۔ وہ ہر اتوار کی شام نوغان کی اسی قدیم امام بارگاہ میں مجلس سے خطاب کرتا ہے۔ یہ اس کا پکا معمول ہے، اور کل بھی وہ وہیں ہوگا، اپنے چاہنے والوں کے درمیان 'حق اور سچ' کا لبادہ اوڑھے۔

رامین نے تھوڑی تشویش سے زکیہ کی طرف دیکھا، لیکن زکیہ کا ارادہ پکا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا، "ٹھیک ہے، اگر تم جانا چاہتی ہو تو آ جاؤ۔ تمہارا وہاں ہونا ہمارے لیے ایک 'کپاس' (Cover) کا کام کرے گا، کیونکہ ایک خاندان یا گروہ کی صورت میں ہم پر شک کم ہوگا۔ لیکن یاد رہے، ہمیں وہاں صرف تماشائی بن کر جانا ہے۔ ہمیں مجلس کے عقیدت بھرے ماحول میں اس طرح جذب ہونا ہے کہ شمس یا اس کے مسلح کارندوں کو ہماری موجودگی کا ذرا بھی احساس نہ ہو۔طے یہ پایا کہ زکیہ برقعے میں خواتین کے راستے سے داخل ہوگی، جبکہ میں اور رامین عام زائرین کے روپ میں مردوں کے حصے میں جگہ بنائیں گے۔رامین نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کل شام کا وقت بہت نازک ہوگا، "ہمیں بہت سنبھل کر نکلنا ہوگا

نواں باب۔۔۔۔۔۔۔ محبت یا مقصد

۔"زکیہ نے سر اٹھایا، اس کی نظریں رامین سے ہوتی ہوئی مجھ پر آ کر رک گئیں۔ "آپ لوگ جس طرح یہ سب کرتے ہیں... کیا کبھی آپ کا جی نہیں چاہتا کہ یہ سب ختم ہو جائے؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "میرا مطلب ہے، آپ کی اپنی بھی تو کوئی زندگی ہوگی، کوئی فیملی، کوئی گھر بار؟" کمرے میں ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ میں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور پھر کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں باہر مشہد کی روشنیاں مدھم ہو رہی تھیں۔ "گھر تو سب کا ہوتا ہے زکیہ،" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "لیکن ہماری زندگی کے فیصلے ہم خود نہیں کرتے، ہمارے حالات کرتے ہیں۔" رامین نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور زکیہ سے مخاطب ہوا۔ "زکیہ ! ذیشان بھائی سے ان کی فیملی کا نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ یہ وہ مسافر ہیں جو اپنے پیچھے سارے دروازے بند کر کے نکلے ہیں۔" زکیہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے براہِ راست مجھ سے پوچھا ذیشان... کیا میں آپ کی فیملی کے بارے میں کچھ جان سکتی ہوں؟" اس نے آواز کو متوازن رکھنے کی کوشش کی، "میرا مطلب ہے، آپ کی زندگی، آپ کے گھر والے... کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" یہ سوال اس قدر اچانک تھا کہ رامین کے ہاتھ بھی ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ میں نے اسے دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک معصوم سا تجسس تھا۔ یہ وہ سوال تھا جو اکثر میرے سامنے آتا تھا، لیکن میرا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا۔ "زکیہ، ہماری دنیا میں 'پرائیویسی' ہی ہماری سب سے بڑی ڈھال ہوتی ہے،" میں نے دھیمی لیکن دو ٹوک آواز میں کہا۔

زکیہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ندامت آئی، لیکن پھر میں نے مسکرا کر بات کو تھوڑا نرم کیا، "لیکن چلو، ہم اس مشن میں ساتھی ہیں تو اتنا حق تو تمہارا بنتا ہے۔ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ میری زندگی ایک ایسے سفر پر ہے جہاں منزل کا تو پتہ ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ واپسی کا راستہ ملے گا یا نہیں۔" زکیہ نے سر جھکا لیا، شاید وہ میرے جواب کی گہرائی کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش سا اعتراف تھا—ایک ایسی متاثر کن شخصیت کے لیے احترام جو اپنا سب کچھ ایک مقصد کے لیے داؤ پر لگا چکا تھا۔ زکیہ نے کافی کا کپ میز پر رکھا، اس کی نظریں کپ سے اٹھنے والی بھاپ میں الجھی ہوئی تھیں۔ "میں معذرت چاہتی ہوں ذیشان، شاید مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ کی شخصیت میں ایک ایسی خاموشی ہے جو اکثر مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ کیا اس سخت جان مجاہد کے پیچھے کوئی ایسا انسان بھی ہے جو کبھی تھکتا ہو؟ جس کا دل کسی کے لیے دھڑکتا ہو؟" میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ "تھکاوٹ تو جسم کا خاصہ ہے زکیہ، لیکن روح جب کسی مقصد سے جڑ جائے تو وہ تھکنا بھول جاتی ہے۔ تم نے پوچھا کہ کیا میں شادی شدہ ہوں؟ تو اس کا جواب 'نا' ہے، اور شاید میری زندگی میں اس 'ہاں' کے لیے کبھی وقت ہی نہیں بچا۔" زکیہ نے ایک گہرا سانس لیا، اس کے لہجے میں اب ایک عجیب سی ہمدردی تھی۔

"کیا آپ کو کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟ کیا کبھی جی نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا ہو جو آپ کی واپسی کا انتظار کرے؟ جو آپ

کے زخموں پر مرہم رکھے؟"انتظار بہت بھاری پتھر ہے زکیہ،" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا، "میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کی آنکھیں چوکھٹ پر لگی رہیں اور کسی کی دعائیں صرف میری سلامتی تک محدود ہو جائیں۔ ہم جیسے لوگ جب گھر سے نکلتے ہیں تو اپنا کفن ساتھ لے کر نکلتے ہیں۔ ایسے میں کسی کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا اس کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ میری محبت، میرا جنون اور میری زندگی... یہ سب اب اس مٹی اور اس مشن کے نام ہو چکے ہیں۔"ہماری خوشی ہماری ذات میں نہیں، بلکہ ان لاکھوں گھروں کے سکون میں ہے جو ہماری بیداری کی وجہ سے چین کی نیند سوتے ہیں۔"
زکیہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک آئی، شاید وہ میرے اس نظریے سے متاثر ہو رہی تھی۔ "آپ کی باتیں سن کر لگتا ہے کہ آپ نے اپنی خواہشات کو کسی بہت بڑے مقصد کے لیے زندہ دفن کر دیا ہے۔ کیا یہ مشکل نہیں ہوتا؟"
"مشکل تو ہوتا ہے،" میں نے اسے براہِ راست دیکھتے ہوئے کہا، "لیکن جب انسان سرحد کے پار بیٹھے دشمن کی چالوں کو دیکھتا ہے اور اپنے ملک کے معصوم چہروں کو یاد کرتا ہے، تو اپنی ذات کی ہر خواہش بہت چھوٹی لگنے لگتی ہے۔ ہم وہ چراغ ہیں زکیہ، جنہیں دوسروں کے گھر روشن رکھنے کے لیے خود جلنا پڑتا ہے۔"
زکیہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر آہستہ سے بولی، "آپ کا عزم دیکھ کر میرا حوصلہ اور بڑھ گیا ہے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آپ کیوں اتنے نڈر ہیں۔ جس کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہ ہو، اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔"میں نے تھوڑا سختی سے کہا، "کھونے کے لیے بہت کچھ ہے زکیہ... ایمان، غیرت اور یہ ملک۔ بس اپنی ذات کو ہم نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔
زکیہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سا دکھ اور احترام ابھرا۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا کہ میرے اس سخت لبادے کے پیچھے کتنی بڑی قربانی چھپی ہے۔"لیکن کیا آپ کو تنہائی نہیں لگتی؟" اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔
"تنہائی اسے لگتی ہے زکیہ جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ میرا مقصد میرے ساتھ رہتا ہے، اس لیے میں کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔
زکیہ نے فوراً پوچھا، "کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ایک ساتھی آپ کی ہمت بڑھا سکتا ہے؟"میں نے دھیمی لیکن پروقار آواز میں کہا، "زکیہ، جس راستے پر میں ہوں، وہاں ہمت سے زیادہ 'خلا' کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کسی کی زندگی کو اپنی خطرناک مہم جوئیوں کی نذر نہیں کر سکتا۔ میری شادی، میری خوشیاں، سب اس سرحد کے تحفظ کے لیے قربان ہو چکی ہیں۔"رامین نے بیچ میں لقمہ دیا، "ذیشان بھائی تو کہتے ہیں کہ ان کی شادی ان کی شہادت والے دن ہو گی۔"میں نے رامین کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور پھر زکیہ سے مخاطب ہوا، "تم اسے لبرل دنیا کی زبان میں 'ظلم' کہہ سکتی ہو کہ ہم اپنی ذات کو مار دیتے ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ دوسروں کے سکون کے لیے اپنی نیندیں حرام کرنا ہی ایک مجاہد کا اصل سکون ہے۔"زکیہ کے لہجے میں اب ایک ایک عجیب سی ہمدردی تھی۔اس نے کہا"کیا ایک مجاہد کا دل پتھر کا ہوتا ہے؟ کیا اسے کسی کے لمس، کسی کی مہر اور کسی کے ساتھ کی ضرورت نہیں ہوتی؟"
میں نے کہا، "پتھر کا نہیں ہوتا زکیہ، لیکن وہ موم بھی نہیں رہ سکتا۔ شادی ایک ذمہ داری ہے، ایک وعدہ ہے کسی کا ساتھ نبھانے کا۔ میں کیسے کسی معصوم کو وہ وعدہ دے دوں جسے پورا کرنے کی ضمانت میرے پاس خود نہیں؟ میری صبح دشمن کی گولیوں میں ہوتی ہے اور شام کسی انجان ٹھکانے پر۔ کیا میں کسی کی زندگی کو اپنے اس 'بے گھر' وجود کے ساتھ

باندھ کر اسے زندہ درگور کر دوں؟"زکیہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی، لیکن مجھے اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب سوالوں سے سوال نکلیں گے اور بات ان جذباتی پگڈنڈیوں پر مڑ جائے گی جن کا میرے مشن سے۔ کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس طرح کی 'نسوانی گفتگو' اور اپنی ذات کے گرد گھومتی باتوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔ ایک مجاہد کے لیے اپنی ذات کی نمائش کرنا یا ذاتی زندگی کے دکھڑے رونا ویسے بھی کوئی اچھے اخلاق کی بات نہیں تھی۔
ہمارے پاس وقت کم تھا اور مقصد بہت بڑا، جبکہ یہاں ایک لڑکی اپنے تجسس کی تسکین کے لیے میری زندگی کی تہیں کریدنا چاہ رہی تھی۔میں نے میز پر ہاتھ رکھ کر اس بحث کو وہیں دفن کر دیا۔ "زکیہ! اب یہ باتیں یہیں چھوڑ دو،" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ سوالوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا اور فی الحال میرے پاس ان باتوں کے لیے نہ وقت ہے اور نہ ہی ذہنی گنجائش۔ ہماری ذات کیا ہے اور ہماری زندگی کیسی ہے، یہ سب ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل حقیقت کل کا وہ مشن ہے جو نوغان کی امام بارگاہ میں ہمارا منتظر ہے۔"زکیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے میز پر انگلی رکھتے ہوئے بات ختم کر دی، ناراض نہ ہونا زکیہ "اب یہ باتیں چھوڑو۔ یہ وہ بحث ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
کل اتوار ہے، کاظم فیکٹری نہیں جائے گا اور آغا شمس الدین امام بارگاہ میں ہوگا۔ ہمیں اپنی توجہ مشن پر رکھنی ہے۔"زکیہ خاموش ہو گئی۔ اسے شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم لوگ اپنی ذات سے کتنے کٹ چکے ہیں۔"۔ زکیہ نے میری آنکھوں میں موجود اس آہنی عزم کو پڑھ لیا تھا جو کسی بھی جذباتی لرزش سے پاک تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے لہجے کو مکمل طور پر پروفیشنل بناتے ہوئے سر ہلا دیا۔"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ذیشان،" اس نے وقار کے ساتھ جواب دیا، "مقصد ذاتی سوالات سے کہیں بڑا ہے۔ میں کل کے لیے بالکل تیار ہوں۔"میں نے موبائل میں موجود نقشے پر انگلی رکھتے ہوئے فائنل پلان دہرایا۔ "بہتر ہے۔ زکیہ! کل ٹھیک گیارہ بجے تم اس پارک کے جنوبی کونے پر پہنچ جانا جہاں رامین کی گاڑی پارک کی ہوئی ہے۔ ہم تمہیں وہیں سے پک کریں گے اور پھر وہاں سے سیدھا 'نوغان' کی پرانی بستی کی طرف نکلیں گے۔ کل کا دن مشہد کی سڑکوں پر ہجوم کا ہوگا، اس لیے وقت کی پابندی لازمی ہے۔زکیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ جانے سے پہلے ہم کچھ دیر مشہد اور خطے کے بگڑتے ہوئے حالات پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ ٹی وی اسکرین پر چلنے والی خبریں تشویشناک تھیں۔ اسرائیلی وزیرِاعظم کی حالیہ دھمکیوں اور امریکی وزیرِ خارجہ کے تہران کے متعلق بیانات نے پورے مشہد میں ایک انجانا سا خوف پھیلا دیا تھا۔"حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں،" زکیہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "اگر اسرائیل نے کوئی حماقت کی تو مشہد کے یہ صنعتی علاقے اور فوجی تنصیبات سب سے پہلے نشانے پر ہوں گے۔ بالکل،" میں نے اضافہ کیا، "ایران کے موجودہ سیاسی تناؤ کا فائدہ اٹھا کر یہ دہلی کے پے رول پر پلنے والے لوگ ملک کے اندرونی حالات خراب کرنا چاہتے ہیں۔ان حالات میں ہمارا مشن اور بھی پرخطر ہو گیا ہے، کیونکہ ذرا سی غلطی ہمیں مقامی انٹیلی جنس (اطلاعات) کی نظروں میں لا سکتی ہے۔
مغرب کا لب و لہجہ پچھلے چند گھنٹوں میں بالکل بدل چکا ہے،" رامین نے تہران ٹائمز کی شہ سرخیاں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وائٹ ہاؤس سے آنے والے بیانات بتا رہے ہیں کہ امریکہ اب صرف سفارت کاری تک محدود نہیں رہنا چاہتا۔ امریکی

وزیرِ خارجہ نے واضح کر دیا ہے کہ اگر ایران نے اپنی حدود میں کسی بھی قسم کی فوجی سرگرمی تیز کی، تو 'میز پر تمام آپشنز موجود ہیں'۔ یہ براہِ راست جنگ کی دھمکی ہے۔" زکیہ نے تشویش سے سر ہلایا، "صرف امریکہ ہی نہیں، فرانس اور برطانیہ نے بھی اپنے شہریوں کو فوری طور پر ایران چھوڑنے کی ہدایت کر دی ہے۔ پیرس سے جاری ہونے والے بیان میں کہا گیا ہے کہ خطے میں تناؤ اس نہج پر پہنچ چکا ہے جہاں کسی بھی وقت 'حادثاتی جنگ' چھڑ سکتی ہے۔"""اور ادھر اسرائیلی وزیرِاعظم کا تکبر دیکھیں،" میں نے بات کاٹتے ہوئے اضافہ کیا، "وہ تو کھل کر کہہ رہا ہے کہ ہم تہران اور مشہد کے صنعتی مراکز کو نشانہ بنانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ اس وقت ایران کے اندرونی حالات، سپریم لیڈر کی صحت کے حوالے سے اڑنے والی افواہیں اور سڑکوں پر موجود عوامی بے چینی اس کے لیے بہترین موقع ہے۔ مغربی میڈیا اس آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کر رہا ہے۔" ایرانی میڈیا کا لہجہ بھی اب دفاعی نہیں رہا،" رامین نے دبے سے لہجے میں کہا۔ "تہران سے جاری ہونے والے سرکاری بیان میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر اسرائیل نے ایک انچ بھی جارحیت کی، تو تل ابیب اور حیفہ کو مٹی کے ڈھیر میں بدل دیا جائے گا۔ ایرانی پاسدارانِ انقلاب (IRGC) کے کمانڈر کا یہ جملہ بار بار گردش کر رہا ہے کہ 'ہمارے ہاتھ اب صرف دفاع کے لیے نہیں بلکہ حملے کے لیے ٹرگر پر ہیں'۔" زکیہ نے موبائل سکرین کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا، "اور ایرانی وزیرِ خارجہ نے اقوامِ متحدہ کو خط لکھ دیا ہے کہ مغرب کی طرف سے دی جانے والی دھمکیاں عالمی امن کے لیے خطرہ ہیں۔ ایرانی اخبارات تو اسے 'آخری معرکہ' قرار دے رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ امریکہ اور فرانس کا اپنے شہریوں کو نکالنا دراصل نفسیاتی جنگ کا حصہ ہے تاکہ ایرانی عوام میں خوف پھیلایا جا سکے، لیکن ایرانی عوام سڑکوں پر آ کر نظام کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں۔"

"یہی تو وہ تضاد ہے زکیہ،" میں نے سنجیدگی سے کہا، "ایک طرف حکومت کا سخت گیر موقف ہے اور دوسری طرف آغا شمس الدین جیسے لوگ، جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے جذبات کو نظام کے خلاف موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایرانی انٹیلی جنس اس وقت بیرونی خطرے پر نظر رکھے ہوئے ہے، اور یہی وہ خلا ہے جس کا فائدہ اٹھا کر یہ 'اندرونی دیمک' ملک کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ ہمیں کل اسی دیمک کو ختم کرنا ہے

زکیہ اپنی لمبی سیاہ چادر کے حصار میں لپٹی ہوئی تھی، جس نے اسے ایک خاص وقار اور پراسراریت بخش دی تھی۔ میری آخری بات سن کر اس نے سر جھکایا اور خاموشی سے میری بات کی تائید کی۔ اس کے چہرے پر اب وہی سنجیدگی تھی جو ایک سپاہی کے چہرے پر مہم سے پہلے ہوتی ہے۔ "من متوجہ شدم ذیشان صاحب! (میں سمجھ گئی ذیشان صاحب!)" اس نے فارسی آمیز اردو میں بڑے ادب سے جواب دیا، "کل کا یہ معرکہ صرف ایک مشن نہیں، بلکہ اس دیمک کو جڑ سے اکھاڑنے کا پہلا قدم ہے جو ہمارے ملک کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ ان شاء اللہ، میں کل ٹھیک وقت پر آپ کو اسی پارک میں ملوں گی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی چادر کے پلوؤں کو درست کیا اور ہم دونوں کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں سر جھکایا۔ "خدا حافظ و نگہدارِ شما (خدا آپ کا حامی و ناصر اور نگہبان ہو)۔" یہ کہہ کر وہ باوقار قدموں سے ریسٹورنٹ کے ہال سے گزرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رامین اور میں کچھ دیر وہیں بیٹھے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے، یہاں تک کہ وہ ہوٹل

کے بیرونی دروازے سے باہر اندھیرے میں اوجھل ہوگئی۔ میں نے میز پر موجود باقیات کو ایک نظر دیکھا، چائے کی پیالیوں سے اب دھواں اٹھنا بند ہو چکا تھا۔ میں نے کرسی پیچھے دھکیلی اور رامین کی طرف اشارہ کیا۔ "چلو رامین، اب ہمیں بھی نکلنا چاہیے۔ کل کا دن ہماری زندگی کے اہم ترین دنوں میں سے ایک ہوگا۔" ہم نے بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ کے روشن ماحول سے باہر نکل آئے۔ مشہد کی ٹھنڈی ہوا نے ہمارے چہروں کو چھوا، لیکن ذہن اب بھی ان نقشوں اور فائلوں میں الجھے ہوئے تھے جو ہم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے زیرِ بحث لائے تھے۔ زکیہ اپنی منزل کی طرف مڑ گئی تھی جبکہ میں اور رامین دوسری سمت میں اپنی رہائش کی طرف بڑھ گئے۔ ہم شہر کے شور شرابے سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچے تو باہر کی ٹھنڈک کے برعکس کمرے کی حبس زدہ فضا میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ رامین نے تھکن سے چور ہو کر جوتے اتارے اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا، جبکہ میں نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکایا تاکہ مشہد کی رات کا نظارہ کر سکوں۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رامین نے ایک گہرا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔ "بھائی! ویسے ماننا پڑے گا، زکیہ جس طرح آپ کی باتیں سن رہی تھی اور جیسے سوالات کر رہی تھی، مجھے تو لگ رہا ہے کہ اس کے دل میں آپ کے لیے کسی خاص عقیدت نے جگہ بنا لی ہے۔ یہ صرف ایک مشن پارٹنر کا احترام نہیں لگتا

وہ آپ کے اس سخت لبادے کے پیچھے چھپے انسان کو کھوج رہی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے اس کے دل میں آپ کے لیے کوئی خاص جگہ بنتی جا رہی ہے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ "رامین، دیکھو! وہ ایک عورت ہے اور عورت کی فطرت میں تجسس ہوتا ہے۔ اپکو تو علم ہے کہ عورتیں کتنی جذباتی ہوتی ہیں اور

ان کا دماغ اکثر ان پگڈنڈیوں پر نکل جاتا ہے جہاں ہم جیسے مسافروں کا داخلہ ممنوع ہے

۔" وہ سوالوں سے سوال نکال رہی تھی تاکہ میرے ماضی یا میری ذات تک پہنچ سکے، لیکن اسے کیا معلوم کہ وہاں اب صرف راکھ بچی ہے۔" شاید وہ میرے اس 'آہنی خول' کو توڑ کر اندر جھانکنا چاہتی ہو، یا شاید وہ یہ جاننا چاہتی ہو کہ جس شخص کے ساتھ وہ اتنے بڑے مشن پر ہے، اس کا ماضی کیا ہے۔ لیکن ہمیں جذباتی ہو کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی وہ ہمارے ساتھ پہلے مشن میں ہے، ہمیں ابھی اس کی وفاداری اور ہمت کو مزید پرکھنا ہے۔ یہ راستہ بہت کٹھن ہے، یہاں ایک پل کی جذباتی وابستگی پورے مشن کو مٹی میں ملا سکتی ہے

میں نے بات کا رخ موڑا اور رامین کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اچھا یہ بتاؤ، تمہیں وہ کیسی لگی؟ تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" رامین ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گیا، پھر سنبھل کر بولا، "بھائی! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ ایک جری لڑکی ہے، اس نے اپنے باپ کی قربانی دی ہے، خوبصورت بھی ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ اس کا ہمت اور سلیقہ دیکھ کر تو کوئی بھی متاثر ہو سکتا ہے۔"

ویسے رامین، تم بار بار اس کی وکالت کیوں کر رہے ہو؟ میں نے اسے آزمائشی نظروں سے دیکھا، اگر تمہیں وہ اتنی ہی اچھی لگتی ہے، اس کا سلیقہ، اس کا وقار اور اس کی بہادری تمہیں متاثر کرتی ہے... تو تم اپنے لیے کیوں نہیں سوچتے؟ آخر

تمہاری بھی تو ایک زندگی ہے۔"تو تم قدم آگے بڑھا سکتے ہو رامین ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گیا، پھر اس کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ آئی لیکن اس نے فوراً اسے سنجیدگی میں بدل دیا۔"بھائی! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے تو کبھی اس نظر سے سوچا ہی نہیں۔ وہ... وہ تو بس آپ کے ساتھ جچتی ہے۔ میرا تو مقصد ہی آپ کا ساتھ دینا ہے۔"
"کیوں نہیں سوچا؟" میں نے اسے ٹوکا۔ "وہ خوبصورت ہے، پڑھی لکھی ہے، اور سب سے بڑھ کر ہمارے نظریات کی ہم سفر ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو ہم اس پر بات کر سکتے ہیں۔"رامین نے بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف رخ کیا اور باہر اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بولا، "سچ کہوں بھائی؟ وہ واقعی ایک مکمل لڑکی ہے۔ اس کی گفتگو میں ایک ایسا ادب اور ٹھہراؤ ہے جو آج کل کی آزاد خیال لڑکیوں میں کہاں! لیکن... لیکن میرا دل گواہی نہیں دیتا کہ میں اس سفر میں کسی اور کو شریک کروں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کسی کی محبت میرے مشن کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔"میں نے اس کے پاس جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہی تو المیہ ہے رامین! ہم جیسے لوگ دوسروں کے گھروں میں خوشیاں بانٹتے ہیں، لیکن اپنے لیے ایک چھوٹا سا گھر بسانے سے بھی ڈرتے ہیں ۔رامین، ایک بات ذہن نشین کر لو۔وہ میرے لیے ایک بہن کی طرح ہے جس کا تحفظ میرا فرض ہے۔
لیکن یقین جانو، میرے دل میں اس کے لیے ویسے کوئی جذبات نہیں ہیں جو ایک مرد کے عورت کے لیے ہو سکتے ہیں۔ میرے دل میں صرف اسکا احترام ہے، ایک ایسی بہن کی طرح جس نے قربانی دی ہو۔میں تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر درد بھرے لہجے میں اضافہ کیا، "میں ایک مسافر ہوں رامین، اور ایک مسافر کبھی اپنے پیچھے کسی کا انتظار یا کسی کی آنکھوں میں آنسو چھوڑ کر نہیں جاتا۔ میری زندگی مشن کی امانت ہے، اور میں کسی معصوم کی زندگی اپنی وجہ سے داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ یہ لبرل دنیا جو ہم پر عورتوں کے حقوق سلب کرنے کا الزام لگاتی ہے، انہیں کیا معلوم کہ ایک مجاہد اپنی جائز خواہشات کو صرف اس لیے دبا دیتا ہے کہ کہیں اس کی محبت کسی دوسرے کی زندگی کے لیے بوجھ نہ بن جائے۔ ہم خود کو مارتے ہیں تاکہ دوسرے جی سکیں۔
رامین خاموش ہو گیا، اسے اندازہ تھا کہ میرے ان الفاظ کے پیچھے کتنا بڑا کرب اور کتنی بڑی قربانی چھپی ہے۔ کمرے میں دوبارہ وہی پیشہ ورانہ سکوت چھا گیا، مگر اب اس سکوت میں ایک دوسرے کے لیے احترام اور بھی بڑھ گیا تھا۔رامین، سچ بتانا... کیا تمہارے دل میں زکیہ کے لیے واقعی کچھ اس طرح کے جذبات ہیں؟" میں نے دھیمی مگر سنجیدہ آواز میں پوچھا۔
رامین کچھ دیر خاموش رہا، جیسے اپنے جذبات کو لفظوں میں تول رہا ہو۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "بھائی، سچ تو یہ ہے کہ اس کا وقار اور اس کا جذبہ متاثر کن ہے۔ اس نے اپنے باپ کا لہو دیکھا، لیکن اس کی آنکھوں میں ڈر کے بجائے ایک عجیب سا ٹھہراؤ ہے۔ اس کی گفتگو میں جو تمیز اور سلیقہ ہے، وہ انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ہاں، شاید میرے دل میں اس کے لیے ایک خاص قسم کی کشش پیدا ہو گئی ہے۔میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "دیکھو رامین، متاثر ہونا ایک الگ بات ہے اور اسے زندگی کا حصہ بنانا بالکل الگ۔ ہمیں ابھی بہت محتاط رہنا ہو گا۔ ابھی وہ ہمارے ساتھ پہلے ہی مشن پر

ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے اپنے دل میں کیا چل رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات سرے سے ہو ہی نہ اور وہ ہمیں صرف اپنے مقصد کے ساتھی کے طور پر دیکھتی ہو۔"رامین نے تھوڑی فکر مندی سے پوچھا، "تو آپ کا کیا مشورہ ہے؟"میرا مشورہ یہ ہے کہ ابھی ہم صرف مشن پر فوکس کریں۔ جذبات میں آ کر کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی جس سے وہ پریشان ہو جائے یا ہمارے کام میں خلل پڑے۔ اگر اس کے دل میں کچھ نہیں ہے، تو ہماری ذرا سی چوک اسے ہم سے دور کر سکتی ہے۔" میں نے بات جاری رکھی، "لیکن ہاں، اگر یہ مشن کامیابی سے مکمل ہو گیا اور حالات سازگار رہے، تو میں خود اس سے بات کروں گا، یا اگر تم چاہو تو تم سلیقے سے اس کا ذہن ٹٹول لینا۔رامین کے چہرے پر ایک امید بھری مسکراہٹ آئی۔ "جی ذیشان بھائی، آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ابھی سارا فوکس اس 'دیمک' کو ختم کرنے پر ہونا چاہیے۔"میں نے رامین کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات میں مزید گہرائی پیدا کی۔

"رامین، میری بات غور سے سنو،" میں نے دھیمی مگر پروقار آواز میں کہا، "اگر واقعی زکیہ کے دل میں تمہارے لیے جگہ بنتی ہے اور تم دونوں ایک دوسرے کے ہم سفر بنتے ہو، تو یقین جانو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ مجھے دلی خوشی ہوگی کہ میرے دو بہترین اور جری ساتھی ایک پاکیزہ بندھن میں بندھ جائیں۔ نکاح تو ویسے بھی برکت کا باعث ہے، اور ہم جیسے مسافروں کی زندگی میں اگر کوئی سکون کا لمحہ آ سکتا ہے، تو وہ یہی ہے۔"رامین کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مگر بھرپور مسکراہٹ آئی، جیسے اسے میری طرف سے ایک بڑی سند مل گئی ہو۔ اس نے نظریں جھکا لیں، لیکن اس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ اس تصویر کو اپنے ذہن میں سجا چکا ہے۔بھائی، آپ کی یہ بات میرے لیے بہت معنی رکھتی ہے،" رامین نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں ڈر رہا تھا کہ شاید آپ اسے مشن سے غداری سمجھیں، لیکن آپ نے تو میری فکر ہی دور کر دی۔"میں نے مسکرا کر اسے ٹوکا، "غداری تب ہوتی جب تم مشن کو پسِ پشت ڈال دیتے۔ لیکن اگر تم ایک جری مجاہدہ کو اپنا جیون ساتھی بناتے ہو، تو یہ تمہارے لیے بھی اچھا رہے گا اور ہمارے مشن کے لیے بھی۔ تم دونوں ایک دوسرے کی طاقت بنو گے۔ لیکن رامین،" میں نے دوبارہ سنجیدگی اختیار کی، "یاد رکھنا، ابھی ہم دہکتے انگاروں پر چل رہے ہیں۔ زکیہ ایک ایسی لڑکی ہے جس نے بہت کچھ کھویا ہے، اس کا اعتماد جیتنا اور پھر اس کے دل میں جگہ بنانا ایک صبر طلب کام ہے۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ تم اس کے زخموں کا مرہم بننا چاہتے ہو، نہ کہ اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔"اور ہاں رامین ایک بات کبھی مت بھولنا۔ تمہیں یاد ہے نا کہ داریان نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا؟ وہ بھی تو ہمارا اپنا تھا، کتنے ہی مشن اس نے ہمارے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر مکمل کیے، ہمارا دستِ راست بنا رہا، لیکن آخر میں اس نے ہمیں کیسا زہریلا دھوکا دیا؟ رامین کی مسکراہٹ تھوڑی مدھم ہوئی اور اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

میں نے بات جاری رکھی، "اسی لیے، میں تمہیں زکیہ کے لیے گرین سگنل تو دے رہا ہوں، لیکن ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر رہا ہوں کہ ہمیں نہایت محتاط رہنا ہے۔ زکیہ ابھی ہمارے ساتھ پہلے مشن پر ہے۔ اگر وہ یہ مشن بھی اسی سنجیدگی اور

وفاداری سے انجام دیتی ہے جیسا کہ اب تک کر رہی ہے، تو پھر ہمارا یقین اس پر پکا ہو جائے گا۔ جب تک یہ 'ٹیسٹ' مکمل نہیں ہوتا، تم نے اپنے جذبات کو اپنے عمل پر حاوی نہیں ہونے دینا۔ اگر وہ واقعی سچی نکلی، تو وہ تمہاری زندگی کا بہترین اثاثہ ثابت ہوگی، لیکن فی الحال... نظریں مشن پر اور دل قابو میں۔"

رامین نے ایک لمبا سانس لیا، جیسے وہ میری بات کی گہرائی کو پوری طرح سمجھ گیا ہو۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی۔ شکریہ کہ آپ نے مجھے زمین پر واپس لے آئے۔ جذبات اپنی جگہ، لیکن حفاظت اور مشن سب سے پہلے۔ میں پوری طرح الرٹ رہوں گا۔" پھر ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور کل کا پلان ذہن میں سوچتے سوچتے پتہ نہیں کب نیند کی وادیوں میں چلے گئے۔ صبح جب آنکھ کھلی تو مشہد کا سورج کھڑکی کے پردوں سے جھانک رہا تھا۔ ہم نے جلدی سے غسل کیا اور ناشتہ ختم کر کے ہوٹل سے نکل پڑے۔ شہر کی فضا میں آج ایک عجیب سا سکون تھا، لیکن یہ وہ سکون تھا جو کسی بڑے طوفان سے پہلے چھا جاتا ہے۔ ہم چہل قدمی کرتے ہوئے اس پارک کی طرف بڑھے جہاں رامین نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ کچھ دیر ہم پارک کی بینچ پر بیٹھے مشہد کی ٹھنڈی صبح کا لطف لیتے رہے اور گزرتے ہوئے لوگوں کا مشاہدہ کرتے رہے۔ گیارہ بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے کہ دور سے ایک جانی پہچانی شخصیت اپنی کالی چادر میں لپٹی، باوقار قدموں کے ساتھ ہماری طرف آتی دکھائی دی۔ یہ زکیہ تھی۔ وہ وقت کی اتنی پابند تھی کہ گیارہ بجنے سے پہلے ہی مقررہ جگہ پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے قریب آکر دھیمی آواز میں سلام کیا۔ "سلام علیکم ذیشان صاحب، سلام رامین صاحب۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے؟"

اس کے لہجے میں وہی متانت اور سنجیدگی تھی جو اس کی پہچان بن چکی تھی۔ میں نے جواب دیا، "وعلیکم السلام زکیہ! تم وقت کی پابند ہو، یہ ایک اچھے سپاہی کی نشانی ہے۔" رامین نے بھی مسکرا کر سلام کا جواب دیا، مگر اس کی آنکھوں میں وہ محتاط نظر اب بھی موجود تھی جس کی تلقین میں نے کل رات اسے کی تھی۔ زکیہ آج مجلس میں جانے کے لیے مکمل طور پر تیار لگ رہی تھی، اس کا حجاب پہلے سے زیادہ محکم تھا تاکہ وہ نوغان کی اس پرانی امام بارگاہ کے ماحول میں مکمل طور پر جذب ہو سکے۔ "گاڑی تیار ہے؟" زکیہ نے رامین کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی بالکل، گاڑی یہیں قریب کھڑی ہے،" رامین نے چابی گھماتے ہوئے جواب دیا۔ "ہمیں اب نکلنا چاہیے، کیونکہ نوغان کے راستوں پر آج رش معمول سے زیادہ ہو سکتا ہے۔" ہم تینوں خاموشی سے گاڑی کی طرف بڑھے۔ رامین نے ریموٹ سے سفید رنگ کی عام سی نظر آنے والی سیڈان کا لاک کھولا، جو مشہد کی سڑکوں پر موجود ہزاروں گاڑیوں جیسی تھی — ایسی گاڑیاں جو ہجوم میں گم ہونے کے لیے بہترین ہوتی ہیں۔ میں اگلی نشست پر رامین کے برابر بیٹھا، جبکہ زکیہ پچھلی سیٹ پر مکمل وقار کے ساتھ اپنی چادر سنبھال کر بیٹھ گئی۔ رامین نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی آہستہ سے پارکنگ سے نکال کر مشہد کی چوڑی شاہراہ پر ڈال دی۔ شہر کے بیرونی حصے سے نوغان کے قدیم محلے تک کا فاصلہ تقریباً 25 کلومیٹر تھا، جس کا مطلب تھا کہ ہمارے پاس مشن کے آخری نکات پر بات کرنے کے لیے ابھی آدھا گھنٹہ موجود تھا۔ "راستے میں سیکیورٹی کافی سخت ہے،" رامین نے آئینے میں پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "حرمِ مطہر کے قریب پہنچتے ہی چیکنگ بڑھ

جائے گی۔ زکیہ! تم اپنا شناختی کارڈ اور فیکٹری کا پاس تیار رکھنا، اگر کسی ناکے پر روکا گیا تو ہم تمہیں ایک فیملی ممبر کے طور پر پیش کریں گے۔"زکیہ نے اپنے بیگ کی زپ چیک کی اور سر ہلا دیا۔ "فکر نہ کریں، میرے کاغذات مکمل ہیں۔"میں نے کہا زکیہ، تم نے وہاں خواتین کے حصے میں رہنا ہے اور آغا شمس کے ہر لفظ پر نظر رکھنی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ اپنی تقریر میں کن 'خفیہ اشاروں' کا استعمال کرتا ہے۔"زکیہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا، "میں پوری کوشش کروں گی کہ اس کی باتوں کے پیچھے چھپے اصل زہر کو پہچان سکوں۔"گاڑی اب شہر کے گنجان آباد علاقوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ باہر مشہد کی سڑکوں پر ایرانی جھنڈے اور مذہبی بینرز لٹکے ہوئے تھے، اور ہر چوراہے پر پولیس کی موجودگی ماحول کی سنگینی کا پتہ دے رہی تھی۔ ہم 25 کلومیٹر کا یہ سفر طے کر رہے تھے، جہاں ہر کلومیٹر ہمیں ایک بڑے خطرے کے قریب لے جا رہا تھا۔ تقریباً پینتیس منٹ کی مسافت کے بعد گاڑی مشہد کے جدید حصے سے نکل کر ان قدیم گلیوں میں داخل ہو گئی جہاں تاریخ سانس لیتی محسوس ہوتی تھی۔ نوغان کی بستی اپنی مخصوص پہچان رکھتی ہے؛ مٹیالے رنگ کی پرانی عمارتیں، لکڑی کے بوسیدہ دروازے اور اتنی تنگ گلیاں کہ جہاں گاڑی گزارنا ایک امتحان سے کم نہ تھا۔رامین نے بڑی مہارت سے ایک کھلی جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی جو امام بارگاہ سے تقریباً دو گلیوں کے فاصلے پر تھی۔ گاڑی سے اترتے ہی مشہد کی مخصوص مٹی اور پرانے فنِ تعمیر کی خوشبو نے ہمارا استقبال کیا۔

"یہاں سے ہمیں پیدل چلنا ہوگا،" میں نے اپنی جیکٹ درست کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ زکیہ نے اپنی چادر کو مزید مضبوطی سے اوڑھا اور ہم ایک فیملی کے روپ میں گلیوں کی طرف بڑھے۔ابھی ظہر کا وقت ہو رہا تھا اور مجلس مغرب کے بعد تھی۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا، اس لیے ہم نے طے کیا کہ براہِ راست امام بارگاہ جانے کے بجائے پہلے ارد گرد کے ماحول کی ریکی (Reconnaissance) کی جائے۔ ذیشان بھائی! وہ سامنے ایک چھوٹا سا قدیم ڈھابہ ہے،" رامین نے ایک نیلی ٹائلوں والے چھوٹے سے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا جس کے باہر لکڑی کے تخت بچھے تھے۔ "وہاں سے امام بارگاہ کا مرکزی گیٹ صاف نظر آتا ہے۔"ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں کی مخصوص ایرانی چائے اور 'آب گوشت' کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے کھانا آرڈر کیا اور خاموشی سے بیٹھ کر مشاہدہ کرنے لگے۔ ڈھابے پر بیٹھے لوگ مقامی فارسی لہجے میں سیاست اور بڑھتی ہوئی مہنگائی پر گفتگو کر رہے تھے، لیکن ہماری توجہ اس بلند و بالا عمارت پر تھی جہاں شام کو 'خاموش زلزلہ' آنے والا تھا۔میں نے لقمہ توڑتے ہوئے سرگوشی کی۔۔ زکیہ! تم کھانا ختم کر کے خواتین والے راستے سے اندر جاؤ۔ وہاں نماز پڑھو اور دیکھو کہ عورتوں کے حصے میں کیا سرگرمیاں ہیں۔ کیا وہاں بھی کوئی خاص قسم کا لٹریچر یا اشتہارات تقسیم ہو رہے ہیں؟"زکیہ نے گوشت چباتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں سمجھ گئی، میں وہاں کی سیکیورٹی اور خواتین کے درمیان ہونے والی باتوں پر نظر رکھوں گی۔"میں نے رامین کی طرف دیکھا، "ہم دونوں مردوں والے حصے میں الگ الگ داخل ہوں گے۔ نماز وہیں ادا کریں گے اور دیکھیں گے کہ منبر کے گرد کون لوگ موجود ہیں۔ نماز کے بعد ہم وہاں زیادہ دیر نہیں رکیں گے تاکہ شک نہ ہو۔ ہم واپس باہر نکل کر اسی قریبی پارک میں ملیں گے جہاں سے امام بارگاہ کا عقبی راستہ (Back exit) نظر آتا ہے۔"

کھانا ختم کر کے ہم نے بل ادا کیا اور اپنے پلان کے مطابق الگ ہو گئے۔ میں اور رامین تھوڑے فاصلے سے امام بارگاہ کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔ اندر کا ماحول عقیدت اور احترام سے بھرپور تھا۔ قدیم طرزِ تعمیر، بلند ستون اور دیواروں پر لگی کالی مخملی چادریں ایک خاص ہیبت طاری کر رہی تھیں۔ میں نے ایک ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کی، جبکہ رامین دوسری صف میں موجود تھا۔ نماز کے بعد ہم نے تقریباً آدھا گھنٹہ وہیں گزارا، مختلف زاویوں سے اندرونی نظام کو دیکھا، لیکن بظاہر کوئی ایسی مشکوک چیز نظر نہیں آئی جس پر فوراً ہاتھ ڈالا جا سکے۔طے شدہ وقت پر ہم باہر نکلے اور مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے اس چھوٹے سے پارک میں پہنچے جہاں زکیہ پہلے سے ایک بنچ پر بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ پارک سے امام بارگاہ کا وہ حصہ صاف نظر آ رہا تھا جہاں سے مغرب کو آغا شمس کی آمد متوقع تھی۔زکیہ نے اپنی چادر کو درست کیا اور سرگوشی کے انداز میں اپنی رپورٹ دینی شروع کی۔"نماز کے دوران میں نے خواتین کے پورے حصے کا بغور معائنہ کیا،" زکیہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا، "لیکن سچ تو یہ ہے کہ بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ کوئی مشکوک لٹریچر نہیں، نہ ہی کوئی ایسی سرگرمی جو شک پیدا کرے۔ عورتیں عام زائرین کی طرح دعاؤں اور زیارت میں مصروف ہیں۔ مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔"میں نے سر ہلایا، "ہمیں بھی مردوں کے حصے میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں ملی۔ پہرے دار الرٹ ضرور ہیں، لیکن وہ صرف نظم و ضبط برقرار رکھ رہے ہیں۔ لگتا ہے آغا شمس نے اپنی اصلیت کو بہت گہری تہوں میں چھپا رکھا ہے۔"ہم تینوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے، اور ہماری گفتگو کا رخ ایران کے موجودہ جنگی حالات کی طرف مڑ گیا۔ اس وقت مشہد کی فضا میں ایک عجیب سی گھٹن تھی، جیسے بارود کی بو ہر سو پھیلی ہوئی ہو۔رامین نے اپنے فون کی سکرین میری طرف کی، جہاں تہران سے آنے والی ایک تازہ ترین خفیہ الرٹ گردش کر رہی تھی۔ذیشان بھائی، اب یہ محض افواہیں نہیں رہیں۔ پچھلے 72 گھنٹوں میں حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ ایران کی سپریم نیشنل سیکیورٹی کونسل نے 'ریڈ الرٹ' جاری کر دیا ہے۔ خبر ہے کہ خلیجِ فارس میں طیارہ بردار بحری جہازوں کی پوزیشن بدل چکی ہے اور مغربی طاقتوں نے تہران کے سفارتی چینلز کو آخری وارننگ دے دی ہے۔"پھر رامین نے اپنے فون پر مڈل ایسٹ کی تازہ ترین لائیو اپڈیٹس دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "بھائی، صرف مغرب ہی نہیں، اب تو پورے خطے کی تپش یہاں محسوس ہو رہی ہے۔ سعودی عرب نے خلیج میں اپنی سیکیورٹی فورسز کو 'ہائی الرٹ' پر رکھا ہے اور ان کا بیانیہ ہے کہ وہ اس جنگ میں کسی کا ساتھ نہیں دیں گے، لیکن ان کی خاموشی بہت کچھ کہہ رہی ہے۔

دوسری طرف عراق اور شام کی سرحدوں پر امریکی ڈرونز کی پروازیں غیر معمولی حد تک بڑھ گئی ہیں، جیسے وہ کسی بڑے حملے کے لیے 'کوریڈور' تیار کر رہے ہوں۔"زکیہ نے فکر مندی سے پوچھا، "اور ہمارے اندرونی حالات؟ کیا لوگ اس پروپیگنڈے کا شکار ہو رہے ہیں؟""یہی تو سب سے بڑا خطرہ ہے،" میں نے جواب دیا۔ "پچھلے تین دنوں میں مشہد اور زاہدان کے کچھ علاقوں میں سنی اور شیعہ کے درمیان مصنوعی تناؤ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سوشل میڈیا پر ایسی جعلی ویڈیوز وائرل کی جا رہی ہیں جن کا مقصد عقیدت مندوں کو آپس میں لڑانا ہے۔ دشمن جانتا ہے کہ اگر ایران کو باہر سے نہیں گرایا جا سکتا، تو اسے اندرونی طور پر مسلکی فسادات کی آگ میں جھونک دیا جائے۔"رامین نے تائید میں سر ہلایا۔

"بالکل بھائی، اور آغا شمس الدین جیسے لوگ اسی 'خلا' کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں بظاہر تو دین کی بات کریں گے، لیکن ان کے الفاظ کے پیچھے چھپا ہوا زہر سنی اور شیعہ کے درمیان اس دیوار کو گرانے کے لیے ہے جو اب تک دشمن کا راستہ روکے ہوئے تھی۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ جب باہر سے پہلا میزائل گرے، تو اندر مشہد کی سڑکوں پر بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہو۔"

زکیہ کی آنکھوں میں عزم کی جھلک نمایاں تھی۔ "مطلب یہ کہ آج کی مجلس صرف ایک مذہبی اجتماع نہیں، بلکہ انٹیلی جنس کی زبان میں ایک 'لانچنگ پیڈ' ہے جہاں سے فتنے کی چنگاری چھوڑی جانی ہے۔"

اب سورج مکمل طور پر ڈھل چکا تھا اور افق پر سرخی پھیل گئی تھی۔ مغرب کی اذان کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ پارک کی روشنیاں ٹمٹمانے لگیں اور زائرین کا ایک بڑا سیلاب دوبارہ امام بارگاہ کی طرف بڑھنے لگا۔"وقت آگیا ہے،" میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا، "اب آغا شمس کی آمد ہو گی۔ رامین! تم عقبی راستے پر نظر رکھو، زکیہ تم دوبارہ اندر جاؤ۔ میں مرکزی ہال میں رہوں گا۔ آج رات ہمیں اس مکر کے جال کو ہر صورت تار تار کرنا ہے۔"مغرب کی نماز کے فوراً بعد امام بارگاہ کا وسیع ہال عقیدت مندوں سے بھر چکا تھا۔ وہاں کا ماحول سیاہ چادروں، علم اور بلند ستونوں کی وجہ سے ایک خاص ہیبت طاری کر رہا تھا۔ ایران میں مجلس کا آغاز عموماً 'پیش خوانی' سے ہوتا ہے، جس میں کچھ سوز خواں بغیر مائیک کے مرثیہ خوانی کرتے ہیں تاکہ لوگ ہمہ تن گوش ہو جائیں۔ اس کے بعد ایک قاری نے سورہِ دہر کی تلاوت کی، جس کی گونج پورے ہال میں سنائی دے رہی تھی۔ میں اور رامین مردوں کے حصے میں الگ الگ ستونوں کے پاس بیٹھ گئے، جبکہ زکیہ خواتین کے لیے مخصوص بالائی گیلری (زنانہ) میں چلی گئی تھی۔ وہاں عورتوں میں ایک عجیب سی سرگوشی تھی، جیسے وہ کسی بڑے اعلان کا انتظار کر رہی ہوں۔

کچھ ہی دیر میں اسٹیج (منبر) پر آغا شمس الدین نمودار ہوا۔ اس کا سفید عمامہ، لمبی سیاہ قبا اور چہرے پر مصنوعی متانت اسے ایک پہنچا ہوا بزرگ ثابت کر رہی تھی۔ اس نے خطبے کا آغاز 'نہد و نصلی' سے کیا اور پھر بڑی مہارت سے اپنی تقریر کا رخ سیاسی اور سماجی حالات کی طرف موڑ دیا۔میرے عزیزو! ہم امن کے علمبردار ہیں،" اس نے دھیمی اور رقت آمیز آواز میں کہا، "اسلام سلامتی کا دین ہے۔ لیکن یاد رکھو، وہ امن جو غلامی کی زنجیروں میں لپٹا ہو، وہ امن نہیں بلکہ موت ہے۔ آج جب سرحدوں پر بادل گرج رہے ہیں، تو ہمارے حکمران ہمیں صبر کی تلقین کر رہے ہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں، کیا صبر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی معیشت کو تباہ ہوتے دیکھیں؟ کیا صبر یہ ہے کہ بیرونی دشمن کے ڈر سے ہم اپنے ہی گھر کے اندر گھٹ کر رہ جائیں؟"اس کے الفاظ بہت ہوشیارانہ تھے۔ وہ براہِ راست حکومت کے خلاف نہیں بول رہا تھا، بلکہ 'مصلحت پسندی' اور 'کمزوری' کا طعنہ دے کر لوگوں کے جذبات بھڑکا رہا تھا۔

"حکومت کی پالیسیاں شاید کاغذوں پر ٹھیک ہوں،" اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جاری رکھا، "لیکن جب ایک باپ اپنے بچے کو بھوکا دیکھتا ہے تو اسے 'عالمی سازشوں' سے فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اتحاد ہی بقا ہے، لیکن کیا اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے حقوق کی آواز دبا دیں؟ دشمن باہر نہیں، دشمن ہماری اپنی صفوں میں موجود وہ مصلحت ہے جو

ہمیں خاموش رکھتی ہے۔" ہال میں موجود نوجوانوں کے چہرے تپنے لگے تھے۔ وہ امن کی بات بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ریاست کے خلاف ایک 'خاموش بغاوت' کا بیج بھی بو رہا تھا۔ وہ نظام کی نفی براہِ راست نہیں کر رہا تھا، بلکہ نظام چلانے والوں کی اہلیت پر سوال اٹھا کر عوام کا اعتماد متزلزل کر رہا تھا۔آغا شمس الدین کے لہجے میں اب ایک خاص قسم کا 'جلال' آ چکا تھا۔ اس نے اپنے چشمے کو ٹھیک کیا اور مجمعے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ہال میں موجود لوگ سانس روکے اس کے اگلے الفاظ کا انتظار کر رہے تھے۔اس نے بڑی چالاکی سے مذہبی عقیدت کو سیاسی بے چینی کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔میرے عزیزو! میں دیکھ رہا ہوں کہ مشہد کے بازاروں میں ہو کا عالم ہے۔ تہران کے ایوانوں میں بیٹھے لوگ اعداد و شمار کی جادوگری دکھاتے ہیں، لیکن کیا ان اعداد و شمار سے کسی غریب کا چولہا جلتا ہے؟ ریال کی گرتی ہوئی قدر اور کمر توڑ مہنگائی کیا کوئی 'عالمی سازش' ہے یا ہمارے اپنے حکمرانوں کی نااہلی؟ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہم ایک عظیم ریاست ہیں، لیکن کیا وہ ریاست عظیم ہو سکتی ہے جہاں جوان ڈگریاں ہاتھ میں لیے در در کی خاک چھان رہے ہوں؟" اس نے ایک گہرا سانس لیا اور مجمعے کی نبض ٹٹولتے ہوئے جاری رکھا: "ہم امن چاہتے ہیں، ہم اپنے پڑوسیوں سے صلح چاہتے ہیں۔ اسلام نے تو ہمیں ہمسائے کے حقوق سکھائے ہیں، پھر یہ کیسی پالیسیاں ہیں جو ہمیں پوری دنیا سے کاٹ کر تنہا کر رہی ہیں؟ یاد رکھو، جب معیشت دم توڑتی ہے تو غیرت بھی نیلام ہونے لگتی ہے۔ حکومت ہمیں 'صبر' کا درس دیتی ہے، لیکن کیا یہ وہی صبر ہے جو ہمیں اپنے بچوں کا مستقبل اندھیرے میں دھکیلنے پر مجبور کرے؟"

اس نے مجمعے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے آواز دھیمی کی: "ہمیں آپس میں لڑنا نہیں ہے، سنی ہو یا شیعہ، ہم سب اس مہنگائی اور نااہلی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ہمارا دشمن وہ نہیں جو سرحد کے پار ہے، بلکہ ہمارا اصل دشمن وہ 'نظام' ہے جو ہمیں بولنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمیں متحد ہونا ہے، مگر اس جابرانہ خاموشی کے خلاف جو ہمیں زندہ درگور کر رہی ہے۔ اگر آج ہم نے امن کے نام پر اس ناانصافی کو قبول کر لیا، تو کل تاریخ ہمیں بزدل کہے گی۔"

اس کی تقریر کا یہ حصہ عوامی جذبات کو آگ لگا رہا تھا۔ وہ بظاہر "امن اور بھائی چارے" کی بات کر رہا تھا، لیکن حقیقت میں وہ ریاست کے ستونوں کو ہتھوڑے مار رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، ان کی آنکھوں میں حکومت کے خلاف غصہ اور آغا کے لیے اندھی عقیدت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔لوگوں نے 'لبیک' کے نعرے بلند کیے، مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنی ہی بربادی کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں۔ رامین نے میری طرف دیکھا، اس کی پیشانی پر پسینہ تھا—وہ ان کوڈز کی سنگینی کو سمجھ چکا تھا۔

جیسے ہی عشاء کا وقت قریب آیا، اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ ایران میں مجلس کا اختتام عموماً 'دعاِ امامِ زمانہ' اور شہداء کے درجات کی بلندی کی دعا پر ہوتا ہے۔ ہال میں ایک گداز سی کیفیت طاری ہو گئی، لیکن میری اور رامین کی نظریں دعا کے دوران بھی ان 'مخصوص چہروں' پر تھیں جو منبر کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر مجمعے کی نگرانی کر رہے تھے۔دعا ختم ہوتے ہی امام بارگاہ میں ایک دم ہلچل مچ گئی۔ لوگ عقیدت میں دیوانہ وار منبر کی طرف لپکے۔ آغا شمس الدین منبر سے نیچے اترا تو اس کے گرد مسلح محافظوں کا ایک حصار بن گیا، لیکن اس کے باوجود لوگ اس کے ہاتھ چومنے اور اسے اپنی

عرضیاں دینے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔
"یا آغا! دعا کریں،" "آغا صاحب! ہمیں راستہ دکھائیں،" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ بڑے تپاک سے لوگوں کے سروں پر ہاتھ رکھ رہا تھا،ایران میں رواج ہے کہ ایسی بڑی مجالس کے بعد جید علماء ایک مخصوص 'مضافتی حجرے' یا امام بارگاہ سے ملحقہ ایک بیٹھک میں تشریف لے جاتے ہیں، جہاں خاص عقیدت مند ان سے مسائل پوچھتے ہیں اور ان کے ہاتھ چوم کر دعا لیتے ہیں۔میں نے رامین کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے۔ ہم نے اپنی چادروں کے پلوؤں کو تھوڑا اوپر کر کے چہروں کو اس طرح چھپایا جیسے عقیدت کی وجہ سے کیا جاتا ہے، تاکہ وہاں لگے سی سی ٹی وی کیمرے یا آغا کے مسلح محافظ ہمارے نقوش نہ پہچان سکیں۔ ہم خاموشی سے اس ہجوم کا حصہ بن گئے جو آغا کے پیچھے اس کے 'خلوت کدے' کی طرف بڑھ رہا تھا۔اندر کا منظر باہر کے شور سے بالکل مختلف تھا۔ دیواروں پر قیمتی ایرانی قالین لٹکے ہوئے تھے اور فرش پر بچھی گاؤ تکیوں والی نشستوں پر آغا شمس الدین نہایت اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد چند مخصوص لوگ تھے، جن کے حلیے عام زائرین جیسے نہیں بلکہ کسی منظم گروہ کے کارندوں جیسے لگ رہے تھے۔میں اور رامین ایک ستون کی اوٹ میں، دوسرے عقیدت مندوں کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئے۔ لوگوں کے سوالات وہی روایتی تھے جو عموماً ایسی محفلوں میں ذاکرین سے پوچھے جاتے ہیں۔ ایک بوڑھے شخص نے لرزتی آواز میں پوچھا، "آغا! کیا اس نفسا نفسی کے دور میں زیارتِ امام کا ثواب وہی رہے گا جو پہلے تھا؟"آغا نے بڑی متانت سے جواب دیا، "بابا! تنگی کے دور میں کی گئی عبادت کا اجر دگنا ہوتا ہے۔ بس اپنے عقیدے کی حفاظت کرو۔"ایک نوجوان طالب علم نے سوال کیا، "آغا! کیا رزق کی تلاش میں ملک چھوڑنا گناہ ہے؟ یہاں حالات بہت کٹھن ہوتے جا رہے ہیں۔"
آغا کا جواب: "ہجرت سنتِ انبیاء ہے، لیکن اگر تم اپنا گھر اس لیے چھوڑ رہے ہو کہ یہاں کے 'مصلحت پسند' حکمرانوں نے تمہارا رزق چھین لیا ہے، تو یاد رکھو کہ زمین اللہ کی وسیع ہے۔ مگر لڑنا بھی تو ہم نے یہیں ہے، بھاگ کر کدھر جاؤ گے؟"ایک چھوٹے بچے کے باپ نے پوچھا، آغا! میری طبیعت ناساز رہتی ہے اور ڈاکٹر نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے، کیا میں فدیہ دے کر قضا کر سکتا ہوں؟"آغا کا جواب: " دین میں تنگی نہیں ہے۔ اگر جان کا خطرہ ہو تو روزہ واجب نہیں رہتا۔ آپ ہر روزے کے بدلے مسکین کو کھانا کھلا دیں (فدیہ دیں)، اللہ آپ کی نیت کا اجر دے گا۔ایک دکاندار نے پوچھا، "آغا! آج کل بازار میں جو درآمد شدہ اشیاء آ رہی ہیں، ان کے اجزاء کے بارے میں شک ہوتا ہے۔ کیا محض 'حلال' کے لیبل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟"آغا کا جواب: "اگر وہ مسلمان ملک سے آئی ہے تو 'سوق المسلمین' (مسلمانوں کے بازار) کا قاعدہ لاگو ہوگا، آپ اسے حلال سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر شک بہت زیادہ ہو تو احتیاط بہتر ہے، کیونکہ مشکوک لقمہ دل کو مردہ کر دیتا ہے۔"ایک نوجوان طالب علم نے تھوڑی جھجک کے ساتھ پوچھا، "آغا! کیا ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اسی 'رہبر' کی بات مانے جو تخت پر بیٹھا ہے؟ کیا ہم اپنے مقامی علماء کی تقلید نہیں کر سکتے جو ہمیں زیادہ بہتر سمجھتے ہیں؟"آغا کا جواب: "اطاعت صرف معصومؑ کی واجب ہے، باقی سب انسان خطا کار ہیں۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے علاقے کا عالم تمہیں زیادہ سچائی دکھا رہا ہے، تو اندھی تقلید سے بچو۔ حق وہاں ہے جہاں عدل ہے، نہ

کہ وہاں جہاں صرف طاقت ہے۔" (یہ براہِ راست مرکزی قیادت کے خلاف اکساوا تھا)۔ایک بوڑھے نے روتے ہوئے پوچھا، "آغا! فتنوں کا دور ہے، کیا یہ 'ظہور' کی نشانیاں ہیں؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
آغا کا جواب: " انتظار کا مطلب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا نہیں ہے۔ انتظار کا مطلب ہے زمین کو تیار کرنا۔ جب تک ہم اپنے اندر کے 'یزیدیوں' (حکمرانوں کی طرف اشارہ) کو نہیں نکالیں گے، تب تک عدل کا سورج کیسے طلوع ہوگا؟ تیاری کرو، کیونکہ وقت قریب ہے۔"رامین نے کمال مہارت سے اپنے موبائل کو دعا کی کتاب کے نیچے چھپا کر دو تین کلوز شاٹ لیے اور آغا کے قریب بیٹھے ان مخصوص کارندوں کے چہرے بھی محفوظ کر لیے جو بظاہر مرید تھے مگر ان کی عقابی نظریں پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ایک جلوس آرگنائزر نے تھوڑی تلخی سے پوچھا، "آغا! حکومت اب مجلسوں اور جلوسوں کے لیے 'رجسٹریشن' اور 'سیکیورٹی کلیئرنس' کے نام پر ہمیں تنگ کر رہی ہے۔ ہر جگہ کیمرے لگائے جا رہے ہیں اور سادہ لباس اہلکار ہماری تلاشی لیتے ہیں۔ کیا یہ ہماری توہین نہیں؟آغا شمس کا جواب: """بیٹا! سیکیورٹی کے نام پر جو 'حصار' کھڑا کیا جا رہا ہے، وہ دراصل حفاظت کے لیے نہیں بلکہ نگرانی (Surveillance) کے لیے ہے۔ یہ لوگ ڈرتے ہیں کہ کہیں حسینی فکر بیدار نہ ہو جائے۔ وہ کیمرے آپ کی حفاظت کے لیے نہیں، آپ کے چہروں کی شناخت کے لیے ہیں۔ عزاداری ہماری شہ رگ ہے۔
عزاداری آزاد ہونی چاہیے، کسی سرکاری اجازت نامے کی محتاج نہیں۔ جب ریاست عقیدت مندوں کی تلاشی لینے لگے، تو سمجھ لو کہ وہ آپ پر بھروسہ نہیں کرتی۔"ایران میں یہ سیکیورٹی کے سخت اقدامات اس لیئے ہیں تاکہ دہشت گردی نہ ہو لیکن

ان سوالات اور جوابات نے کمرے میں موجود لوگوں کے ذہنوں میں حکومت کے خلاف ایک خاموش نفرت بھر دی تھی۔ وہ ہر دینی مسئلے کو گھما پھرا کر سیاسی عدم اعتماد پر لے آتا تھاایک شخص نے دھیمی آواز میں پوچھا، "آغا! میرا ایک رشتہ دار مجھ سے قطع تعلق کر چکا ہے، کیا میں بھی اس سے بدلہ لوں یا صلح کی کوشش جاری رکھوں؟"آغا شمس کا جواب: "قطع رحمی گناہِ کبیرہ ہے۔ تم اپنی طرف سے سلام کا دروازہ کھلا رکھو۔ مومن وہ ہے جو جوڑتا ہے، توڑتا نہیں ہے۔ تم اپنا حق ادا کرو، اللہ اس سے اس کا حساب لے گا۔"اس سوال کے دوران آغا شمس الدین بالکل ایک مصلح اور درویش صفت انسان لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر موجود اطمینان اور لہجے کی مٹھاس کسی کو یہ شک نہیں ہونے دے رہی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جو پسِ پردہ دہلی کے رابطوں میں ہے۔ حجرے کی فضا اب تبدیل ہو رہی تھی۔ عام عقیدت مند اہستہ اہستہ رخصت ہو رہے تھے اور آغا شمس الدین نے اپنی تسبیح روک کر اپنے خاص معتمدین کی طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی۔
رامین، اب نکلنا ہوگا،" میں نے سرگوشی کی۔ "اب اگر یہاں رکے تو ہم نمایاں ہو جائیں گے۔ آغا کی نظریں اب ہر چہرے کو پرکھ رہی ہیں۔"ہم نے نہایت احتیاط سے اپنے قدم سمیٹے، اپنی چادروں کے پلو چہروں پر ذرا اور کس لیے اور عام زائرین کی طرح نظریں جھکائے، خاموشی سے حجرے کی بھاری دہلیز پار کر لی۔ باہر برآمدے میں کھڑے پہرے داروں نے ایک لمحے کے لیے ہماری طرف دیکھا، مگر ہماری جھکی ہوئی نظروں اور فقیرانہ حلیے نے انہیں مطمئن کر دیا۔ جیسے ہی

ہم امام بارگاہ کے بیرونی آہنی گیٹ پر پہنچے، میں نے تیزی سے موبائل نکال کر زکیہ کو ایک لفظی میسج کیا: "باہر آؤ۔" ابھی ہم گیٹ سے چند قدم ہی دور ہوئے تھے کہ سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ایک سایہ تیزی سے خواتین والے راستے سے برآمد ہوا۔ یہ زکیہ تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر کوئی اشارہ نہیں کیا، بس خاموشی سے ہمارے پیچھے ایک محفوظ فاصلے پر چلنے لگی۔ ہم تینوں نوغان کی ان پراسرار اور تنگ گلیوں میں ایک سائے کی طرح تیر رہے تھے۔ کچی دیواروں سے اٹھتی پرانی لکڑی کے جلنے کی بو اور دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس رات کی سنگینی میں اضافہ کر رہی تھیں۔
تقریباً تین منٹ کی تیز مسافت کے بعد ہم اس اندھیرے گوشے میں پہنچے جہاں رامین کی گاڑی کسی بے جان ڈھانچے کی طرح کھڑی تھی۔ رامین نے تیزی سے آگے بڑھ کر ریموٹ سے گاڑی ان لاک کی۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھا اور زکیہ بجلی کی سی تیزی سے پچھلی نشست پر سمٹ گئی۔ رامین نے جیسے ہی چابی گھمائی، انجن ایک دبی ہوئی گرج کے ساتھ اسٹارٹ ہوا۔ اس نے ہیڈ لائٹس ابھی آن نہیں کی تھیں تاکہ ہم اندھیرے میں ہی اس گلی سے نکل سکیں۔ گاڑی رینگتی ہوئی جیسے ہی مشہد کی مرکزی شاہراہ کی روشنیوں میں پہنچی، رامین نے ایک لمبا سانس لیا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ میں نے پچھلی نشست کی طرف مڑ کر زکیہ کی آنکھوں میں دیکھا، جو ابھی بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "زکیہ! اب بتاؤ، اندر خواتین کے حصے میں کیا رنگ تھا؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
زکیہ نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی چادر درست کرتے ہوئے جواب دیا، "ذیشان صاحب! وہاں عقیدت کا جو عالم ہے، وہ خطرناک حد تک گہرا ہے عورتیں آغا شمس الدین کو محض ایک عالم نہیں بلکہ کسی 'مسیحا' کی طرح دیکھ رہی ہیں۔ ان کی ہر بات کو وحی کی طرح سنا جا رہا تھا۔"
اس نے تھوڑا آگے جھک کر اپنی آواز مزید دھیمی کر لی، "ایک اور اہم بات... وہاں آغا شمس کی بیوی اور بیٹی بھی موجود تھیں۔ عورتیں دیوانہ وار ان کے ہاتھ چوم رہی تھیں، جیسے ان کا لمس باعثِ برکت ہو۔ میں نے کمال مہارت سے ہجوم کا فائدہ اٹھایا اور ان دونوں کی کچھ بہت واضح تصویریں بھی کھینچ لی ہیں۔"
"بہت خوب! یہ تو کمال کر دیا تم نے،" میں نے اس کی مستعدی کی تعریف کی۔ "ان کا چہرہ سامنے آنا ہمارے لیے بہت بڑا ثبوت ثابت ہوگا۔" زکیہ نے جاری رکھا، "عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ آغا شمس ان کے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔ کوئی کہہ رہی تھی کہ انہوں نے ان کے گھر کا مہینوں کا راشن بندوبست کیا ہے، تو کوئی بتا رہی تھی کہ مشکل وقت میں آغا نے انہیں نقد رقم بھی دی ہے۔ وہ غریبوں کا بہت خیال رکھتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ان پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔" رامین نے آئینے میں زکیہ کو دیکھا اور ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا، "مطلب یہ کہ آغا نے صرف مردوں کو نہیں، بلکہ پورے کے پورے خاندانوں کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ جب گھر کی عورتیں اس نظریے پر ایمان لے آئیں، تو مردوں کو اشتعال دلانا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "بالکل، جب عقیدت پیٹ اور جیب سے جڑ جائے، تو پھر عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ ہمیں اس جال کو ہر صورت توڑنا ہوگا۔" "زکیہ! ویسے ماننا پڑے گا، تمہیں وہاں ڈر نہیں لگا؟ اتنی سخت سیکیورٹی کے بیچ تصویریں کھینچنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔" زکیہ نے ایک

گہرا سانس لیا اور اپنی چادر کو درست کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: "رامین صاحب! جب مقصد جان سے پیارا اور بڑا ہو جائے، تو پھر ڈر راستہ چھوڑ دیتا ہے۔

جب ایک بیٹی کے سامنے اس کا باپ کا ناحق خون بہے تو پھر خوف ختم ہو جاتا ہے میرے سامنے صرف اپنے باپ کا وہ ادھورا مشن تھا، اور اس کے آگے مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔"رامین نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لہجے میں تھوڑی بے تکلفی پیدا کی۔ "اچھا، یہ تو بتاؤ... کیا اس انتقام کی تپش میں کبھی وہ عام سی خواہشیں سر نہیں اٹھاتیں؟

کیا تمہارا کبھی جی نہیں کرتا کہ تم بھی عام لڑکیوں کی طرح خواب دیکھو، شاپنگ کرو یا مستقبل کی باتیں کرو؟ کیا ہر وقت یہ بارود، فائلیں اور انتقام ہی اب تمہاری زندگی ہے؟زکیہ کے لبوں پر ایک اداس مگر دلفریب مسکراہٹ آئی۔اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا، جیسے وہ میری موجودگی کو محسوس کر رہی ہو، پھر دھیمی آواز میں رامین سے مخاطب ہوئی خواب تو سب دیکھتے ہیں رامین صاحب۔ شاپنگ اور عام دوستانہ باتیں میں اپنے ہاسٹل کی سہیلیوں کے ساتھ کر لیتی ہوں۔ لیکن آپ لوگوں کے ساتھ میرا رشتہ صرف اس مشن کی حد تک ہے۔ جس دن میرے باپ کا بدلہ پورا ہو گیا، میں اپنی اسی نارمل زندگی کی طرف لوٹ جاؤں گی۔"رامین نے کچھ دیر خاموشی سے اس کی بات سنی، پھر بڑے تپاک اور ایک خاص اپنائیت بھرے لہجے میں مخاطب ہوا: "زکیہ! میں تمہارے عزم کی قدر کرتا ہوں، ویسے اگر کبھی تمہارا جی چاہے کہ تم کسی بھی موضوع پر گفتگو کرو، کوئی عام سی بات شیئر کرنا چاہو، یا بس اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہو... تو یاد رکھنا، ہم یہاں موجود ہیں۔ تم مجھ سے کسی بھی عنوان پر بلا جھجھک بات کر سکتی ہو، ہم صرف بندوق چلانے والے لوگ نہیں ہیں، ہم تمہارے مخلص دوست بھی ہیں۔"گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی زکیہ نے اپنی سیاہ چادر کے پلو کو انگلیوں میں مروڑا، اس کے لہجے میں اب ایک ایسی شرارت آمیز لہر تھی جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے رامین کی طرف تھوڑا سا جھک کر، آواز کو اتنا دھیما کیا جیسے وہ کوئی بہت بڑا راز فاش کر رہی ہو، مگر اس کی نظریں مسلسل سامنے والے آئینے میں میرے عکس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ویسے رامین صاحب!آج آپ کے لہجے میں یہ رنگینیاں، شاپنگ کے تذکرے اور خوابوں کی باتیں... سچ کہوں تو مجھے تھوڑی حیرت ہو رہی ہے،" زکیہ نے دبی دبی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔"ذرا اپنے ان 'فولادی دوست' (ذیشان) کا بھی تو خیال رکھیں۔انہیں ایسی باتیں بالکل پسند نہیں، وہ تو ان چیزوں کو وقت کا ضیاع اور مشن کی توہین سمجھتے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے نظم و ضبط کی تلوار ہم پر چل جائے۔"آپ ذرا اپنے دوست کا مزاج صحیح کریں، کہیں ہماری گفتگو ان کے نظم و ضبط کے آہنی پردوں کو نہ چیر دے۔"کیونکہ انکے دماغ میں تو اب بھی کاظم اور آغا شمس کے نیٹ ورک چل رہے ہوں گے

میں جو اب تک خاموشی سے مشہد کی رات کے سحر میں کھویا ہوا تھا، ان کی باتیں سن کر دل ہی دل میں مسکرایا۔ مجھے فوراً وہ کل ریستوران کے اندر ہونے والی گفتگو یاد
آگئی جب میں نے زکیہ کو

ذرا سخت لہجے میں 'فضول باتوں' سے روکا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ زکیہ اب اپنے لفظوں کے تیروں سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنا بدلہ لے رہی ہے ۔ میرے ذہن میں ایک خیال کوندا کہ دیکھو، انتقام کی اس آگ میں جلتی ہوئی لڑکی کے اندر بھی ایک زندہ دل انسان چھپا ہے جو موقع پاتے ہی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ میں نے ایک گہرا اور اطمینان بخش سانس لیا، اپنے اندرونی سکون کو مجتمع کیا اور آہستہ سے گاڑی کی اندرونی لائٹ روشن کی۔ پیلے رنگ کی مدھم روشنی نے گاڑی کے اندرونی ماحول کو ایک دم بدل دیا۔ میں نے سیٹ سے ٹیک ہٹائی اور پیچھے مڑ کر زکیہ کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں اب ایک عجیب سی جھجک اور تجسس کا امتزاج تھا۔

"زکیہ ! تمہارے اس 'طنزِ لطیف' نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنی خاموشی توڑ دوں،" میں نے لہجے میں ایک دوستانہ وقار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ کل میں نے تمہیں ٹوکا تھا، لیکن وہ ایک مجاہد کی ضرورت تھی، ایک انسان کی فطرت نہیں۔ میری خاموشی کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ میں تمہارے جذبوں اور انسانی ضرورتوں سے ناواقف ہوں۔ "ہم نے ایک دوسرے کی ڈھال بننا ہے، زنجیر نہیں۔" میں نے ان دونوں کے چہروں پر پھیلی حیرت کو محسوس کیا اور پھر بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ علامہ اقبال کا وہ لافانی کلام دہرایا جس نے گاڑی کی فضا کو کسی خانقاہ جیسی پاکیزگی عطا کر دی:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

زکیہ، یہ شعر ہماری پوری زندگی کا نچوڑ ہے،" میں نے وضاحت کی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک مومن اپنے مخلص ساتھیوں اور دوستوں کے درمیان بیٹھا ہو، تو اسے ریشم کی طرح نرم، شفیق، ہمدرد اور خوش اخلاق ہونا چاہیے۔ لیکن جب وہی مومن میدانِ جنگ میں باطل کے سامنے کھڑا ہو، تب اسے فولاد بننا پڑتا ہے۔ ہم اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اس لیے یہاں تمہیں مجھ سے ڈرنے یا جھجکنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہاں ہم دوستوں کے حلقے میں ہیں۔" زکیہ کی آنکھوں میں ایک نئی چمک اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی، جیسے اسے پہلی بار مشہد کے اس اجنبی ماحول میں ایک گھر جیسی اپنائیت ملی ہو۔

ذیشان واہ... کیا کمال کا شعر ہے،" زکیہ نے دھیمی آواز میں دہرایا، جیسے وہ ان الفاظ کی مٹھاس کو اپنے اندر اتار رہی ہو۔ "آپ کے ملک کا یہ شاعر، علامہ اقبال... سچ میں کتنا بڑا پارکھ ہے انسانی جذبوں کا۔ کتنا خوبصورت نچوڑ نکالا ہے انہوں نے ایک مجاہد کی زندگی کا۔" رامین نے جوش سے گاڑی کا اسٹیرنگ تھپتھپایا۔ "دیکھا زکیہ ! میں نے کہا تھا نا کہ ذیشان بھائی کے پاس ہر تالے کی چابی ہوتی ہے۔ اب آپ کو یقین آ گیا ہو گا کہ ہم اپنے حلقۂ یاراں میں بالکل ریشم کی طرح نرم ہیں۔" زکیہ ہلکا سا مسکرائی، اس کی مسکراہٹ میں اب وہ پرانی جھجک نہیں تھی۔ "جی رامین صاحب، علامہ اقبال کے اس شعر نے تو جیسے میری ساری الجھن ہی ختم کر دی۔ اب مجھے اس فولادی نظم و ضبط سے ڈر نہیں لگے گا، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے پیچھے ایک ریشم جیسا دل دھڑک رہا ہے۔" گاڑی کی رفتار اب دھیمی ہو چکی تھی کیونکہ رامین نے اسٹیئرنگ

کو زکیہ کے ہاسٹل کی طرف موڑ دیا تھا۔رامین نے آئینے میں زکیہ کی طرف دیکھا اور تھوڑی فکر مندی سے پوچھا، "زکیہ! ہاسٹل میں دوسری لڑکیاں تم سے سوال تو کریں گی نا؟ پورا دن تم غائب رہیں، اگر کسی نے پوچھ لیا کہ کہاں تھیں، تو کیا جواب دو گی؟ کہیں کوئی شک تو نہیں کرے گا؟" زکیہ نے ایک پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "آپ فکر نہ کریں رامین صاحب! ہاسٹل میں میرا معمول سب کو معلوم ہے۔ اگر کسی نے پوچھا بھی تو میں کہہ دوں گی کہ میں پورا دن حرمِ امام علی رضاؑ میں زیارت اور دعا کے لیے گزار کر آئی ہوں۔ وہاں ویسے بھی اتوار کو اتنا رش ہوتا ہے کہ کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ میں وہاں سے کہیں اور بھی جا سکتی ہوں۔ وہاں کا سکون ہی میری سب سے بڑی گواہی بن جائے گا۔" بہترین کور (Cover) ہے،" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

کچھ منٹوں بعد رامین نے گاڑی کو ہاسٹل والی گلی کے دہانے پر، ایک اندھیرے گوشے میں روک دیا تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ زکیہ نے اترنے سے پہلے ہم دونوں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں احترام اور مشن کی کامیابی کا اطمینان تھا۔ "ذیشان صاحب، رامین صاحب! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا،" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے جذبات سے لبریز لہجے میں جواب دیا، "زکیہ، شکریہ تو ہمیں تمہارا ادا کرنا چاہیے! تم نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر جو وہاں معلومات اور تصویریں حاصل کی ہیں، وہ ہمارے مشن کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ تمہاری ہمت اور حاضر دماغی نے آج ثابت کر دیا کہ تم ایک بہترین سپاہی ہو۔ ہم تمہارے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔" زکیہ نے سر جھکا کر کہا، "شکریہ کی کوئی بات نہیں، میں بھی تو آپ کے اس سفر کی ساتھی ہوں۔ اللہ حافظ!" وہ گاڑی سے اتری اور تیزی سے گلی کے موڑ پر غائب ہو گئی۔ ہم نے اسے تب تک دیکھا جب تک وہ محفوظ طریقے سے ہاسٹل کے گیٹ کے اندر نہیں چلی گئی۔ رامین نے ایک گہرا سانس لیا، گیئر بدلا اور گاڑی کو دوسری سڑک پر ڈال دیا۔اب ہم واپس اپنے ہوٹل کی طرف بڑھ رہے تھے، جہاں ہمیں اس جمع شدہ (ڈیٹا) کا باریک بینی سے جائزہ لینا تھا۔ گاڑی کے اندر اب صرف انجن کی آواز تھی، مگر ہمارے ذہنوں میں ان فائلوں کے انکشافات گردش کر رہے تھے جو مشہد کی تقدیر بدلنے والے تھے۔

ہوٹل پہنچ کر ہم سیدھا اپنے کمرے میں چلے گئے کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی باہر کی دنیا کا شور تھم گیا، لیکن ہمارے ذہنوں میں آج کے مشن کی سنسناہٹ ابھی باقی تھی۔ میں نے میز پر رکھا اپنا مخصوص لیپ ٹاپ کھولا، جبکہ رامین نے مستعدی سے وہ میموری کارڈ اور موبائل نکال لیا جن میں آج کا سارا کچا چھٹا قید تھا۔ رامین، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس. خاموش بارود کو ترتیب دیں،" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

ہم دونوں میز کے گرد جم کر بیٹھ گئے۔ رامین نے کیبلز کنیکٹ کیں اور لیپ ٹاپ کی سکرین روشن ہوتے ہی تصاویر اور آڈیو فائلوں کا انبار سامنے آگیا۔ سب سے پہلے ہم نے ان تصاویر پر کام شروع کیا جو زکیہ اور رامین نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر لیں تھیں۔ میں نے سافٹ ویئر کے ذریعے ان تصاویر کو اینالائز (Analyze) کیا، پکسلز درست کیے اور آغا شمس الدین کی بیوی، بیٹی اور ان کے گرد موجود مشکوک کارندوں کے چہرے بالکل واضح کر دیے۔ ایک ایک چہرہ اب ہماری سکرین پر کسی مجرم کی طرح بول رہا تھا۔اس کے بعد باری آئی اس آڈیو ریکارڈنگ کی جو ہم نے مجلس اور حجرے کی

نشست کے دوران چھپ کر کی تھی۔ شروع میں بیک گراؤنڈ میں لوگوں کا شور بہت زیادہ تھا، لیکن میں نے 'نواز فلٹر' (Noise Filter) کا استعمال کرتے ہوئے اس شور کو آہستہ آہستہ ختم کرنا شروع کیا۔ چند منٹوں کی مشقت کے بعد، آغا شمس الدین کی وہ دھیمی مگر زہریلی آواز بالکل کلیئر اور صاف ہو گئی۔
ہم نے کافی محنت کے بعد ایک فائل تیار کی۔ اس میں آڈیو کلپس، ہائی ریزولوشن تصاویر، نقشے اور کاظم کے نیٹ ورک کی تمام تفصیلات ایک ترتیب سے پرو دی گئیں۔اب ہمارے پاس کاظم کے خلاف تمام ٹھوس ثبوت موجود تھے ذیشان بھائی، ڈیٹا مکمل ہے،" رامین نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔اب اس کی تین کاپیاں بناؤ،" میں نے اسے ہدایت دی۔
"پہلی کاپی میرے پاس رہے گی، دوسری تم اپنے پاس محفوظ کرو گے، اور تیسری کاپی ہم ابھی اسی وقت اپنے خفیہ کلاؤڈ سرور پر اپ لوڈ کریں گے۔اگر خدانخواستہ زمین پر ہمیں کچھ ہو جائے یا ہمارے آلات قبضے میں لے لیے جائیں، تو یہ ثبوت فضاؤں میں محفوظ رہیں گے اور کوئی بھی طاقت انہیں مٹا نہیں سکے گی۔"
جب کلاؤڈ پر اپ لوڈنگ کا بار (Bar) 100 فیصد پر پہنچا، تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے پاس اب وہ تمام مٹیریل موجود تھا جو آغا شمس اور کاظم کے اس پورے استبدادی ڈھانچے کو زمین بوس کر سکتا تھا۔ذیشان بھائی! اب اگلا قدم کیا ہے؟ ہم نے یہ سارا کچا چھٹھا اکٹھا تو کر لیا،رامین کی آنکھیں تجسس سے بھرپور تھیں۔میں نے ایک گہرا سانس لیا اور میز پر پڑے انکرپٹڈ فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "رامین، اب وقت آ گیا ہے کہ ہم یہ سارا ڈیٹا ایرانی انٹیلی جنس کے حوالے کر دیں۔"رامین یہ سن کر ایک دم چونک پڑا، اس کے چہرے پر حیرت اور تشویش کے بادل چھا گئے۔ "کیا؟ انٹیلی جنس کے حوالے؟ بھائی، آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ ہم خود ان کے ریڈار پر آ سکتے ہیں!"میں نے سکون سے اسے سمجھایا، "رامین، جذبات سے ہٹ کر منطق سے کام لو۔ تم نے خود چیک کر لیا ہے کہ اس نیٹ ورک کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ آغا شمس اور کاظم کے ہاتھ ہر اہم جگہ تک پہنچ چکے ہیں۔ ہم صرف تین لوگ ہیں، ہمارے پاس نہ اتنے وسائل ہیں اور نہ ہی اتنی طاقت کہ ہم اکیلے ان بڑے بڑے مگرمچھوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ان کا توڑ صرف ریاست کے پاس ہے۔ انٹیلی جنس کے پاس وہ 'ہاتھ' اور وہ 'اختیارات' ہیں جو اس پورے جال کو ایک جھٹکے میں ادھیڑ سکتے ہیں۔ وہ اس گندگی سے نمٹنے کے لیے ہم سے ہزار گنا بہتر پوزیشن میں ہیں۔"ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ ہمارے بس میں جو ہو گا ہم اپنے طور پر کرتے رہیں گے
رامین تھوڑی دیر خاموش رہا، جیسے وہ میری بات کی سنگینی کو ہضم کر رہا ہو۔ "آپ کی بات تو ٹھیک ہے بھائی، لیکن... ان تک یہ ثبوت پہنچائیں گے کیسے؟ اگر ہم خود وہاں گئے تو وہ پہلے ہمیں دھر لیں گے؟ہم دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پہلے ہمارے ذہن میں ایک مقامی صحافی کا خیال آیا۔ اگر ہم مشہد کے کسی نڈر رپورٹر کو یہ فائلیں دے دیں تو وہ اسے شہ سرخی بنا دے گا۔" لیکن پھر اس خیال کو ہم نے جھٹک دیا۔ یہ بہت خطرناک تھا۔ وہ صحافی تو مارا ہی جائے گا، ساتھ میں انٹیلی جنس والے ہمیں بھی نہیں چھوڑیں گے ۔ پھر ہم نے سوچا کہ کیا کوئی آن لائن راستہ اپنایا جائے؟ کسی انکرپٹڈ لنک کے ذریعے ڈیٹا انٹیلی جنس کے سرور پر پھینک دیا جائے؟ لیکن اس پر بھی ہم دونوں نے سر جوڑ کر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ

موجودہ جنگی حالات میں ایران کی سائبر سیکیورٹی (فتا) اتنی الرٹ ہے کہ وہ سیکنڈوں میں ہمارا آئی پی ایڈریس ٹریس کر لیں گے۔ ہم ہوٹل کی دہلیز پار کرنے سے پہلے ہی کسی عقوبت خانے میں ہوں گے۔کافی دیر تک ہم مختلف منصوبوں کو رد کرتے رہے، کمرے میں ٹہلتے رہے اور کڑیوں سے کڑیاں جوڑتے رہے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا کہ اچانک، جیسے اندھیرے میں کوئی بجلی کوندی ہو، میرے ذہن میں وہ پرانا کلاسیکی طریقہ آیا جس نے تاریخ کی بڑی بڑی جاسوسی جنگوں کا پانسہ پلٹا تھا۔میں نے ایک دم رک کر رامین کی طرف دیکھا، میری آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی۔ "رامین! ہم کوئی ڈیجیٹل یا انسانی واسطہ استعمال نہیں کریں گے۔ ہم 'ڈیڈ ڈراپ' (Dead Drop) کریں گے۔"رامین نے حیرت سے مجھے دیکھا، اسے شاید اس قدیم مگر فول پروف طریقے کی توقع نہیں تھی۔ "ڈیڈ ڈراپ؟ مشہد کی ان مصروف سڑکوں پر؟ ذیشان بھائی، یہ کیسے ممکن ہوگا؟"میں نے اپنے موبائل کی اسکرین پر مشہد کا نقشہ کھولا۔ میری انگلی نقشے پر رینگتی ہوئی شہر کے جنوب مشرقی حصے میں واقع اس وسیع و عریض رقبے پر جا کر رک گئی جسے "بہشتِ رضا" کہا جاتا ہے۔ مشہد کا یہ سب سے بڑا اور پُراسرار قبرستان اس وقت ہماری آخری امید بننے والا تھا۔میں نے اسکرین پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔ "ہم فجر کے وقت بہشتِ رضا جائیں گے۔ وہاں جنوبی بلاک کی جو بالکل پہلی قبر ہے، ہم اپنی یو ایس بی (USB) اس کے کتبے کی جڑ میں دفن کر دیں گے۔"

رامین نے حیرت سے پوچھا، "لیکن بھائی، پہلی قبر ہی کیوں؟ وہاں تو لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔"میں نے سکون سے اسے سمجھایا، "پہلی قبر اس لیے، کیونکہ جنوبی گیٹ سے داخل ہوتے ہی انٹیلی جنس کے 'ریکوری یونٹ' کے لیے یہ سب سے آسان اور تیز مقام ہوگا۔ ہمیں انہیں الجھانا نہیں ہے، بلکہ راستہ دکھانا ہے۔ اس قبر کے کتبے پر جو نام لکھا ہے، وہ ہم انہیں کوڈ ورڈ کے طور پر بتا دیں گے تاکہ وہ کسی دوسری جگہ وقت ضائع نہ کریں۔"رامین نے تائید میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، لیکن انہیں الرٹ کیسے کریں گے؟""ڈیٹا وہاں رکھنے کے بعد، میں پبلک فون سے انٹیلی جنس کے ہاٹ لائن پر کال کروں گا،" میں نے اپنی منصوبہ بندی مکمل کی۔ "میں انہیں صرف اتنا کہوں گا: 'بہشتِ رضا، جنوبی بلاک کی پہلی قبر کے قدموں میں مشہد کی بقا کا راز دفن ہے۔ کتبے پر موجود نام تمہاری منزل ہے'۔ ہمارا کام بس اس ڈیٹا کو صحیح ہاتھوں تک پہنچانا ہے، باقی کا کام ریاست خود کرے گی۔"رامین نے ایک لمبا سانس لیا، اس کی آنکھوں میں اب اس مشکل مشن کے خاتمے کی امید نظر آ رہی تھی۔ "یہ بہترین منصوبہ ہے ذیشان بھائی۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر وہاں پہنچ کر یو ایس بی اٹھا لیں گے اور پھر کاظم کے اس پورے نیٹ ورک پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔"بھائی! کیا زکیہ کو میسج کر کے بتا دوں کہ ہم فجر کے وقت بہشتِ رضا میں 'ڈیڈ ڈراپ' کرنے والے ہیں؟" رامین نے اسکرین پر انگلی رکھے ہوئے پوچھا۔ "وہ بیچاری بھی تو اس مشن کا حصہ ہے، اسے علم ہونا چاہیے کہ ہم آج کیا بڑا قدم اٹھانے جا رہے ہیں۔"

"نہیں رامین، رک جاؤ!" میں نے سختی سے اس کا ہاتھ روک دیا۔ "اسے فی الحال بالکل انجان رہنے دو۔رامین نے تھوڑی حیرت سے مجھے دیکھا، تو میں نے اسے تفصیل سے سمجھایا: "دیکھو، وہ اس وقت تھکن سے چور ہو کر سو چکی ہوگی، اسے ڈسٹرب کرنے کا مطلب ہے اس کے اعصاب پر اضافی بوجھ ڈالنا۔ ہمارے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے کہ اسے کال کر

کے پورا نقشہ سمجھائیں یا اس کی گھبراہٹ دور کریں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حالات جس طرح بگڑ چکے ہیں، ہم کوئی چھوٹا سا رسک بھی نہیں لے سکتے۔ زکیہ ایک مخلص بیٹی ہے جو اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتی ہے، لیکن وہ ابھی اس خطرناک کھیل کی ماہر نہیں بنی۔ مجھے ڈر صرف یہ ہے کہ اگر اسے پتہ چل گیا کہ ہم نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا ہے، تو وہ کل جذبات میں آ کر یا اس خوشی میں کہ 'اب میں بہت کچھ کر سکتی ہوں'، کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لے جو ہمارے پورے پلان کو چوپٹ کر دے۔"میں نے ایک لمحہ رک کر اس کی آنکھوں ہیں جھانکا۔ "فیلڈ میں کبھی کبھی زیادہ جوش بھی نقصان دہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس وقت ہمارے پاس یہاں کمرے میں ہوتی، تو شاید ہم اسے سمجھا بجھا کر تیار کر لیتے لیکن اب وہ دور اپنے ہاسٹل میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ رات بھر اس ٹینشن یا خوشی میں جاگتی رہے اور کل اس کے چہرے سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جائے جس سے کاظم کو شک ہو جائے۔ اس لیے ابھی اسے اس معاملے سے دور رکھنا ہی اس کے لیے اور اس مشن کے لیے سب سے بہتر ہے۔"اگر اسے علم ہو گیا اور کل فیکٹری میں اس کے چہرے پر ذرا سی بھی لرزش یا غیر معمولی سنجیدگی آ گئی، تو کاظم جیسا شکاری کتا ایک سیکنڈ میں بھانپ لے گا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔"رامین نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے اشارے سے روک دیا۔ "دیکھو، رامین، جذبات کو ایک طرف رکھو۔ تمہیں یاد ہے نا کہ دریان نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا؟ اس نے کتنے مشن ہمارے ساتھ شانہ بشانہ مکمل کیے، کتنی بار ہماری جان بچائی، لیکن آخر میں کیا ہوا؟ اس ایک شخص کے دھوکے نے ہمارے پورے نیٹ ورک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں اب اندھا دھند کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ زکیہ مخلص نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہے، اس نے اپنی ہمت ثابت کی ہے، لیکن پھر بھی... ہمیں احتیاط کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ پتہ نہیں کیوں، میرا ضمیر کہتا ہے کہ اس وقت یہ معلومات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہنی چاہئیں۔ یہ ڈیٹا مشہد کی بقا کی آخری چابی ہے، اور میں اس معاملے میں کوئی ذرہ برابر بھی 'رسک' نہیں لے سکتا۔"اس ڈیٹا کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہ غلط ہاتھوں میں چلا گیا یا وقت سے پہلے افشا ہو گیا، تو لاکھوں زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی ہیں رامین نے ایک لمبا سانس لیا اور میری آنکھوں میں چھپی اس پیشہ ورانہ سختی کو بھانپ لیا جو کسی بھی قیمت پر مشن کو بچانا چاہتی تھی۔ "ٹھیک ہے بھائی، آپ کی بات ٹھیک ہے۔ ہم اسے ابھی کچھ نہیں بتائیں گے۔

"رات کی اس طویل اور تھکا دینے والی منصوبہ بندی کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ ذہن میں نقشوں اور خطروں کا ہجوم تھا، مگر جسمانی تھکن اتنی زیادہ تھی کہ پتہ بھی نہیں چلا کب ہم نیند کی گہری آغوش میں چلے گئے۔ صبح جب آنکھ کھلی تو مشہد کا آسمان فجر کی ہلکی سرخی سے بھر رہا تھا۔ ہم نے جلدی سے غسل کیا اور عام ایرانی زائرین جیسا سادہ لباس پہنا تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آئیں۔ ہوٹل کے قریب ہی ایک چھوٹی سی دکان سے گرم 'نانِ بربری' اور پنیر کا مختصر ناشتہ کیا اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر بہشتِ رضا قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے قبرستان پہنچ کر رامین نے گاڑی کو جنوبی بلاک سے کافی فاصلے پر ایک پرانے درخت کے سائے میں پارک کر دیا۔۔ ہم دونوں گاڑی سے اترے اور نہایت نارمل انداز میں، جیسے کوئی اپنے پیاروں کی قبر پر فاتحہ کے لیے آتا ہے، چلتے ہوئے اس مخصوص مقام کی طرف بڑھے۔وہ پہلی قبر ہمارے سامنے تھی۔۔ میں نے کتبے کی طرف دیکھا کتبے پر لگی دھول نے نام کو دھندلا دیا تھا۔ کتبے پر

کندہ تھا: "العبد الحقیر... زوار حسین"۔ میں خاموشی سے قبر کے پیروں والی سمت بیٹھ گیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ رامین میرے برابر بیٹھا ادھر ادھر کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے دعا مانگتے ہوئے بڑی مہارت سے کتبے کی جڑ میں موجود نرم مٹی کو اپنے چاقو سے تھوڑا سا ہٹایا اور وہ یو ایس بی وہاں دبا کر اوپر سے مٹی برابر کر دی۔ کام ہو گیا،" میں نے سرگوشی کی۔ ہم وہاں سے اٹھے اور تھوڑی دیر تک دوسری قبروں کے درمیان ٹہلتے رہے تاکہ کسی دیکھنے والے کو شک نہ ہو۔ جب ہم واپس گاڑی کے پاس پہنچے تو رامین نے انجن اسٹارٹ کیا اور ہم وہاں سے نکل گئے۔ قبرستان سے تقریباً تین کلومیٹر دور ایک مصروف

شاہراہ پر پٹرول پمپ نظر آیا۔

جہاں زائرین کی گاڑیوں اور ٹیکسیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

میں نے رامین کو اشارہ کیا، اس نے پٹرول پمپ سے کوئی 50 قدم پہلے ہی گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ میں نے اپنی جیکٹ کی زپ تھوڑی اوپر کی، بالوں کو درست کیا اور ایک عام مسافر کا روپ دھار کر گاڑی سے باہر نکلا۔ میں نے اپنی چال میں ذرا بھی جلدی نہیں دکھائی تاکہ کسی سی سی ٹی وی (CCTV) کیمرے یا کسی مخبر کی نظر میں مشکوک نہ لگوں۔ میں نے نہایت اطمینان سے تیس قدم کا فاصلہ طے کیا اور پٹرول پمپ کے آخری کونے میں نصب اس مخصوص پیلے رنگ کے پبلک فون بوتھ میں داخل ہو گیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ریسیور اٹھایا۔ میرا ہاتھ تیزی سے ہاٹ لائن کے ہندسوں پر چلا۔ فون کی گھنٹی ابھی پوری طرح بجی بھی نہیں تھی کہ پہلی ہی بار کال ریسیو ہو گئی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری اور نپی تلی آواز آئی:

"بفرمایید؟" (فرمائیے؟)

میں نے اپنی آواز کو جتنا ہو سکتا تھا سپاٹ رکھا تاکہ جذباتی پن کا ذرا بھی شائبہ نہ ہو، اور وہی مخصوص پیغام دہرا دیا جو مشہد کی خاموش گلیوں میں ایک طوفان لانے والا تھا: بہشتِ رضا، جنوبی بلاک کی پہلی قبر۔ کتبے پر 'زوار حسین' کا نام درج ہے۔ اس کے قدموں میں مشہد کی بقا کا راز دفن ہے۔ یہی تمہاری منزل ہے۔" جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے فوراً فون کا ریسیور کریڈل پر رکھا اور بوتھ سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنی رفتار نارمل رکھی تاکہ پٹرول پمپ پر موجود کسی بھی شخص کو مجھ پر شک نہ ہو، اور دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ رامین نے جیسے ہی میرا چہرہ دیکھا، اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور ہم مشہد کی مصروف سڑکوں پر گم ہو گئے۔ میں نے اپنا فون نکالا اور میسج ٹائپ کرنے لگا۔ رامین خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مگر اس کی نظریں بار بار میرے فون کی سکرین کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میں نے زکیہ کو میسج کیا: "زکیہ، خیریت سے پہنچ گئی ہو ناں؟ وہاں صورتحال کیسی ہے؟" کچھ ہی سیکنڈز بعد اسکرین پر اس کا جواب چمکا:

"جی، میں فیکٹری پہنچ چکی ہوں۔ سب کچھ بالکل نارمل ہے اور کام معمول کے مطابق چل رہا ہے۔" میں نے فوری طور پر اگلا میسج ٹائپ کیا: تم نے وہاں بالکل نارمل رہنا ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے ہی کاظم فیکٹری پہنچے، یا اس کے دفتر میں کوئی غیر معمولی ہلچل نظر آئے، یا تمہیں کوئی بھی ایسی چیز محسوس ہو جو روزمرہ سے ہٹ کر ہو—تم نے فوراً مجھے مطلع

کرنا ہے۔زکیہ کا جوابی میسج فوراً آگیا: "جی ٹھیک ہے، میں پوری نظر رکھوں گی اور کچھ بھی ہوا تو آپ کو فوری طور پر اپ ڈیٹ کر دوں گی۔"

میں نے آخری میسج میں لکھا: "اوکے، اپنا خیال رکھنا۔" اور فون جیب میں رکھ دیا۔میں نے رامین کو اشارہ کیا، اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور ہم مشہد کی سڑکوں پر بہتے ہوئے اپنے ہوٹل کی طرف بڑھنے لگے۔ اب شکنجہ کسنا شروع ہو گیا تھا؛ زکیہ فیکٹری کے اندر ہماری آنکھیں بنی ہوئی تھی اور ہم نے باہر اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ اب ہمیں اس 'خاموش زلزلے' کے اثرات کا انتظار کرنا تھا۔ہوٹل پہنچ کر ہم اپنے کمرے کی طرف بڑھے کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ رامین نے پردے برابر کیے اور میں نے میز پر اپنا لیپ ٹاپ اور فون سیٹ کر لیا۔ باہر مشہد کی سڑکوں پر زندگی معمول کے مطابق لگ رہی تھی، لیکن ڈیجیٹل دنیا میں 'خاموش زلزلے' کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔"رامین! اب وقت ہے عالمی نبض چیک کرنے کا، دیکھو دنیا کے ایوانوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے،" میں نے خبروں کی لائیو سٹریم کھولتے ہوئے کہا۔اسرائیلی وزیراعظم کا ہولناک بیان: ٹاپ نیوز کے مطابق نیتن یاہو نے تل ابیب میں وار کیبنٹ کے ہنگامی اجلاس کے بعد دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ۔ ایران کی جارحیت اب ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے ہم ایران کو اس قابل نہیں ہونے دیں گے کہ وہ ایٹمی ہتھیار (NuclearWeapons) بنا کر پورے خطے (Middle East) کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دے اور امن تباہ کر دے۔

"اگر ہمیں اپنی بقا کے لیے ایران کی ایٹمی تنصیبات کو ملیامیٹ کرنا پڑا، تو ہم ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کریں گے۔ ہمارے طیارے فضاؤں میں ہیں اور وقت کا تعین ہم خود کریں گے پینٹاگون کے ترجمان نے براہِ راست وارننگ جاری کی کہ "اگر ایران نے آبنائے ہرمز کی ناکہ بندی کرنے یا عالمی تیل کی سپلائی روکنے کی ذرا سی بھی کوشش کی، تو امریکہ ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کرے گا اور اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ ایران پر حملہ کر دے گا۔" امریکی طیارہ بردار بحری جہاز اب اتنے قریب تھے کہ ان کے ریڈار مشہد کی فضاؤں تک رسائی حاصل کر رہے تھے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے ہنگامی بیان جاری کیا ہے کہ وہ اپنی فضائی حدود کسی بھی فوجی کارروائی کے لیے استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ عرب لیگ نے تمام فریقین کو صبر و تحمل کی تلقین کی ہے، لیکن پسِ پردہ وہ بھی کسی بڑے ٹکراؤ کے خوف سے کانپ رہے ہیں روس اور چین نے مشترکہ طور پر امریکہ کو خبردار کیا ہے کہ ایران پر کسی بھی قسم کی جارحیت عالمی معیشت کو تباہ کر دے گی اور وہ خاموش تماشائی نہیں رہیں گے فرانسیسی صدر نے ہنگامی بیان جاری کرتے ہوئے تہران میں موجود اپنے تمام فرانسیسی شہریوں کو 'اگلے 24 گھنٹوں کے اندر' ایران چھوڑنے کی آخری وارننگ دے دی ہے۔ فرانس نے واضح کیا ہے کہ وہ سفارتی حل کی کوشش تو کر رہا ہے، مگر اپنے شہریوں کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ برطانوی اور جرمن سفارت خانوں نے بھی اپنے غیر ضروری عملے کو نکالنا شروع کر دیا ہے۔ مغربی میڈیا کا پروپیگنڈا عروج پر تھا۔ وہ بار بار دکھا رہے تھے کہ کس طرح مغربی ممالک اپنے شہریوں کو تہران اور مشہد سے نکال رہے ہیں۔ہم ان خبروں کا تجزیہ کر ہی رہے تھے کہ اچانک میز پر رکھے میرے فون کی سکرین روشن ہوئی اور مخصوص انکرپٹڈ ٹون کے ساتھ ایک

میسج چمکا۔ یہ زکیہ کا پیغام تھا۔ میں نے جلدی سے فون اٹھایا اور رامین کو اشارہ کیا۔ میسج کی تفصیل کچھ یوں تھی
ذیشان "تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کاظم فیکٹری پہنچا تھا۔
اور اسکے انے کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد، اس کے کچھ 'مہمان' فیکٹری آئے تھے وہ لوگ کسی کاروباری مہمان کی طرح نہیں لگ رہے تھے۔ وہ سیدھے کاظم کے کیبن میں گئے، وہاں چند منٹ کی گفتگو ہوئی اور پھر وہ کاظم کو اپنے ساتھ لے کر نکل گئے۔ سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ کاظم اپنی گاڑی فیکٹری میں ہی چھوڑ گیا ہے۔ وہ ان مہمانوں کی گاڑی میں بیٹھا اور پچھلے گیٹ کے راستے غائب ہو گیا۔"میں نے رامین کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں الجھن اور امید کا ملا جلا تاثر تھا۔"بھائی! کیا وہ اطلاعات (انٹیلی جنس) والے تھے؟" رامین نے سرگوشی میں پوچھا۔ "ایک طرف تو دل کہتا ہے کہ ہمارا 'ڈیڈ ڈراپ' کام کر گیا اور انہوں نے کاظم کو پکڑ لیا ہے، اسی لیے وہ اپنی گاڑی چھوڑ کر خاموشی سے ان کے ساتھ چلا گیا۔"ہو سکتا ہے،" میں نے جواب دیا، پھر رامین نے حیرانگی سے کہا"لیکن دوسرا پہلو بھی تو دیکھو ذیشان۔ اگر وہ انٹیلی جنس والے تھے تو انہوں نے فیکٹری کو اب تک سیل (Seal) کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے فیکٹری کا کنٹرول حاصل کیوں نہیں کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کاظم کو الرٹ مل گیا ہو اور وہ اپنے ان مخصوص 'دوستوں' کے ساتھ کسی محفوظ ٹھکانے پر منتقل ہو گیا ہو؟"ہم دونوں اب ان دو متضاد خیالات کے بیچ پھنس چکے تھے۔ کیا ریاست نے اپنا شکنجہ کس لیا تھا یا غداروں نے اپنی چال بدل لی تھی؟
میں نے فوراً زکیہ کو جوابی میسج ٹائپ کیا: "زکیہ، صورتحال پر کڑی نظر رکھو۔ جیسے ہی وہ واپس آئے، چاہے دو گھنٹے لگیں یا تین، مجھے فوراً میسج کر کے بتانا کہ وہ پہنچ گیا ہے۔" کچھ ہی لمحوں میں زکیہ کا مختصر سا جواب اسکرین پر چمکا: "اوکے، میں نظر رکھے ہوئے ہوں۔"فون میز پر رکھتے ہی میں نے دیکھا کہ رامین کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ صاف نظر آ رہا تھا۔ اچانک وہ رک کر میری طرف مڑا اور بولا، "ذیشان بھائی! میں اس طرح یہاں بند کمرے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔ میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم خود سراغ لگانے کی کوشش کریں؟ یہاں بیٹھ کر صرف اندازے لگانے سے بہتر ہے کہ ہم خود ہوا کا رخ دیکھیں۔"میں نے رامین کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "رامین، جذبات سے نہیں، ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ اس وقت ہمارا وہاں جانا خود کو بے نقاب کرنے کے مترادف ہو سکتا ہے۔ ہمیں تھوڑا صبر سے کام لینا ہوگا۔"میں نے اسے اپنی منطق سمجھائی، "دیکھو، اگر وہ واقعی اپنے کسی کاروباری دوست کے ساتھ کسی ہنگامی میٹنگ پر گیا ہے، تو وہ اگلے دو تین گھنٹوں میں واپس آ جائے گا اور زکیہ ہمیں بتا دے گی۔ لیکن... اگر شام کے چار پانچ بج گئے اور وہ واپس نہ آیا، تو پھر ہمیں یقین ہو جائے گا کہ اسے (انٹیلی جنس) والوں نے باقاعدہ اٹھا لیا ہے۔ ان کا طریقہ کار یہی ہے کہ وہ شور مچائے بغیر مہرے کو غائب کر دیتے ہیں تاکہ تفتیش مکمل ہونے تک پورا نیٹ ورک الرٹ نہ ہو۔"کمرے میں ہمیں ابھی دس پندرہ منٹ ہی گزرے تھے۔ ہر سیکنڈ بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے کرسی پیچھے کی اور رامین کی طرف دیکھا جو ابھی تک بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔
"رامین، چلو! یہاں بیٹھ کر صرف دیواریں تکنے سے بہتر ہے کہ ہم خود فیکٹری کی طرف چلیں۔ ہم دور سے ریکی

(Reconnaissance) کریں گے اور چوک پر پوزیشن سنبھال کر دیکھیں گے کہ وہاں کیا خفیہ حرکت ہو رہی ہے۔ کون سے بندے آ رہے ہیں، کون جا رہا ہے اور کیا کاظم واپس پلٹتا ہے یا نہیں۔"رامین کی آنکھوں میں جیسے چمک آ گئی۔ ہم نے فوراً اپنا ضروری سامان اٹھایا، ہوٹل سے نکلے اور رامین کی گاڑی میں بیٹھ کر صنعتی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم فیکٹری کے قریبی گوداموں والے علاقے میں پہنچ گئے۔ ہم نے گاڑی کو ایک ایسی جگہ پارک کیا جہاں سے فیکٹری کا مرکزی گیٹ اور چوک صاف نظر آ رہے تھے، مگر ہم خود کسی کی نظر میں نہیں آ سکتے تھے۔ہم نے اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمے ٹکائے اور رامین نے برابر والی سیٹ سے مقامی اخبار اٹھا کر میرے سامنے پھیلا دیا۔ ہم دونوں نے اخبار کے پیچھے اپنے چہروں کو اس طرح چھپایا جیسے ہم کسی خبر پر بحث کر رہے ہوں، مگر ہماری نظریں اخبار کے کناروں سے نکل کر سامنے والے چوک اور فیکٹری کے مرکزی گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔وہاں سے گزرنے والے مزدور اور لوڈر گاڑیاں ہمارے پاس سے بے خبر گزر رہے تھے۔سڑک پر عام گہما گہمی تھی، ہم تین گھنٹے وہیں بیٹھے رہے۔ سورج ڈھلنے لگا اور مشہد کی فضاؤں میں شام کے سائے گہرے ہونے لگے، مگر فیکٹری کے گیٹ پر کوئی خاص ہلچل نظر نہیں آئی۔ نہ کاظم کی گاڑی وہاں سے ہلی اور نہ ہی وہ پراسرار مہمان واپس آئے۔تقریباً پانچ بجے کے قریب میرے فون کی سکرین روشن ہوئی۔ زکیہ کا میسج تھا:"ذیشان صاحب! چھٹی کا وقت ہو گیا ہے، میں اب نکل رہی ہوں۔ کاظم ابھی تک واپس نہیں آیا اور اس کا کچھ پتہ نہیں ہے۔"میں نے فوراً جوابی میسج ٹائپ کیا:
"ٹھیک ہے زکیہ، تم اب آرام سے گھر جاؤ اور ریسٹ کرو۔ ہم شام سات بجے اسی پرانے قہوہ خانے پر ملیں گے جہاں پہلے ملے تھے۔"زکیہ کا جواب آیا: "ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔"میسج بند کرنے کے بعد میں نے رامین کی طرف دیکھا۔ "رامین، زکیہ تو چلی گئی، لیکن ہم ابھی ادھر ہی رکیں گے۔ ہم سات بجے تک یہیں انتظار کریں گے۔ اگر ان دو گھنٹوں میں بھی وہ واپس نہ آیا، تو پھر یہ بات سو فیصد پکی ہو جائے گی کہ اسے
(انٹیلی جنس) والوں نے اٹھا لیا ہے۔ اس کے بعد ہم قہوہ خانے میں بیٹھ کر زکیہ کے ساتھ مل کر اگلا پلان بنائیں گے۔"رامین نے خاموشی سے سر ہلایا اور ہم دونوں نے اپنی نظریں دوبارہ فیکٹری کے اس خاموش گیٹ پر جما دیں، جہاں اب رات کا اندھیرا اترنا شروع ہو گیا تھا۔اگلے دو گھنٹے ہم نے جس کرب میں گزارے، وہ بیان سے باہر تھا۔
رامین کبھی کھڑکی کے پردے ہٹا کر باہر سڑک پر گزرتی گاڑیوں کو دیکھتا اور کبھی بے چینی سے اپنے موبائل کی سکرین کو چیک کرنے لگتا۔ ہم،
ڈیڑھ گھنٹہ خاموشی سے بیٹھے رہے مگر ہمارے ذہنوں میں ہزاروں سوالات گردش کر رہے تھے۔ کیا کاظم واقعی کسی تفتیشی مرکز میں ہے؟ یا وہ اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر کسی نئی تباہی کا نقشہ بنا رہا ہے؟ساڑھے چھ بجے کا وقت ہوا اور مشہد کے افق پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ فیکٹری کے گیٹ پر ہماری نظریں جمی تھیں، مگر کاظم کا دور دور تک پتا نہ تھا۔"رامین، اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سات بجنے والے ہیں، ہمیں قہوہ خانے پہنچنا چاہیے۔رامین نے گاڑی موڑی اور ہم پرانے شہر کی تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے اس روایتی قہوہ خانے کے سامنے جا پہنچے۔ باہر لوگوں کا تانتا بندھا

ہوا تھا، کہیں سے تانبے کے برتنوں کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی تو کہیں حقے کا دھواں فضا میں رقص کر رہا تھا۔ ہم خاموشی سے اندر داخل ہوئے اور ہجوم سے بچتے ہوئے کونے کے ایک مخصوص کیبن میں بیٹھ گئے۔ رامین نے کیبن کا بھاری لکڑی کا پردہ برابر کر دیا تاکہ باہر کی نظریں ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ابھی ہمیں بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ پردہ سرکا اور زکیہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر تھکن اور تشویش کے آثار واضح تھے۔ وہ ہمارے سامنے والی نشست پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ "کیا رپورٹ ہے زکیہ؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

زکیہ نے ایک گہرا سانس لیا، "ذیشان! میں نے ہاسٹل پہنچ کر اپنے فیکٹری کے کچھ لوگوں سے چھان بین کی ہے، کاظم کا فون اب بھی بند ہے اور وہ اب تک واپس نہیں آیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔"

رامین نے میز پر مکہ مارا، ذیشان "بھائی، اب ہمیں اگلا پلان بنانا چاہیے، وقت ہاتھ سے نکل رہا ہے۔"زکیہ نے میری طرف دیکھا، میری خاموشی اسے کچھ عجیب سی لگی۔ "ذیشان آپ کافی پریشان لگ رہے ہیں، سب خیریت تو ہے؟"

ابھی میں جواب دینے ہی والا تھا کہ کیبن کا پردہ ایک بار پھر سرکا اور ایک ادھیڑ عمر ایرانی ویٹر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تانبے کی ایک بڑی ٹرے تھی جس میں سے بھاپ اڑتا ہوا قہوہ اور خوشبو دار دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے نہایت مہارت سے ہمارے سامنے قہوے کے پیالے رکھے اور ساتھ ہی ایک چھوٹی پلیٹ میں 'خرما' (ایرانی کھجوریں) اور 'نبات' (زعفرانی مصری کی ڈلیاں) سجا دیں۔ "بفرمایید! نوشِ جان" (لیجیے، شوق سے پیجیے)، ویٹر نے مخصوص ایرانی انکساری سے سر جھکایا اور خاموشی سے کیبن سے باہر نکل کر پردہ گرا دیا۔ویٹر کے جاتے ہی کیبن میں ایک بار پھر وہ مخصوص سنجیدگی چھا گئی۔ میں نے قہوے کا گرم پیالہ ہاتھ میں لیا، اس کی کڑوی خوشبو نے میرے اعصاب کو تھوڑی تحریک دی، اور پھر میں نے زکیہ کی طرف دیکھ کر اپنی اصل بات شروع کی۔ "زکیہ، میری بات غور سے سنو،" میں نے لہجے میں ایک خاص وزن پیدا کیا۔ "ہم نے آج صبح ڈیڈ ڈراپ (Dead Drop) مکمل کر لیا ہے۔ وہ تمام تصویریں، آڈیو ریکارڈنگز اور کاظم کے نیٹ ورک کا کچا چھٹا جو ہم نے جمع کیا تھا... وہ اب ایرانی انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ لیکن ابھی ہمیں سو فیصد کنفرم نہیں ہے کہ اج جو فیکٹری سے کاظم کو بندے لے کر گئے تھے وہ انٹیلیجنس والے تھے یا اس کے اپنے ساتھی۔" زکیہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا اور پھر صدمے کی ایک لہر اس کی آنکھوں میں دوڑ گئی۔ اس نے تھرتھراتے ہاتھوں سے اپنا پیالہ میز پر رکھا، اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک ایسی نمی تیر رہی تھی جو غصے سے زیادہ دکھ کی عکاسی کر رہی تھی۔ کیا؟" اس کی آواز میں ایک لرزش تھی۔ "آپ لوگوں نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا؟ ذیشان صاحب! میں آپ کے اس مشن کی ساتھی تھی۔ میں نے اپنے باپ کے قاتلوں کے خلاف اپنی جان داؤ پر لگائی، لیکن آج آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کو مجھ پر ذرہ برابر بھی اعتبار نہیں ہے۔ کیا میں صرف ایک مہرہ تھی جسے استعمال کیا گیا اور جب وقت آیا تو اسے اندھیرے میں چھوڑ دیا گیا؟ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں تھا کہ مجھے پتہ ہوتا کہ آج میرے ارد گرد کیا ہونے والا ہے؟" وہ خاموش ہوئی تو اس کی آنکھ سے ایک آنسو گال پر پھسل گیا۔ رامین نے بے چینی سے میری طرف دیکھا، وہ زکیہ کی اس حالت پر تڑپ اٹھا

تھا، مگر میں نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھا۔ میں جانتا تھا کہ اسے اصولی اور مجاہدانہ جواب ہی مطمئن کر سکتا ہے
زکیہ! تمہارا دکھ اور تمہارا غصہ اپنی جگہ بالکل جائز ہے۔ تمہارے یہ سوالات بھی غلط نہیں ہیں،" میں نے لہجے میں ہمدردی بھرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ذرا ٹھنڈے دماغ سے کل رات کے حالات کا تصور کرو۔ جب ہم نے یہ فیصلہ کیا، تب آدھی رات گزر چکی تھی۔ ہوٹل کے باہر سیکیورٹی الرٹ تھی اور ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ ہم تمہیں ہاسٹل میں کال کرتے، تمہیں پورا نیا پلان سمجھاتے اور تمہاری گھبراہٹ دور کرتے۔ جاسوسی کی اس دنیا میں فیصلے سیکنڈوں میں کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں 'پلان بی' (Plan B) سوچنے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ کب، کیا اور کیسے ہو جائے، کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنے ذہن سے اس طرح کام لینا پڑتا ہے کہ جذبات پیچھے رہ جائیں اور صرف مقصد سامنے ہو اگر تم ہماری جگہ ہوتیں اور تمہارے سامنے مشہد کی بقا کا یہ آخری موقع ہوتا، تو شاید تم بھی بالکل وہی کرتیں جو ہم نے کیا۔ تم بھی اسی طرح 'شارٹ نوٹس' پر قدم اٹھاتیں کیونکہ یہاں ایک پل کی تاخیر بھی پورے مشن کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتی تھی۔ لیکن ابھی تم ان باتوں کی گہرائی اور اس کھیل کی سمجھ بوجھ سے تھوڑی دور ہو، اسی لیے تمہیں یہ سب 'بے اعتباری' لگ رہا ہے۔"۔ کاظم کوئی عام آدمی نہیں ہے، وہ ایک شکاری کتے کی طرح ہے جس کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہے۔ اسے ذرا سی بھی بو آ جاتی تو وہ پورا رخ بدل لیتا۔ تمہاری ذرا سی بھی غیر معمولی حرکت اسے الرٹ کر سکتی تھی۔
زکیہ نے اپنی آنکھیں صاف کیں، مگر اس کا لہجہ اب بھی تلخ تھا۔ "ذیشان صاحب! یہ 'وقت کی کمی' والی منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیا آپ لوگوں کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ صرف ایک 'انکرپٹڈ میسج' کر دیتے؟ بس اتنا لکھ دیتے کہ 'ہم ڈیٹا انٹیلی جنس کے حوالے کر رہے ہیں'۔ کیا ایک میسج کرنے میں گھنٹوں لگتے ہیں؟ اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں ذہنی طور پر تیار رہتی۔ "کیا میں نے پہلے آپ کے ساتھ مل کر وہ فائلیں چوری نہیں کی تھیں؟ تب بھی تو میں نارمل رہی تھی، تب بھی تو میں نے ہمت دکھائی تھی۔ میں نے کرسی پر تھوڑا آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ اور کہا فائل چوری کرنا ایک الگ مشن تھا، لیکن آج کاظم کی فیکٹری میں انٹیلی جنس کا آپریشن ایک الگ چیز تھی" لیکن چلو، ایک پل کے لیے فرض کر لو کہ میں تمہیں میسج کر دیتا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ، زکیہ! اگر تمہیں پتہ ہوتا کہ آج فیکٹری میں کچھ بڑا ہونے والا ہے، تو تم وہاں کیا کرتیں؟" میں وہی کرتی جو ایک الرٹ ساتھی کو کرنا چاہیے!" زکیہ نے فوراً جواب دیا۔ "میں ان آنے جانے والے 'مہمانوں' پر کڑی نظر رکھتی۔ میں چھپ کر ان کی تصویریں لیتی، ان کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرتی، شاید ان کی کوئی سرگوشی سن لیتی۔ اب تو ہمیں یہ بھی یقین سے نہیں پتہ کہ کاظم کو انٹیلی جنس نے اٹھایا ہے یا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ فرار ہوا ہے۔ اگر میں الرٹ ہوتی تو آج ہمارے پاس سو فیصد تصدیق ہوتی۔
میں نے ایک طنزیہ مگر گہری مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ "یہی تو تمہاری سب سے بڑی نادانی ہوتی، زکیہ! اور اسی جذباتی فیصلے سے بچانے کے لیے تمہیں بے خبر رکھنا میری مجبوری تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ آنے والے لوگ کاظم کے اپنے بندے تھے، تو ہمیں ان کی تصویروں کا اچار ڈالنا تھا؟ ہمارے پاس پہلے ہی کاظم اور اس کے نیٹ ورک کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت موجود ہیں جو اسے اور اس کے پورے گروہ کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی

ہیں۔ ہمیں ان کے مزید مہروں کی تصویروں کی اس وقت ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے لہجے میں پیشہ ورانہ کاٹ پیدا کی، "اور دوسری بات... اگر وہ واقعی (ایرانی انٹیلی جنس) کے تربیت یافتہ آپریٹو تھے، تو تم انہیں اتنا اناڑی سمجھتی ہو؟ وہ کسی بھی جگہ ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے ایک ایک انچ کو اسکین کر لیتے ہیں۔ انہیں پہلے سے پتہ ہوتا ہے کہ عمارت میں کون کس ڈگری پر اور کس پوزیشن پر کھڑا ہے۔ ان کے پاس ایسے سینسرز اور کیمرے ہوتے ہیں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتی۔" میں نے میز پر انگلی سے دستک دیتے ہوئے اسے حقیقت دکھائی: "اگر تم وہاں موبائل نکال کر ان کی تصویر لینے کی ذرا سی بھی 'ہوشیاری' دکھاتیں، تو ان کے ڈیجیٹل ریڈار پر تم ایک 'مشکوک سگنل' بن کر ابھرتیں۔ وہ تمہیں کاظم کی وفادار سمجھ کر وہیں ڈھیر کر سکتے تھے۔ ہمارا اصل مقصد کیا تھا؟ یہی کہ کاظم انٹیلی جنس کے ہتھے چڑھے۔ اگر وہ ان کے ساتھ چلا گیا ہے، تو ہمارا کام مکمل ہو گیا۔ دیکھو زکیہ، انٹیلی جنس کے ماہرین جب کسی بڑی مچھلی پر ہاتھ ڈالتے ہیں، تو ان کی پہلی نظر ہی اس بات پر ہوتی ہے کہ 'ڈیڈ ڈراپ' کرنے والے اصل چہرے کون ہیں؟ انہیں اس بات کا شک ہو سکتا تھا کہ فائلیں چرا کر یو ایس بی وہاں رکھنے والا کوئی کاظم کا بہت قریبی بندہ ہی ہے۔" میں نے اسے اس کے اصل خطرے سے آگاہ کیا: "اگر تمہارے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی یا 'جاننے والا تاثر' ہوتا، تو وہ فوراً بھانپ لیتے کہ اس لڑکی کو یو ایس بی کا پتہ ہے اور شاید اسی نے یہ سب پلان کیا ہے۔ وہ تمہیں وہیں دھر لیتے اور پھر کاظم کے ساتھ ساتھ تم بھی ان کی تفتیش کی چکی میں پس رہی ہوتیں۔ تمہاری خوش قسمتی یہ تھی کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں تھا، اسی لیے تم وہاں ایک حقیر ملازمہ بن کر اپنا کام کرتی رہیں اور ان کی نظروں سے بچ نکلیں۔ اسی 'بے خبری' کی وجہ سے ہمارا کام اتنی آسانی سے مکمل ہو گیا۔

"زکیہ جو ابھی تک اپنی بہادری کے قصے سنا رہی تھی، اچانک خاموش ہوگئی۔ میں نے اپنی بات مزید جاری رکھی اور کہا اچھا زکیہ، اب ذرا ایک منٹ کے لیے خود کو اس فیکٹری کے ہال میں تصور کرو۔ تم وہاں کھڑی ہو اور اچانک تمہیں پتہ چلتا ہے کہ وہی 'خاص مہمان' (ایرانی انٹیلی جنس) اندر داخل ہو رہے ہیں جن کا تم نے بڑی بے صبری سے انتظار کیا تھا۔ سچ سچ بتانا... کیا تمہارے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نہ آتی؟ کیا تمہاری آنکھوں میں وہ 'چمک' نہ ابھرتی کہ دیکھو میرا بچھایا ہوا جال کام کر گیا؟" کیا تمہارا دھیان اپنے کام پر ہوتا یا تم بار بار گردن گھما کر انہیں دیکھتیں؟ تمہارا جوش، تمہاری وہ 'مبارک ہو' والی کیفیت تمہارے چہرے کا تاثر بدل دیتی۔ اور بس... ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ شکاری ہیں زکیہ! وہ چہروں پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ فوراً بھانپ لیتے کہ یہ لڑکی ایک عام ملازمہ نہیں، بلکہ اس پورے ڈرامے کی 'ڈائریکٹر' ہے۔ وہ تمہیں کاظم کے ساتھ ہی گاڑی میں ڈالتے اور پھر تفتیش کے وہ طریقے آزماتے جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں زکیہ کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی، اس نے ایک گہرا سانس لیا اور رامین کی طرف دیکھا جو خود بھی حیرت زدہ تھا۔ زکیہ دھیمی آواز میں بولی "ہاں... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اتنی پرجوش ہوتی کہ شاید میں خود کو نارمل نہ رکھ پاتی۔ میرا وہ تجسس ہی میرا دشمن بن جاتا۔ رامین نے میری طرف دیکھا اور گرمجوشی سے کہا ماننا پڑے گا ذیشان بھائی! یہ پہلو تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں تو صرف مشن کی کامیابی دیکھ رہا تھا،

لیکن تم نے اس 'بے خبری' کو ڈھال بنا کر جس طرح زکیہ کو بچایا، وہ کمال ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج مجھے فخر ہو رہا ہے کہ تم جیسا دور اندیش انسان میرا بہترین دوست اور بھائیوں جیسا ساتھی ہے۔ تمہاری اس گہری سوچ نے مجھے آج پھر سے تمہارا قائل کر دیا ہے۔"

زکیہ جو اب تک اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی، اس نے ایک لمبا سانس لیا اس کے لہجے کی تیزی اب نرمی میں بدل چکی تھی۔"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ذیشان..." زکیہ نے دھیمی آواز میں اعتراف کیا۔ "میں نے واقعی اس زاویے سے نہیں سوچا تھا۔ میں شاید اپنے جوش میں ان کی نظروں میں آ جاتی اور پھر ہم سب کے لیے مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ شکریہ کہ تم نے مجھے اس انجانے خطرے سے بچا لیا"لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں ہمیشہ جذبات کی رو میں بہہ جاؤں گی۔ میں نے بھی اس آگ میں جل کر بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ خیر، اب جو ہو گیا سو ہو گیا... اچھی بات یہ ہے کہ ہمارا کام ہو گیا۔ اب اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کاظم کا یوں غائب ہونا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔"

زکیہ کا اعتراف سن کر میرے چہرے پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے کرسی سے تھوڑا پیچھے ہو کر اسے گہری نظروں سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں اب وہ غصہ نہیں بلکہ ایک پختہ سمجھ بوجھ تھی۔"زکیہ! یقین جانو، مجھے تم پر فخر ہو رہا ہے،" میں نے نہائت اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہاری یہ خودداری اور حق بات کو تسلیم کرنے کا ظرف... یہ ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ میں تمہاری ہمت کو سلام کرتا ہوں کہ تم نے نہ صرف اس خطرناک مشن میں ہمارا ساتھ دیا، بلکہ اب جس سنجیدگی سے تم حالات کو سمجھ رہی ہو، اس نے ثابت کر دیا ہے کہ تم ایک عام لڑکی نہیں بلکہ ایک جری مجاہدہ ہو۔ تمہاری یہی بات مجھے بہت اچھی لگی ہےزکیہ نے چونک کر میری طرف دیکھا، اسے شاید مجھ سے اتنی کھلی تعریف کی توقع نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی لالی دوڑ گئی جو اس کی حیا اور خوشی کا امتزاج تھی۔ رامین جو اب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہا تھا، موقع پاتے ہی بول پڑا: "اوہو ذیشان بھائی! آج تو آپ بڑے فارم میں ہیں۔ اتنی تعریفیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مشہد کی اس ٹھنڈی ہوا نے آپ کے 'فولادی دل' کو تھوڑا نرم کر دیا ہے؟" رامین نے شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے زکیہ کی طرف دیکھا۔ "زکیہ، ذرا سنبھل کر رہنا، ذیشان بھائی جب اتنی تعریف کریں تو سمجھو اگلا مشن اس سے بھی زیادہ خطرناک ہونے والا ہے!" زکیہ دبی دبی ہنسی ہنستے ہوئے بولی، "رامین تم، بھی بس... موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیکن سچ کہوں تو ذیشان کی ان باتوں نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ مجھے واقعی لگ رہا تھا کہ شاید میں آپ لوگوں کے لیے صرف ایک بوجھ ہوں۔" میں نے دوبارہ زکیہ کی طرف رخ کیا، میرا لہجہ اب مکمل طور پر پیشہ ورانہ ہو چکا تھا: "بوجھ کی بات چھوڑو زکیہ، تم اس مشن کی ایک اہم کڑی ہو۔ اب جب کہ ماحول تھوڑا صاف ہو گیا ہے، تو ذرا 'پیشہ ورانہ' ہو جائیں؟ اب ہمیں اگلے قدم کے بارے میں سوچنا ہے۔"

یہ بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں اگلا کیا پلان ہے؟ آگے کیا کرنا چاہیے؟"زکیہ نے ایک گہرا سانس لیا اور نفی میں سر ہلایا۔ "ذیشان، سچ کہوں تو اس وقت میرا دماغ بالکل خالی ہے۔ فیکٹری کے ان پراسرار حالات اور کاظم کے یوں غائب ہونے

کے بعد مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ فلحال میرے ذہن میں کوئی پلان نہیں ہے... آپ ہی بتائیں، آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟ ہم مل کر اسی پر عمل کرتے ہیں۔"میں نے رامین کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے گلا صاف کیا اور اپنا نقشہ ان کے سامنے رکھا: دیکھو، میرا خیال ہے کہ ہمیں اب دو محاذوں پر کام کرنا ہو گا۔ کل صبح، میں اور رامین 'امام بارگاہ' کی طرف جائیں گے۔ ہمیں آغا شمس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ کیا وہاں بھی کوئی ہلچل ہوئی ہے یا وہ اب تک آزاد ہے۔ ہم وہاں کی ریکی (Recce) کریں گے تاکہ پتہ چل سکے کہ انٹیلی جنس کا شکنجہ وہاں تک پہنچا ہے یا نہیں۔"میں نے زکیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: اور زکیہ، تمہارا کام فیکٹری تک محدود رہے گا۔ تم کل دوبارہ فیکٹری جاؤ گی اور وہاں کے حالات کا جائزہ لو گی۔ یہ دیکھنا کہ کیا کاظم کا کوئی سراغ ملا، یا وہاں کوئی نیا بندہ چارج سنبھال رہا ہے۔ ہمیں ابھی سو فیصد کنفرم نہیں ہے کہ ایجنسی نے اسے اٹھایا ہے یا نہیں، اس لیے کل کا دن بہت اہم ہے۔"رامین نے تائید میں سر ہلایا تو میں نے اپنی بات مکمل کی: "اگر کل شام تک ہمیں کوئی ٹھوس خبر نہ ملی یا ایجنسی کی طرف سے کوئی واضح کارروائی نظر نہ آئی، تو پھر ہم سمجھ جائیں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس صورت میں ہم کل رات بیٹھ کر کوئی فائنل اور بڑا قدم طے کریں گے۔"زکیہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا، "ٹھیک ہے ذیشان، مجھے یہ پلان سمجھ آ گیا ہے۔ کل میں فیکٹری کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھوں گی۔رامین نے فون اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی اور اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "ذیشان بھائی! تازہ ترین بریکنگ نیوز ہے کہ اسرائیل نے تل ابیب میں اپنی 'ایرو تھری'(Arrow 3) ڈیفنس سسٹم کو ہائی الرٹ کر دیا ہے اور امریکی پینٹاگون نے بحیرہ روم میں موجود اپنے بیڑے کو تہران کی جانب رخ کرنے کا حکم دے دیا ہے۔"زکیہ نے بے چینی سے پوچھا، "کیا واقعی جنگ چھڑنے والی ہے؟"میں نے اخبار کی ایک سرخی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا، "لگتا تو یہی ہے۔ واشنگٹن سے خبر ہے کہ اگر ایران نے جوابی کارروائی کی تو امریکہ براہِ راست مداخلت کرے گا۔ دوسری طرف پاکستان کی وزارتِ خارجہ نے بھی ہنگامی بیان جاری کیا ہے کہ وہ خطے میں کسی بھی قسم کی جارحیت کے خلاف ہیں اور اپنے شہریوں کو ایران سے نکلنے کی ہدایت کر رہے ہیں۔

" کچھ دیر کے لیے ہم تینوں پر خاموشی چھا گئی۔ پھر زکیہ نے بڑے معصومانہ مگر. متجسس انداز میں مجھ سے پوچھا، "ذیشان ! آپ نے ابھی پاکستان کا ذکر کیا۔ سچ بتائیں، وہاں کے حالات کیسے ہیں؟ کیا وہاں بھی ہر وقت ایسا ہی تناؤ رہتا ہے، یا وہاں زندگی سکون سے گزرتی ہے؟"

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ "زکیہ، پاکستان ایک عجیب جگہ ہے۔ وہاں مسائل تو بہت ہیں، کبھی سیاست کی گرمی ہوتی ہے تو کبھی معیشت کی، لیکن وہاں کے لوگوں کے دلوں میں جو سکون اور زندہ دلی ہے، وہ تمہیں شاید کہیں اور نہیں ملے گی۔ زکیہ! تم جنگی خبروں سے پریشان ہو؟ اگر تم پاکستان میں ہوتیں تو تمہیں پتہ چلتا کہ 'بہادر قوم' کسے کہتے ہیں۔ وہاں اگر سرحد پر گولے بھی چل رہے ہوں ناں، تو ہماری عوام گھروں میں دبک کر نہیں بیٹھتی، بلکہ چھتوں پر چڑھ کر 'نظارے' دیکھتی ہے اور اپنی فوج کے حق میں نعرے لگاتی ہے۔"زکیہ نے حیرت سے پوچھا، "کیا

واقعی؟ انہیں ڈر نہیں لگتا؟"" بالکل نہیں!" میں نے فخر سے جواب دیا۔ "پاکستان کی مٹی کا خمیر ہی کچھ ایسا ہے کہ وہاں بچہ بچہ خود کو سپاہی سمجھتا ہے۔ ہماری فوج دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک ہے، ان کا ڈیفنس سسٹم اور عزم اتنا مضبوط ہے کہ عوام ان کے سائے میں خود کو مکمل محفوظ سمجھتی ہے۔ وہاں جنگ کا مطلب 'خوف' نہیں بلکہ 'اتحاد' ہوتا ہے رامین نے بیچ میں لقمہ دیا، ذیشان بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں، وہاں کی عوام 'ٹینشن' لینے کے بجائے اسے 'انجوائے' کرنا جانتی ہے۔" زکیہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر اس کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز سنجیدگی ابھری۔ "ذیشان! آپ تو بڑی تعریفیں کر رہے ہیں، مگر میں نے خبروں میں سنا ہے کہ پاکستان میں تو عوام اور فوج کے درمیان کافی کھنچاتانی رہتی ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں کی فوج سیاست میں بہت مداخلت کرتی ہے اور عوام بھی اب پہلے جیسی خوش نہیں رہی۔ وہاں تو اکثر آپس میں ہی جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ تو پھر آپ کیسے کہہ رہے ہیں کہ وہ ایک ہو جاتے

ہیں؟"میں نے قہوہ کا پیالہ میز پر رکھا اور ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا:

"زکیہ! تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔ یہ اختلافات، یہ بحثیں اور یہ سیاسی نوک جھونک ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ ہم پاکستانی تو ایک دوسرے سے لڑے بغیر کھانا بھی ہضم نہیں کر پاتے۔ کبھی سیاست پر، کبھی فوج پر اور کبھی مہنگائی پر... ہم دن بھر ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔"سیاست پر ایسی بحث کرتے ہیں کہ لگتا ہے ابھی دست و گریبان ہو جائیں گے

میں نے ذرا آگے جھک کر لہجے میں وزن پیدا کیا:"لیکن زکیہ، یہی تو پاکستان کی خوبصورتی اور اس کے 'مزے' کی بات ہے۔ ہم آپس میں جتنے بھی دست و گریبان ہوں، لیکن جب بات سرحدوں کی ہو یا کسی بیرونی دشمن کی جارحیت کی... تو وہ تمام اختلافات ایک سیکنڈ میں ہوا ہو جاتے ہیں۔ تب نہ کوئی سیاسی پارٹی رہتی ہے، نہ کوئی تنقید۔ تب صرف ایک جذبہ ہوتا ہے

(لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ)

پھر ہم 'ایک مسلمان' اور 'ایک پاکستانی' بن کر ابھرتے ہیں۔

بچے بچے کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہوتا ہے پاکستان کا مطلب کیا۔لا اِلٰہ اِلّا اللہ وہی کلمہ جو ہمیں ایک لڑی میں پروتا ہے، ہمیں ایک ایسی فولادی دیوار بنا دیتا ہے جسے توڑنا ناممکن ہے۔ہم پہلے دشمن کو 'پھینٹی' لگاتے ہیں، اسے دھول چٹاتے ہیں، اور جب وہ بھاگ جاتا ہے، تو ہم واپس بیٹھ کر پھر سے اپنے آپسی جھگڑے وہی پرانے سیاسی قصے شروع کر دیتے

ہیں۔"رامین نے ہنستے ہوئے کہا واہ ذیشان یعنی پاکستانی وہ گھر والے ہیں جو آپس میں تو لڑتے ہیں، لیکن باہر والے کی جرات نہیں کہ انکی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔ تمھاری فوج اور عوام کا رشتہ ایسا ہے کہ جتنا بھی گلہ ہو، مشکل وقت میں ایک دوسرے کی ڈھال بن جاتے ہیں۔"زکیہ خاموشی سے میری بات سن رہی تھی، اس کی آنکھوں میں اب ایک عجیب سا احترام اور چمک تھی۔ "عجیب لوگ ہیں آپ! مطلب لڑائی بھی جاری رہتی ہے اور ایمان کا رشتہ آپ کو ایک مٹھی بھی بنا دیتا ہے؟"پھر تو لگتا ہے مجھے بھی ایک بار پاکستان کا وزٹ ضرور کرنا چاہیے؟کیوں نہیں زکیہ!" میں نے تپاک سے

جواب دیا۔ "تمہیں پاکستان ضرور آنا چاہیے۔ زکیہ نے دھیمے سے مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ "انشاء اللہ! اگر زندگی نے موقع دیا اور یہ مشن خیر و عافیت سے انجام کو پہنچا، تو میں ضرور وہاں کا رخ کروں گی۔"
ماحول تھوڑا نارمل ہوا تو میں نے تجسس سے اس سے پوچھا، "ویسے زکیہ، تم نے اب تک کن ممالک کی سیر کی ہے؟ کہاں کہاں گھومی ہو تم؟" زکیہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر جواب دیا، "ذیشان! سچ کہوں تو میں زیادہ کہیں نہیں گئی۔ بس ایک لبنان گئی ہوں، اس کے علاوہ اب تک صرف ایران کی سرحدوں کے اندر ہی رہی ہوں۔ زکیہ نے جب لبنان کا نام لیا تو میری دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ رامین بھی اب بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا کیونکہ لبنان کی تاریخ اور وہاں کی خوبصورتی، دونوں ہی اپنی مثال آپ ہیں۔ میں نے کرسی پر تھوڑا آگے جھکتے ہوئے پوچھا، "اچھا؟ تو پھر لبنان کیسا لگا تمہیں؟ سنا ہے وہاں کے حالات اور فضا ایران سے کافی مختلف ہیں۔ بیروت کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اسے 'مشرقِ وسطیٰ کا پیرس' کہا جاتا ہے۔ تم وہاں کہاں کہاں گئیں اور تمہیں وہاں کیسا محسوس ہوا؟" زکیہ کی آنکھوں میں پرانی یادوں کی ایک چمک سی لہرائی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور بڑے پرسکون انداز میں بتانے لگی:
"ذیشان! سچ کہوں تو لبنان ایک خواب جیسا ہے۔ وہاں کی فضا میں ایک عجیب سی بیباکی اور رنگینی ہے۔ میں نے کچھ وقت بیروت میں گزارا، جہاں ایک طرف نیلا سمندر ہے اور دوسری طرف جدید عمارتیں، لیکن وہاں کی گلیوں میں اب بھی جنگ کے پرانے نشانات ملتے ہیں جو انسان کو اداس کر دیتے ہیں۔ وہاں کی زندگی بہت تیز ہے، لوگ ہر لمحے کو جی لینا چاہتے ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا ہوگا۔" اس نے تھوڑا رک کر ایک اور شہر کا تذکرہ کیا، "پھر میں بعلبک (Baalbek) بھی گئی تھی۔ وہاں کے قدیم رومی کھنڈرات دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ وہاں کی تاریخ اتنی گہری ہے کہ آپ کو اپنی حیثیت بہت چھوٹی لگنے لگتی ہے۔ لیکن بیروت کی شامیں... وہ واقعی جادوئی ہیں۔ وہاں کے قہوہ خانے اور سمندر کی لہروں کا شور بالکل الگ ہی احساس دیتا ہے۔" لبنان خوبصورت ہے، رنگین ہے، مگر وہاں ایک انوکھا سا خوف بھی چھپا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے مجھے مشہد کی یہ خاموشی زیادہ عزیز ہے۔" میں نے بیروت کا نام سن کر ایک گہرا سانس لیا اور تھوڑی سنجیدگی سے پوچھا، "اچھا زکیہ! لبنان تو بالکل اسرائیل کی سرحد پر ہے۔ وہاں بھی تو اکثر جھڑپیں اور جنگی حالات رہتے ہیں، تو کیا تمہیں وہاں قیام کے دوران کچھ محسوس ہوا؟ وہاں کے لوگ ان جنگی خبروں کو کیسے لیتے ہیں؟" زکیہ نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر بڑے سچائی بھرے لہجے میں جواب دیا:
"ذیشان! سچ کہوں تو میں وہاں گھومنے گئی تھی، میری تمام تر توجہ وہاں کی تاریخی عمارتوں اور سمندر پر تھی۔ میں نے ان فوجی معاملات یا سرحد کی خبروں پر اتنی گہری توجہ نہیں دی، اور آپ کو تو پتہ ہے، میں ان چیزوں کی اتنی ماہر بھی نہیں ہوں کہ ہر باریک بین حرکت کو سمجھ سکوں۔" اس نے تھوڑا سا رک کر اپنی بات مکمل کی: "ہاں، اتنا ضرور یاد ہے کہ وہاں کے لوگ بہت 'بے فکر' نظر آتے ہیں۔ وہ شاید ان حالات کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ انہیں دور کہیں ہونے والے دھماکوں سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ وہ قہوہ خانوں میں بیٹھے ہنستے مسکراتے رہتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے آپ نے ابھی پاکستان کی عوام کے بارے میں بتایا۔ بس اتنا ہی پتہ ہے مجھے، باقی ان 'جنگی چالوں' کا علم تو آپ جیسے ماہرین کو ہی ہوتا

ہے۔"
زکیہ نے لبنان کی یادوں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پوچھا، "اچھا ذیشان کیا آپ نے ایران کے علاوہ کبھی کسی اور ملک کی سیر کی ہے؟ یا آپ کا پورا وقت ان مشنز اور سرحدوں کی نذر ہی ہو گیا؟"میں نے ایک کڑوی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ "نہیں زکیہ! سچ تو یہ ہے کہ میں فی الحال کہیں نہیں گیا۔ میری سرحدیں بس یہیں تک محدود رہی ہیں۔ پاکستان سے نکلا تو بس ان راستوں کا ہو کر رہ گیا۔زکیہ نے تپاک سے جواب دیا، "یہ تو بڑی ناانصافی ہے! چلو، اس مشن کے بعد ہم آپ کی ایسی مہمان نوازی کریں گے کہ آپ بیروت کو بھول جائیں گے۔ ایسا نہ ہو نا کہ آپ پاکستان واپس جاکر لوگوں کو کہیں کہ 'ایرانی لوگ تو ایسے ہیں یا ویسے ہیں'۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے صرف اچھی یادیں لے کر جائیں۔"رامین نے موقع پاکر شرارت سے زکیہ کی طرف دیکھا اور ایک بھرپور قہقہہ لگایا:"ارے زکیہ! تم ذیشان بھائی کی فکر چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ یہ جب اپنے پاکستان کے قصے سنانے پر بیٹھتے ہیں نا، تو سننے والا اپنی منزل بھول جاتا ہے۔ یہ تمہیں اپنی باتوں کے ایسے چکر میں ڈالیں گے کہ تم ایران کے راستے بھول کر وہیں کی کسی گلی میں گم ہو جاؤ گی۔ ان کے لفظوں میں وہ جادو ہے کہ بندہ نقشہ دیکھنا چھوڑ دیتا ہے اور بس ان کی سنتا رہتا ہے۔"زکیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا، "اچھا؟ تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ ذیشان صاحب مجھے رستہ بھلا دیں گے؟ میں بھی ایرانی ہوں رامین صاحب، ہم اپنے راستے اتنی جلدی نہیں بھولتے
میں نے مسکرا کر رامین کے کندھے پر تھپکی دی، "رامین میاں! اتنا بھی مبالغہ نہ کرو کہ زکیہ ڈر ہی جائے۔ میں تو بس اسے یہ بتا رہا تھا کہ وہاں کی مٹی میں ایک ایسی کھینچ ہے کہ جو ایک بار ان قصوں میں کھو جائے، وہ پھر کہیں اور کا نہیں رہتا۔"زکیہ کی مسکراہٹ اب پہلے سے زیادہ گہری اور اپنائیت بھری تھی۔ "تو پھر ٹھیک ہے! ایک طرف آپ کے پاکستان کے قصے ہوں گے اور دوسری طرف ہماری ایرانی خاطر تواضع۔ دیکھتے ہیں کون جیتتا ہے!"میں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، وقت تیزی سے سرک رہا تھا۔ "اچھا! اب کافی دیر ہو گئی ہے، ہمیں نکلنا چاہیے۔" میں نے لہجے میں وہی پرانی سنجیدگی پیدا کی۔ "زکیہ! ہم تمہیں ہاسٹل چھوڑ دیں گے، وہاں سے رامین اور میں واپس اپنے ٹھکانے پر جائیں گے تاکہ کل صبح کے لیے خود کو تیار کر سکیں۔ کل فجر کا وقت ہمارے لیے بہت اہم ہے۔"ہم تینوں اٹھے، رامین نے خاموشی سے بل ادا کیا اور ہم قہوہ خانے کے بھاری پردے ہٹا کر باہر نکل آئے۔ مشہد کی رات اب پہلے سے زیادہ سرد اور پراسرار ہو چکی تھی۔ گلیوں میں سائے گہرے تھے اور دور کہیں سے فوجی جیپوں کے گزرنے کی گونج سنائی دے رہی تھی۔گاڑی مشہد کی پرپیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے ہاسٹل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ رامین نے اسٹیرنگ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے آئینے میں زکیہ کی طرف دیکھا اور بڑے اعتماد سے بولا: زکیہ! ایک ضروری بات... ہم نے کاظم کے نیٹ ورک سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کی تین الگ الگ کاپیاں بنا لی ہیں۔ ایک ذیشان بھائی کے پاس ہے، ایک میرے پاس، اور تیسری ہم نے کلاؤڈ پر انکرپٹڈ فارمیٹ میں اپ لوڈ کر دی ہے۔ اس لیے اب ڈیٹا کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟ کیا تمہیں بھی ان فائلوں کی کوئی کاپی اپنے پاس محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے یا کلاؤڈ کا پاسورڈ شیئر کر

دوں؟" زکیہ نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر سنجیدگی سے جواب دیا، "نہیں رامین! فی الحال مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا کام فیکٹری کے اندر کی معلومات تک محدود ہے، زیادہ ڈیٹا کا بوجھ میرے لیے خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ تم لوگ ہی اسے سنبھالو۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے بات کو اگلے مرحلے کی طرف موڑ دیا، "ٹھیک ہے! فلحال ہم کل کے نتائج کا انتظار کریں گے۔ اگر کل شام تک کاظم کا سراغ مل گیا تو ٹھیک، ورنہ ہم اپنا 'پلان بی' (Plan B) ایکٹیو کر دیں گے۔ ہمارے پاس ان کے نیٹ ورک کے دیگر کارندوں کے جو نمبرز، خفیہ ٹھکانے اور سپلائی روٹس کی تفصیلات موجود ہیں، ہم ان پر گہرائی سے کام شروع کر دیں گے۔"

رامین نے جوش سے سر ہلایا، "بالکل بھائی! ہمارے پاس جو ثبوت ہیں وہ کسی ایٹم بم سے کم نہیں ہیں۔ کل اگر ہمیں کوئی سراغ نہ ملا، تو ہم نئے پلان پر کام شروع کر دینگے

گاڑی مشہد کی پرسکون لیکن پراسرار گلیوں کو چیرتی ہوئی ہاسٹل کے قریب ایک اندھیری نکڑ پر جا رکی۔ یہاں اسٹریٹ لائٹس مدھم تھیں، جو ہمارے مشن کی رازداری کے لیے بہترین تھیں۔ رامین نے پیچھے مڑ کر زکیہ کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر اب ایک عجیب سا سکون اور عزم تھا۔ "خیال رکھنا زکیہ! کل کا دن ہم سب کے لیے بہت بڑا امتحان ہے۔" زکیہ نے ایک پروقار مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا اور ہم دونوں کو 'خدا حافظ' کہا۔ اس کے لہجے میں اب وہ پہلے والی جھجک نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے ساتھی کا اعتماد تھا جو اپنی منزل پہچان چکا ہو۔ وہ خاموشی سے گاڑی سے اتری اور اپنی سیاہ چادر کو سنبھالتے ہوئے ہاسٹل کے بھاری لوہے کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ہم دونوں کی نظریں اس وقت تک وہیں جمی رہیں جب تک وہ گیٹ کے اندر داخل ہو کر تاریکی میں روپوش نہیں ہو گئی۔ رامین نے ایک لمبا سانس لیا، کلچ چھوڑا اور گاڑی کا رخ ہماری رہائش گاہ کی طرف موڑ دیا۔ واپسی کا سفر بالکل خاموش تھا۔ مشہد کی سڑکوں پر اب ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی، بس کہیں کہیں پولیس کے گشتی دستے نظر آ رہے تھے جو اسرائیل اور ایران کے بڑھتے ہوئے تناؤ کی وجہ سے الرٹ تھے۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے گاڑی محفوظ جگہ پارک کی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں پہنچ کر ہم نے ایک بار پھر اپنے ساز و سامان، کاظم کے نیٹ ورک سے ملے انکرپٹڈ فونز اور ان روٹس کے نقشوں پر سرسری نظر ڈالی جن پر ہمیں کل کام کرنا تھا۔ جسم تھکن سے چور تھا لیکن ذہن میں کل کے مشن کے ہزاروں سوالات اور نقشے گردش کر رہے تھے۔ رامین اپنے بستر پر گرا اور چند ہی منٹوں میں اس کی گہری سانسیں بتانے لگیں کہ وہ نیند کی آغوش میں جا چکا ہے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دور نظر آنے والے مزارِ امام رضا کے سنہری گنبد کو دیکھا جو رات کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ ایک عجیب سی دعا دل سے نکلی اور میں بھی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ جیسے ہی آنکھیں موندیں، نیند کا بوجھل پن مجھ پر غالب آ گیا اور میں شعور کی سرحدوں کو پار کر کے خوابوں کی وادی میں اتر گیا۔ پتہ بھی نہیں چلا کہ کب مشہد کی وہ پراسرار رات ڈھل گئی اور ہم گہری نیند سو گئے

اگلی صبح جب مشہد کے افق پر سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں، تو ہم ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکل پڑے۔ سرد ہوا کے جھونکے چہرے پر لگ رہے تھے جو رات بھر کی تھکن کو اتارنے کے لیے کافی تھے۔ رامین نے گاڑی کو امام بارگاہ سے کچھ

فاصلے پر پارک کیا، اور ہم عام زائرین کے روپ میں اس وسیع و عریض عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔گلیوں میں معمول کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ رامین نے بڑی مہارت سے ایک پرانے تسبیح فروش کی دکان پر رک کر باتوں باتوں میں جال بچھانا شروع کیا۔ اس نے خالص مشہدی لہجے میں کسی عام مرید کی طرح پوچھا:"آغا! سنا ہے آغا شمس صاحب کے درس آج کل بہت مشہور ہیں۔ ہم دور سے ان کی زیارت اور کچھ مشورے کے لیے آئے ہیں۔ کیا وہ آج تشریف فرما ہوں گے؟"

دکاندار نے ایک لمحے کے لیے ہمیں غور سے دیکھا اور پھر بیزاری سے سر جھٹک دیا۔ "بھائی صاحب! ہمیں ان کے آنے جانے کا کیا علم؟ وہ بڑی شخصیت ہیں، کبھی کسی محفل میں ہوتے ہیں تو کبھی کسی دوسرے شہر کے دورے پر۔ آپ کسی اور سے پوچھ لیں۔"ہم تھوڑا آگے بڑھے تو ایک بوڑھے شخص سے ملاقات ہوئی جو مسجد کی صفائی میں مصروف تھا۔ رامین نے اسے سلام کیا اور وہی سوال دہرایا۔ اس نے شفقت سے ہماری طرف دیکھا اور مشورہ دیا:

"بیٹا! آغا شمس صاحب کی مصروفیات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ وہ کبھی یہاں ہوتے ہیں اور کبھی غائب۔ آپ ایسا کریں، امام بارگاہ کے اندرونی انتظامی دفتر چلے جائیں، وہاں ان کا پورا شیڈول۔(Schedule) ہوتا ہے۔ وہیں سے آپ کو صحیح پتہ چلے گا کہ وہ آج کل کہاں ہیں۔"

ہم امام بارگاہ کے عقبی حصے میں واقع ایک پرانے لکڑی کے دروازے کے سامنے پہنچے، جس پر 'دفترِ انتظامیہ' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچے، ایک ادھیڑ عمر شخص، جس نے سر پر کالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، کنجیوں کا گچھا گھماتے ہوئے دفتر کے بھاری دروازے کو تالا لگا رہا تھا۔رامین نے تیزی سے قدم بڑھائے اور بڑے مودبانہ مگر پُر اعتماد لہجے میں سلام کیا۔ "آغا! معذرت چاہتے ہیں، کیا دو منٹ مل سکتے ہیں؟ ہم بہت دور سے آغا شمس صاحب کی زیارت اور کچھ شرعی مسائل کے حوالے سے رہنمائی لینی تھی۔ کچھ ایسے گھریلو معاملات ہیں جن پر ان کا فتویٰ یا مشورہ بہت ضروری ہے۔اس شخص نے عینک کے اوپر سے ہمیں دیکھا اور ایک لمبا سانس لے کر جواب دیا"وعلیکم السلام! بیٹا، آغا شمس صاحب تو یہاں ابھی نہیں ہیں۔ وہ کسی نجی مصروفیت کی وجہ سے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں، یا شاید کسی مجلس میں مدعو ہیں۔ ہمیں ان کے نجی شیڈول کا زیادہ علم نہیں ہوتا۔آغا! کیا کوئی مخصوص وقت ہے جب وہ یہاں دستیاب ہوتے ہوں؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "ہمارا مسئلہ ذرا سنگین ہے، اگر آج یا کل میں ملاقات ہو جاتی تو بڑی آسانی ہوتی۔"

اس نے دراز بند کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا، "دیکھیں، وہ کب واپس آتے ہیں، یہ تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کبھی وہ ایک شہر میں ہوتے ہیں تو کبھی کسی دوسرے شہر کے دورے پر۔ آپ ایسا کریں، دو تین دن بعد دوبارہ چکر لگا لیں یا کسی خادم سے پتہ کر لیجیے گا فلحال تو وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔"اس کا لہجہ بالکل نارمل اور بے نیاز تھا، جیسے روزانہ بیسیوں لوگ اسی طرح آ کر پوچھتے ہوں۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہاں مزید رکنے یا سوال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اسے واقعی کچھ علم نہیں تھا یا پھر اسے یہی بتانے کی ہدایت دی گئی تھی۔

دفتر سے نکل کر ہم نے فوراً وہاں سے ہٹنا مناسب نہ سمجھا، بلکہ ایک منجھے ہوئے آپریٹو کی طرح ہم نے گرد و نواح کا جائزہ

لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے رامین کو اشارہ کیا اور ہم عام زائرین کی طرح مٹر گشتی کرتے ہوئے امام بارگاہ کے ارد گرد کی تنگ گلیوں میں نکل گئے۔ ہمیں دیکھنا یہ تھا کہ کیا اس خاموشی کے پیچھے کوئی چھپی ہوئی آنکھیں ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہیں۔ ہم کبھی کسی قدیم کتابوں کی دکان پر رک جاتے، کبھی کسی کونے میں کھڑے ہو کر نقش و نگار کا معائنہ کرنے لگتے، لیکن ہماری نظریں مسلسل ارد گرد کے چہروں اور گاڑیوں پر تھیں۔

تقریباً ادھے گھنٹے تک ہم اسی طرح مختلف گلیوں میں گھومتے رہے، کبھی بازار کی بھیڑ میں گم ہو جاتے اور کبھی کسی ویران موڑ پر رک کر پیچھے دیکھتے۔ ہم ابھی ایک قدیم عمارت کے سائے میں کھڑے ہو کر اگلے قدم پر غور ہی کر رہے تھے کہ اچانک میرے فون کی وائبریشن نے خاموشی توڑ دی۔ میسج مختصر لیکن بہت تشویشناک تھا: "ذیشان! فیکٹری میں کچھ بہت بڑا ہوا ہے۔ یہاں کا پورا ماحول بدل چکا ہے۔ میں ابھی تفصیل نہیں لکھ سکتی، بہتر ہے کہ ہم فوراً ملیں۔" میں نے زکیہ کو جوابی میسج کیا: "ہم امام بارگاہ سے نکل رہے ہیں۔ تم کوہ سنگی 'پارکِ' کے جنوبی گیٹ کے پاس والے کیفے 'گلستان' پہنچو۔ وہاں رش میں ملنا آسان اور محفوظ رہے گا۔ ہم بیس منٹ میں وہاں ہوں گے۔" میسج بھیجتے ہی ہم تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف لپکے۔ رامین نے فوراً انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو مشہد کی مصروف سڑکوں پر ڈال دیا۔ میرا دھیان باہر گزرتے ہوئے مناظر پر تھا، جہاں جگہ جگہ سیکیورٹی کے گشتی دستے نظر آ رہے تھے۔ ہم نے تہران روڈ سے ہوتے ہوئے کوہِ سنگی کا رخ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں پارک کے جنوبی گیٹ کے سامنے جا پہنچے رامین نے گاڑی کو ایک محفوظ کونے میں پارک کیا اور ہم تیز قدموں سے 'کیفے گلستان' کی طرف بڑھے۔ کیفے کے باہر کھلے صحن میں لکڑی کی پرانی میزیں اور کرسیاں بچھی تھیں۔ ہم نے ہجوم سے ذرا ہٹ کر ایک کونے والی میز کا انتخاب کیا جہاں سے پارک کا داخلی راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ہمیں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ زکیہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہماری طرف آتی دکھائی دی۔ اس نے قریب آ کر دبی آواز میں سلام کیا اور ہماری میز پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے باوجود ایک عجیب سی فاتحانہ چمک تھی۔

ذیشان صاحب! رامین! سب کچھ بدل گیا ہے،" اس نے ایک گہرا سانس لے کر تفصیل بتانا شروع کی۔ "آج صبح جب میں فیکٹری پہنچی، تو تھوڑی ہی دیر بعد کاظم کا نائب وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے تمام ملازمین کو جمع کیا اور اعلان کر دیا کہ فیکٹری کو سیل (Seal) کیا جا رہا ہے۔" میں نے چونک کر پوچھا، "سیل؟ اس نے کیا وجہ بتائی؟" زکیہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "وہ تو یہی بہانہ بنا رہا تھا کہ امریکہ و اسرائیل کے ساتھ جنگی حالات کی وجہ سے سپلائی چین متاثر ہو گئی ہے، باہر سے مال نہیں آ رہا اور سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر فیکٹری بند کرنی پڑ رہی ہے۔ لیکن میں وہیں سمجھ گئی تھی کہ یہ سب محض ایک پردہ ہے۔ اگر جنگ کی وجہ سے فیکٹری سیل ہونی ہوتی، تو آس پاس کی دوسری فیکٹریاں کیوں چل رہی ہیں؟ صرف کاظم کی فیکٹری پر ہی یہ 'جنگی افت' کیوں ٹوٹی؟" کاظم کی گاڑی اب بھی وہیں کھڑی ہے، وہ اب تک واپس نہیں آیا۔ زکیہ کی آنکھوں میں اب خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہمارا کام ہو گیا ہے۔ اسے ایرانی انٹیلی جنس نے اٹھا لیا ہے۔ اب وہ ایجنسی کے شکنجے میں ہے اور یقیناً وہ اس سے ایک ایک مہرے کا پتہ اگلوا رہے ہوں گے۔

رامین نے میز پر مکہ مارا، اس کے چہرے پر بھی جوش تھا۔
اسنے زاکیہ کی تائید کرتے ہوئے
کہا" بلکل انٹیلی جنس والے جب کسی کو 'سکین' کرنا شروع کرتے ہیں تو وہ اس کی روح تک پہنچ جاتے ہیں۔"اب یہ بات بھی کنفرم ہے کے آغا شمس کو بھی انٹیلی جنس والے کل لے گئے تھے وگرنہ آج وہ امام بارگاہ میں ضرور ہوتا۔
زکیہ جذباتی ہوتے ہوئے بولی، "میرے باپ کا بدلہ پورا ہو گیا میں نے اپنی آنکھوں سے اس استبدادی ڈھانچے کو گرتے دیکھا ہے۔ اب انٹیلی جنس والے فیکٹری کے ایک ایک انچ کی تلاشی لیں گے، وہاں لگے کیمرے، کمپیوٹرز اور خفیہ دستاویزات سب ان کے قبضے میں ہوں گے۔ کاظم اب کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل پائے گا۔"میں نے زکیہ کو پرسکون رہنے کا اشارہ کیا، اگرچہ میرے اندر بھی اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو زکیہ۔ شکنجہ اب پوری طرح کسا جا چکا ہے۔ انٹیلی جنس والوں نے کیا کمال کی ریکی کی ہے! انہوں نے جس خاموشی سے دوسرے مہروں پر ہاتھ ڈالا ہے اور کسی شور شرابے کے بغیر آکر فیکٹری سیل کر دی، یہ ایک ماہرانہ آپریشن کی نشانی ہے۔ اب وہ اہستہ اہستہ اس پورے جال کو خود ہی ادھیڑ دیں گے۔"میری نظروں کے سامنے وہ تمام کٹھن راستے گھوم گئے جو میں نے وزیر آباد سے مشہد تک طے کیے تھے۔ "واہ! کیا کمال ہو گیا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا مشن کامیاب رہا۔ آج مشہد کی مٹی گواہ ہے کہ ہم نے پاکستان اور ایران کے دشمنوں کے ایک اور گڑھ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ہم نے ایک اور زہریلے ناگ کا سر کچل دیا ہے۔"۔"میرے لہجے میں ایک خاص قسم کا سکون اور فخر تھا۔ "ان ہینڈلرز کو، جو بلوچستان میں زہر اگلتے تھے، جو سرحدوں پر معصوموں کا خون بہاتے تھے اور جو ہمارے وطن کے خلاف سازشوں کے جال بنتے تھے... آج انہیں ان کے منطقی انجام تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ جو اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے، آج ریاست کے آہنی ہاتھوں میں تڑپ رہے ہوں گے۔زکیہ کی آنکھوں میں اب فتح کی چمک دیکھ کر میں نے ایک گہرا اور پرسکون سانس لیا۔ اس نے تجسس سے پوچھا، "ذیشان رامین اب آگے کا کیا پلان ہے؟ کیا اب ہم آرام کریں گے؟"میں نے مسکرا کر رامین کی طرف دیکھا اور پھر زکیہ کو مخاطب کیا: "زکیہ! ہمارا پلان تو ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ ہم وہ لوگ نہیں جو ایک منزل پا کر رک جائیں۔ ہمارا تو ایک مشن ختم ہوتا ہے تو دوسرا وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں ابھی بہت کام کرنا ہے، ابھی تو ان جڑوں کو کاٹنا ہے جو سرحدوں کے آر پار پھیلی ہوئی ہیں۔ ارام تو ہماری قسمت میں شاید لکھا ہی نہیں، لیکن..."میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور کہا۔آج میں تھوڑا رکنا چاہتا ہوں۔ میں امام علی رضا کے روضے پر جاؤں گا۔ وہاں سجدہِ شکر بجا لاؤں گا اور دعا کروں گا۔ اتنی بھاگ دوڑ اور خون خرابے کے بعد، اب میرا دل تھوڑا سکون چاہتا ہے، اور مجھے پتہ ہے کہ وہ سکون مجھے وہیں ملے گا۔ میں اپنی روح کی تھکن اتارنا چاہتا ہوں۔
"زکیہ کے چہرے پر عقیدت کے رنگ ابھر آئے۔ "واہ! کیا بات ہے ذیشان ۔ وہاں سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے۔"رامین نے فوراً گاڑی کی چابی گھمائی اور پرجوش لہجے میں بولا، "تو پھر دیر کس بات کی؟ ہم سب وہیں چلتے ہیں۔ روضے کی فضاؤں میں بیٹھ کر ہی اگلا پلان بنائیں گے۔ہم 'کیفے گلستان' سے اٹھے اور کوہِ سنگی پارک کی ڈھلوانوں سے

اترتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ رامین نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کوہِ سنگی کی پہاڑیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے مشہد کے مرکز کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ تقریباً 9 کلومیٹر کا مختصر مگر اہم سفر تھا۔ رامین نے گاڑی کو بہار ایونیو (Bahar Ave) اور امام رضا بلیوارڈ (Emam Reza Blvd) کی چوڑی سڑکوں پر ڈال دیا

مشہد کی سڑکوں پر اب ٹریفک معمول سے زیادہ تھی، کہیں کہیں جنگی حالات کے پیشِ نظر حکومت کے حق میں نکلنے والی چھوٹی ریلیاں بھی نظر آ رہی تھیں، مگر ہمارا رخ اس مرکز کی طرف تھا جہاں ہر شور خاموشی میں بدل جاتا ہے۔رامین نے گاڑی چلاتے ہوئے زکیہ سے پوچھا، "زکیہ! کیا تم نے اپنے والدہ اور بھائی کو اطلاع دے دی ہے کہ جس مقصد کے لیے تم گھر سے نکلی تھیں، اس کی پہلی بڑی کامیابی مل گئی ہے؟ کیا انہیں پتہ ہے کہ وہ فیکٹری سیل ہو چکی ہے جہاں سے تمہارے باپ کی زندگی چھینی گئی تھی؟"زکیہ نے نفی میں سر ہلایا، اس کی انگلیاں چادر کے پلو کو مروڑ رہی تھیں۔ "نہیں رامین ابھی تک ہمت نہیں پڑی۔ میں سوچ رہی تھی کہ رات کو اطمینان سے بتاؤں گی، لیکن اب رہا نہیں جا رہا۔"رامین نے گاڑی کو مزارِ امام رضا کی طرف موڑتے ہوئے شیشے سے زکیہ کو دیکھا۔ "ابھی بتا دو زکیہ! خوشی بانٹنے سے بڑھتی ہے۔ تمہاری ماں کی دعائیں ہی تھیں جو آج تم یہاں محفوظ کھڑے ہو۔زکیہ نے تھرتھراتے ہاتھوں سے اپنا فون نکالا اور اپنی والدہ کا نمبر ملایا۔ گاڑی میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ جیسے ہی دوسری طرف سے اس کی ماں کی نحیف اور ممتا بھری آواز میں

الو... سلام زکیہ جان! دخترم توئی؟(ہیلو... سلام زکیہ جان! بیٹی تم ہو؟)"کی صدا آئی، زکیہ کا ضبط ریت کی دیوار کی طرح ڈھہ گیا۔ اس کے لب کپکپائے، آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہوا اور آواز جیسے سینے میں کہیں پھنس کر رہ گئی۔اور وہ روتے ہوئے فارسی میں بولی: "آرے مادر! منم..(ہاں امی! میں ہوں)

امی... امی!" اس نے سسکتے ہوئے پکارا،"ابو کا لہو رنگ لے آیا ہے۔ وہ فیکٹری... جہاں سے ہماری خوشیاں چھینی گئی تھیں، وہ آج ہمیشہ کے لیے سیل ہو گئی ہے۔ کاظم کو ریاست کے آہنی ہاتھوں نے جکڑ لیا ہے۔ امی! اب وہ درندہ کسی اور کا سہاگ نہیں اجاڑے گا، اب کوئی اور بیٹی تڑپ کر یتیم نہیں ہو گی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا امی!"دوسری طرف ایک دم سناٹا چھا گیا، اور پھر سسکیوں کا ایک طوفان تھا جو فون کے اسپیکر سے باہر آ رہا تھا۔ اس کی ماں کی آواز دعاؤں میں بھیگی ہوئی تھی: "میری بہادر بیٹی! تو نے اپنی بوڑھی ماں کی کمر سیدھی کر دی۔ تیرے باپ کی قبر آج ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔ اللہ ان مسافروں (ذیشان اور رامین) کو سلامت رکھے جنھوں نے تیرا ہاتھ تھاما۔"پھر اس نے اپنے بھائی سے بات کی۔ اس کا بھائی، جو شاید صدمے سے پتھر ہو چکا تھا، خبر سنتے ہی دھاڑیں مار کر رو پڑا۔"زکیہ! میری بہن! تو نے ہمیں سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ دے دیا۔ لوگ کہتے تھے ہم بے بس ہیں، لیکن تو نے ثابت کر دیا کہ ایک بہن ایک بیٹی کی غیرت بڑے بڑے یزیدیوں کے تخت الٹ دیتی ہے۔ تو صرف میری بہن نہیں، تو اس خاندان کی ڈھال ہے۔"میں نے اسٹیئرنگ پر جھکے رامین کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں نم تھیں۔ میری اپنی کیفیت بھی مختلف نہ تھی؛ میری پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر مشہد کی سڑکوں کو دیکھا، لیکن مجھے کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا، بس ایک عجیب سا جذباتی

تلاطم تھا جو اندر ہی اندر اٹھ رہا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے اٹھ گیا اور دل کی گہرائیوں سے ایک صدا نکلی: "یا اللہ! تیرا کروڑوں شکر ہے کہ تو نے ہمیں اس عظیم مقصد کے لیے چن لیا۔ ہم تو محض مٹی کے پتلے تھے، لیکن تو نے ہمیں ایک مظلوم بیٹی کا سہارا بنا دیا۔" میرے اندر ایک عجیب سا مجاہدانہ سکون اتر آیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کے لیے میں نے وزیر آباد سے مشہد تک کا یہ کٹھن سفر طے کیا تھا۔ تاکہ میرے ہم وطن، میرے بھائی اور سرحد کے دونوں پار بسنے والے انسان سکون کی نیند سو سکیں۔ میں نے سوچا کہ دنیا کی تمام آسائشیں، تمام اعزازات اور تمام دولت ایک طرف، لیکن ایک یتیم بیٹی کے دل سے نکلنے والا یہ سکون اور اس کی ماں کی وہ دعائیں ایک طرف۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے رب سے کہا: "مولا! زندگی کا یہی سکون کافی ہے۔ تو نے ہمیں ایک اور ہینڈلر، ایک اور فتنے کو جڑ سے اکھاڑنے کی توفیق دی۔ آج تہران سے لے کر بلوچستان تک پھیلا ہوا وہ زہریلا نیٹ ورک اپنی موت آپ مر رہا ہے زکیہ نے جب فون بند کیا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، لیکن ان آنکھوں میں ایک ایسی فاتحانہ چمک اور سکون تھا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے سینے پر رکھا منوں۔ بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔ "ذیشان! رامین!" اس نے رندھی ہوئی آواز میں ہم دونوں کی طرف دیکھا، "میرے گھر والوں نے کہا ہے کہ وہ آج رات شکرانے کے نوافل پڑھیں گے۔ میرا دل آج اتنا ہلکا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں دوبارہ سے سانس لینا سیکھ رہی ہوں۔ شکریہ... آپ دونوں کا احسان میں کبھی نہیں اتار سکوں گی۔" میں نے مزارِ امام رضا کے قریب آتے ہوئے سنہری میناروں کو دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا: "شکر اس ذات کا کرو زکیہ، جس نے ہمیں وسیلہ بنایا۔ آج مشہد کی فضا میں ایک مظلوم کی دعا قبول ہوئی ہے۔" ہم مزار کے قریب پہنچے تو عقیدت مندوں کا ایک سمندر تھا جو جوق در جوق باب الرضا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رامین نے بڑی مہارت سے گاڑی کو ایک قریبی پارکنگ میں لگایا اور ہم پیدل ہی مرکزی گیٹ کی طرف بڑھے۔ یہاں سے مردوں اور خواتین کی قطاریں الگ ہو جاتی ہیں۔ زکیہ نے ہمیں ایک الوداعی نظر سے دیکھا اور خواتین کے لیے مخصوص تفتیش (Checking) والے حصے کی طرف مڑ گئی، جہاں چادر پوش خواتین کی ایک لمبی لائن لگی تھی۔ میں اور رامین مردوں والے راستے سے تلاشی کے عمل سے گزر کر حرم کے وسیع و عریض صحن میں داخل ہو گئے۔ اندر قدم رکھتے ہی ایسا لگا جیسے ہم کسی دوسری دنیا میں آ گئے ہوں۔ سنگِ مرمر کے چمکتے ہوئے فرش، سنہری مینار اور فضا میں رچی بسی عود اور گلاب کی خوشبو نے اعصاب کو ایک عجیب سی تازگی بخش دی۔ جیسے جیسے ہم ضریح مبارک (سنہری جالی) کے قریب پہنچ رہے تھے، لوگوں کا ہجوم اور سسکیوں کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں اور رامین ہجوم کو چیرتے ہوئے اس سنہری جالی کے بالکل قریب پہنچ گئے جس کے پیچھے امام علی رضا علیہ السلام آرام فرما ہیں۔ ہم نے وہاں جی بھر کر دعا کی، اپنی خطاؤں کی معافی مانگی اسکے بعد میں اور رامین 'صحنِ انقلاب' کی طرف بڑھے، جہاں سے سنہری گنبد کا سب سے خوبصورت نظارہ ملتا ہے۔

ہم نے وہاں موجود قالینوں پر جگہ بنائی اور شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ سجدے میں سر رکھا تو ان تمام کٹھن راتوں اور خطرناک لمحوں کا بوجھ جیسے آنسو بن کر بہہ گیا۔ میں نے دیر تک تلاوتِ قرآن کی اور اپنے رب سے اس عظیم کامیابی پر

گڑگڑا کر شکر ادا کیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ عبادت اور دعا میں گزارنے کے بعد، میں نے رامین کو اشارہ کیا اور ہم 'صحنِ جامع رضوی' کی طرف آ گئے۔ یہ حرم کا سب سے بڑا اور کشادہ صحن ہے جہاں خاندان کے لوگ، مرد اور خواتین ایک ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ جگہ ان تھکے ہارے مسافروں کے لیے ہے جو دور دراز سے زیارت کے لیے آتے ہیں اور یہاں اپنے پیاروں کے ساتھ بیٹھ کر سکون کے لمحے گزارتے ہیں۔ میں نے جیب سے فون نکالا اور زکیہ کو میسج کیا کہ ہم 'صحنِ جامع' کے ایک مخصوص ستون کے پاس بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سفید پھول دار چادر میں لپٹی زکیہ پُرنور چہرے کے ساتھ ہجوم کو چیرتی ہوئی ہماری طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر ایک تقدس بھرا اطمینان تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی سب سے بڑی مراد پوری ہو گئی ہو۔

وہ خاموشی سے آ کر ہمارے پاس بیٹھ گئی، اس کی آنکھیں اب بھی دعا کے اثر سے نم تھیں۔ میں نے اسے دیکھ کر دھیرے سے پوچھا، "زکیہ! کیسا رہا؟ دل کو قرار آیا؟" زکیہ نے ایک گہرا سانس لیا اور سنہری گنبد کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں بولی، "ذیشان سچ کہوں تو ایسا سکون زندگی میں پہلے کبھی نہیں ملا۔ میں نے وہاں ضریح (جالی) کو تھام کر جی بھر کے اپنے رب سے باتیں کی ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے اندر کا سارا بوجھ، وہ سارا غصہ اور انتقام کی آگ اب ایک ٹھنڈی دعا میں بدل گئی ہے۔ میں نے اپنے ابو کے لیے دعا کی، آپ لوگوں کی سلامتی مانگی اور اس فتح پر شکر ادا کیا۔ آج مجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ معاف کر دینے اور حق کے لیے لڑنے میں کتنا فرق ہے۔"

رامین نے مسکرا کر تائید کی، "بے شک زکیہ! اس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ یہاں آ کر تو بڑے بڑے طوفان تھم جاتے ہیں اب مجھے پکا یقین ہے کہ میں صحیح راستے پر صحیح لوگوں کے ساتھ ہوں، اور مجھے کوئی ڈر نہیں کیونکہ میں نے اپنی زندگی کی تپتی دھوپ میں ایک مضبوط سایہ پا لیا ہے۔ میں نے مزار کے سفید سنگِ مرمر پر جمی اپنی نظریں اٹھائیں اور زکیہ کی طرف دیکھا، جو اب بالکل پر سکون لگ رہی تھی۔ "زکیہ! اب جب کہ فیکٹری سیل ہو چکی ہے تمہارے باپ کا انتقام پورا ہو چکا ہے اور وہ درندے اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں... تو اب تمہارا آگے کا کیا ارادہ ہے؟ تم واپس اپنے گھر جاؤ گی یا فلحال مشہد میں ہی رکنے کا ارادہ ہے؟ آخر تمہارا اس مشن کا حصہ تو اب مکمل ہو چکا ہے۔" زکیہ نے ایک گہرا سانس لیا اور مزار کے میناروں کو دیکھتے ہوئے بہت متانت سے جواب دیا: "ذیشان سچ کہوں تو فیکٹری بند ہونے کے بعد اب وہاں میرا کوئی کام نہیں رہا۔ میں نے جو سوچا تھا وہ کر دکھایا۔ اب میں سوچ رہی ہوں کہ واپس اپنے گھر چلی جاؤں، شاید اب وہاں رہ کر اپنی زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دے سکوں۔ لیکن ایک بات تو ہے، اس تپتی دھوپ جیسے کٹھن سفر میں، میں نے آپ اور رامین کی صورت میں وہ۔ مضبوط سایہ پایا ہے جس نے مجھے گرنے نہیں دیا۔ میں بس یہ سوچ رہی تھی کہ کیا اب ہمارا یہ ساتھ یہیں ختم ہو جائے گا؟ زکیہ کی بات سن کر میں نے ایک لمحے کے لیے رامین کی طرف دیکھا، جو خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا تاکہ وہ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دے۔ رامین فوراً سمجھ گیا؛ وہ تسبیح جیب میں ڈالتے ہوئے اٹھا اور کہنے لگا، "ذیشان بھائی! میں ذرا سامنے والے سبیل سے پانی پی کر آتا ہوں، پیاس لگ رہی ہے۔" اس کے جاتے ہی میں نے اپنی آواز ذرا دھیمی کی اور زکیہ کی طرف متوجہ

ہوا۔"زکیہ! میں تم سے ایک ذاتی بات پوچھنا چاہتا ہوں، اگر تم برا نہ مانو؟" میں نے لہجے میں اپنائیت بھری۔ زکیہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔"کیا تمہاری زندگی میں کوئی ہے؟ میرا مطلب ہے، کیا کہیں تمہاری منگنی یا شادی کی بات طے ہو چکی ہے؟"زکیہ نے نفی میں سر ہلایا اور ایک لمبا سانس لیا۔ "نہیں ذیشان! فی الحال تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ نہ ہی میری کوئی منگنی ہوئی ہے اور نہ ہی خاندان میں کہیں بات چیت چل رہی ہے۔ میرے لیے تو بدلہ ہی سب کچھ تھا، میں نے کبھی اس رخ پر سوچا ہی نہیں تھا۔" اس نے تھوڑا رک کر مجھ سے بھی وہی سوال کیا، "اور آپ کی زندگی میں؟"میں نے مسکرا کر جواب دیا، "میں تو تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں زکیہ، میری زندگی میں تو ایسی کسی بات کی جگہ ہی نہیں بن سکی۔ بارود اور سرحدوں کے بیچ چلنے والوں کے لیے یہ سپنے بہت مہنگے ہوتے ہیں۔"زکیہ نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی اور دھیمے سے بولی، "لیکن اگر... اگر کوئی ایسی لڑکی آ جائے جو آپ کے ان خطروں میں شریک ہونا چاہے، تو کیا آپ اسے قبول کریں گے؟"میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور ایک خاموش التجا تھی، جسے سمجھنے کے لیے کسی لفظ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ حیادار لڑکی کھل کر کچھ نہیں کہہ پا رہی، لیکن اس کا دل اس وقت اپنی تمام تر سچائی کے ساتھ میرے سامنے کھلا تھا۔میں نے ایک گہرا سانس لیا اور مزار کے سنہری گنبد کی طرف دیکھا، پھر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو کر دھیمی مگر مضبوط آواز میں کہا۔زکیہ! میری زندگی کے وہ دروازے اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ میں نے وہ وقت گزار دیا جب خواب دیکھے جاتے تھے، اب تو صرف حقیقتیں ہیں۔میں نے ذرا رک کر مزار کے گنبد کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی:

"میرے دشمن اتنے بڑھ چکے ہیں کہ میں خود نہیں جانتا کہ اگلا سورج دیکھ پاؤں گا یا نہیں۔ میں کسی کو اپنے ان خطروں کا ایندھن نہیں بنا سکتا۔ میں نے اپنی زندگی اپنے دین اور اپنے وطن کے نام کر دی ہے، اور اب اس میں کسی تیسرے کی جگہ بلکل نہیں ہے۔

زکیہ بالکل خاموش ہو گئی، میری دو ٹوک باتوں نے اسے حقیقت کی اس زمین پر لا کھڑا کیا جہاں جذباتی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لیا اور نظریں جھکا لیں، شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نے یہ فیصلہ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ اس کی زندگی کی بقا کے لیے کیا ہے۔میں نے مزار کے پر سکون ماحول میں اپنی آواز کو مزید دھیما کیا اور زکیہ کی طرف متوجہ ہوا، جو اب بالکل پر سکون لگ رہی تھی۔ "زکیہ بہن! میں ایک مسافر ہوں، میرا کام ختم ہوا تو میں نے اپنی سرحد کے پار چلے جانا ہے۔ لیکن ایک بھائی کی حیثیت سے اگر تمہاری اجازت ہو تو میں ایک بات تم سے شیئر کرنا چاہتا ہوں؟"زکیہ کے چہرے پر تھوڑی حیرت ابھری، اس نے چادر درست کی اور دھیمی آواز میں بولی"جی ذیشان بھائی! آپ حکم کریں۔"آپ کو اجازت کی ضرورت نہیں۔

حکم نہیں زکیہ، یہ ایک مخلصانہ مشورہ ہےدیکھو زکیہ! اگر تمہارے خاندان میں کہیں بات چیت نہیں چل رہی یا تمہارے اپنے ذہن میں ابھی تک کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے... تو میں ایک پیغام رساں بن کر تم تک رامین کی بات پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہ سامنے رامین کھڑا ہے، تم اسے بہتر جانتی ہو۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ وہ تمہیں اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا ہے۔

اس کے دل میں تمہارے لیے بہت گہرے اور پاکیزہ جذبات ہیں۔وہ تمہارے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ مشن کے بعد وہ اپنی وہی اصفہان والی صحافتی زندگی دوبارہ شروع کرے گا،جو تم جیسی لڑکی کے لیے پرسکون اور محفوظ ہو سکتی ہے۔زکیہ ایک لمحے کے لیے چونک پڑی، اس کی نظریں جھک گئیں اور اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔ یہ اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔میں نے ایک لمحہ رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سنجیدگی سے بات مکمل کی: "میں صرف ایک پیغام پہنچا رہا ہوں، باقی فیصلہ سراسر تمہارا ہے۔ تمہاری اپنی زندگی ہے، تمہاری اپنی مرضی ہے۔ تم جہاں چاہو، جیسے چاہو اپنی خوشی سے زندگی گزارنے کا پورا حق رکھتی ہو۔ میں کوئی دباؤ نہیں ڈال رہا، بس ایک بھائی کی حیثیت سے ایک مخلص انسان کا نام تمہارے سامنے رکھا ہے۔ تم اپنے دل کی آواز سنو، اپنے گھر والوں سے مشورہ کرو اور پھر جو تمہاری خوشی ہو وہی کرنا۔ زکیہ خاموش رہی، اس کی نظریں مزار کے سفید سنگِ مرمر پر جم گئی تھیں۔ وہ شاید اپنے ذہن میں رامین کی شخصیت کے ان تمام ٹکڑوں کو جوڑ رہی تھی جو اس نے پچھلے چند دنوں میں دیکھے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی تھی، جیسے وہ کسی گہرے سمندر میں اتری ہو۔"ذیشان !میں نے اس مختصر وقت میں اسے بہت قریب سے دیکھا ہے،رامین کی شرافت اور بہادری پر مجھے کوئی شک نہیں، لیکن یہ فیصلہ... یہ تو بہت بڑا ہے،اتنا بڑا کہ میرے اعصاب اس کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہے۔"" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "گھر والوں سے مشورہ کیے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی، "بالکل زکیہ،میں جانتا ہوں کہ یہ پہاڑ جیسا فیصلہ ہے۔گھر والوں کی اور تمہاری اپنی رضا سب سے مقدم ہے۔ تم اپنی والدہ اور بھائی سے بات کرو۔ اگر تمہارا دل مانتا ہے تو پھر میرے لیے اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں ہوگی۔ ذیشان بھائی میں آج ہی اپنی والدہ اور بھائی سے بات کروں گی، بلکہ میں ابھی جا کر انہیں فون پر سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔

زکیہ کا جواب سن کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اس نے جس سنجیدگی اور وقار سے میری بات سنی تھی، اس نے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی ایک سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔میں نے ایک ممنونیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور بہت دھیمی آواز میں کہا: "زکیہ ! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری بات کو ٹھنڈے دل سے سنا اور اس کا برا نہیں مانا۔ میں صرف ایک پیغام رساں تھا اور میرا مقصد صرف ایک مخلص انسان کی بات تم تک پہنچانا تھا۔ باقی فیصلہ، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، سراسر تمہارا ہے۔ تمہاری اپنی خوشی اور تمہارے گھر والوں کی رضا ہی سب سے مقدم ہے۔ میں اب اس معاملے میں مزید کچھ نہیں کہوں گا، تم اپنی مرضی سے جو بہتر سمجھو وہی کرنا۔"زکیہ نے احترام سے سر جھکا لیا، اس کے چہرے کی خاموشی میں ایک ایسی تفہیم تھی جو لفظوں کی محتاج نہیں تھی۔ہم ابھی اسی حصار میں تھے کہ دور سے رامین تسبیح گھماتا ہوا ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر میں نے فوراً اپنا لہجہ بدلا اور چہرے پر وہی پرانی پیشہ ورانہ سختی لے آیا۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب پہنچ کر بیٹھا، اس نے تجسس سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ہاں بھائی! کوئی نیا پلان بنا؟ہاں رامین! پلان تو ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ہم آج کہیں نہیں جا رہے، رات یہیں گزاریں گے کل ہمیں یہاں سے نکل کر سیدھا ان جگہوں کا رخ کرنا ہے جہاں حکومت کے حق میں اور اس کے خلاف ریلیاں نکل رہی ہیں۔ ہمیں ان احتجاجی مظاہروں کا حصہ بننا ہے

اور قریب سے دیکھنا ہے کہ اصل میں ہو کیا رہا ہے۔" رامین نے چونک کر میری طرف دیکھا، "ریلیوں میں؟میں نے سنجیدگی سے جواب دیا، "وہی تو اصل کام ہے۔ ہمیں ان ہجوم کی آڑ میں ریکی (Recce) کرنی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ عالمی میڈیا کے کون کون سے صحافی مشہد پہنچ چکے ہیں، وہ کس زاویے سے کوریج کر رہے ہیں اور ان کے پیچھے کون سے 'ایجنڈے' چھپے ہیں۔ مجھے ان مظاہروں کی تصویریں اور ویڈیوز چاہیے تاکہ ہم اس بگڑتے ہوئے جنگی ماحول اور عوامی ردِ عمل کا درست اندازہ لگا سکیں۔"رامین، جو خود ایک منجھا ہوا صحافی تھا، فوراً پیشہ ورانہ موڈ میں آ گیا۔ "سمجھ گیا بھائی! مشہد کے مرکزی چوکوں، جیسے 'میدانِ تقی آباد' اور 'خیابانِ احمد آباد' پر اس وقت سخت تناؤ ہے۔ وہاں غیر ملکی میڈیا کے وفود موجود ہوں گے۔ میں ان۔صحافیوں کے کارڈز اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھوں گا۔

میں نے زکیہ کی طرف رخ کیا، "زکیہ! کیا تم ابھی ہمارے ساتھ چلو گی؟زکیہ نے ایک نظر مجھ پر اور پھر رامین پر ڈالی اور پر عزم لہجے میں کہا، "جی میں بالکل تیار ہوں۔"رامین نے تھوڑا فکر مند ہو کر پوچھا، "بھائی! زکیہ کی واپسی کا کیا پروگرام ہے؟ اسے ہاسٹل چھوڑنا ہے یا..."میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا، "نہیں رامین، ابھی اسے جانے دو۔ یہ ایک دو دن ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔ رامین خاموش ہو گیا، اسے ابھی تک ذرا سا بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں نے زکیہ سے اس کے مستقبل اور رشتے کے بارے میں کیا بات کی ہے۔زکیہ اٹھی اور بولی، "ذیشان رامین! میں ذرا گھر فون کر لوں، امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" میں ابھی بات کر کے آتی ہوں۔"وہ جیسے ہی ہجوم میں تھوڑا فاصلے پر گئی، میں نے رامین کی طرف دیکھا جو ابھی تک ریلیوں کے روٹس ذہن میں ترتیب دے رہا تھا۔اب وقت تھا کہ میں اسے وہ دھماکہ خیز خبر سناؤں جس کی اسے توقع بھی نہ تھی۔رامین!" میں نے آواز دھیمی رکھی، "ایک خبر ہے تمہارے لیے۔"وہ چونک کر میری طرف مڑا، "جی بھائی؟ کوئی نئی اپڈیٹ؟""میں نے ابھی زکیہ سے تمہارے رشتے کی بات کی ہے،" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں نے اسے صاف بتا دیا ہے کہ تم اس کے لیے کیا جذبات رکھتے ہو اور اسے شریکِ سفر بنانا چاہتے ہو۔"رامین کے ہاتھ سے تسبیح گرتے گرتے بچی۔ اس کا رنگ ایک لمحے میں سرخ ہوا اور پھر زرد پڑ گیا۔ اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی۔"کیا؟ ذیشان بھائی... یہ آپ نے کیا کر دیا؟ اتنی جلدی؟ ابھی تو مشن کی دھول بھی نہیں بیٹھی تھی... آپ نے مجھ سے مشورہ تو کیا ہوتا۔ وہ کیا سوچے گی؟ اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور حیرت کا طوفان تھا۔میں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "رامین، سکون سے سنو۔ یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔ وقت بالکل ٹھیک تھا۔ ہم اس وقت ایک مقدس جگہ پر بیٹھے ہیں، کاظم کے انجام نے زکیہ کا پرانا بوجھ اتار دیا ہے اور وہ اس وقت ذہنی طور پر بہت پرسکون ہے۔ مزار کی اس روحانی فضا میں سچ بات کرنے کے لیے اس سے بہتر لمحہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

رامین نے تھوک نگلا، اس کی نظریں اب بھی زکیہ کی سمت تھیں جو دور فون پر بات کر رہی تھی۔ "لیکن بھائی... اس نے کیا کہا؟ اس نے انکار نہیں کیا رامین،" میں نے اسے اطمینان دلایا۔ "اگر اسے تم پسند نہ ہوتے یا اس کے دل میں تمہارے لیے جگہ نہ ہوتی، تو وہ وہیں ٹوک دیتی۔ وہ بہت کھری لڑکی ہے، صاف کہہ دیتی کہ 'ذیشان بھائی، پیغام پہنچانے کا شکریہ مگر میں دلچسپی نہیں رکھتی'۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ 'میں گھر والوں سے مشورہ کروں گی'، اصل میں اس کی خاموش رضا

مندی ہے۔ وہ حیادار ہے، اس لیے وہ خود 'ہاں' نہیں کہہ سکتی تھی، اس نے فیصلہ اپنے خاندان پر چھوڑ دیا ہے۔میں نے بات جاری رکھی، "اور رہی بات اس کے گھر والوں کی، تو وہ اس پر کوئی پریشر نہیں ڈالیں گے۔ وہ اس کی خوشی میں خوش ہوں گے۔ہم نے مل کر اس کے باپ کا بدلہ لیا ہے... ان کے لیے تم سے بہتر انتخاب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے پریشان ہونا چھوڑو۔رامین کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ دبی آواز میں بولا:

۔ذیشان بھائی! آپ نے جو سمجھایا وہ اپنی جگہ، مگر میرے خیال میں آپ نے واقعی بہت جلدی کر دی۔ ہم کل جب ایک ساتھ مشن پر نکلیں گے، ان ریلیوں اور احتجاج کے ہجوم میں ہوں گے، تو کیا ہم پہلے کی طرح دوستانہ انداز میں بات کر سکیں گے؟ اس کے ذہن میں اب ایک عجیب سی جھجک بیٹھ گئی ہوگی۔ اگر اس نے انکار کر دیا، تو چلو

میرے دل میں اس کے لیے کوئی غصہ، نفرت یا کینہ پیدا نہیں ہوگا، میں اسے پہلے کی طرح ہی عزت دوں گا۔"میں تو اپنا کام کر لوں گا... مگر وہ؟ وہ جب بھی میری طرف دیکھے گی، یہی سوچے گی کہ میں اس سے محبت کی بھیک مانگ رہا ہوں وہ اب مجھے ایک برابر کا ساتھی سمجھنے کی بجائے ایک 'طلبگار' کی نظر سے دیکھے گی۔ اسے لگے گا کہ میں اب اس کے ساتھ مشن پر نہیں، بلکہ اس سے رشتے کی امید لگائے بیٹھا ہوں۔وہ جو ایک بے تکلفی تھی، وہ جو ایک ٹیم والا اعتماد تھا، وہ اب اس ایک بات سے بوجھل ہو گیا ہے۔ سچی بات ہے بھائی، مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کی توجہ مشن سے ہٹ کر ان الجھنوں میں نہ الجھ جائے۔"رامین نے ایک لمبا سانس لیا اور نظریں جھکا لیں، "آپ نے اسے ایک دم سے اتنے بڑے فیصلے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے، پتہ نہیں اب وہ ہمیں پہلے والی نظر سے دیکھتی بھی ہے یا نہیں!"میں نے رامین کے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر پُر اعتماد لہجے میں کہا: "رامین! میری بات غور سے سنو۔ ہمارے کام میں کچھ فیصلے لٹکائے نہیں جاتے۔ تم جسے 'جلدی' کہہ رہے ہو، میں اسے حکمتِ عملی اور موقع شناسی کہتا ہوں۔ ہم جس آگ کے دریا میں کھڑے ہیں، وہاں کل کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہی سب سے بہترین وقت تھا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔"یہی تو موقع شناسی ہے کہ لوہا گرم دیکھ کر چوٹ ماری جائے۔"میں نے مزار کے سنہری گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: "ایسی مقدس جگہ پر بیٹھ کر، جب دل مٹی کے بوجھ سے آزاد ہو، تبھی زندگی کے بڑے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ میں اسے کسی انجانے خوف یا 'آسرے' میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ہمیں ایک واضح جواب چاہیے تھا تاکہ ہم یکسوئی سے اپنے اگلے مشن پر توجہ دے سکیں۔دیکھو رامین! میرے ابھی یہاں ایک دو ضروری کام باقی ہیں، وہ نمٹا کر مجھے بہرحال اپنے وطن واپس لوٹنا ہے۔ تم نے میرے ساتھ رہنا ہے یا اپنی صحافتی زندگی میں واپس جانا ہے، یہ فیصلہ اس رشتے کے جواب پر منحصر ہوگا۔اگر وہ انکار کر دیتی ہے، تو ہماری راہ واضح ہو جائے گی۔وہ ان ریلیوں تک ہمارے ساتھ بطور 'ڈھال' رہے گی اور پھر ہم اسے ایک بھائی کی طرح، پوری عزت و احترام کے ساتھ شکریہ ادا کر کے اس کے گھر رخصت کر دیں گے۔ ہم کسی لڑکی کو غیر یقینی صورتحال یا کسی 'آسرے' میں رکھ کر اپنے ساتھ نہیں گھسیٹ سکتے۔ یہ ناانصافی ہوتی۔"میں نے رامین کو جھرجھری دیتے ہوئے کہا، "کسی بات کو دل میں چھپا کر رکھنا بوجھ بن جاتا ہے۔ اب جو بھی ہوگا، سامنے ہوگا۔ اگر وہ تمہاری شریکِ حیات بنتی ہے، تو سچائی سے آغاز ہوگا، میں نے اس پاک جگہ کا

انتخاب اس لیے کیا تاکہ ہم سب کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اس کھیل میں، رامین، ٹائمنگ ہی سب کچھ ہوتی ہے، اور میں نے اس کے وقار اور تمہاری مخلصی کے لیے یہی وقت مناسب سمجھا ہے۔" رامین نے ایک لمبا سانس لیا، اس کے چہرے پر اب گھبراہٹ کی جگہ ایک عجیب سا سرور اور امید رقص کر رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا، مزار کے صحن میں عقیدت مندوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن ہم دونوں کی نظریں مسلسل ہجوم میں زکیہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک وہ دور سے آتی دکھائی دی، اس کے چہرے پر ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا، جیسے وہ کوئی بہت بڑا فیصلہ کر کے آئی ہو۔

وہ آئی اور خاموشی سے ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے رامین کی بے چینی بھانپ لی تھی، لیکن میں نے بہت نارمل انداز میں پوچھا، "ہاں زکیہ! گھر پر سب خیریت ہے؟ بھائی اور والدہ سے بات ہو گئی؟" زکیہ نے نظریں جھکا کر دھیرے سے سر ہلایا، "جی ذیشان بھائی، سب ٹھیک ہیں۔ میں نے امی اور بھائی کو سب بتا دیا ہے۔ وہ لوگ تو آپ دونوں کو پہلے سے جانتے تھے کیونکہ میں مشن کے دوران آپ لوگوں کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ ذیشان میں نے بھائی اور والدہ کو آپ کے پیغام کے بارے میں بتایا۔ بھائی پہلے تو بہت حیران ہوئے لیکن پھر وہ بخوشی اس رشتے کے لیے تیار ہو گئے وہ بہت خوش ہیں اور انہوں نے رامین پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے۔۔انہوں نے کہا کہ اگر میری رضا ہے، تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ زکیہ نے جب اپنے گھر والوں کی رضا مندی کی خبر سنائی، تو مزار کے صحن میں ایک عجب سا سکون چھا گیا۔ تو زکیہ!" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا، "گھر والے تو راضی ہیں، اب تمہارا اپنا حتمی فیصلہ کیا ہے؟ تم کیا کہتی ہو؟" زکیہ نے تھوڑی جھجک کے ساتھ رامین کی طرف ایک سرسری نظر ڈالی اور مجھ سے مخاطب ہوئی، "ذیشان بھائی... اگر مجھے اعتراض ہوتا تو میں آپ کو پہلے ہی منع کر دیتی۔ جب میرے گھر والے راضی ہیں، تو مجھے بھی یہ رشتہ دل سے قبول ہے۔ میں نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا اور رامین کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ "ماشاء اللہ! پھر تو مبارک ہو۔ زکیہ نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر اپنی بات جاری رکھی، "ذیشان بھائی! میں سوچ رہی تھی کہ ابھی آپ لوگوں کا یہاں کام باقی ہے اور ہم نے ساتھ ہی رہنا ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اس بابرکت جگہ پر جہاں لوگ ترستے ہیں آنے کیلئے ایک سادہ سا شرعی نکاح (عقد) کر لیں؟ تاکہ ہمارا ساتھ رہنا بھی شرعی ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کے محرم بن جائیں۔ رہی بات شادی کی رسموں اور دعوت کی، تو وہ سب تہران میں گھر والوں کی موجودگی میں بعد میں ہوتا رہے گا۔ زکیہ کی زبان سے جب نکاح کا لفظ نکلا، تو میں ایک لمحے کے لیے چونک پڑا۔ مجھے اس قدر فوری اور پختہ فیصلے کی توقع نہیں تھی۔ میں نے حیرت سے زکیہ کے پُرنور چہرے کو دیکھا اور پھر رامین کی طرف مڑا، جو جیسے کسی دوسری دنیا میں کھو گیا تھا۔ وہ یک دم چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر خوشی، حیرت اور تھوڑی سی گھبراہٹ کے رنگ بدل رہے تھے۔ "نکاح؟ ابھی؟ یہاں؟" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا، "زکیہ! تمہارے گھر والے... میرا مطلب ہے وہ تہران میں ہیں، وہ برا تو نہیں مانیں گے؟

اس سے پہلے کہ رامین اپنی الجھنوں میں گم ہوتا، میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"رامین! گھر والوں کی فکر چھوڑو۔ اس کی والدہ اور بھائی خود اس تجویز سے خوش ہیں۔ الٹا ان کے لیے تو یہ سکون کی بات ہوگی کہ ان کی بیٹی اب ایک شرعی رشتے کے تحفظ میں ہے۔

زکیہ! تمہاری بات نے مجھے واقعی حیران کر دیا، لیکن سچ تو یہ ہے کہ تمہاری سوچ بہت دور اندیش اور پختہ ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہم جس طرح ایک مشن پر ساتھ ہیں اور ابھی ہمیں مزید کچھ وقت اکٹھے گزارنا ہے، تو اسے شرعی پردے میں لانا ہی سب سے بہتر ہے۔ زکیہ نے چادر درست کرتے ہوئے کہا"ذیشان بھائی! میرے گھر والوں نے بھی یہی کہا ہے کہ ہم یہیں مزار پر ہی نکاح کر سکتے ہیں؟ وہ چاہتے ہیں کہ اس پاک جگہ سے ہی ہماری نئی زندگی کا آغاز ہو۔ رامین آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ہمیں ابھی نکاح کر لینا چاہیے؟"تم اپنے گھر والوں سے پوچھ لو۔ رامین! نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ زکیہ تم میرے گھر والوں کی فکر چھوڑو۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ ان کے بیٹے نے حرمِ امام رضا جیسی مقدس جگہ پر، ایک ایسی نیک اور بہادر لڑکی سے نکاح کیا ہے جس نے حق کے لیے اتنی بڑی قربانی دی، تو ان کا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔ والدین کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا بیٹا ایک شرعی اور پاکیزہ بندھن میں بندھ رہا ہے۔ باقی رہی رسم و رواج کی بات، تو وہ سب تہران اور اصفہان میں خاندانوں کی موجودگی میں دھوم دھام سے کر لیں گے۔

زکیہ نے رامین کی بات سن کر ایک گہرا سانس لیا، اس کی آنکھوں میں اب کوئی شک نہیں بلکہ ایک پختہ یقین جھلک رہا تھا۔ اس نے مزار کے سنہری گنبد کی طرف دیکھا اور بہت دھیمی مگر صاف آواز میں بولی: "رامین اگر آپ کے گھر والوں کو اعتراض نہیں اور میرا بھائی اور والدہ بھی یہی چاہتے ہیں، تو پھر دیر کیسی؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ نیک کام میں جتنی جلدی ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ یہاں امامِ ضامن کے سائے میں ہمارا محرم بننا میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہوگا۔" میں نے ان دونوں کے چہروں پر پھیلی مسرت دیکھی تو دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایک مشکل سفر کا کتنا خوبصورت اختتام ہو رہا ہے۔ میں نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا: "ماشاء اللہ! جب تم دونوں کا دل مطمئن ہے تو پھر اب ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن رامین! پہلے ہمیں یہاں کا باقاعدہ طریقہ کار معلوم کرنا ہوگا۔ حرم کی انتظامیہ کے اپنے ضوابط ہیں۔ چلو، ذرا معلومات لیتے ہیں کہ 'دفترِ عقد' (نکاح کے دفتر) میں آج کے لیے کیا صورتحال ہے اور وہ ہمیں کب کا وقت دے سکتے ہیں۔" رامین نے فوراً تائید کی، "جی ذیشان بھائی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں پہلے یہ جاننا ہوگا کہ کاغذی کارروائی اور قاضی صاحب کی دستیابی کا کیا سین ہے۔ ہم مزار کے مرکزی صحن سے متصل 'رواقِ شیخ طوسی' کی طرف بڑھے، جہاں زائرین کے مذہبی اور شرعی معاملات کے لیے مخصوص دفاتر قائم ہیں۔ وہاں سبز رنگ کی مخصوص واسکٹ پہنے ایک باوقار خادم کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں پروں والا ڈنڈا (حرم کی علامت) تھا۔ رامین نے آگے بڑھ کر خالص مشہدی لہجے میں اس سے دریافت کیا کہ اگر کوئی جوڑا یہاں نکاح (عقد) کرنا چاہے تو اس کا کیا عمل ہوتا ہے۔ اس خادم نے ہمیں ایک کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا جہاں 'دفترِ عقد' (نکاح کا دفتر) کی تختی لگی ہوئی تھی۔ پھر ہم اس دفتر کی طرف بڑھ گئے وہاں ایک عمر رسیدہ رجسٹرار بڑی تندہی سے ایک موٹے رجسٹر میں کچھ اندراج کر رہا تھا۔ رامین نے آگے

بڑھ کر بڑے شائستہ لہجے میں سلام کیا اور اپنی درخواست پیش کی: "آغا! سلام۔ ہم یہاں ایک سادہ سا شرعی نکاح (عقد) کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ہمیں ابھی کوئی وقت مل سکتا ہے؟" رجسٹرار نے اپنی عینک درست کی اور رامین کو غور سے دیکھنے کے بعد اپنے سامنے رکھا بڑا سا رجسٹر چیک کیا۔ اس نے پنسل سے کچھ حساب لگایا اور پھر سنجیدگی سے جواب دیا: دیکھیے آغا! حرم میں نکاح کے لیے وقت پہلے سے بک کرنا پڑتا ہے۔ آج کے تمام قاضی صاحبان کا شیڈول مکمل ہے اور اب کوئی 'سلاٹ' خالی نہیں ہے۔ آج کا پورا دن اور رات بک ہو چکی ہے۔" رامین نے تھوڑی التجا کے ساتھ کہا، "آغا! ہم مسافر ہیں اور ہمیں کل ایک ضروری کام سے نکلنا ہے، کیا کوئی بھی راستہ نہیں کہ آج یہ مقدس فریضہ ادا ہو سکے؟" رجسٹرار نے تھوڑا سوچا، پھر رجسٹر کے اگلے صفحے پر کچھ درج کرتے ہوئے دوٹوک لہجے میں جواب دیا: "آج تو بالکل ممکن نہیں، لیکن میں آپ کا نام کل کے لیے درج کر لیتا ہوں۔ رجسٹرار نے ایک گہرا سانس لیا اور میز پر دھری ایک بھاری بھرکم جلد والی کتاب کھولی، جس کے صفحات پر مخصوص سرکاری مہریں لگی تھیں۔ اس نے ایک لمبا قلم اٹھایا اور رامین کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا:

"آغا! اپنے اور اس خاتون کے اصل شناختی کاغذات (کارت ملی) دکھایئے۔" رامین نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا کارڈ نکالا اور زکیہ نے اپنی چادر کے اندر سے اپنا شناختی کارڈ میز پر رکھ دیا۔ رجسٹرار نے بڑی باریک بینی سے ان کی تاریخِ پیدائش اور مشہد میں رہائش کی تفصیلات چیک کیں۔ پھر اس نے ایک مخصوص 'درخواست فارم' (فرمِ تقاضا) نکالا اور رامین سے اس کے خاندان، پیشہ اور مہر کے بارے میں بنیادی معلومات درج کروائیں۔

اس کے بعد اس نے اپنے کمپیوٹر کی اسکرین پر کچھ کلک کیا اور پھر رجسٹر کے ایک مخصوص خانے میں پنسل سے نشان لگاتے ہوئے بولا: "دیکھیے! اج کا کوئی وقت خالی نہیں، لیکن میں نے آپ کا اندراج کل نو بجے کے لیے کر لیا ہے۔ یہ آپ کی 'نوبت' (Appointment) ہے۔" اس نے ایک چھوٹی سی رسید (فیش) کاٹ کر رامین کے ہاتھ میں تھمائی، جس پر ان کا نام، وقت اور 'رواقِ شیخ طوسی' کا مخصوص کمرہ نمبر درج تھا۔ "یاد رکھیے! کل نو بجے سے پندرہ منٹ پہلے آپ کو یہاں حاضر ہونا ہوگا۔ اگر لڑکی کا ولی (بھائی) موجود نہیں ہے، تو اس وقت آپ کو اس کی ٹیلیفونک یا ویڈیو کال پر گواہی کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ ہمارے قاضی صاحب صرف پندرہ منٹ انتظار کریں گے، اگر آپ لیٹ ہوئے تو آپ کی باری ختم ہو جائے گی۔ اس نے اپنی مخصوص مہر اس رسید پر لگائی اور اسے فائل میں لگا دیا۔ "اب آپ جا سکتے ہیں۔ کل وقت کی پابندی کیجیے گا۔"

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس خاموش مگر پروقار دفتر سے باہر نکل آئے۔ رامین نے وہ رسید ایسے تھام رکھی تھی جیسے اسے دنیا کا سب سے بڑا اعزاز مل گیا ہو۔ میں نے رامین کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا، "چلو رامین! اب جب کہ کل نو بجے کی 'نوبت' مل گئی ہے، تو تھوڑا بازار کا چکر لگاتے ہیں۔ آخر کل تمہاری زندگی کا سب سے بڑا دن ہے، کچھ ضروری چیزیں لینی ہوں گی اور ویسے بھی، میری بہن اور میرے بہترین دوست کی شادی ہو رہی ہے، تو میرا تحفہ دینا تو بنتا ہے نا؟ میں چاہتا ہوں کہ جب میں یہاں سے چلا جاؤں، تو تمہارے پاس میری کوئی یادگار تو رہے۔" رامین نے کچھ

کہنا چاہا لیکن میں نے اسے ٹوک دیا، "انکار مت کرنا، دوست ہونے کے ناطے اتنا حق تو میرا بنتا ہے۔"

زکیہ جو خاموشی سے سن رہی تھی، ایک دم رک گئی اور میری طرف دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے بولی، "ذیشان بھائی! آپ ہمارے لیے جو کر رہے ہیں اس کا شکریہ تو ہم کبھی ادا نہیں کر پائیں گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا، جب آپ یہاں سے واپس پاکستان جائیں گے، تو آپ کی واپسی کا ٹکٹ ہماری طرف سے ہوگا۔ یہ ہمارا آپ کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہوگا۔"

یہ سن کر میں یک دم چونک پڑا۔ کیونکہ زکیہ کو ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ میں تو یہاں غیر قانونی طریقے سے، سرحدیں پھلانگ کر پہنچا ہوں، میرے پاس تو نہ پاسپورٹ ہے اور نہ ہی میں کسی ایئرپورٹ سے ٹکٹ لے کر جا سکتا ہوں۔ میرا واپسی کا راستہ تو تفتان کے سنگلاخ پہاڑوں کا ہے۔ میں نے فوراً اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا اور مسکرا کر بات ٹالتے ہوئے کہا، "ارے زکیہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ابھی تو میرے یہاں بہت سے کام باقی ہیں، واپسی کا ارادہ بنے گا تو دیکھی جائے گی۔ فلحال تو ہمیں کل کی فکر کرنی ہے۔" رامین نے میری طرف دیکھا، وہ سچ جانتا تھا اس لیے اس نے خاموشی سے نظریں چرا لیں۔ ہم مزار کے قریب واقع مشہور بازارِ رضا (Bazaar-e-Reza) میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک طویل اور خوبصورت بازار ہے جہاں عطر، تسبیحوں اور ایرانی دستکاری کی بھرمار ہے۔ ہر طرف سے زعفران اور لبان کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے ایک دکان سے زکیہ کے لیے ایک خوبصورت ایرانی چادر اور انگوٹھی لی پھر میں نے رامین کے لیے ایک بہت ہی عمدہ قلم (Parker Style) اور ایک قیمتی کلائی گھڑی پسند کی، کیونکہ وہ ایک صحافی تھا اور یہ چیزیں اس کی شخصیت اور کام کے لیے بہترین تھیں۔ رامین کی آنکھوں میں تشکر کی چمک تھی، وہ بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ کل اس کی زندگی کا نیا سفر شروع ہونے والا ہے۔ بازار میں گھومتے ہوئے ہم عام سیاحوں کی طرح دکھ رہے تھے، لیکن ہمارے ذہنوں میں کل کے مشن اور نکاح کی تیاریاں گردش کر رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو خوش دیکھ کر دل میں ایک عجیب سا سکون محسوس کیا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ میرا اپنا واپسی کا راستہ ابھی بہت کٹھن اور خطرناک ہے۔ ہم بازار سے نکلے تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ میں نے رامین کی طرف دیکھا، "ہوٹل جانا ابھی ٹھیک نہیں ہوگا، کیونکہ زکیہ کا ہمارے ساتھ وہاں رکنا قانونی پیچیدگیاں پیدا کر سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم آج کی رات حرم میں ہی گزاریں۔ وہاں عبادت بھی ہو جائے گی اور ہم محفوظ بھی رہیں گے۔" زکیہ نے تائید کی، "جی ذیشان بھائی، حرم میں قیام سب سے بہتر ہے۔ میں خواتین کے لیے مخصوص 'رواق' میں آرام کر لوں گی، آپ لوگ مردوں والے حصے میں رہنا۔ ہم فجر کے بعد دوبارہ اسی 'صحنِ جامع' میں ملیں گے۔" ہم نے حرم کے ایک پرسکون گوشے میں جگہ بنائی۔ رات کا منظر سحر انگیز تھا؛ سنہری گنبد پر پڑنے والی روشنیاں اور زائرین کی دھیمی آوازیں۔ صحنِ جامع رضوی کے ایک کونے میں بچھے قالین پر ہم تینوں بیٹھے تھے۔ سامنے چائے کے ڈسپوزایبل کپ رکھے تھے اور ہم خاموشی سے بسکٹ کھاتے ہوئے کل کے پروگرام بنا رہے تھے۔ مزار کی ٹھنڈی ہوا نے ماحول کو پُرسکون بنا دیا تھا۔ زکیہ نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور اچانک سنجیدگی سے پوچھا، "ذیشان بھائی! ہم نے نکاح کے لیے ابھی تک گواہوں کا نہیں سوچا؟ آخر

گواہوں کا کیا کرنا ہے؟"رامین نے بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا، "زکیہ! اس کی ٹینشن مت لو۔رجسٹرار آغا نے دفتر میں ہی بتا دیا تھا کہ گواہ ہمیں حرم کے اندر سے ہی مل جائیں گے۔ وہاں بہت سے نیک زائرین ہوتے ہیں جو ایسے کارِ خیر میں بخوشی گواہ بن جاتے ہیں۔"زکیہ نے سر ہلا کر اثبات کیا، "اچھا! اگر اندر سے مل جائیں گے تو پھر تو ٹھیک ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ایک گواہ تو ہم مزار کے اندر سے لے لیں گے، لیکن دوسرا گواہ... دوسرا گواہ میرے ذیشان بھائی ہوں گے۔

میں چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کی طرف سے آپ میرے وکیل اور گواہ بنیں۔یہ سن کر میں یک دم چونک پڑا۔ چائے کا کپ میرے ہاتھ میں لرز گیا اور میں نے گھبرا کر رامین کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب یہ راز مزید نہیں چھپ سکے گا۔

نہیں زکیہ! یہ ممکن نہیں ہے،" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تمہارا گواہ نہیں بن سکتا۔زکیہ کے ماتھے پر حیرت کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے چائے کا کپ نیچے رکھا اور تذبذب سے پوچھا، "لیکن کیوں ذیشان بھائی؟ کیا کوئی قانونی مسئلہ ہے؟میں نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔اور کہاہاں زکیہ! قانونی مسلہ ہے تم سمجھ رہی ہو کہ میں یہاں ایک عام ویزے پر آیا ہوں، لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر میں کل 'دفترِ عقد' میں گواہ کے طور پر اپنا پاسپورٹ یا شناختی کارڈ پیش کروں گا، تو میں سیکنڈوں میں پکڑا جاؤں گا۔ کیونکہ سرکاری ریکارڈ میں میرا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔" زکیہ ساکت رہ گئی۔ "مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں؟

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنی آواز کو مزید دھیما کر لیا۔ "زکیہ! حقیقت یہ ہے کہ میں ایران میں قانونی طور پر موجود ہی نہیں ہوں۔ میں یہاں کسی ایئرپورٹ سے نہیں اترا، نہ میرے پاسپورٹ پر کوئی انٹری لگی ہے اور نہ ہی میرے پاس کوئی ویزا ہے۔ میں 'غیر قانونی' طریقے سے، سرحدیں پھلانگ کر اور چھپتے چھپاتے یہاں پہنچا ہوں۔"زکیہ کا رنگ ایک دم اڑ گیا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹنے لگا۔ "کیا۔۔۔؟ غیر قانونی طریقہ؟ آپ۔۔۔ آپ ایک غیر ملکی ہو کر یہاں بغیر دستاویزات کے گھوم رہے ہیں؟" وہ جیسے صدمے میں چونک پڑی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو شخص اتنے اہم مشن پر کام کر رہا ہے، وہ خود ایک 'مجرمانہ' طریقے سے ملک میں داخل ہوا ہے۔میں نے جھک کر سرگوشی میں اسے وہ سب بتانا شروع کیا جو اب تک ایک راز تھا۔

زکیہ میری مجبوری سمجھو

اگر میں ورک ویزے یا وزٹ ویزے کے قانونی چکروں میں پڑتا، تو میری شناخت ریکارڈ میں آ جاتی۔ ایئرپورٹ پر انٹری سے لے کر ہوٹل کی رجسٹریشن تک، ہر جگہ میری نقل و حرکت پر نظر رکھی جاتی۔ میں یہاں 'ٹائم لمٹ' کے ساتھ نہیں، بلکہ کھل کر اور اپنی مرضی سے کام کرنا چاہتا تھا۔ مشہد، تہران اور اصفہان جیسے حساس شہروں میں، جہاں پہلے ہی جنگی حالات کی وجہ سے ہر اجنبی پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے، ایک باقاعدہ ویزے والے شہری کے لیے خاموشی سے آپریشن کرنا ناممکن ہوتا۔

پھر میں نے اسے مختصر وہ داستان سنائی جو میرے اور رامین کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے بلوچستان کے ان سنگلاخ اور بے رحم پہاڑوں کو کیسے عبور کیا جہاں راستہ بھٹکنے کا مطلب صرف موت ہے۔ میں نے اسے ان تنگ دروں اور اسمگلروں کے ان خفیہ راستوں کا بتایا جہاں سے گزرتے ہوئے ہر پل یہ ڈر رہتا تھا کہ کہیں کوئی بارڈر فورس کا سپاہی یا کوئی اجرتی قاتل سامنے نہ آ جائے۔"زکیہ! میں نے سرحد پر خاردار تاروں کے سائے میں بھوک برداشت کر کے راتیں گزاری ہیں، میں ان دشوار گزار روٹس سے ہو کر یہاں پہنچا ہوں جہاں تپتی دھوپ اور جما دینے والی ٹھنڈ کے سوا کچھ نہیں تھا۔میری باتیں سن کر زکیہ ساکت رہ گئی۔ اس نے شاید خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جس شخص کو وہ ایک عام۔پاکستانی شہری سمجھ رہی تھی، وہ اپنے وطن اور اپنے مقصد کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر، تمام بین الاقوامی قوانین کو پسِ پشت ڈال کر یہاں پہنچا ہے۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے احترام اور ہمدردی کی ایک نئی لہر ابھر آئی۔ذیشان بھائی! آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ آپ اتنے بڑے خطرے میں تھے اور ہم انجان بنے رہے۔ اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو کیا ہوتا؟میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "زکیہ! سچ تو یہ ہے کہ سچ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہم ہر وقت کسی نہ کسی تعاقب میں تھے، کبھی کاظم کا خوف تو کبھی آغا شمس کی چالیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے تم کسی اور ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاؤ۔زکیہ نے بے چینی سے اپنے گرد بیٹھے زائرین پر نظر دوڑائی، جیسے اسے اب ہر چہرہ مشکوک لگ رہا ہو۔ "ذیشان بھائی! اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اب پہلے سے کہیں زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ اگر یہاں کسی کو شک بھی ہو گیا کہ آپ کا پاسپورٹ یا ویزا نہیں ہے، تو حالات قابو سے باہر ہو سکتے ہیں۔ مشہد کی پولیس اور انٹیلی جنس اس معاملے میں بہت سخت ہے۔

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا، "زکیہ! تم اس کی فکر بالکل نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ سائے کی طرح کیسے رہا جاتا ہے اور نشان چھوڑے بغیر کیسے نکلنا ہے۔ ابھی ہمارا پورا فوکس کل صبح نو بجے کے نکاح پر ہونا چاہیے۔ میری فکر چھوڑ دو، میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ بس تم یہ دعا کرو کہ کل کا دن خیریت سے گزر جائے اور تم دونوں ایک پاک رشتے میں بندھ جاؤ۔"

ہم نے چائے کے خالی کپ ایک طرف رکھے اور رات کے اس پہر 'صحنِ جامع' سے اٹھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے زکیہ کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا، "زکیہ! اب تم جا کر خواتین کے لیے مخصوص 'رواق' میں آرام کرو۔ صبح ایک بڑا دن ہے، تمہارا تازہ دم ہونا ضروری ہے۔ ہم بھی یہیں مردوں والے حصے میں کسی گوشے میں جگہ بنا لیں گے۔"

زکیہ نے سر ہلایا، اس کی آنکھوں میں ابھی تک میری داستان کا اثر تھا، مگر اس نے خود پر قابو پایا۔ "جی ذیشان بھائی، آپ لوگ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔ انشا اللہ فجر کی نماز کے بعد ہم اسی جگہ 'باب الرضا' کے قریب ملیں گے۔" وہ اپنی چادر درست کرتی ہوئی باوقار قدموں سے خواتین کے ہال کی طرف بڑھ گئی۔ ہم اسے اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ زائرین کے ہجوم میں اوجھل نہیں ہو گئی۔رامین اور میں نے جوتوں کے تھیلے اٹھائے اور حرم کے ایک اندرونی ہال 'رواقِ دار الحجہ' کی طرف چل دیے۔ وہاں بچھے ہوئے ایرانی قالینوں پر سینکڑوں زائرین تلاوتِ قرآن اور عبادت میں مصروف

تھے۔ ہم نے بھی ایک پر سکون کونے میں جگہ بنائی۔ میں نے ایک رحل اٹھائی اور قرآن پاک کھول لیا۔ ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے میرے دل کو وہ سکون مل رہا تھا جو شاید دنیا کے کسی اور کونے میں میسر نہ ہوتا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ اس سفر کو خیر و عافیت سے انجام تک پہنچائے اور رامین اور زکیہ کی نئی زندگی میں برکت ڈالے تھوڑی دیر بعد، تھکن نے غلبہ پایا تو ہم نے وہیں قالین پر سر ٹکا دیے۔ نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور تھی، مگر جسم کی نقاہت نے تھوڑی دیر کے لیے غنودگی کی آغوش میں دھکیل دیا۔ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ 'مؤذن' کی سحر انگیز آواز بلند ہوئی۔ "اللہ اکبر... اللہ اکبر!" فجر کی اذان مشہد کی ٹھنڈی ہواؤں میں گھل کر روح کو تروتازہ کر رہی تھی۔ ہم نے فوراً وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز کے بعد میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے وطن پاکستان اور پوری امت مسلمہ کی سلامتی کے لیے دعا مانگی۔ جیسے ہی سورج کی پہلی کرن نے سنہری گنبد کو چھوا، ہم طے شدہ جگہ پر پہنچ گئے۔ زکیہ پہلے سے وہاں موجود تھی، اس کا چہرہ وضو کے پانی سے چمک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک نئی امید تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو سر ہلا کر سلام کیا، ناشتے کے نام پر صرف تھوڑا سا قہوہ پیا کیونکہ جوش اور گھبراہٹ میں بھوک مٹ چکی تھی۔نو بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں،" رامین نے اپنی نئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم خاموشی سے 'رواقِ شیخ طوسی' کی طرف بڑھے، جہاں وہ 'دفترِ عقد' ہمارا منتظر تھا۔ رواقِ شیخ طوسی' کی پر سکون راہداریوں میں ہمارے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔پھر ہم اس مخصوص 'دفترِ عقد' کے باہر پہنچے جہاں لکڑی کے بھاری دروازے پر سنہری حروف میں فارسی خطاطی نمایاں تھی۔ہم وہاں رکھے صوفوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ابھی پانچ سات منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک باوقار، سفید داڑھی والے بزرگ عالمِ دین، جن کے سر پر سفید عمامہ اور کندھوں پر عبا تھی، وقار کے ساتھ برآمد ہوئے۔ ان کے پیچھے وہی رجسٹرار تھا جس نے کل 'فیش' کاٹی تھی۔ رجسٹرار نے ہمیں دیکھتے ہی مسکرا کر سر ہلایا اور ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کے دروازے پر 'اتاقِ عقد' (نکاح کا کمرہ) لکھا تھا۔کمرے کے اندر کا منظر سحر انگیز تھا۔ دیواروں پر آئینہ کاری کا کام سورج کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ فرش پر نفیس ایرانی قالین بچھے تھے اور کمرے کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی میز پر 'سفرہِ عقد' (نکاح کا دسترخوان) سجا ہوا تھا، جس پر آئینہ، شمعدان، قرآن پاک اور مٹھائی رکھی تھی۔ہم سب قاضی صاحب کے سامنے دائرے میں بیٹھ گئے۔ زکیہ نے اپنی نئی سفید ایرانی چادر کو اس طرح اوڑھ رکھا تھا کہ صرف اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ وضو کے پانی اور عبادت کی رات نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سا نور بکھیر دیا تھا۔ وہ اس سادہ سی چادر میں بہت پاکیزہ اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ رامین کے چہرے پر بھی ایک سنجیدہ متانت تھی، وہ شاید دل ہی دل میں اس عظیم نعمت کا شکر ادا کر رہا تھا۔ قاضی صاحب نے رجسٹر کھولا اور فارسی میں کچھ ابتدائی کلمات کہے۔ پھر انہوں نے رامین کی طرف دیکھ کر پوچھا، "آغا! کیا دلہن کا ولی (والد یا بھائی) موجود ہے؟"

میں نے فوراً اپنا فون نکالا اور زکیہ کے بھائی کو ویڈیو کال ملائی۔ جیسے ہی اس کا چہرہ اسکرین پر نمودار ہوا، میں نے قاضی صاحب کو فون دکھایا۔ "آغا! یہ زکیہ کا بھائی ہے، اس کے والد حیات نہیں ہیں، اس لیے یہ اپنی بہن کا ولی بن کر اپنی رضامندی دے رہا ہے۔ اور میں، اس کے بھائی کی طرف سے یہاں وکیل اور گواہ کے طور پر موجود ہوں۔" قاضی

صاحب نے ویڈیو کال پر بھائی سے زکیہ کی شناخت اور اس رشتے پر اس کی مرضی ل۔پو چھی۔ بھائی کی آواز بھرائی ہوئی تھی، اس نے موبائل کے کیمرے میں دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا، "جی آغا! میں اپنی بہن زکیہ کا نکاح رامین سے کرنے پر مکمل طور پر راضی ہوں اور ذیشان صاحب کو اپنا وکیل مقرر کرتا ہوں۔"اس کے بعد قاضی صاحب نے خطبۂ نکاح شروع کیا۔ کمرے میں ایک مقدس خاموشی چھا گئی۔ جس میں اللہ کی حمد و ثنا اور حضور پاک ﷺ پر درود و سلام کے بعد نکاح کی اہمیت پر قرآن کی آیات تلاوت کیں۔ خطبے کی گونج نے ماحول کو ایک خاص روحانیت سے بھر دیا۔

قاضی صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور میز پر دھری 'قرآنِ کریم' کی رحل کو زکیہ اور رامین کے سامنے تھوڑا قریب کر دیا۔ کمرے میں صندل کی ہلکی سی خوشبو رچی ہوئی تھی اور دیواروں پر لگی آئینہ کاری میں مزار کے سنہری میناروں کا عکس جھلک رہا تھا

پھر قاضی صاحب نے زکیہ کی طرف رخ کیا اور عربی و فارسی کے ملے جلے الفاظ میں پہلا سوال کیا: "دخترم زکیہ! آیا وکیلم؟ (میری بیٹی زکیہ! کیا میں تمہارا وکیل بن کر تمہارا نکاح رامین سے کر دوں؟)"کمرے میں ایک بوجھل خاموشی چھا گئی۔ایران میں نکاح کی یہ روایت بہت خوبصورت اور قدیم ہے۔ جب قاضی صاحب پہلی بار دلہن سے اجازت مانگتے ہیں، تو خاموشی کے دوران وہاں موجود سہیلیاں یا خواتین کہتی ہیں: "عروس خانم رفتہ گل بچینہ" (دلہن بی بی پھول چننے گئی ہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شرم و حیا کی وجہ سے فوراً جواب نہیں دے رہیں، بلکہ ایک 'خوشبو' یا 'اجازت' لینے گئی ہیں۔ دوسری بار پوچھنے پر کہتے ہیں کہ 'دلہن گلاب کا عرق نکالنے گئی ہے'۔ تیسری بار وہ جواب دیتی لیکن یہاں زکیہ کے پاس کوئی سہیلی نہیں تھی، وہ تنہا اپنی سفید چادر میں لپٹی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی خاموشی ان تمام سالوں کے دکھوں، یتیمی کے کرب اور اس طویل جدوجہد کی داستان سنا رہی تھی جو اس نے آج کے دن تک پہنچنے کے لیے لڑی تھی اس کی خاموشی اس کے صبر کی علامت تھی۔

قاضی صاحب نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر دوسری بار وہی سوال دہرایا: "دخترم! برای بارِ دوم می پرسم... آیا وکیلم؟ (بیٹی! دوسری بار پوچھ رہا ہوں، کیا میں وکیل ہوں؟)"زکیہ کے لب تھرتھرائے، اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے دانے خاموشی سے ڈھلک رہے تھے۔ رامین نے بے چینی سے میری طرف دیکھا، میں نے اسے نظروں ہی سے حوصلہ دیا۔ تیسری بار جب قاضی صاحب نے نہایت شفقت سے پوچھا، "دخترم! برای بارِ سوم می پرسم... آیا وکیلم؟ (بیٹی! تیسری بار پوچھ رہا ہوں، کیا میں وکیل ہوں؟)"

اب زکیہ نے اپنا سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں ایک عزم اور سکون تھااسنے نے ایک لمبا سانس لیا، جیسے برسوں کا بوجھ سینے سے ہٹا دیا ہو، اور بہت دھیمی مگر صاف آواز میں کہا:" با اجازہِ بزرگترہا و با توکل بہ خدا... بلے! (بڑوں کی اجازت اور اللہ پر توکل کے ساتھ... جی ہاں!)اس ایک لفظ 'بلے' نے کمرے کا سارا تناؤ ختم کر دیا۔ قاضی صاحب نے مسکراتے ہوئے رجسٹر پر درج حق مہر کی رقم اور شرائط پر ایک نظر ڈالی اور پھر رامین کو مخاطب کیا: آغا رامین! کیا آپ، مسمات زکیہ خانم بنتِ (علی حیدر)، کو ان کے بھائی اور وکیل کی موجودگی میں، طے شدہ حق مہر (114 طلائی سکے) ایک جلد کلام اللہ

مجید (قرآن پاک)
اور شرعی شرائط کے عوض، اپنی زوجیت میں قبول کرتے ہیں؟"رامین نے ایک لمحے کے لیے زکیہ کی طرف دیکھا، جس کا سر حیا سے جھکا ہوا تھا، اور پھر پورے عزم کے ساتھ جواب دیا: بلے! با توکل بہ خدا و رضایتِ کامل، قبول کردم۔ (جی ہاں! اللہ پر توکل اور مکمل رضا مندی کے ساتھ، میں نے قبول کیا!)" قاضی صاحب نے تسلی کے لیے دوسری بار پوچھا، "آغا رامین! کیا آپ زکیہ خانم کو اپنی شریکِ حیات تسلیم کرتے ہوئے ان کے تمام شرعی حقوق اور نان و نفقہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں؟"
رامین کی آواز پہلے سے بھی زیادہ مضبوط تھی، "بلے! با رضایتِ کامل قبول می کنم۔ (جی ہاں! میں مکمل رضا مندی کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔)"
تیسری بار جب قاضی صاحب نے حتمی تصدیق کی، تو رامین نے مزار کے سنہری گنبد کی طرف ایک نظر ڈالی اور کہا:
"قبلتُ ا لنکاح... قبول کردم!
اس کے ساتھ ہی 'ایجاب و قبول' کا مرحلہ مکمل ہوا۔
قاضی صاحب نے بلند آواز میں کہا، "مبارک باشد! ان شاء اللہ کہ بہ پائے ہم پیر شوید۔ (مبارک ہو! اللہ کرے کہ تم دونوں ایک ساتھ بڑھاپے تک خوش رہو۔)" رجسٹرار نے ایک بڑا 'عقد نامہ' (نکاح نامہ) میز پر رکھا۔ یہ محض ایک کاغذ نہیں تھا، بلکہ زکیہ کے لیے تحفظ کی وہ ڈھال تھی جو اسے برسوں بعد نصیب ہوئی تھی۔ رامین نے اپنے نئے پار کر قلم سے، جو میں نے اسے تحفے میں دیا تھا، بڑے فخر کے ساتھ اپنے دستخط کیے۔ پھر وہی قلم زکیہ کو تھمایا گیا۔ زکیہ نے لرزتے ہاتھوں سے دستخط کیے،
میں نے دیکھا کہ دستخط کرتے وقت زکیہ کی آنکھ سے ایک آنسو گرا اور کاغذ کے ایک کونے پر جذب ہو گیا۔ وہ آنسو شاید اس کے باپ کی قبر پر ایک خراجِ تحسین تھا۔ آخر میں، وہاں موجود دو بزرگ ایرانی زائرین نے، جو سفید لبادوں میں ملبوس تھے، بطور گواہ اپنے دستخط کیے۔ میں، جو اس سارے عمل کا اصل معمار تھا، خاموشی سے پیچھے کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ قانونی کاغذات پر میرا نام نہیں تھا، لیکن ان دونوں کے دلوں پر میرا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہم سب نے سر جھکا لیے۔ انھوں نے نہایت رقت آمیز آواز میں دعا مانگی: "خدایا! اس جوڑے کو امام رضا (ع) کے صدقے میں ہمیشہ سلامت رکھ، ان کے رزق میں برکت دے اور ان کے اس پاک بندھن کو دشمنوں کی نظرِ بد سے بچا کر رکھ۔" نکاح کے اس مقدس کمرے میں جیسے ہی قاضی صاحب نے آخری دعا ختم کی، ایک عجیب سی اپنائیت اور سکون کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر رامین کو گلے لگایا، میری آنکھیں بھی خوشی سے نم تھیں اور رامین کا جسم جذبات کی شدت سے ہلکا سا کانپ رہا تھا۔ "مبارک ہو میرے بھائی! اللہ تمہارے اس نئے سفر میں برکت ڈالے،" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ رامین نے مجھے اتنی سختی سے بھینچا جیسے وہ ان تمام احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہو جو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر میں نے زکیہ کی طرف رخ کیا۔ وہ جو ابھی تک سر جھکائے

بیٹھی تھی، اس نے دھیرے سے اپنی نظریں اٹھائیں۔ اس وقت اس کا چہرہ کسی چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ سفید ایرانی چادر کے ہالے میں اس کا رنگ دودھ کی طرح سفید اور اجلا محسوس ہو رہا تھا، جیسے برسوں کی تپش اور دکھوں کے بعد اس کے وجود پر کوئی ٹھنڈی پھوار پڑ گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں حیا کی لالی اور خوشی کی چمک نے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ واقعی ایک شہزادی لگ رہی تھی جس نے آج اپنے صبر کا پھل پا لیا تھا۔"مبارک ہو زکیہ بہن! آج تمہارا حق ادا ہو گیا،" میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔زکیہ نے اپنی چادر کا پلو درست کیا اور اس کی آنکھوں سے خوشی کا ایک آخری آنسو ٹپک کر اس کے گلابی گال پر رک گیا۔یہ وہ آنسو تھا جس میں یتیمی کا دکھ بھی تھا اور آج ملنے والے اس پاکیزہ رشتے کا شکرانہ بھی۔"یہ سب آپ کی وجہ سے ہے ذیشان بھائی،" اس کی آواز میں ایسی مٹھاس اور گہرائی تھی کہ میرا دل بھر آیا۔جیسے میرا مشہد آنے کا ایک بڑا مقصد آج پورا ہو گیا ہو۔زکیہ کے ان الفاظ نے میرے ضبط کے تمام بندھن توڑ دیے۔ میں جو سنگلاخ پہاڑوں اور بارود کی بو میں رہنے والا ایک سخت جان انسان تھا، اس وقت اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میری آنکھوں کے گوشے بھیگی لکیروں میں بدل گئے اور ایک گرم آنسو میری پلکوں سے ٹوٹ کر زمین پر جذب ہو گیا۔ایک یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا اور اسے عزت کے ساتھ اس کے گھر بار تک پہنچانا، میرے لیے کسی بھی دنیاوی کامیابی سے بڑھ کر تھا۔ مشہد کی تپتی دوپہروں اور سرد راتوں کی ساری تھکن اس ایک پل میں مٹ گئی۔رامین نے زکیہ کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر فخر اور محبت کا ایک انوکھا توازن تھا۔ وہ دونوں اب صرف ایک مشن کے ساتھی نہیں تھے، بلکہ حرمِ امام رضا (ع) کی گواہی میں ایک دوسرے کے لباس بن چکے تھے۔ رجسٹرار نے جب وہ سنہری کام والا 'عقد نامہ' (نکاح نامہ) رامین کے ہاتھ میں تھمایا، تو اسے دیکھ کر ایسا لگا جیسے ان دونوں نے پوری دنیا کی دولت پا لی ہو۔نکاح کے اس پر نور کمرے سے باہر نکلتے ہی مزار کا وسیع و عریض صحن اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ ہمارے سامنے تھا۔ فضا میں تبرک کی خوشبو اور زائرین کے درود و سلام کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ رامین نے بازارِ رضا سے خریدی ہوئی ایرانی مٹھائی نکالی جبکہ زکیہ نے اپنے بیگ سے وہ مہندی نکالی جو اس نے خاص طور پر اس کارِ خیر کے لیے سنبھال کر رکھی تھی۔ ہم نے صحنِ جامع کے ایک گوشے میں رک کر وہاں موجود زائرین، بوڑھی خواتین اور بچوں میں مٹھائی بانٹنا شروع کی۔زکیہ جب ان زائر خواتین کو مہندی اور مٹھائی پیش کر رہی تھی، تو وہ دعاؤں کے ساتھ اس کے سر پر پیار دیتیں اور "مبارک باشد" (مبارک ہو) کہتیں۔رامین بھی نہایت جوش کے ساتھ چھوٹے بچوں میں مٹھائی تقسیم کر رہا تھا، اس کے چہرے کی وہ پرانی سختی اب ایک گہری مسرت میں بدل چکی تھی۔ تبرک تقسیم کرنے کے بعد، ہم صحن کے ایک پرسکون کونے میں بچھے ہوئے قالینوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے امام رضا (ع) کا سنہری گنبد سورج کی روشنی میں سنہرا نور بکھیر رہا تھا۔میں نے ایک بار پھر ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا:"رامین! زکیہ! ایک بار پھر میری طرف سے تم دونوں کو یہ نیا سفر بہت بہت مبارک ہو۔انہوں نے شرماتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مجھے بھی مبارکباد دی اور شکریہ ادا کیا۔ ہم نے کچھ دیر ہنسی مذاق اور مستقبل کے چھوٹے چھوٹے خوابوں پر بات کی۔ رامین زکیہ کو بتا رہا تھا کہ وہ اسے تہران کے کن خوبصورت مقامات پر لے جائے گا

اور کیسے وہ مل کر ایک نیا گھر بسائیں گے۔ ماحول اتنا پرسکون تھا کہ ایک لمحے کے لیے ہم بھول ہی گئے کہ ہم مشہد کے ایک حساس ترین مشن پر ہیں۔ لیکن پھر میں نے ایک گہرا سانس لیا اور لہجے کو تھوڑا سنجیدہ کرتے ہوئے کہا، "چلو دوستو! اب جذباتی باتوں سے ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ سورج ڈھلنے میں ابھی وقت ہے، لیکن ہمیں اس شام کا بھرپور فائدہ اٹھانا ہے۔ نکاح کی خوشی اپنی جگہ، مگر باہر کی دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ ایرانی میڈیا اور عالمی طاقتیں اس وقت کیا کہہ رہی ہیں۔" رامین نے اپنی صحافیانہ مہارت کے ساتھ مختلف نیوز ویب سائٹس اور ٹیلی گرام چینلز اسکرول کرنا شروع کیے۔ مزار کے پرسکون صحن میں بیٹھے ہوئے، ہم اس وقت دنیا کے خطرناک ترین 'وار زون' کا تجزیہ کر رہے تھے۔ ذیشان بھائی! کھیل بہت گہرا ہے،" رامین نے ایک نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسرائیل اور امریکہ اس وقت براہِ راست جنگ سے پہلے ایران کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ وہ عراق اور شام کی مثالیں دے رہے ہیں۔ جس طرح صدام حسین کو برسوں تک جنگوں میں الجھائے رکھا گیا اور پھر اسے تنہا کر کے عراق کو کھنڈر بنا دیا گیا، وہی فارمولا اب یہاں آزمایا جا رہا ہے۔" زکیہ جو بہت غور سے سن رہی تھی، دبی آواز میں بولی، "لیکن ذیشان بھائی! عراق اور شام کا حال تو ہمارے سامنے ہے۔

وہاں بھی تو یہی کہا گیا تھا کہ ہم 'جمہوریت' لا رہے ہیں، مگر آج وہاں صرف لاشیں اور بھوک ہے۔ کیا وہ ایران کے ساتھ بھی یہی کرنا چاہتے ہیں؟"" وہی تو اصل چال ہے زکیہ،" میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اسرائیل اس وقت عرب ممالک اور ایران کے درمیان خلیج بڑھا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایران کے ہمسایہ ممالک اسے ایک خطرہ سمجھیں تاکہ اسے علاقائی طور پر تنہا کر دیا جائے۔ روس اور چین اگرچہ ایران کے حق میں بیانات دے رہے ہیں اور اسے کثیر القطبی دنیا (Multipolar World) کا اہم حصہ قرار دے رہے ہیں، لیکن وہ بھی اپنے مفادات کے تحت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں۔ روس اس وقت خود یوکرین کی جنگ میں الجھا ہوا ہے، اس لیے وہ صرف سفارتی سطح پر ایران کی ڈھال بن رہا ہے۔ دوسری طرف "غزہ سے آنے والی تصویریں دل دہلا دینے والی تھیں۔ ہسپتالوں اور پناہ گزین کیمپوں پر بمباری کی خبریں سن کر زکیہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "مغرب کے بڑے انسانی حقوق کے علمبردار اب کہاں ہیں؟" وہ دبی آواز میں بولی۔ فلسطینی مزاحمت کاروں نے بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ آخری سانس تک اپنی زمین کا دفاع کریں گے رامین نے ایک اور اہم نقطہ اٹھایا، "اور دیکھو! فلسطینیوں کے معاملے پر عالمِ اسلام کی خاموشی کتنی پراسرار ہے۔ جب بھی ایران فلسطین کی حمایت میں آواز اٹھاتا ہے، مغربی میڈیا اسے 'دہشت گردی کی پشت پناہی' کا نام دے کر ایران کے خلاف عالمی رائے عامہ ہموار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ عراق اور شام کو پہلے ہی میدانِ جنگ بنا چکے ہیں تاکہ ایران کی 'سپلائی لائن' کٹ جائے اور اسے ہر طرف سے گھیرے میں لیا جا سکے۔"یورپ کے بڑے دارالحکومتوں (لندن، پیرس، برلن) میں حکومتیں تو اسرائیل کی پیٹھ تھپتھپا رہی تھیں، مگر وہاں کی سڑکوں پر لاکھوں عام شہری فلسطینیوں کے حق میں باہر نکل آئے تھے۔ برطانوی اور فرانسیسی حکام مظاہرین پر پابندیاں لگانے کی کوشش کر رہے تھے، جس نے 'اظہارِ رائے کی آزادی' کے دعووں پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ وائٹ ہاؤس سے ٹرمپ انتظامیہ نے اسرائیل کے لیے اربوں ڈالر کے نئے

جنگی پیکج کا اعلان کر دیا تھا، جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ آگ کو بجھانے کے بجائے اس میں تیل ڈال رہے ہیں۔ میں نے رامین کے ٹیبلٹ پر موجود ایک نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی: "زکیہ! دیکھو کس طرح دشمن پرانے زخموں کو کرید رہا ہے۔ عراق اور شام میں ایران کی مداخلت کو بنیاد بنا کر وہاں کے لوگوں کے جذبات کو ابھارا جا رہا ہے۔ وہ انہیں یاد دلاتے ہیں کہ کس طرح ایران نے ان کے اندرونی معاملات میں قدم جمائے، تاکہ ان کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑکائی جا سکے۔ دشمن کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ایران کے خلاف 'سنی کارڈ' استعمال کرے اور دوسری طرف خود شیعہ اکثریت والے ملکوں جیسے عراق میں بھی ایران مخالف جذبات کو ہوا دے کر اسے تنہا کر دے۔"

رامین نے تائید میں سر ہلا کر کہا، "بالکل ذیشان بھائی! وہ لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچا کر انہیں یہ باور کروا رہے ہیں کہ ایران ان کا خیر خواہ نہیں بلکہ ایک قابض قوت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بغداد، دمشق اور بیروت کی سڑکوں پر بیٹھا عام مسلمان تہران کو اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ اس طرح وہ ایک ایسی خونی خلیج پیدا کر رہے ہیں جسے بھرنے میں دہائیاں لگ جائیں گی۔ دوسری طرف یورپی یونین کا حال دیکھو؛ وہ ایک طرف ایران پر انسانی حقوق کی پابندیاں لگا رہے ہیں اور دوسری طرف ملین یورو کی 'انسانی امداد' کا اعلان کر کے اپنی گرتی ہوئی ساکھ بچا رہے ہیں۔ وہ ایران کو تنہا کرنے کے ساتھ ساتھ توانائی کی قیمتوں میں اضافے سے بھی بری طرح خوفزدہ ہیں۔" "اور خلیجی ممالک کا اضطراب تو عروج پر ہے،" میں نے مزید اضافہ کیا۔ "ایران نے انہیں صاف خبردار کر دیا ہے کہ وہ اپنی بندرگاہیں اور تنصیبات خالی کر دیں کیونکہ اگر جنگ چھڑی تو کوئی جگہ محفوظ نہیں رہے گی۔ دشمن صرف طاقتور نہیں، مکار بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر مسلمان متحد ہو گئے تو اسے مشرقِ وسطیٰ میں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ اسی لیے وہ عربوں کو عجم (ایران) سے ڈراتا ہے، اور سنیوں کو شیعوں کے خلاف اکساتا ہے۔ عراق اور شام کو اسی لیے اکھاڑا بنایا گیا تاکہ ایران کے گرد ایک ایسی 'خونی دیوار' کھڑی کر دی جائے کہ وہ کبھی اسرائیل تک پہنچ ہی نہ سکے۔ دیکھو ذیشان بھائی!" رامین نے جوش سے کہا، "صرف فرانسیسی صدر ہی نہیں، روسی صدر پیوٹن نے بھی یوکرین کے معاملے پر ایک سخت پیغام بھیجا ہے۔ خبر ہے کہ کریملن سے واشنگٹن کو صاف کہہ دیا گیا ہے کہ اگر ایران پر براہِ راست حملہ ہوا، تو روس یوکرین میں اپنے ہتھیاروں کی حد ختم کر دے گا اور بحیرہِ اسود (Black Sea) میں امریکی بحری بیڑوں کے لیے کوئی جگہ محفوظ نہیں رہے گی۔" زکیہ نے حیرت سے پوچھا، "کیا روس واقعی ایران کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لے گا؟" میں نے کڑواہٹ سے مسکرا کر جواب دیا، "زکیہ! یہ کوئی ہمدردی نہیں، یہ بقا کی جنگ ہے۔ روس جانتا ہے کہ اگر ایران گرا، تو اگلا نمبر اس کا ہے۔ اسی لیے وہ یوکرین کے محاذ کو ایران کی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔" مزار کے اس پُر سکون گوشے میں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔

ہم تینوں کے درمیان بحث و مباحثے اور تجزیوں کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ رامین کبھی ماضی کے بیانات نکال کر دکھاتا کہ کس طرح پچھلی دہائیوں میں صیہونی طاقتوں نے قدم جمائے، تو کبھی میں تازہ ترین جنگی اپڈیٹس پر اپنی رائے دیتا۔ زکیہ خاموشی سے ہماری باتیں سنتی، مگر کبھی کبھی وہ ایسی گہری بات کر جاتی کہ ہم دونوں چونک پڑتے۔ کبھی ہم

امریکہ اور یورپ کی بدلتی ہوئی چالوں پر بات کرتے، تو کبھی عراق، شام اور لبنان کے مزاحمتی محاذوں کی صورتحال کا جائزہ لیتے۔ کبھی کسی پُرانی خبر کا حوالہ دیا جاتا تو کبھی سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والی کسی نئی ویڈیو پر تبصرہ ہوتا۔ اس ذہنی مشق اور عالمی نقشے پر ہونے والی اس شطرنج کی بازی کو سمجھتے سمجھتے ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ "گزرتے ہوئے لمحے ہمیں بتا رہے ہیں کہ اب مزید یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں،" میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"تجزیے بہت ہو چکے، اب ہمیں زمین پر اتر کر اصل صورتحال دیکھنی ہوگی۔ ہم نے جو نقشہ ابھی ذہن میں بنایا ہے، اسے اب باہر کے حالات کے مطابق پرکھنے کا وقت آگیا ہے۔"رامین نے اپنا ٹیبلٹ بند کر کے بیگ میں رکھا اور گہرا سانس لیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ذیشان بھائی۔ یہاں بیٹھے ہم صرف خبریں پڑھ سکتے ہیں، لیکن حقیقت کا پتہ تو تب چلے گا جب ہم خود اس ہلچل کا حصہ بنیں گے۔ باہر جو احتجاج اور ریلیاں ہو رہی ہیں، ان کے درمیان سے راستہ بنانا ہی ہمارا اصل امتحان ہے۔"

زکیہ نے اپنی چادر کو درست کیا اور اٹھتے ہوئے کہا، "چلو بھائی! اللہ کا نام لے کر نکلتے ہیں۔ میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ مشہد کی سڑکوں پر کیا گزر رہی ہے۔"ہم نے ایک آخری بار امامِ رضا (ع) کے سنہری گنبد کی طرف دیکھا، دل ہی دل میں دعا مانگی اور پھر قدم مزار کے خارجی دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ اب ہم اس روحانی حصار سے نکل کر اس بے رحم دنیا کی طرف جا رہے تھے جہاں ہر موڑ پر ایک نیا خطرہ اور ایک نئی سنسنی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

دسواں باب ۔۔۔۔۔۔ ہنگامی واپسی

باہر سیکیورٹی کی غیر معمولی نفری تعینات تھی اور فضا میں ایک عجیب سی بے چینی رچی ہوئی تھی۔ ہم خاموشی سے پارکنگ کی طرف بڑھے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی رامین نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے اور ایک گہرا سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ "ذیشان بھائی! باہر کے حالات ہمارے تجزیوں سے بھی زیادہ گرم ہیں۔ شہر کے مرکزی چوک، 'میدانِ شہدا' کی طرف ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس بڑھ رہا ہے۔ ہمیں اسی ہجوم کے ساتھ مل کر اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا ہوگا تاکہ کوئی شک نہ کر سکے۔"

زکیہ پچھلی نشست پر۔ خاموشی سے بیٹھی کھڑکی سے باہر بدلتے مناظر دیکھ رہی تھی۔ "رامین! احتیاط کرنا،" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "پولیس اور پاسدارانِ انقلاب کی گاڑیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ اگر ہم کسی ناکہ بندی میں پھنس گئے تو نکاح کے یہ کاغذات بھی ہمیں نہیں بچا پائیں گے۔" جیسے ہی ہم مرکزی شاہراہ پر پہنچے، انسانی سروں کا ایک سمندر نظر آیا۔ ہر طرف 'مرگ بر اسرائیل' اور 'مرگ بر امریکہ' کے کتبے لہرائے جا رہے تھے۔ لوگ غصے اور جوش میں سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ رامین نے کمال مہارت سے گاڑی کو ہجوم کے کنارے کنارے چلانا شروع کیا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے ایک

تنگ گلی میں گاڑی پارک کر دی جہاں سے احتجاجی جلسے کا مرکزی۔ مقام صاف نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے،" رامین نے سرگوشی کی۔ اس نے اپنی سیٹ کے نیچے سے اپنا پیشہ ورانہ ڈیجیٹل کیمرہ نکالا۔ وہ اب ایک عام زائر نہیں بلکہ ایک منجھا ہوا صحافی لگ رہا تھا۔ ہم گاڑی سے اترے اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر نیچے کا منظر دیکھنے لگے۔

وہاں بین الاقوامی میڈیا کے نمائندے بھی موجود تھے۔ رامین نے تیزی سے کیمرے کے لینز درست کیے اور تصویریں اتارنا شروع کر دیں۔ وہاں ایک یورپی صحافی مائیک ہاتھ میں لیے لائیو رپورٹنگ کر رہا تھا، جبکہ اس کے پیچھے لوگ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ رامین نے صرف ہجوم کی نہیں بلکہ وہاں موجود کچھ گاڑیوں اور سیکیورٹی کیمروں کے پاس کھڑے سادہ لباس افراد کی بھی تصویریں لیں۔ سورج اب ڈھلنا شروع ہو گیا تھا اور احتجاجی ہجوم کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ذیشان بھائی! یہاں دور کھڑے رہ کر ہمیں وہ 'باریکیاں' نظر نہیں آئیں گی جو اس بھیڑ کے اندر چھپی ہو سکتی ہیں،" رامین نے ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں اس سمندر کے بیچ میں اترنا چاہیے۔ وہاں سادہ لباس میں گھومتے ہوئے ہم بہتر طریقے سے ریکی۔(Reconnaissance) کر سکیں گے کہ کہیں دشمن کے کارندے اس عوامی غصے کا فائدہ اٹھا کر کوئی نئی چال تو نہیں چل رہے۔" ہم نے ایک گہرا سانس لیا اور اس انسانی سمندر کا حصہ بن گئے۔ زکیہ ہمارے درمیان تھی، اس نے اپنی چادر کا پلو چہرے پر تھوڑا نیچا کر لیا تھا تاکہ اس کی شناخت چھپی رہے۔ جیسے ہی ہم جلوس کے مرکز میں پہنچے، نعروں کی گونج اتنی تیز تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک طرف مردوں کا جمِ غفیر تھا تو دوسری طرف خواتین کے دستے الگ سے نعرے لگا رہے تھے، جن کے ہاتھوں میں 'لبیک یا اقصیٰ' کے کتبے تھے۔

فضا ان فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی: "مرگ بر اسرائیل! مرگ بر۔امریکہ!" (اسرائیل مردہ باد، امریکہ مردہ باد)— یہ وہ بنیادی نعرہ تھا جو ہر تھوڑی دیر بعد پورے مجمع کی زبان پر ہوتا۔ "خیبر خیبر یا صیہون، جیشِ محمد قادمون!" (اے صیہونیوں! خیبر کا انجام یاد کرو، محمد ﷺ کا لشکر آ رہا ہے)— اس نعرے نے پورے ماحول میں ایک جنگی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

"ہزاراں ہزاروں... لبیک یا اقصیٰ!" (ہزاروں ہزار بار... ہم حاضر ہیں اے اقصیٰ)— خواتین کے دستے یہ نعرہ بلند کر رہی تھیں، جن کے ہاتھوں میں معصوم بچوں کی تصویریں تھیں۔

"ہیہات منا الذلہ!" (ہم ذلت کو قبول نہیں کریں گے)— یہ نعرہ کربلا کی یاد دلاتا تھا اور نوجوان اسے سینہ کوبی کرتے ہوئے دہرا رہے تھے۔

"قدس لنا، حقٌ لنا!" (قدس ہمارا ہے، یہ ہمارا حق ہے)— عرب زائرین کے کچھ گروہ یہ نعرہ لگا رہے تھے، جس سے ثابت ہو رہا تھا کہ یہ صرف ایران کا نہیں بلکہ پوری امتِ مسلمہ کا درد ہے۔ ہم نے بہت محتاط انداز میں ریکی شروع کی۔ ہماری نظریں نعرے لگانے والوں پر نہیں، بلکہ ان لوگوں پر تھیں جو خاموش کھڑے کونوں سے نگرانی کر رہے تھے۔ ہم ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کس طرح لوگ جذبات میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے

ہوئے تھے۔ کہیں سبیلیں لگی تھیں جہاں زائرین کو پانی اور کھجوریں دی جا رہی تھیں، اور کہیں نوجوان موٹر سائیکلوں پر جھنڈے لہراتے ہوئے گزر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہجوم کا ریلا اتنا زوردار تھا کہ میں رامین اور زکیہ سے کٹ کر سڑک کے کنارے لگی آہنی باڑ کی طرف جا گرا۔ وہیں ڈیوٹی پر تعینات ایک پولیس اہلکار کھڑا تھا جو مظاہرین کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں اس سے ٹکرایا، اس نے ایک جھٹکے سے میرا بازو پکڑ لیا اور شک بھری نظروں سے میرے چہرے کو دیکھا اور فارسی میں غراتے ہوئے پوچھا:

"کجا میری آغا؟ کارتِ شناسائی ات کو؟" (کہاں جا رہے ہو جناب؟ تمہارا شناختی کارڈ کہاں ہے؟)

میرا دل حلق میں آ گیا۔ اس وقت ہجوم میں موجود کسی بھی اجنبی سے تلاشی لینا ان کا معمول تھا، لیکن میرے پاس کوئی دستاویز نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں خاموش رہا یا گھبرا گیا تو وہ مجھے وہیں دبوچ لے گا۔ میں نے فوراً چہرے پر جوش اور غصے کے تاثرات سجائے اور اسی کے لہجے میں بلند آواز سے فارسی میں جواب دیا: صبر کن آغا! من زائر ہستم۔۔۔" (صبر کریں جناب، میں زائر ہوں۔۔۔) میں نے اسے الجھانے کی کوشش کی، مگر پولیس والے کی آنکھوں میں شک کی لہر دوڑی۔ اس نے میرا بازو نہیں چھوڑا اور کرخت لہجے میں بولا: "بیا اینجا! باید تفتیش ات کنم۔" (ادھر آؤ! مجھے تمہاری تلاشی لینی ہے۔) سپاہی نے ابھی کچھ اور پوچھنا چاہا ہی تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا اور پوری قوت سے نعرہ بلند کیا: "خیبر خیبر یا صیہون!" آس پاس کے چار پانچ مظاہرین نے بھی میرا نعرہ سن کر جواب میں آواز بلند کی۔ اس اچانک شور اور نعرے بازی نے سپاہی کو الجھا دیا۔ اسے لگا کہ میں شاید کوئی جذباتی زائر ہوں جو جوش میں آپے سے باہر ہو رہا ہے۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا بازو پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میری جیبوں کو ٹٹولنا چاہا، مگر ہجوم کے شور اور دھکم پیل کی وجہ سے اسے مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے موقع دیکھ کر کہا: "آغا! تلاشی لینی ہے تو شوق سے لیں، میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ آپ دونوں ہاتھوں سے تلاشی لیں تاکہ آپ کو تسلی ہو جائے۔" جیسے ہی اس نے تلاشی لینے کے لیے میرا بازو چھوڑا اور اپنے دونوں ہاتھ میری جیکٹ کی جیبوں کی طرف بڑھائے، میں نے بجلی کی تیزی سے نعرہ بلند کیا: "مرگ بر اسرائیل! خیبر خیبر یا صیہون!" اور ساتھ ہی اپنے برابر سے گزرتے ہوئے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز میں چلایا: "اوئے ٹھہرو! میرا بھائی ادھر جا رہا ہے، وہ رہا میرا بھائی!" ہمیں صیہونیوں کو بتانا ہے کہ ہم زندہ ہیں!" پولیس والا ایک لمحے کے لیے چونک کر اس سمت دیکھنے لگا۔ یہی وہ چند سیکنڈ تھے جن کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے اسے مہلت نہ دی اور مچھلی کی طرح پھسل کر ہجوم کے اس گھنے حصے میں غوطہ لگا دیا جہاں لوگ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔ اس وقت اس سپاہی کے باقی ساتھی اس سے تقریباً ساٹھ ستر فٹ دور سڑک کے دوسرے کونے پر گشت کر رہے تھے وہ سپاہی بوکھلا کر میرے پیچھے لپکا اور فارسی میں زور زور سے چلانے لگا: "بگیریدش! بگیریدش! آن مرد را بگیرید!" (اسے پکڑو! اسے پکڑو! اس آدمی کو پکڑو!) اس کی آواز ہجوم کے نعروں میں دب رہی تھی، لیکن اس کا غصہ آسمان چھو رہا تھا۔ وہ مظاہرین کو دھکے دیتا ہوا میری طرف بڑھا اور ایک موقع پر تو اس کی انگلیاں میری جیکٹ کے پچھلے حصے کو چھو گئیں، بس ایک سیکنڈ کی بات تھی اور وہ مجھے دبوچ لیتا۔ میرا دل حلق میں آ گیا، موت

اور زندگی کے درمیان بس ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔
میں نے پوری قوت سے ایک آخری جھٹکا دیا اور اپنے سامنے موجود دو کڑیل نوجوانوں کے بیچ سے راستہ بناتے ہوئے دوسری طرف نکل گیا۔ سپاہی ہجوم کے اس ریلے میں پھنس گیا جہاں لوگ 'مرگ براسرائیل' کے جوش میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ اب بھی ہاتھ ہلا ہلا کر دور کھڑے اپنے پولیس ساتھیوں کو اشارے کر رہا تھا کہ کوئی مشکوک جوان بھاگا ہے، اور اپنے وائرلیس پر میرا حلیہ (خاکی جیکٹ اور قد و قامت) چیخ چیخ کر بتا رہا تھا۔ لیکن ہزاروں لوگوں کے اس سمندر میں، جہاں ہر دوسرا شخص کالے یا خاکی لباس میں تھا، میرا سراغ لگانا ناممکن تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ ناکہ بندی سخت ہوتی یا کوئی دوسرا اہلکار مجھے دیکھ پاتا، میں نے سر جھکایا اور ہجوم کی لہروں کے ساتھ بہتا ہوا
ایک جذباتی گروہ کے بیچ میں گھس گیا جو سینہ کوبی کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ان کے سائے میں چھپ کر میں نے سڑک کا رخ بدلا اور دو تین بڑی سڑکیں کراس کیں تاکہ میرا رخ کسی کے علم میں نہ رہے۔ کچھ دیر گلیوں میں دوڑنے کے بعد جب مجھے اطمینان ہوا کہ پیچھا چھوٹ گیا ہے، تو میں ایک پرانی دیوار سے لگ کر ہانپنے لگا۔ میرا سانس پھول رہا تھا اور خوف کی ایک لہر ابھی تک میرے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ ایک محفوظ دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو کر میں نے رامین اور زکیہ کو میسج ٹائپ کیا: میں ایک پولیس والے کے شک میں آگیا تھا، تلاشی لینے ہی والا تھا کہ میں بمشکل اسکے چنگل سے نکلا ہوں۔ اسنے اپنے دوسرے پولیس ساتھیوں کو الرٹ کر دیا ہے۔ تم دونوں فوراً گاڑی لے کر 'باب الجواد' کے عقب میں موجود اس پرانی مارکیٹ کی پارکنگ میں پہنچو۔ میں وہیں چھپا ہوا ہوں۔ دیر مت کرنا، حالات بہت سنگین ہیں!" ابھی مجھے میسج بھیجے مشکل سے دس سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ اسکرین روشن ہوئی اور رامین کا جوابی پیغام موصول ہوا:
"اوکے ذیشان بھائی! پھر فوراً دوسرا میسج ایا ہم بالکل قریب ہیں، بس پانچ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ آپ الرٹ رہیں، ہم گاڑی کی لائٹس آف کر کے بیک سائیڈ سے داخل ہوں گے۔
اسی لمحے زکیہ کا بھی میسج آگیا: "بھائی! ہم پہنچ رہے ہیں، آپ بس محفوظ رہیں۔ ہم آپ کو وہاں سے نکال لیں گے۔"
ان کے جوابات نے میرے اکھڑے ہوئے سانسوں کو تھوڑا سہارا دیا۔ میں نے فون جیب میں ڈالا اور گلی کے کونے سے باہر سڑک کا جائزہ لیا۔ دور سے پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹروں(Siren) کی آوازیں قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔
میں جانتا تھا کہ وہ سپاہی خاموش نہیں بیٹھا ہوگا اور مشہد کی سیکیورٹی فورسز اب اس 'مشکوک پاکستانی' کی تلاش میں گلیوں کی چھان بین شروع کر چکی ہوں گی۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر ہاتھ میں دبالی تاکہ میرا حلیہ تھوڑا بدلے اور پھر میں اس پارکنگ لاٹ کی طرف دبے قدموں بڑھنے لگا، جہاں رامین کی گاڑی نمودار ہونی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد، پرانی مارکیٹ کی اندھیری پارکنگ کے کونے سے رامین کی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس نے ہیڈ لائٹس آف کر رکھی تھیں تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ جیسے ہی گاڑی میرے قریب آکر رکی،
میں نے جلدی سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور رامین کے ساتھ بیٹھ گیا، جبکہ زکیہ پچھلی نشست پر موجود تھی۔ رامین

نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر کلچ چھوڑا اور گاڑی ٹائروں کی چنگھاڑ کے ساتھ سڑک پر دوڑنے لگی۔ میرا سانس ابھی تک اکھڑا ہوا تھا اور میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی پولیس کی موبائل ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہی۔ ذیشان بھائی! آپ کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی، کیا ہوا تھا وہاں؟" رامین نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

"بس نکل آئے، یہی بہت ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "پولیس اب ہر مشکوک بندے کو روک رہی ہے۔ رامین! اب سڑکوں پر گھومنا یا شہر کی ناکہ بندیوں میں پھنسنا خودکشی کے برابر ہے۔ ہمیں فوری طور پر کسی محفوظ جگہ پہنچنا ہوگا جہاں بیٹھ کر ہم سکون سے اگلا قدم سوچ سکیں۔""تو پھر کہاں چلیں؟ رامین نے گاڑی کی رفتار برقرار رکھتے ہوئے سوال کیا۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا، میرا ذہن اس وقت بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ۔ اس وقت بہترین حل یہ ہے کہ کسی ایسے ہوٹل میں چلیں جہاں زائرین کا بہت زیادہ رش ہو اور ہم اس ہجوم میں گم ہو سکیں۔ وہاں کے بند کمرے میں ہی بیٹھ کر ہم تسلی بخش طریقے سے اگلا پروگرام بنا سکیں گے۔ مجھے ابھی خود سمجھ نہیں آ رہی کہ آگے کیا کرنا ہے، بس فلحال اس پولیس کے حصار سے نکلنا سب سے ضروری ہے۔ رامین نے سر ہلا کر تائید کی اور گاڑی کو شہر کے اندرونی حصوں کی طرف موڑ دیا۔ ہم نے مشہد کی مرکزی شاہراہوں کو چھوڑ کر متبادل راستے اختیار کیے تاکہ کسی بڑے ناکے پر نہ رکنا پڑے۔ کچھ دیر کی مسافت کے بعد، ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں سستے ہوٹلوں اور مسافرخانوں کی بھرمار تھی اور زائرین کی چہل پہل کی وجہ سے سیکیورٹی کا دباؤ ذرا کم محسوس ہو رہا تھا۔ ہم نے شہر کے اس گنجان علاقے میں واقع 'ہوٹل قصرِ مشہد' کی پارکنگ میں گاڑی لگائی۔ یہ ایک ایسا ہوٹل تھا جہاں زائرین کا بے پناہ رش تھا، جس کی وجہ سے ہم ہجوم میں چھپ سکتے تھے۔ ہم گاڑی سے اترے اور تیز قدموں سے لابی کی طرف بڑھے۔ زکیہ نے اپنی چادر کو نقاب کی طرح لپیٹ رکھا تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔

لابی میں پہنچے تو کاؤنٹر پر موجود کلرک نے شک بھری نظروں سے ہمیں دیکھا۔ مشہد میں سیکیورٹی حالات کی وجہ سے ایک مرد اور ایک خاتون کا ساتھ ہونا بغیر کسی ثبوت کے ناممکن تھا۔ کلرک نے کڑے لہجے میں پوچھا:

"آغا! محرم ہستید؟ مدرک دارید؟" (جناب! کیا آپ محرم ہیں؟ کوئی ثبوت ہے؟)

میرا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ میرے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں تھا، لیکن رامین نے کمالِ ہوشیاری سے جیب سے وہ سنہری 'عقد نامہ' (نکاح نامہ) نکالا جو ہمیں مزار سے تھوڑی دیر پہلے ہی ملا تھا۔ جیسے ہی کلرک نے مزارِ امام رضا (ع) کی مہر والا نکاح نامہ دیکھا، اس کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو گئیں اور اس نے احترام سے سر جھکایا۔ اس نے مجھے رامین کا بھائی سمجھا اور رامین کے 'کارتِ ملی' (شناختی کارڈ) پر انٹری کر لی۔ "ہمیں ایک ایسا کمرہ چاہیے جہاں تین افراد کے ٹھہرنے کی جگہ ہو،" رامین نے سنجیدگی سے کہا۔ کلرک نے رجسٹر میں اندراج کیا اور ہمیں تیسری منزل پر واقع ایک 'تھری بیڈ فیملی روم' کی چابی تھما دی۔ ہم خاموشی سے لفٹ کی طرف بڑھے اور جیسے ہی کمرے کے اندر داخل ہو کر دروازہ لاک کیا، میں نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا۔

کمرے کی خاموشی میں میرے دل کی دھڑکنیں اب بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ شکر ہے رامین! تمہارا یہ نکاح نامہ آج ہماری سب سے بڑی ڈھال بن گیا،" میں نے رامین اور زکیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آج یہ کاغذ ہمارے پاس نہ ہوتا، تو وہ ہوٹل کا کلرک ہمیں کبھی کمرہ نہ دیتا۔ مشہد کی اس سخت ناکہ بندی اور پولیس کی تلاشیوں کے بیچ، ایک اجنبی مرد اور خاتون کا بغیر شرعی ثبوت کے ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ ہم کسی بھی لمحے دھر لیے جاتے۔" زکیہ جو ابھی تک صدمے کی کیفیت میں تھی، بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی۔ میں نے ان دونوں کو مخاطب کیا اور اس تلاشی کی پوری روداد سنائی: "تمہیں معلوم ہے، جب ہجوم کے ریلے نے مجھے تم سے الگ کیا، تو میں سیدھا ایک پولیس والے کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے میرا بازو اتنی سختی سے جکڑا ہوا تھا کہ مجھے اپنی ہڈی چٹختی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کارڈ مانگا، میں نے بہانہ بنایا کہ کہیں ہجوم میں چوری ہو گیا۔" میں نے ایک لمحے کے لیے رک کر پانی کا گھونٹ بھرا اور پھر جاری رکھا: "اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا، بلکہ مجھے باڑ کی طرف دھکیل کر کہا کہ 'تلاشی دو'۔ میں نے اپنی حاضر دماغی سے کام لیا اور اسے خود ہی کہا کہ آپ دونوں ہاتھوں سے تسلی کر لیں۔ جیسے ہی اس نے تلاشی کے لیے میری گرفت ڈھیلی کی، میں نے 'مرگ بر اسرائیل' کا نعرہ لگایا اور ایک فرضی بھائی کی طرف اشارہ کر کے اسے الجھا دیا۔ بس وہی چند سیکنڈ تھے جن میں میں مچھلی کی طرح اس کے چنگل سے پھسل کر اس ہزاروں کے ہجوم میں روپوش ہو گیا۔" میری بات سن کر رامین اور زکیہ کے چہروں پر خوف اور راحت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ رامین نے میرا کندھا تھپتھپایا، "ذیشان بھائی! آپ کی ہمت ہے، ورنہ آج ہم سب کسی بڑی مصیبت میں ہوتے۔" زکیہ نے فکرمندی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا، "ذیشان بھائی! اب آگے کا کیا پلان ہے؟ آپ اب کیا کرنے کا سوچ رہے ہیں؟" میں نے ایک لمبا سانس لیا اور سنجیدگی سے کہا، "زکیہ، رامین! میرا کام یہاں تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ جتنی اہم معلومات اور دستاویزات مجھے اکٹھی کرنی تھیں، وہ سب اب میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان معلومات کا یہاں ایران میں رہنا اب میرے لیے موت کا پروانہ ہے، اس لیے میرا اب یہاں ایک پل بھی رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ اب مجھے ہر حال میں واپس پاکستان پہنچنا ہے۔" رامین نے حیرت سے میری طرف دیکھا، "پاکستان؟ لیکن بھائی، اس وقت تو سرحدوں پر چڑی بھی پر نہیں مار سکتی۔ آپ وہاں کیسے پہنچیں گے؟" ہر طرف احتجاج ہو رہے ہیں، سڑکیں بلاک ہیں اور آپ نے خود دیکھا کہ باہر سیکیورٹی کتنی سخت ہو چکی ہے۔ ایسے میں قدم باہر نکالنا خودکشی ہے۔ اسی لیے تو میں جا رہا ہوں رامین!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "سیکیورٹی مزید سخت ہوتی جا رہی ہے اور یہی وقت ہے یہاں سے نکلنے کا۔ اگر ہم ذرا بھی دیر کریں گے تو مشہد کے تمام داخلی اور خارجی راستوں پر سخت چیکنگ کی وجہ سے نکلنا مشکل ہو جائے گا میں نے کھڑکی کے پردے کی تھوڑی سی درز سے باہر لرزتی ہوئی اسٹریٹ لائٹس کو دیکھا اور میرا لہجہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ "مجھے سب سے زیادہ ڈر اس پولیس والے کا ہے جس نے میرا چہرہ دیکھ لیا ہے۔ وہ خاموش نہیں بیٹھا ہوگا۔ یہاں رکنا اب میرے لیے بہت خطرناک ہو چکا ہے، شاید موت سے بھی زیادہ خطرناک۔

یہ معلومات جو میرے پاس ہیں، یہ اب صرف کاغذ کے ٹکڑے نہیں بلکہ ایک امانت ہیں جنہیں ہر حال میں سرحد پار پاکستان پہنچنا ہے۔یہ معلومات ہمارے ملک کی سلامتی کے لیے بہت اہم ہیں اگر میں یہاں پکڑا گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"میں نے رامین اور زکیہ کی آنکھوں میں جھانک کر حتمی لہجے میں کہا، "دوستو! اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے راستے جدا کریں۔ تم دونوں اب ایک دوسرے کے شرعی لباس بن چکے ہو، اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم دونوں کی جان بھی خطرے میں پڑے۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تم دونوں اب خاموشی سے تہران اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ وہاں تم محفوظ رہو گے۔"میں اب اپنے ان پرانے اور سنگلاخ راستوں پر نکلوں گا جہاں سے میں آیا تھا۔"یہ سنتے ہی زکیہ ایک دم چونک پڑی، اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، "یہ آپ کیا بات کر رہے ہیں ذیشان بھائی؟ کیا ہم آپ کو اس طرح خطرے میں تنہا چھوڑ دیں؟ بارڈر تک کا راستہ سینکڑوں میل طویل ہے، آپ اکیلے کیسے جائیں گے؟"میں نے مسکرا کر اسے سمجھانا چاہا، "زکیہ! اگر تم میرے ساتھ آؤ گی تو خطرہ مزید بڑھ جائے گا۔ میں ایک 'سایہ' ہوں، اکیلا تیزی سے نکل سکتا ہوں۔"لیکن رامین نے فوراً مداخلت کی،اس کا لہجہ پکا تھا، "نہیں ذیشان بھائی! زکیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ کو اس وقت ایک 'کور' (Cover) کی ضرورت ہے۔ اگر آپ اکیلے نکلے تو ہر ناکے پر آپ مشکوک لگیں گے، لیکن اگر ہم ساتھ ہوں گے تو ہم ایک 'فیملی' لگیں گے۔ زکیہ کا ساتھ ہونا ہمارے لیے سب سے بڑی ڈھال بنے گا کیونکہ پولیس فیملی والی گاڑیوں پر اتنا شک نہیں کرتی۔"زکیہ نے رامین کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا، "ہاں بھائی! ہم آپ کو بارڈر کی اس آخری لکیر تک چھوڑ کر آئیں گے جہاں سے آپ کا خفیہ راستہ شروع ہوتا ہے۔ میں ایک عورت کے طور پر آپ کے ساتھ ہوں گی، تو تلاشی کے دوران ہم پر شک کم ہوگا۔ ہم آپ کو اس طرح موت کے منہ میں اکیلا نہیں بھیج سکتے۔ان دونوں کا اصرار دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایک خاندان کی صورت میں سفر کرنا سرحد کے قریب کھڑے فوجیوں کی نظروں سے بچنے کا بہترین طریقہ تھا۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر حامی بھر لی۔ ٹھیک ہے! اگر تم دونوں یہی چاہتے ہو تو ہم بارڈر تک ساتھ چلیں گے،""لیکن یاد رکھو، اب سے ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ ہم ابھی آرام کریں گے اور صبح سویرے فجر کی نماز کے فوراً بعد یہاں سے نکل جائیں گے۔ ہم مشہد کے مرکزی اور مصروف راستوں کے بجائے شہر کے پچھلے حصوں سے نکلیں گے اور چھوٹے دیہاتی راستوں کا انتخاب کریں گے۔ ہم بستیوں اور آباد علاقوں سے بچتے ہوئے پہاڑی پٹی کے ساتھ ساتھ سفر کریں گے تاکہ کسی بڑے ناکے پر تلاشی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔رامین نے تائید میں سر ہلا دیا اور گاڑی کی چابیاں میز پر رکھ دیں۔ ہم نے اگلے آدھے گھنٹے تک ایک ایک موڑ اور ایک ایک چیک پوسٹ کا ممکنہ حل سوچا اور اپنا حتمی ایکشن پلان مکمل کیا۔ کمرے میں موجود وہ مدھم سی روشنی ہماری اس آخری خفیہ میٹنگ کی گواہ تھی۔اب تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے ہیں،" میں نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "کل کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا ہوگا، اور ہمیں سرحد تک پہنچنے کے لیے پوری توانائی کی ضرورت ہے۔"ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی، لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میرے ذہن میں ان سنگلاخ پہاڑوں کے نقشے اور وہ تمام خطرناک موڑ گھوم رہے تھے جو اب میری واپسی کا راستہ تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا

کر رہا تھا کہ اللہ ہمیں اس آخری مرحلے میں بھی سرخرو کرے۔اور پھر پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ابھی تڑکا ہی ہوا تھا کہ مزارِ امام رضا (ع) کے میناروں سے اٹھنے والی مشہد کی مسحور کن اذان کی آواز نے ہمیں بیدار کیا۔ فجر کی ٹھنڈی ہوا کمرے کی کھڑکی سے چھن کر آ رہی تھی۔ ہم سب اٹھے، بوجھل آنکھوں کے ساتھ وضو کیا اور نماز ادا کی۔دعا کے بعد میں نے اپنا وہ مخصوص بیگ سنبھالا جس میں میرا ضروری سامان موجود تھا۔جلدی کرو رامین! سورج نکلنے سے پہلے ہمیں اس علاقے کو چھوڑنا ہوگا،" میں نے سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ زکیہ نے بھی اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور اپنی چادر کو درست کیا۔ ہم ہوٹل کی لابی میں آئے، رامین نے خاموشی سے چابی کاؤنٹر پر رکھی اور ہم پارکنگ کی طرف بڑھ گئے۔ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہوٹل میں رکنے کے بجائے راستے میں ہی ناشتہ کریں گے تاکہ وقت بچ سکے۔
رامین نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم مشہد کی سڑکوں پر نکل آئے۔ شہر ابھی انگڑائی لے رہا تھا، کہیں کہیں بلدیہ کے عملے کے سوا سڑکیں ویران تھیں۔
ہم نے ایک چھوٹے سے ڈھابے پر رک کر تازہ ایرانی نان اور پنیر لیا، ساتھ میں گرم چائے کے دو دو گھونٹ بھرے اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔رامین نے گاڑی کو بزرگراہِ آسیائی (Asian Highway) کی طرف موڑ دیا، جو مشہد کو جنوب کے شہروں سے جوڑتی ہے۔ہمارا پہلا پڑاؤ تربتِ حیدریہ کی طرف تھا۔ راستے میں سیکیورٹی کی صورتحال سخت تھی، جگہ جگہ پولیس کی گاڑیاں اور چیک پوسٹیں نظر آ رہی تھیں۔ رامین نے کمال مہارت سے گاڑی کو ان راستوں پر رکھا جہاں سے ہم کسی بڑے ناکے میں نہ پھنسیں۔شہر کی حدود سے باہر نکلتے ہی مناظر تیزی سے بدلنے لگے۔ شہر کے سرسبز باغات اور بلند عمارتیں پیچھے چھوٹ گئیں اور اب سامنے سنگلاخ بنجر پہاڑ اور کھلے بے رنگ میدان تھے۔ زکیہ آگے رامین کے ساتھ بیٹھی تھی تاکہ کسی بھی چیک پوسٹ پر اگر گاڑی روکی جائے تو ایک خاتون کی موجودگی کی وجہ سے پولیس زیادہ پوچھ گچھ نہ کرے، جبکہ میں پچھلی نشست پر دب کر بیٹھا ہوا تھا۔سفر طویل تھا اور مشہد سے نکلے ابھی دو گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ میری طبیعت بگڑنے لگی۔ شاید پچھلی کئی راتوں کی بے خوابی، وہ بھاگ دوڑ اور پولیس سے بچنے کے تناؤ نے اب اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میرے سر میں شدید کجی محسوس ہو رہی تھی اور جسم کا جوڑ جوڑ جیسے ٹوٹ رہا ہو۔رامین! ذرا گاڑی آہستہ کرو،" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میرے سر میں بہت تیز درد ہے اور سارا جسم تپ رہا ہے۔"رامین نے فکرمندی سے آئینے میں مجھے دیکھا اور تربتِ حیدریہ کے قریب ایک میڈیکل اسٹور دیکھ کر گاڑی روکی۔ زکیہ نے جلدی سے پانی کی بوتل نکالی اور رامین میرے لیے بخار اور سر درد کی گولیاں لے آیا۔ میں نے دوائی لی اور سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ زکیہ بار بار پیچھے مڑ کر میری خیریت پوچھ رہی تھی، اس کے لہجے میں اپنے بھائی کے لیے وہی پرانی ممتا اور فکر تھی۔ہم دوبارہ سفر پر نکلے۔ راستہ تھکا دینے والا تھا اور تپتی دھوپ ریتلے میدانوں پر ناچ رہی تھی۔ تقریباً پانچ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم گناباد کے علاقے سے گزرے۔ یہاں سے ریگستان کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ ہم نے ایک سڑک کنارے بنے چھوٹے سے ایرانی ریستوران پر قیام کیا جہاں رامین نے 'چلو کباب' کا آرڈر دیا، مگر میری طبیعت کی وجہ سے میں نے صرف تھوڑی سی دہی اور نان کھایا۔سورج اب ڈھلنا شروع ہو گیا تھا اور ہم بیرجند کی حدود میں داخل ہو رہے

تھے۔ یہ مشہد سے تقریباً 500 کلومیٹر دور ہے، یعنی ہم آدھا راستہ طے کر چکے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ سیکیورٹی کے دستے نظر آتے، مگر رامین بڑی مہارت سے گاڑی کو نارمل رفتار پر رکھتا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ذیشان بھائی! اب ہم نہبندان کی طرف بڑھ رہے ہیں،" رامین نے بتایا۔ "یہاں سے زاہدان تک کا راستہ بہت ویران ہے اور رات کے اندھیرے میں یہ ریگستان کافی پراسرار ہو جاتا ہے۔"میرا سر درد دوائی کی وجہ سے کچھ کم ہوا تھا، مگر کمزوری اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں افق پر لالی پھیل رہی تھی اور دور دور تک ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ وہی راستہ تھا جو مجھے اس خفیہ سرحد کی طرف لے جا رہا تھا جہاں سے میرا واپسی کا سفر شروع ہونا تھا۔ ہم۔خاموشی سے اس طویل شاہراہ پر رواں تھے، جہاں گاڑی کے انجن کی آواز کے سوا صرف ہوائیں سنائی دے رہی تھیں۔شام کے سات بج رہے تھے اور یخ بستہ رات اپنا مکمل تسلط جما چکی تھی۔ گاڑی کا ہیٹر پوری قوت سے چل رہا تھا، لیکن اس کے باوجود کھڑکیوں کے شیشوں پر جمی دھند اور باہر کی ہڈیوں میں اترتی سردی ہمیں اپنی موجودگی کا مسلسل احساس دلا رہی تھی۔ یہ سیستان و بلوچستان کا وہ بے رحم علاقہ تھا جہاں رات کے وقت سردی انسان کا خون جما دیتی ہے۔ ہم زاہدان کی حدود پار کر کے اب سرحد کی طرف بڑھنے والی آخری شاہراہ پر تھے، جہاں دور افق پر فلڈ لائٹس اندھیرے کو چیر رہی تھیں۔ ابھی ہم مرکزی فوجی چیک پوسٹ سے کافی پیچھے تھے کہ اچانک سڑک پر ایک عارضی پولیس ناکہ نظر آیا۔ یہ وہ معمول کی چیکنگ تھی جو حالیہ جنگی حالات اور شہر میں ہونے والے احتجاج کے باعث سخت کر دی گئی تھی۔

"ذیشان بھائی! خود کو سنبھالیں، ناکہ آگیا ہے،" رامین نے دبی آواز میں کہا اور گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ میرا دل حلق میں آگیا، میں نے اپنی چادر سر تک تان لی اور سیٹ کے ساتھ لگ کر خود کو جتنا ہو سکے چھپانے کی کوشش کی۔ایک طویل تڑنگا سپاہی، جس نے چہرے پر اونی مفلر لپیٹ رکھا تھا، ہاتھ میں ٹارچ لیے ہماری گاڑی کے قریب آیا۔ اس نے شیشے پر دستک دی تو رامین نے آہستگی سے شیشہ نیچے کیا۔ سرد ہوا کا ایک تیکھا، نوکیلا جھونکا اندر داخل ہوا جس نے ہم سب کو کپکپا دیا۔"سلام آغا! کارتِ شناسائی و مدارکِ خودرو؟" (سلام جناب! اپنا شناختی کارڈ اور گاڑی کے کاغذات دکھائیں؟) سپاہی کی آواز کرخت اور سرد تھی۔

رامین نے کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا کارڈ نکالا اور ساتھ ہی اپنا پریس کارڈ (صحافیانہ شناخت) بھی اوپر رکھ دیا۔ سپاہی نے ٹارچ کی تیز روشنی کارڈز پر ڈالی جیسے ہی اس کی نظر 'پریس' کے لفظ پر پڑی، اس کے تیور تھوڑے نرم ہوئے۔ پھر اس نے ٹارچ کی روشنی گاڑی کے اندر گھمائی۔آگے کی نشست پر زکیہ اپنی چادر میں لپٹی پروقار انداز میں بیٹھی تھی۔ ایک خاتون کی موجودگی اور رامین کے پریس کارڈ نے جادو کا سا اثر کیا۔ سپاہی کو لگا کہ یہ کوئی صحافی خاندان ہے جو شاید کسی نجی دورے پر اس طرف آیا ہے۔ اس نے پچھلی نشست پر میرا ہیولہ تو دیکھا، مگر زکیہ کے آگے ہونے کی وجہ سے اس نے مزید کریدنا یا تلاشی لینا مناسب نہ سمجھا اور کارڈز واپس کرتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے راستہ صاف کر دیا۔بفرمایید آغا! سفر بخیر۔" (جائیں جناب! آپ کا سفر اچھا گزرے۔) جیسے ہی گاڑی ناکے سے آگے نکلی، ہم سب نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا۔ "شکر ہے رامین! تمہاری شناخت اور زکیہ کی موجودگی آج پھر ہمیں بچا گئی۔" میں نے دل پر ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا، جہاں دھڑکنیں اب بھی تیز تھیں۔ناکے سے نکلتے ہی رامین نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی، مگر ہم سب جانتے تھے کہ اصل امتحان ابھی باقی ہے۔ یہ تو محض پولیس کا ایک عارضی ناکہ تھا، لیکن زاہدان سے سرحد کی طرف جانے والی اس شاہراہ پر چند کلومیٹر آگے وہ مرکزی فوجی چیک پوسٹ تھی جہاں سے کوئی بھی پرندہ پر مارے بغیر نہیں گزر سکتا تھا۔ وہاں ہر مسافر کو گاڑی سے اتار کر اس کی بائیو میٹرک تلاشی لی جاتی ہے۔ہم نے خاموشی سے اگلے بیس منٹ تک اس سنسان شاہراہ پر سفر جاری رکھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کے کنارے لگے سنگِ میل (Milestones) تیزی سے پیچھے چھوٹ رہے تھے۔ یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے اب پہلے سے زیادہ تیز ہو گئے تھے، جو بتا رہے تھے کہ ہم انسانی آبادی سے دور ایک سنگلاخ ریگستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ذیشان بھائی! وہ رہی مرکزی فوجی چیک پوسٹ۔ یہاں سے وہ اب تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اب ایک انچ بھی آگے جانا آپ کے لیے خودکشی ہوگی۔ ہمیں یہیں کسی اندھیرے گوشے میں رکنا ہوگا۔"رامین نے بڑی مہارت سے گاڑی کو سڑک سے اتار کر ایک کچی پگڈنڈی پر ڈالا اور ایک بلند ٹیلے کے پیچھے گاڑی روک کر لائٹس بند کر دیں۔ انجن بند ہوتے ہی باہر کی برفانی ہواؤں کی سائیں سائیں خاموشی کو چیرنے لگی۔زکیہ! رامین! میری بات بہت غور سے سنو،" میں نے اپنی آواز کو مدھم کیا جیسے یہ زندگی کی آخری وصیت ہو۔ "یہیں ہمارا ساتھ ختم ہوتا ہے،" "ہم نے گاڑی میں جو پروگرام بنایا تھا، اب اسی پر عمل کرنا ہے۔ تم زکیہ کو لے کر واپس میر جاوہ کے قبیلے ہوٹل میں چلے جاؤ۔ اس سردی میں گاڑی میں رکنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جیسے ہی میں بارڈر کراس کر کے پاکستان کی حدود میں داخل ہو جاؤں گا، میں تمہیں گرین سگنل (پیغام) دے دوں گا۔"میں نے زکیہ کی طرف دیکھ کر اطمینان دلایا، "اگر آج رات میرا میسج آ جائے تو تم لوگ صبح تہران کے لیے نکل جانا۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہوا یا میں سگنل نہ دے سکا، تو تم لوگ کل کا دن وہیں رکنا اور حالات دیکھ کر کوئی فیصلہ کرنا۔ میرے لیۓ بس یہی سمجھ لینا کہ شاید مقدر میں یہی لکھا تھا، یا میں دشمن کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔یا پھر..." میرا لہجہ تھوڑا لڑکھڑایایا... یا شاید ان سنگلاخ پہاڑوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔"زکیہ! اگر ایسا ہو تو سمجھ لینا کہ تمہارا بھائی اپنی مٹی کا قرض اتارتے ہوئے مٹی ہو گیا ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔

میری یہ بات سن کر زکیہ نے تڑپ کر اپنا منہ اپنی چادر میں چھپا لیا۔ اس کی سسکیوں میں یتیمی کا وہ پرانا دکھ اور ایک نئے بچھڑنے والے بھائی کا کرب شامل تھا۔نہیں ذیشان بھائی! خدا کے لیے ایسی منحوس باتیں مت کریں!" وہ روتے ہوئے پکاری، "ہم نے ابھی ابھی تو ایک بھائی پایا ہے، کیا ہم آپ کو یہاں ان کالی راتوں اور بھوکے بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں؟ آپ نے ہماری زندگیوں میں اجالا کیا، کیا خود اس اندھیرے میں گم ہونے جا رہے ہیں؟میں نے زکیہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، جیسے ایک بڑا بھائی اپنی بہن کو آخری بار رخصت کرتے وقت جگر پر پتھر رکھ کر حوصلہ دیتا ہے۔

"پاگل مت بنو زکیہ! تم اب ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہو۔ تمہاری حفاظت اب میری ذمہ داری نہیں، رامین کی ہے۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اب میرا فرض میری مٹی کی طرف ہے، جو مجھے ان پہاڑوں کے پار سے پکار رہی ہے۔ اگر میں آج نہ گیا، تو شاید یہ ثبوت کبھی اپنے ملک نہ پہنچ سکیں گے۔"رامین اپنی سیٹ سے باہر آ چکا تھا، اس کی آنکھوں

سے بہتے آنسو اس کی گال میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ خاموشی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے خدا سے اس 'بھائی' کی زندگی مانگ رہا ہو۔ فضا میں یخ بستہ ہوا کی سائیں سائیں اور ان دو مخلص انسانوں کی سسکیاں ایک ایسا منظر پیش کر رہی تھیں جسے لکھتے ہوئے شاید قلم بھی آنسو بہا دے۔ رامین کے قدم لڑکھڑائے اور وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی سسکیاں اب اس کے سینے میں دب کر رہ گئی تھیں، مگر اس کے جسم کی تھرتھراہٹ مجھے اپنی روح تک محسوس ہو رہی تھی۔ "ذیشان بھائی! آپ کا جسم تو تپ رہا ہے،" رامین نے پریشانی سے مجھے خود سے الگ کرتے ہوئے میرا ماتھا چھوا۔ "آپ کو تو شدید بخار ہے، اس حالت میں ان پتھریلے راستوں پر چلنا خودکشی ہے۔ خدا کے لیے آج رات رک جائیں، کل چلے جایئے گا۔

"زکیہ کی آنکھیں بھی التجا کر رہی تھیں، "ذیشان بھائی! رامین ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں، ان کالی راتوں اور برفانی ہواؤں کا مقابلہ آپ کیسے کریں گے؟ ایک رات سے کچھ نہیں ہوگا، ہم کہیں چھپ جائیں گے، بس آج مت جائیں۔ میں نے زکیہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ رامین کی طرف دیکھا۔ "بھائی! بخار تو جسم کی تھکن ہے، مگر میرے حوصلے ابھی جوان ہیں۔ اگر آج کا سورج نکلنے سے پہلے میں نے یہ پہاڑ پار نہ کیے، تو شاید کل کا سورج میرے لیے قید خانے کی دیواروں سے طلوع ہو۔ میرے پاس جو امانت ہے، اسے اپنی منزل تک پہنچانا میرے بخار سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔" رامین نے ایک لمبا سانس لیا، اس نے جان لیا تھا کہ میرا فیصلہ پتھر کی لکیر ہے۔ اس نے روتے ہوئے ایک آخری بار مجھے گلے لگایا، "اللہ آپ کا نگہبان ہو ذیشان بھائی۔ ہم تادمِ مرگ آپ کے لیے دعاگو رہیں گے۔" میں نے زکیہ کی طرف دیکھ کر سر ہلایا، اس نے اپنی چادر کے پلو سے آنسو پونچھے اور دھیرے سے کہا، "خدا حافظ بھائی! آپ کا سایہ ہم پر سلامت رہے۔ وہ دونوں بوجھل قدموں سے گاڑی میں بیٹھے۔ رامین نے انجن اسٹارٹ کیا اور ایک لمحے کے لیے گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن کیں تاکہ میں سامنے کا راستہ دیکھ سکوں۔ اس تیز روشنی میں وہ گرد آلود پگڈنڈی کسی سانپ کی طرح پہاڑوں میں گم ہوتی نظر آئی۔ میں نے اپنا بیگ کندھے پر سنبھالا، پیچھے مڑ کر ایک آخری بار ہاتھ ہلایا اور اندھیرے کی چادر اوڑھے ان سنگلاخ چوٹیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس گل ہوئیں اور انجن کی آواز آہستہ آہستہ سرد ہوا کے شور میں دفن ہو گئی۔ رات کے تقریباً سوا آٹھ بج رہے تھے۔

اب میں بالکل تنہا تھا، میرے سامنے برفانی ہواؤں کا طوفان تھا اور وہ راستہ جو مجھے میرے وطن کی مٹی تک لے جانے والا تھا۔ جونہی میں نے آگے قدم بڑھایا یخ بستہ ہوا میرے چہرے سے کسی تیز دھار خنجر کی طرح ٹکرانے لگی؛ یہ سردی ایسی تھی جو ہڈیوں کے گودے تک کو جما دے۔ میرے پاس کوئی کاغذ پر بنا نقشہ نہیں تھا، بس ذہن میں وہ خفیہ راستے نقش تھے جن سے میں کچھ عرصہ پہلے یہاں آیا تھا۔ میں ستاروں کی پوزیشن اور پہاڑوں کی مخصوص ساخت کو دیکھ کر اپنا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ یہ فاصلہ اگرچہ صرف 14 سے 16 کلومیٹر کا تھا، لیکن ان دشوار گزار چوٹیوں اور گہری کھائیوں کے درمیان یہ فاصلہ میلوں پر محیط لگ رہا تھا۔ بخار کی تپش میرے اندر تھی اور باہر کی برفانی سردی میرے وجود کو پگھلا رہی تھی۔ میں ہر چند قدم بعد رکتا، کسی بڑے پتھر کی اوٹ لیتا اور اپنا سانس بحال کر کے دور افق پر ٹمٹماتی ہوئی ایرانی بارڈر

گارڈز کی سرچ لائٹس کا جائزہ لیتا۔ وہ روشنیاں اندھیرے کو چیرتی ہوئی گزرتی تھیں اور میرا دل دھک سے رہ جاتا کہ کہیں ان کی زد میں نہ آ جاؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس راستے کو طے کرنے میں مجھے کم از کم تین سے چار گھنٹے لگیں گے، کیونکہ یہاں رفتار سے زیادہ احتیاط ضروری تھی۔ یا اللہ! بس ہمت دے دے، یہ امانت اپنی مٹی تک پہنچانی ہے،" میں نے لرزتے لبوں سے دعا مانگی۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے کہ اچانک آسمان پر سیاہ بادل منڈلانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ یہ بارش کسی سزا سے کم نہیں تھی۔ پانی کے قطرے نہیں تھے، بلکہ برف کی سوئیاں تھیں جو میرے تپتے ہوئے جسم کو چھید رہی تھیں۔ میرا بخار اب شدت اختیار کر چکا تھا، جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور دانت آپس میں بج رہے تھے۔ میں تڑپ رہا تھا، مگر رکنے کا مطلب موت تھا۔ لیکن اس بارش میں ایک خفیہ رعایت بھی چھپی تھی۔ بارش کی وجہ سے حدِ نگاہ کم ہو گئی تھی اور سیکیورٹی کی نظروں سے بچنا اب پہلے سے زیادہ آسان تھا۔ بارڈر گارڈز اپنی چوکیوں کے اندر دبک گئے تھے۔ میں اسی افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، کیچڑ میں لت پت ان پتھریلے راستوں پر رینگتا رہا۔ تقریباً ایک بجے تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔ میرا لباس بھیگ کر بوجھل ہو چکا تھا اور سردی کی وجہ سے میرا پورا جسم سُن ہو رہا تھا۔ ہر قدم ایک بوجھ بن گیا تھا اور میرے وجود کا جوڑ جوڑ ایسے تڑپ رہا تھا جیسے سینکڑوں سوئیاں ایک ساتھ چبھ رہی ہوں۔ چلنے سے جسم میں تھوڑی بہت حرارت تو پیدا ہوتی تھی، مگر سردی کی اس تیکھی ہوا کے سامنے وہ ناکافی تھی۔ میرا دل مچل رہا تھا کہ بس اب کہیں ڈھیر ہو جاؤں، اس سنگلاخ زمین پر لیٹ کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں موند لوں، مگر میں جانتا تھا کہ اس وقت رکنے کا مطلب خود کو ایرانی انٹیلی جنس کے حوالے کرنا تھا۔ یہ ایران کی آخری حدود تھی، یہاں کا ذرہ ذرہ میرے لیے نامحرم اور خطرناک تھا۔ بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ سرحد کی لکیر پار کر لوں۔ ایک بار اپنی مٹی پر قدم رکھ دیا، تو پھر چاہے پوری رات اسی بارش اور برف باری میں سڑک کنارے گزارنی پڑے، مجھے کوئی ڈر نہ ہوگا، کیونکہ وہ میری اپنی سرزمین ہو گی، میرا اپنا گھر ہو گا۔ اس کٹھن گھڑی میں، جب موت اور زندگی کے درمیان ایک بال برابر فاصلہ رہ گیا تھا، مجھے ان گمنام جوانوں کا شدت سے احساس ہوا جو سرحدوں کی بے رحم تنہائیوں میں وطن کی حرمت کا پہرہ دیتے ہیں۔ ہم لوگ جو شہروں کی رنگینیوں اور آرام دہ کمروں کے ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر ان کی قربانیوں کا محض تذکرہ کرتے ہیں، آج مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کن ہولناک راتوں، یخ بستہ ہواؤں اور تنہائی کے کرب سے گزر کر ہماری نیندوں کی پہرے داری کرتے ہیں۔ وطن کی محبت صرف نعروں یا سوشل میڈیا کی بحثوں کا نام نہیں، بلکہ اس کا اصل ذائقہ ان کٹیلی تاروں، پہاڑوں کی بے رحم چٹانوں اور بارش کی اس ٹھنڈک میں چھپا ہے جو ہڈیوں کا گودا تک جما دیتی ہے۔ آج مجھے ان خفیہ مجاہدوں کی قدر ہو رہی تھی جو کسی تمغے یا شہرت کی تمنا کے بغیر، غیر ممالک میں اپنی شناخت مٹا کر، 'سایوں' کی طرح دشمن کے نیٹ ورکس کو توڑتے ہیں۔ ایران اگرچہ ہمارا برادر اسلامی ملک ہے اور وہاں کے عوام کی محبت میرے دل میں ہے، لیکن ایک دوسرے ملک میں بغیر دستاویزات کے، ایک خفیہ آپریشن کرنا کتنا بڑا جوکھم ہے، یہ آج میری ہمت آزما رہا تھا آج مجھے اپنی مٹی کی قدر پہلے سے کہیں زیادہ ہو رہی تھی۔

دوسرے دیس میں ایک 'سایہ' بن کر رہنا اور اپنوں کے لیے اپنی ہستی مٹانا کتنا بڑا بوجھ ہے، اس کا اندازہ صرف اس

مسافر کو ہو سکتا ہے جس کے پیچھے دشمن کے کتے پڑے ہوں اور سامنے اندھیری گھاٹیاں۔ میں گرتا، سنبھلتا اور بخار کی شدت میں ہذیانی کیفیت کے باوجود صرف ایک ہی ورد کر رہا تھا: "بس تھوڑا سا اور... بس تھوڑی سی ہمت اور۔" میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ ایک طرف یہ جوان ہیں جو برف باری میں خون تھوکتے ہیں مگر قدم پیچھے نہیں ہٹاتے، اور دوسری طرف ہمارے کچھ حکمران اور مراعات یافتہ طبقہ ہے، جو بیرونی طاقتوں کی چاپلوسی کرنے اور اپنے مفادات کے لیے دوسروں کے سامنے جھکنے میں ذرا برابر عار محسوس نہیں کرتے۔ کتنا بڑا تضاد ہے کہ مٹی کا اصل بیٹا اسی مٹی کے لیے جان کی بازی لگا رہا ہے اور ایوانوں میں بیٹھے لوگ اسی مٹی کا سودا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ آج ان لوگوں پر بھی افسوس ہو رہا تھا جو بند کمروں میں بیٹھ کر اپنی فوج اور محافظوں پر تنقید کے نشتر چلاتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جب گولی چلتی ہے یا جب دشمن کی انٹیلی جنس ایجنسیاں آپ کے تعاقب میں ہوتی ہیں، تو صرف خدا کی ذات اور اپنے ملک کا جھنڈا ہی ڈھال بنتا ہے۔ یہ وردی اور یہ جذبہ ہی ہے جو ایک انسان کو ہڈی توڑ سردی میں بھی چٹان بنا دیتا ہے۔ میرے قدم اب بھاری ہو رہے تھے، بخار کی تپش نے ذہن کو دھندلا دیا تھا، مگر غیرتِ ایمانی اور وطن کا قرض مجھے رینگنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں آج گر گیا تو وہ اہم ثبوت کبھی پاکستان نہیں پہنچ پائیں گے جن کے لیے میں نے یہ جلاوطنی کاٹی تھی۔ رات کے دو بجنے کے قریب تھے، بارش تھم چکی تھی مگر فضا میں یخ بستہ نمی اور گہری دھند کا راج تھا۔ یہاں نہ تو کوئی بلند و بالا واچ ٹاور تھا اور نہ ہی کوئی باقاعدہ خاردار تار کیونکہ یہ وہ خفیہ اور سنگلاخ راستہ تھا جسے صرف اسمگلر یا وہ لوگ جانتے تھے جن کی زندگی ان پہاڑوں کی اوٹ میں گزرتی ہے۔ یہاں سیکیورٹی براہِ راست نظر نہیں آ رہی تھی، مگر خاموشی اتنی ہولناک تھی کہ ایک سوکھے پتے کے ٹوٹنے کی آواز بھی کسی دھماکے سے کم محسوس نہ ہوتی۔۔ دور کہیں افق پر خاردار تاروں کا ایک دھندلا سا سایہ اور سرحدی باڑھ کی ہلکی سی لکیر نظر آ رہی تھی، جو یہ بتا رہی تھی کہ باقاعدہ سرحد وہاں ہے، مگر میں ان دشوار گزار چٹانوں کے بیچ اس گمنام درے سے گزر رہا تھا جہاں انسانی قدموں کے نشان ڈھونڈنا بھی ناممکن تھا۔

میں نے ایک گہری گھاٹی کی اوٹ لی اور وہیں پتھروں کے بیچ دب کر بیٹھ گیا۔ میرا جسم بخار سے تپ رہا تھا، مگر میرا ذہن کسی شکاری کی طرح بیدار تھا۔ میں نے اگلے پندرہ بیس منٹ وہیں ساکت لیٹ کر گزارے، اپنی سانسوں کی آواز کو بھی قابو میں رکھا۔ میں دور سے آنے والی کسی ممکنہ جیپ کے انجن یا بوٹوں کی چاپ کا انتظار کر رہا تھا، مگر وہاں صرف برفانی ہوا کی سائیں سائیں تھی جو کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی۔ سوا دو بجنے والے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ وہ وقت ہے جب پہرے داروں کی گشت کا دورانیہ بدلتا ہے یا وہ سردی سے بچنے کے لیے اپنی عارضی چوکیوں میں پناہ لیتے ہیں۔ میں نے اپنا بیگ سینے سے لگایا اور نیچے جھک کر رینگنا شروع کیا۔ کیچڑ اور نوکیلے پتھر میری کہنیوں اور گھٹنوں کو زخمی کر رہے تھے، مگر مجھے اس وقت کسی درد کا احساس تک نہ تھا۔ میں نے ایک گہری گھاٹی کی اوٹ لی، جہاں پہاڑوں کی قدرتی ساخت نے ایک ایسا راستہ بنا رکھا تھا جو سیکیورٹی کی نظروں سے اوجھل تھا۔ یہاں نہ کوئی آہنی باڑھ تھی اور نہ ہی کوئی دیوار، کیونکہ ان عمودی چٹانوں پر تار لگانا انسانی بس سے باہر تھا۔ دراصل اس مقام پر شدید بارشوں اور لینڈ سلائیڈنگ کی

وجہ سے اکثر بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں گرتی رہتی تھیں، جس کی وجہ سے اگر کبھی یہاں باڑھ لگانے کی کوشش بھی کی جاتی تو وہ قدرتی آفات کے سامنے ٹک نہ پاتی اور ٹوٹ کر ملبے میں دب جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ درّہ ہمیشہ سے ایک 'گمنام راستہ' بنا ہوا تھا۔ بس زمین پر پڑے وہ سیاہ پتھر گواہ تھے کہ یہاں ایک ملک کی حد ختم اور دوسرے کی شروع ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ وہ 'زیرو لائن' ہے جس کا کوئی مادی وجود نہیں، مگر یہ دو ملکوں کی تقدیر جدا کرتی ہے۔ میں نے ایک آخری جست لگائی اور لڑکھڑاتے ہوئے اس غیر مرئی لکیر کو پار کر لیا۔

جیسے ہی میرے پاؤں نے اس پار کی مٹی کو چھوا، میرے سینے میں ایک عجیب سی تڑپ اٹھی۔ یہ وہی سنگلاخ راستہ تھا، وہی پتھر تھے، مگر اس مٹی کے لمس میں ایک ایسی کشش تھی جس نے میرے بخار سے ٹوٹتے ہوئے نحیف جسم میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ میری اپنی مٹی ہے، مگر میں وہاں ایک پل کے لیے بھی نہیں رکا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی ایرانی گشتی دستہ اندھیرے میں مجھے دیکھ نہ لے اور وہ یہ سمجھ کر مجھ پر جھپٹ پڑیں کہ میں ابھی ان کی حدود میں ہوں۔ میں بخار سے ٹوٹتے ہوئے وجود کے باوجود دیوانہ وار بھاگتا رہا۔ میں نے تقریباً دو تین سو گز کا فاصلہ تیزی سے طے کیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں دشمن کی دسترس اور ان کی گولی کی مار سے دور اپنی سرزمین کی گہرائی میں آ چکا ہوں، تب میرے قدم تھم گئے۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل گرا اور اپنی مٹی پر سر رکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔۔میرے جسم سے پسینہ اور بارش کا پانی مل کر بہہ رہا تھا، بخار کی تپش اب بھی عروج پر تھی، مگر میرے دل کو وہ قرار آ گیا تھا جو مہینوں کی جلاوطنی میں ایک لمحے کو بھی میسر نہیں ہوا تھا۔ میں پاکستان میں تھا اب وہ خوف جو سائے کی طرح مشہد کی گلیوں سے یہاں تک میرے ساتھ رہا تھا، ایک دم کافور ہو گیا تھا۔ اب مجھے کسی غیر ملکی انٹیلی جنس یا بیرونی ایجنسی کا ڈر نہیں تھا۔ اب اگر میں پکڑا بھی جاتا یا کسی کی نظر میں آ بھی جاتا، تو میں اپنے لوگوں کے درمیان ہوتا، اپنی سرزمین پر ہوتا۔ وہ جو ایک انجانا سا بوجھ اور پردیس میں 'غیر قانونی' ہونے کا ڈر تھا، وہ اس لکیر کے پار ہی رہ گیا تھا۔ اگرچہ ابھی مجھے اپنے ہی ملک میں 'خفیہ' طریقے سے آگے بڑھنا تھا اور اپنے محافظوں کی نظروں سے بچ کر محفوظ مقام تک پہنچنا تھا، لیکن یہ چیلنج اس ہولناک ڈر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب میں 'سایہ' نہیں تھا، اب میں اپنے گھر کا بیٹا تھا جو اپنے سینے میں دفن رازوں کو امانت سمجھ کر لوٹا تھا۔ میں نے وہیں پتھروں کے بیچ بیٹھ کر کانپتے ہاتھوں سے فون نکالا؛ اب سگنل کی لہریں اسکرین پر رقص کر رہی تھیں۔ میں نے رامین اور زکیہ کو وہ طے شدہ پیغام بھیجا: ''سبز سگنل! میں اپنے گھر کی دہلیز پر ہوں۔ میسج سینڈ ہوتے ہی میرا دل بوجھل پن سے آزاد ہو گیا۔ میں نے اپنا بیگ سختی سے بھینچا اور ایک گہرا سانس لیا؛ اس ہوا میں میر جاوہ کی ٹھنڈک نہیں، میرے وطن کی خوشبو تھی۔ میں سرحد کی لکیر سے تقریباً 300 گز اندر تو آ چکا تھا، مگر یہ سنگلاخ پہاڑ اب بھی سردی اور خاموشی کا کفن اوڑھے ہوئے تھے۔ پو پھٹنے میں ابھی تقریباً پونے چار گھنٹے باقی تھے اور مجھے ان گھنٹوں میں سرحد سے اتنا دور نکلنا تھا کہ سورج کی پہلی کرن مجھے کسی نامحرم نظر کے سامنے عریاں نہ کر دے۔ بخار کی تپش میرے اندر لاوے کی طرح ابل رہی تھی، سر چکرا رہا تھا اور پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے، مگر میں نے خود کو حوصلہ دیا اور ان دشوار گزار پگڈنڈیوں پر گرتے سنبھلتے آگے بڑھنا شروع کیا۔ میں نے جان

بوجھ کر ان راستوں کا انتخاب کیا جو ہماری اپنی سرحدی چوکیوں سے دور پہاڑوں کے عقب میں تھے۔ دور سے کبھی کبھار کسی چوکی کی مدھم سی روشنی نظر آتی، تو میں فوراً کسی چٹان کی اوٹ میں دب جاتا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت میری حالت کسی 'مشکوک درانداز' سے کم نہیں تھی: کیچڑ میں لت پت لباس، اور کٹی پھٹی جیکٹ کے ساتھ اگر میں کسی محافظ کے سامنے آ جاتا، تو وہ اپنی پروفیشنل ذمہ داری نبھاتے ہوئے مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا۔ تقریباً پونے چار گھنٹے تک میں ان سنگلاخ تلازموں سے لڑتا رہا۔

جب گھڑی نے صبح کے چھ بجائے، تو افق پر سپیدۂ سحر کی ہلکی سی لکیر نمودار ہونے لگی تھی۔ میں اب سرحد سے تقریباً نو دس کلومیٹر اندر ایک ایسے ویران پہاڑی سلسلے میں پہنچ چکا تھا جہاں خاموشی کا راج تھا۔ تھکن اب اس انتہا پر تھی کہ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ میں نے ایک ڈھلوان کے نیچے پتھروں کی ایک قدرتی اوٹ دیکھی جو چھپنے کے لیے بہترین تھی۔ میں نے اپنا وہ قیمتی بیگ ادھر رکھا۔ زمین ٹھنڈی تھی، مگر میرے لیے کسی مخمل کے بستر سے کم نہ تھی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے خشک مٹی سے تیمم کیا اور بیٹھ کر فجر کی نماز ادا کی۔ وہ سجدہ جو میں نے اس مٹی پر کیا، اسکی لذت بیان سے باہر تھی۔ نماز کے بعد میں نے وہیں لیٹ کر تھوڑی دیر ارام کرنے کا سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں اب کوئی خطرہ نہیں ہے؛ میں اپنے ملک کی آغوش میں تھا، اپنے محافظوں کے حصار میں تھا۔ بخار کی شدت اور تھکن نے جیسے ہی مجھے اپنی گرفت میں لیا، میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں نے ایک آخری بار آسمان کی طرف دیکھا جہاں تارے اب دھندلا رہے تھے، اور ایک پرسکون نیند کی وادی میں اتر گیا، اس یقین کے ساتھ کہ اب اگر میری آنکھ کھلی تو وہ میرے آزاد وطن کی پہلی محفوظ صبح ہوگی۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج آسمان کے عین وسط میں چمک رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بجنے کو تھے اور زرد دھوپ ان بنجر چٹانوں پر پوری طرح پھیل چکی تھی۔ اگرچہ اس روشنی میں تپش نہیں تھی، مگر اس کی چمک اتنی تیز تھی کہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک دم سب کچھ دھندلا سا گیا۔ رات کی بارش اور نمی سے بھیگے ہوئے میرے کپڑے اب خشک ہو کر اکڑ چکے تھے، جس کی وجہ سے جسم کی حرکت کے ساتھ ہی کپڑوں کی رگڑ ایک عجیب سی چبھن کا احساس دلا رہی تھی۔ ہوا میں اب بھی وہی کاٹ دار خنکی تھی جو اس ریگزار اور پہاڑی علاقے کا خاصہ ہے۔ میں نے اٹھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی؛ رات کی وہ خوفناک سیاہی اب ایک سرمئی اور بھورے رنگ کے منظر نامے میں بدل چکی تھی۔ میں جس گھاٹی میں چھپا ہوا تھا، وہاں سے آگے کا راستہ ایک کھلے میدان اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے بیچ سے گزرتا تھا۔ میرا حلق پیاس سے کانٹا بن رہا تھا، مگر مجھے معلوم تھا کہ یہاں کسی چشمے یا آبادی کا ملنا ناممکن ہے۔ مجھے اب ان پگڈنڈیوں پر نکلنا تھا جو مجھے مرکزی شاہراہ کی نظروں سے دور رکھتے ہوئے آگے کی سمت لے جائیں۔ یہاں سے سرحد کا قریبی قصبہ تقریباً پندرہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، لیکن میرا ہدف کوئی بستی نہیں بلکہ وہ گمنام کچی سڑکیں تھیں جہاں سے گزرنے والے کوئلے کے ٹرک یا مقامی گاڑیاں مجھے کسی محفوظ ٹھکانے تک پہنچا سکتی تھیں۔ میں نے اپنے بیگ کی پٹیاں ایک بار پھر سختی سے کسیں اور ان سنگلاخ چٹانوں کے بیچ سے رستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ بخار کی لہریں اب بھی میرے سر میں

ہتھوڑوں کی طرح بج رہی تھیں، مگر میرا ارادہ ان چٹانوں سے زیادہ سخت تھا۔ میں نے جان بوجھ کر ان پگڈنڈیوں کا انتخاب کیا جو مرکزی شاہراہ سے دور پہاڑوں کے عقب میں مڑتی تھیں۔ یہاں ہر قدم ایک نئی آزمائش تھا؛ کبھی پاؤں کسی پھسلن زدہ پتھر پر پڑتا تو کبھی خاردار جھاڑیاں میرے جسم کو تھوڑا لہولہان کر دیتیں۔وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ سورج اب مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا اور آسمان پر نارنجی رنگت پھیل رہی تھی۔ جب میں نے دور سے ایک کچی سڑک کے آثار دیکھے، تو میری گھڑی شام کے چھ بجا رہی تھی۔ ان ساڑھے پانچ گھنٹوں میں، میں نے تقریباً 18 سے 20 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ تھکن اب اس انتہا پر تھی کہ میرے گھٹنے ہر قدم پر جواب دے رہے تھے، مگر نظریں اب بھی کسی 'سہارے' کی تلاش میں تھیں۔میں نے کچی سڑک کے کنارے ایک بڑی چٹان کی اوٹ لی اور اپنا بیگ کھولا۔ میرے پاس ایک جوڑی صاف کپڑے موجود تھے جو میں نے اسی وقت کے لیے بچا کر رکھے تھے۔ میں نے جلدی سے کیچڑ اور مٹی میں لت پت قمیض بدلی اور اپنے حلیے کو کسی حد تک 'عام مسافر' جیسا بنانے کی کوشش کی۔ اگرچہ بخار کی وجہ سے میرا چہرہ اترا ہوا تھا، مگر اب میں کسی مفرور در انداز کے بجائے ایک تھکا ہوا مسافر لگ رہا تھا۔اس علاقے میں ایک مسافر اور 'مشکوک شخص' کے درمیان فرق صرف آپ کے حلیے اور اعتماد کا ہی ہوتا ہے۔پھر میں سڑک کے موڑ پر آ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا، جہاں گاڑی کی رفتار قدرتی طور پر کم ہو جاتی تھی میرے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا
جیسے میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔اچانک، تھوڑی دیر بعد خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک بھاری بھرکم انجن کی آواز سنائی دی۔ دور سے مٹی کا ایک مرغولہ اٹھتا ہوا دکھائی دیا، ایک پرانا، گرد و غبار میں لتاڑا ہوا کوئلے کا ٹرک ہولے ہولے رینگتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے انجن کی آواز کسی تھکے ہوئے جانور کی کراہ جیسی تھی۔ٹرک کی رفتار اتنی دھیمی تھی کہ اس کے ٹائر پتھروں سے ٹکرانے کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ٹرک کا پچھلا حصہ کوئلے کی بوریوں سے آدھا بھرا ہوا تھا اور اوپر ترپال ڈھکی ہوئی تھی۔جب ٹرک قریب آیا اور اس کی ہیڈلائٹس کی زرد روشنی مجھ پر پڑی، تو میں نے اطمینان سے ہاتھ ہلایا۔تو انجن کی ایک بھاری کراہ کے ساتھ ٹرک چند گز کے فاصلے پر رک گیا۔ میں چل کر ڈرائیور والی کھڑکی کے پاس گیا۔ ڈرائیور کی عمر پچاس کے قریب ہوگی، چہرے پر جھریوں اور گرد کی تہیں اس کی سخت زندگی کی گواہ تھیں۔ خیر ہے جوان؟ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟' اس نے پشتو لہجے میں پوچھا۔
میں نے اپنے لہجے کو جتنا ہو سکا مقامی رنگ دینے کی کوشش کی اور جواب دیا، 'خان صاحب! میں پیچھے ایک 'زیمباڈ' (پک اپ) میں آ رہا تھا، کم بخت کا ایکسل ٹوٹ گیا اور وہ وہیں کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور پیچھے ہی رک گیا ہے، اس نے مجھے کہا کہ تم آگے نکل جاؤ اور اگر کوئی گاڑی ملے تو قریبی بستی سے مدد بھیج دینا۔ میں نے اپنی آواز کو جتنا ہو سکا پر اعتماد رکھا، حالانکہ اندر سے میرا وجود کانپ رہا تھا۔' یہ ایک ایسی کہانی تھی جو ان کچے راستوں پر روز کا معمول ہے۔ زیمباڈ گاڑیوں کا خراب ہونا یا پھنس جانا یہاں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ڈرائیور نے تھوڑا سوچا۔اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میری نئی قمیض اور بیگ نے شاید اسے کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا کہ میں واقعی کسی مشکل میں ہوں۔اس نے خاموشی سے اندر کی طرف سے دروازہ کھولا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔میں جیسے ہی سیٹ پر بیٹھا، انجن کے شور اور کیبن کی ہلکی سی تپش نے

مجھے ایک عجیب سا سکون دیا۔ ٹرک دوبارہ اپنی سست رفتاری سے چلنے لگا۔ ڈرائیور نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پوچھا، 'کہاں سے آ رہے ہو جوان؟ڈرائیور کے سوال پر میں نے گہرا سانس لیا اور چہرے پر ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ لانے کی کوشش کی، جو شاید تھکن کی وجہ سے ادھوری ہی رہی۔"خان صاحب، میں ایک صحافی ہوں، ریسرچ (تحقیق) کے لیے اس علاقے کی پرانی پگڈنڈیوں اور یہاں کی عام زندگی پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں،" میں نے اعتماد سے جھوٹ بولا، کیونکہ ایک صحافی کا اس طرح ویرانوں میں مارا مارا پھرنا لوگوں کے لیے زیادہ حیرت کی بات نہیں ہوتی۔

"اسی چکر میں اس بدبخت زیمباڑ والے کے ہتھے چڑھ گیا، اس نے کہا تھا کہ شارٹ کٹ سے جلدی پہنچا دے گا، مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔میری آواز میں وہ تھکن نہیں تھی جو میرے جسم پر طاری تھی، بلکہ ایک کھری سچائی تھی۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا؛ اگر اس ڈرائیور نے ذرا سی بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی یا مجھے کسی جال میں پھنسانے کا سوچا، تو میں وہ سب کچھ کرنے کی سکت رکھتا تھا جو میں اب تک سرحد کے اس پار کرتا آیا تھا۔ جلاوطنی نے مجھے جینا اور لڑنا سکھا دیا تھا۔ اب میں کوئی تر نوالہ نہیں تھا جسے کوئی بھی ہضم کر لے ۔ڈرائیور نے میری بات سن کر ایک لمبی ہوں بھری اور اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ "صحافی ہو؟ بڑی ہمت ہے تمہاری جوان۔ اس خاک اڑتی زمین پر کتاب لکھنے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ یہاں تو دن کو دھوپ جلاتی ہے اور رات کو تنہائی کھا جاتی ہے۔"اس نے ڈیش بورڈ پر رکھی نسوار کی ڈبیا اٹھائی اور ایک چٹکی بھرتے ہوئے دوبارہ میری طرف دیکھا۔ویسے تم لگتے نہیں ہو کہ ان راستوں کے عادی ہو۔ یہ بیگ، یہ جوتے... یہ سب شہر کی نشانی ہیں۔خیر اب تم میرے ساتھ ہو، فکر نہ کرو۔

، تم سچ بول رہے ہو یا جھوٹ، اس سے مجھے سروکار نہیں۔ تم میرے مسافر ہو اور پشتون کی غیرت مسافر کو منزل تک پہنچانا جانتی ہے۔ تمہیں اگلی بڑی بستی کے اڈے پر اتار دوں گا، وہاں سے تمہیں کوئٹہ کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ مل جائے گا۔"میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں شام کا جھٹپٹا اب گہرے اندھیرے میں بدل رہا تھا۔ ڈرائیور کی باتوں نے میرے دل سے ایک بوجھ اتار دیا تھا،"شکریہ خان صاحب، آپ کا احسان رہے گا،" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اب خاموشی چھا گئی تھی، صرف ٹرک کے پرانے گیئر بدلنے کی آواز آتی تھی۔ میری آنکھیں پھر سے بوجھل ہونے لگیں، مگر میں نے خود کو سونے سے روکا۔ اس سفر میں ابھی بہت سے مرحلے باقی تھے اور اس ڈرائیور کا ہر سوال میرے لیے ایک نئی آزمائش ہو سکتا تھا۔میرے ذہن میں وہ تمام نقشے، دستاویزات اور انٹیلی جنس کی وہ رپورٹیں گردش کر رہی تھیں جنہیں میں سرحد کے اس پار سے موت کے جبڑے سے نکال کر لایا تھا۔"تمہارا نام کیا ہے جوان؟" خان صاحب نے سڑک پر نظریں جمائے اچانک پوچھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ میری عادت بن چکی تھی کہ نام پوچھے جانے پر کوئی فرضی شناخت ڈھونڈوں، مگر اب میں سرحد کے اس پار نہیں تھا۔ اب میں مشہد کی تنگ گلیوں یا زاہدان کے ویرانوں میں نہیں چھپا ہوا تھا جہاں مجھے اپنی پہچان بدلنی پڑے۔ اب میں پاکستان میں تھا، اپنی مٹی پر۔"میرا نام ذیشان ہے، خان صاحب،" میں نے پورے فخر اور اطمینان سے جواب دیا۔ اپنا اصلی نام اپنی زبان سے ادا کرنا مجھے ایسا لگا جیسے میں نے برسوں بعد اپنا کھویا ہوا وجود دوبارہ پا لیا

ہو۔خان صاحب نے سر ہلایا۔ "ذیشان۔۔۔ اچھا نام ہے۔ دیکھو ذیشان! آگے ایک چھوٹی سی چوکی آئے گی۔ وہاں عام طور پر لیویز والے ہوتے ہیں۔ تم صحافی ہو، تو ڈرنے کی ضرورت نہیں، بس اپنا کارڈ تیار رکھنا۔ وہ بس یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی مشکوک سامان تو نہیں۔"ذہنی طور پر میں اب بھی الرٹ تھا، لیکن وہ خوف جو دل کو مٹھی میں دبوچے رکھتا تھا، اب ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا بیگ کندھے سے ذرا اور اوپر کر لیا۔ میرے پاس کوئی باقاعدہ پریس کارڈ تو نہیں تھا، مگر میرے پاس وہ سچائی تھی جو کسی بھی کارڈ سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اگر ان محافظوں نے روکا بھی، تو میں اپنے ہی بھائیوں کے سامنے کھڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر نوبت آئی تو میں انہیں باور کروا لوں گا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں ہوں۔اچانک دور اندھیرے میں کچھ ٹارچوں کی روشنیاں لہراتی نظر آئیں۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک لکڑی کا بیریئر لگا ہوا تھا اور وردی پوش سائے حرکت میں تھے۔ ٹرک کے بریکوں کی چیں چیں کرتی آواز خاموش رات میں دور تک گونجی۔ "السلام علیکم خان صاحب! کیا لاد کر لا رہے ہو؟" ایک لیویز اہلکار نے ٹارچ کی روشنی کیبن کے اندر مارتے ہوئے پوچھا۔

روشنی سیدھی میری آنکھوں میں پڑ رہی تھی، مگر اس بار میں نے نظریں نہیں چرائیں۔ میں نے اپنی پلکیں تک نہیں جھپکائیں، بلکہ پوری ہمت کے ساتھ اس روشنی کا سامنا کیا۔

"وعلیکم السلام، کوئلہ ہے اور ساتھ میں ایک مسافر،" خان صاحب نے جواب دیا۔اہلکار کی ٹارچ اب میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ "کون ہو جوان؟ کہاں سے آ رہے ہو؟" اس کا لہجہ کرخت تھا مگر اس میں دشمنی نہیں، صرف ڈیوٹی کی سختی تھی۔اہلکار کی ٹارچ کی تیز زرد روشنی میری آنکھوں میں چبھ رہی تھی، مگر میرے چہرے پر اب وہ ہراسگی نہیں تھی جو ایران کی سرحد عبور کرتے وقت میرے اعصاب پر سوار تھی۔ میں نے اطمینان سے اپنا ہاتھ اٹھا کر روشنی کو تھوڑا پرے کرنے کا اشارہ کیا اور اپنی آواز میں وہ کھنک پیدا کی جو ایک پڑھے لکھے اور بااعتماد شہری کی پہچان ہوتی ہے۔"میرا نام ذیشان ہے افسر صاحب! میں ایک صحافی اور محقق ہوں،" میں نے لہجے میں وقار برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ان سرحدی علاقوں کی تاریخ اور یہاں کے لوگوں کی زندگی پر ایک دستاویزی کتاب (Documentary Book) لکھ رہا ہوں۔ پیچھے ایک گاڑی خراب ہو گئی تھی، تو خان صاحب نے مہربانی کی اور مجھے لفٹ دے دی۔"اہلکار نے ٹارچ کی روشنی اب میرے بیگ پر ڈالی۔ "بیگ میں کیا ہے؟" اس نے شک بھرے لہجے میں پوچھا۔میں نے فوراً جواب دیا: "اس میں میرا لیپ ٹاپ، کیمرہ اور کچھ تحریری نوٹس ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو چیک کر سکتے ہیں، مگر ذرا احتیاط سے، کیونکہ یہ میرا مہینوں کا کام ہے۔"سچائی جب اتنے اعتماد سے بولی جائے تو وہ شک کی دیواریں گرا دیتی ہے۔ اہلکار نے میری آنکھوں میں دیکھا، جہاں اب خوف کی جگہ ایک مشن کی جھلک تھی۔ اس نے ٹارچ نیچے کر لی اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ اہلکار نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر جماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، "جوان، ہمیں اپنی ڈیوٹی پوری کرنی ہے۔ شکریہ کہ آپ تعاون کر رہے ہیں۔ ذرا اپنا بیگ دکھا دیجیے۔"میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا، "بالکل افسر صاحب، آپ کا حق ہے،" اور اطمینان سے ٹرک سے نیچے اتر کر اپنا بیگ ان کے سامنے بنچ پر رکھ دیا۔ میرے اندر اب کوئی چور نہیں تھا، اس لیے میرا لہجہ پرسکون اور نظریں جمی ہوئی تھیں۔میں نے بیگ کی زپ کھولی تو اوپر ہی میرا

لیپ ٹاپ اور کچھ تحقیقی کاغذات نظر آرہے تھے۔ ساتھ ہی میں نے اپنی جیب سے اپنا اصلی شناختی کارڈ نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ میرا آئی ڈی کارڈ ہے۔ میں ایک صحافی ہوں اور اس سرحدی علاقے کی ثقافت اور گزرگاہوں پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ آپ کو جس چیز کی تسلی کرنی ہو، آپ دیکھ سکتے ہیں اسی دوران ایک سینئر حوالدار، جو اندر سے صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا، باہر آیا۔ اس نے میرا شناختی کارڈ ہاتھ میں لیا، اسے غور سے پڑھا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھا۔ اسے شاید میری باتوں سے زیادہ میرے لہجے کے اعتماد اور سچائی نے متاثر کیا۔

"ذیشان صاحب،" اس نے کارڈ واپس کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا، "ہمیں معذرت ہے کہ آپ کو اس وقت زحمت دی، مگر آپ جانتے ہیں کہ سرحد کے حالات ایسے ہیں کہ ہمیں ہر آنے جانے والے کی تسلی کرنی پڑتی ہے۔اس نے جونیئر اہلکار کو اشارہ کیا کہ بیگ واپس کر دے۔ جونیئر نے بھی بڑے احترام سے میرا لیپ ٹاپ اور کاغذات ترتیب سے بیگ میں رکھے اور زپ بند کر کے بیگ مجھے تھما دیا۔"کوئی بات نہیں حوالدار صاحب، آپ لوگ اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں اور یہ ہمارے ہی تحفظ کے لیے ہے،" میں نے بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔حوالدار کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ "آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ جب تعاون کرتے ہیں تو ہماری ڈیوٹی آسان ہو جاتی ہے۔ آپ کا سفر بخیر گزرے۔ اگلی چوکیوں پر بھی اپنا تعارف اسی طرح کروایئے گا، ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ ٹرک میں جا بیٹھا۔ خان صاحب نے جب ٹرک اسٹارٹ کیا تو میرے دل میں اپنے محافظوں کے لیے ایک گہرا احترام تھا۔ اب میں صرف اپنی سرزمین پر نہیں تھا، بلکہ اپنوں کی حفاظت کے احساس میں بھی تھاٹرک ایک بار پھر رات کے سناٹے کو چیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ سڑک اب قدرے بہتر تھی، مگر گرد و غبار کا وہ طوفان ابھی بھی ہمارے تعاقب میں تھا۔ خان صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور اسٹیرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اب میرے لیے پہلے سے زیادہ عزت اور اپنائیت تھی۔ "ذیشان صاحب! ماننا پڑے گا، آپ کے لہجے میں وہ سچائی ہے جو پتھر دل کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ ان وردی والوں کو تو ہم روز بھگتتے ہیں، مگر آج آپ نے جس طریقے سے ان سے بات کی، وہ دیکھ کر مزہ آگیا۔" خان۔صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں دور افق پر اب تاروں کی بارات سجی ہوئی تھی۔ "خان صاحب، جب انسان سچا ہو اور اپنے ہی ملک میں ہو، تو ڈر کیسا؟ وہ اپنی ڈیوٹی کر رہے تھے اور میں اپنا کام۔"گاڑی کی رفتار اب ساٹھ ستر کلومیٹر فی گھنٹہ کے قریب تھی۔ بخار کی تپش نے اب میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، مگر ایک عجیب سی ذہنی آسودگی تھی جو مجھے تھکنے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ بیگ پر رکھا؛ وہ دستاویزات وہاں موجود تھیں۔ وہ راز جو میں سرحد کے اس پار سے لایا تھا، اب بہت جلد ان لوگوں تک پہنچنے والے تھے جو ان کی قدر جانتے تھے۔

خان صاحب، کوئٹہ پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟" میں نے پوچھاخان صاحب نے ٹرک کے سٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، "ذیشان صاحب! میں تو یہ مال دالبندین کے اڈے پر اتاروں گا، وہاں میرا گودام ہے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں، وہاں سے آپ کو کوئٹہ کے لیے کوئی 'فیلڈر' یا ٹیکسی مل جائے گی جو آپ کو تین چار گھنٹے میں شہر پہنچا دے گی۔""ٹھیک ہے

خان صاحب، دالبندین تک کا ساتھ ہی سہیپھر تھوڑی دیر بعد

دالبندین کے اڈے پر خان صاحب نے جب ٹرک روکا تو رات کا آخری پہر اپنی پوری خاموشی کے ساتھ طاری تھا۔ ہر طرف کوئلے کی بو اور ڈیزل کے دھوئیں کی ایک ملی جلی مہک فضا میں رچی ہوئی تھی۔ خان صاحب مجھے ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا فیلڈر کے پاس لے گئے، جس کا انجن اسٹارٹ تھا اور اس کی ہیڈلائٹس دھندلی سی روشنی پھیلا رہی تھیں۔ "اوئے لالا! ایک سواری ہے، کوئٹہ کے لیے کتنا لو گے؟" خان صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا جو گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے چائے کا آخری گھونٹ بھر رہا تھا۔ بارہ سو روپے (1300) کرایہ ہے، بس آخری ایک سیٹ بچی ہے، ابھی نکل رہے ہیں،" ڈرائیور نے اپنی چادر درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس فیلڈر میں پہلے ہی تین مسافر بیٹھے ہوئے تھے جو اپنی چادروں میں لپٹے اونگھ رہے تھے۔ میں اس گاڑی کا چوتھا اور آخری مسافر تھا

میں نے خاموشی سے جیب سے چودہ سو روپے نکالے اور سو روپے اوپر دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا، "یہ لو، بس مجھے جلدی پہنچا دو میں نے اپنی آواز کو جتنا ممکن ہو سکا، سپاٹ رکھا تاکہ ڈرائیور کو میری کمزوری کا اندازہ نہ ہو۔ خان صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر الوداع کہا اور میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک کونے میں جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی فیلڈر گاڑی دالبندین کی حدود سے نکل کر نیشنل ہائی وے پر چڑھی، اس کی رفتار نے میرے حواس بیدار کر دیے۔ ڈرائیور نے ٹیپ ریکارڈر پر کوئی مدھم سا بلوچی گانا لگا رکھا تھا۔ میرا سر بخار سے بھاری ضرور تھا، مگر میرا ہاتھ مسلسل اپنے بیگ کی پٹی پر جما ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اوپر کر لیے تاکہ ہوا کے تھپیڑے میرے چہرے کو نہ چھو سکیں اور میں نے اپنا بیگ گود میں رکھ کر اس پر بازو جما لیے۔

ڈرائیور مہیب اندھیرے میں بھی کمال مہارت سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے قصبے اور بستیاں سکوتِ شام میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہم 'نوکنڈی' کے ریگزاروں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اب 'پدگ' اور پھر 'احمد وال' کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے چٹیل میدان اور خشک پہاڑ چاند کی مدھم روشنی میں ہیبت ناک لگ رہے تھے، مگر میرے لیے یہ منظر نامہ اجنبی نہیں تھا۔ یہاں کی ہوا میں وہ اپنائیت تھی جو سرحد کے اس پار مفقود تھی۔ تقریباً تین گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ہم 'مستونگ' کی حدود میں داخل ہوئے۔ یہاں سے کوئٹہ کا فاصلہ اب سمٹ رہا تھا۔ فجر کا وقت ہونے کو تھا اور سردی کی لہر میں شدت آ گئی تھی۔ گاڑی اب 'لک پاس' (Lakpass) کی مشہور چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے کوئٹہ کی وادی کا نظارہ شروع ہوتا ہے۔ جب گاڑی چڑھائی کے آخری موڑ پر پہنچی تو نیچے وادی میں بکھری ہوئی کوئٹہ شہر کی روشنیاں کسی جڑے ہوئے ہار کی طرح چمک رہی تھیں۔ شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی ڈرائیور نے آہستہ سے پوچھا، "بھائی صاحب، کہاں اتاروں؟ سریاب روڈ یا بس اڈہ؟" میں نے اپنی جیکٹ کے اندر سے بیگ کو تھوڑا اور سنبھالا اور مضبوط آواز میں کہا، "مجھے براہِ راست سنڈیمن پروونشل ہسپتال کے ایمرجنسی گیٹ پر اتار دو۔ وہیں میرا کام ہے۔" ڈرائیور نے ایک نظر آئینے میں مجھ پر ڈالی، شاید وہ میری پیلی رنگت اور آنکھوں کی سرخی

دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ میں کسی ایمرجنسی ہی میں جا رہا ہوں۔ اس نے سریاب روڈ کی ٹریفک سے بچتے ہوئے گاڑی کو تیزی سے جناح روڈ کی طرف موڑا۔ شہر کی سڑکوں پر ابھی ٹریفک کی گھما گھمی شروع نہیں ہوئی تھی، بس کہیں کہیں سے فجر کی اذان کی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ جب گاڑی سنڈیمن پروونشل ہسپتال کے بڑے لوہے کے گیٹ کے سامنے پہنچی، تو ڈرائیور نے کمال مہارت سے بریک لگائے۔ "بھائی صاحب! یہ سامنے ایمرجنسی وارڈ ہے،" اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا، اپنا بیگ کندھے پر درست کیا اور گاڑی سے نیچے اترا۔ جیسے ہی میرے پاؤں زمین پر پڑے، ایک لمحے کے لیے چکر سا آیا، مگر میں نے بیگ کی پٹی کو سختی سے تھام کر خود کو سنبھالا۔ ہسپتال کی سفید عمارت صبح کی نیلی روشنی میں کسی خاموش محافظ کی طرح کھڑی تھی۔ میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا پھر ہسپتال کے مرکزی دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک چھوٹا سا کاؤنٹر تھا جہاں 'ایمرجنسی پرچی' لکھی ہوئی تختہ آویزاں تھا۔ وہاں ایک شخص پرانے رجسٹر پر اندراج کر رہا تھا۔ میں نے اپنی بوجھل طبیعت کو سنبھالا اور اپنی جیب سے بیس روپے نکال کر اس کے سامنے رکھے۔ "بخار بہت تیز ہے، جلدی پرچی بنا دیں،" میں نے مختصر کہا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ مجھ پر ڈالی، رجسٹر پر میرا نام 'ذیشان' اور عمر درج کی اور ایک چھوٹی سی نیلی پرچی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں وہ پرچی لیے اندر اس بڑے ہال میں داخل ہوا جہاں ڈاکٹرز اور نرسیں مستعدی سے کام کر رہے تھے۔

وہاں سفید ٹائلوں والا وہ بڑا سا ہال فینائل کی بو سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں موجود اسٹریچر اور لوگوں کی آہ و بکاہ نے میرے دل میں ایک عجیب سی گھبراہٹ پیدا کی، میں سیدھا سینیئر ڈیوٹی ڈاکٹر کی میز پر گیا اور اپنی پرچی ان کے سامنے رکھی۔ ڈاکٹر صاحب۔۔۔ بہت تیز بخار ہے۔۔۔ اور بدن ٹوٹ رہا ہے،" میں نے میز کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ میرا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ نوجوان ڈاکٹر نے فوراً اپنی کرسی چھوڑی اور میرے قریب آیا۔ "میاں! تمہیں تو کھڑا ہونا بھی مشکل لگ رہا ہے۔ نرس! جلدی ادھر آؤ۔" ایک نرس فوراً اسٹریچر لے کر آئی۔ انہوں نے مجھے بیڈ نمبر سات پر لٹایا۔ ڈاکٹر نے اسٹیتھوسکوپ سے میرا معائنہ کیا اور پھر تھرمامیٹر لگا کر بخار چیک کیا۔ "103.5 بخار ہے! بلڈ پریشر بھی کافی لو ہو رہا ہے،" ڈاکٹر نے پریشانی سے کہا۔ "نرس، فوراً ایک نارمل سیلائن کی ڈرپ (Drip) لگاؤ اور اس میں پیراسیٹامول اور اینٹی بائیوٹک کا انجکشن ڈال دو۔"

ہسپتال کے اس ماحول میں جہاں ہر طرف بیچارگی اور بیماری کا راج تھا، ڈاکٹر نے میری حالت دیکھ کر فوراً ایک پرچی پر چند مزید ادویات لکھیں اور نرس کو پکڑا دیں۔ نرس نے اپنی ٹرے تیار کی جس میں شیشے کی چھوٹی سی شیشیاں (Vials) اور سرنجیں چمک رہی تھیں

اس نے ڈرپ کے لیے نارمل سیلائن (Normal Saline) کی آدھے لیٹر کی بوتل اسٹینڈ پر لٹکائی۔ یہ وہ بنیادی مائع ہے جو جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک انجکشن بھرا، جو پیراسیٹامول (Paracetamol) کا تھا، تاکہ میرا 103 ڈگری کا ابلتا ہوا بخار نیچے آ سکے۔ ذرا بازو ڈھیلا چھوڑیں،" نرس نے دھیمی آواز میں کہا اور میری رگ میں سوئی داخل کر دی۔

اس ڈرپ کے اندر اس نے ایک اور طاقتور اینٹی بائیوٹک شامل کر دی، تاکہ اگر سفر کی گرد و غبار یا کسی انفیکشن نے میرے اندر گھر کیا ہے، تو اسے وہیں روکا جا سکے۔ جیسے ہی بخار کم کرنے والی دوا اور نمکیات کا وہ ممیزہ (Mixture) میرے خون کے گردشی نظام کا حصہ بنا، مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کی نسیں، جو ہتھوڑوں کی طرح بج رہی تھیں، اب پر سکون ہو رہی ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ قطرہ قطرہ مائع میری رگوں میں اترتا رہا۔ اس دوران بخار کی وہ تپش جو لاوے کی طرح ابل رہی تھی، اب پسینے کی صورت میں میرے ماتھے اور کمر سے بہہ رہی تھی۔ یہ ایک نشانی تھی کہ دوا اپنا کام کر رہی ہے۔

میرے جسم کا جوڑ جوڑ جو پہلے من من بھر کا ہو رہا تھا، اب آہستہ آہستہ ہلکا محسوس ہونے لگا۔جب ڈرپ ختم ہوئی تو نرس نے آکر کینولا نکالا اور وہاں روئی کا ایک پھایا رکھ دیا۔ "اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔میں نے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔بہتر محسوس کر رہا ہوں"بہت بہتر، شکریہ،" میں نے جواب دیا۔ اب میری نظریں صاف تھیں اور دماغ میں چھائی ہوئی دھند چھٹ چکی تھی۔"اب آپ کا بخار بہتر ہو گیا ہے، لیکن آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے،" اس نے مشورہ دیا۔شکریہ، مگر مجھے بہت ضروری کام سے نکلنا ہے،" میں نے مختصر جواب دیا

انہوں نے مجھے کسی بل یا پیسوں کے لیے نہیں کہا کیونکہ سرکاری ہسپتال کی ایمرجنسی میں یہ سہولت مفت تھی۔

میں وارڈ سے باہر نکلا تو ڈاکٹر وہی پرانی میز پر بیٹھے اگلے مریض کی رپورٹ دیکھ رہے تھے۔ میں نے رک کر ان کی طرف دیکھا، انہوں نے سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں آئی چمک دیکھ کر ایک ہلکی سی اطمینان بھری مسکراہٹ دی۔ "خیال رکھنا جوان، گرم چیزیں کھانا اور وقت پر دوائی لینا،" انہوں نے نصیحت کی۔ میں نے سر جھکا کر ان کا شکریہ ادا کیا اور ایمرجنسی کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔باہر اب سورج کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی اور کوئٹہ کے سرد لیکن روشن دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہسپتال کے گیٹ کے باہر رکشوں اور ٹیکسیوں کا شور، چائے کے ڈھابوں سے اٹھتا دھواں اور لوگوں کا ہجوم ایک الگ ہی دنیا کا احساس دلا رہا تھا۔ میں نے ہسپتال کی عمارت کی۔طرف ایک آخری نگاہ ڈالی؛ اس چھت تلے مجھے چند گھنٹوں کی وہ پناہ ملی تھی جس نے مجھے دوبارہ لڑنے کے قابل بنا دیا تھا۔اب مجھے ہجوم کا حصہ بن کر اپنی شناخت چھپانی تھی۔ میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ایک رکشہ والے کو ہاتھ دیا، جو شاید سواری کے انتظار میں انجن بند کیے بیٹھا تھا۔ "خالق آباد، سیٹلائٹ ٹاؤن چلو گے؟" میں نے پوچھا۔کیوں نہیں صاحب، بیٹھو،" اس نے پشتو لہجے میں جواب دیا اور کک ماری۔ رکشے کے انجن کی مخصوص آواز اور دھویں کے مرغولے نے ہسپتال کی اس بوجھل فضا کو میرے پیچھے دھکیل دیا۔رکشہ سریاب روڈ کی طرف مڑ چکا تھا۔ یہ وہی سڑک تھی جہاں سے میں کچھ دیر پہلے گاڑی میں گزر کر آیا تھا، مگر اب میرا رخ ایاز کے سیف ہاؤس کی طرف تھا۔ رکشہ والا کمال مہارت سے ٹریفک کے بیچ سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

تقریباً بیس پچیس منٹ کے اس شور شرابے والے سفر کے بعد، رکشہ سیٹلائٹ ٹاؤن کی پُر سکون گلیوں میں داخل ہوا۔

یہاں کا ماحول ہسپتال اور مین روڈ کے مقابلے میں بالکل مختلف تھا؛ کشادہ سڑکیں، دونوں طرف لگے درخت اور خاموشی۔

"صاحب، سیٹلائٹ ٹاؤن آ گیا، آگے کدھر جانا ہے؟" رکشہ والے نے آئینے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے رکشہ والے کو ایک سامنے بند گلی کے موڑ پر رکنے کا کہا۔ موڑ پر پہنچے تو
میں نے کرایہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہیں اتار دو بھائی،" میں رکشے سے اترا اور چند لمحے وہیں کھڑے ہو کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ گلی سنسان تھی، صرف ایک کتا دور کہیں بھونک رہا تھا۔ میں نے اپنا بیگ کندھے پر درست کیا اور اس مخصوص مکان نمبر کی طرف بڑھا جس کا دروازہ میرے لیے ایک نئی زندگی کا راستہ کھولنے والا تھا۔ سیٹلائٹ ٹاؤن انے کا مقصد کوئی دوستی یا رشتہ داری نہیں تھی، بلکہ وہاں ایک ایاز نامی شخص کا "سیف ہاؤس" موجود تھا جس کا پتہ مشہد سے نکلتے وقت مجھے ایک خفیہ پیغام میں دیا گیا تھا۔ یہاں سے مجھے وہ "آپریشنل کٹ" وصول کرنی تھی جو میرے مشن کے اگلے اور سب سے اہم مرحلے کے لیے ضروری تھی۔ اس کٹ میں ایک نیا موبائل فون اور وہ مخصوص دستاویزات تھیں جن کی مدد سے میں نے لاہور پہنچ کر اپنے اگلے ہدف سے رابطہ کرنا تھا۔ یہ فون کسی عام رابطے کے لیے نہیں بلکہ ایک ایسی محفوظ لائن تھی جس کا نمبر صرف ان لوگوں کے پاس تھا جو وزیر آباد سے شروع ہونے والے اس کھیل کے ماسٹر مائنڈ تھے۔ مجھے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ جب تک میں پنجاب کی حدود میں داخل نہ ہو جاؤں، اس فون کو آن نہیں کرنا۔
میرا دل ایک انجانے جوش اور احتیاط کے ملے جلے جذبات سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے بیگ کی پٹیوں کو کندھے پر درست کیا، چاروں طرف ایک آخری نگاہ ڈالی اور پھر اس پراسرار دروازے پر پہنچ گیا۔ میرا ہاتھ جیسے ہی دستک دینے کے لیے اٹھا، مجھے محسوس ہوا کہ یہ صرف ایک دروازہ نہیں ہے، بلکہ یہ میری پرانی تھکن اور نئی منزل کے درمیان ایک پل ہے۔ میں نے مخصوص ترتیب سے دستک دی اور سانس روک کر اندر سے آنے والی کسی بھی حرکت کا انتظار کرنے لگا۔
چند لمحوں بعد دروازہ ایک جھرجھری کے ساتھ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص سامنے نمودار ہوا۔ اس کی نظریں سیدھی میری آنکھوں میں تھیں، جیسے وہ میرے چہرے کے خدوخال میں کوئی پرانی نشانی تلاش کر رہا ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس میری تصویر اور حلیہ پہلے ہی ڈیجیٹل ذریعے سے پہنچ چکا تھا، اس لیے اس کی آنکھوں میں اجنبیت کے بجائے ایک گہری پہچان تھی اس نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا، 'ذیشان؟'
میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا
ہجرت کرنے والے پرندے لوٹ آئے ہیں جواب سنتے ہی اس کے چہرے کے تناؤ میں کمی آئی اور اس نے کوڈ ورڈ کا اگلا حصہ مکمل کیا، 'جس نے اب اپنے گھونسلوں کی پہرے داری کرنی ہے۔" یہ جملہ ادا ہوتے ہی فضا میں موجود وہ انجانی سی کھنچاؤ اور شک کی گنجائش ختم ہوگئی۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے راستہ دیا اور پھر
تیزی سے قدم بڑھا کر دروازے کی مضبوط کنڈی چڑھائی اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک گہرا سانس لے کر وہاں موجود صوفے پر بیٹھ گیا، تھکن اب میرے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ اس نے میرے حلیے اور چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا، 'تم کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ اوپر والے کمرے کے ساتھ ہی غسل خانہ ہے، وہاں جا کر تازہ دم ہو جاؤ۔ جب تک تم نیچے آؤ گے، ناشتہ اور تمہاری 'امانت' تیار ہو گی میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ گرم پانی کے غسل نے میرے جسم کی ساری اکڑن ختم کر دی تھی۔ جب میں نیچے آیا تو میز پر سادہ لیکن بھرپور ناشتہ لگا ہوا تھا انڈے، پراٹھے اور چائے کی

بھاپ اڑتی پیالیاں میرے اندر کی بھوک کو بیدار کر رہی تھیں۔ ہم دونوں میز پر بیٹھ گئے اور خاموشی سے ناشتہ شروع کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایاز کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا، "اور میری 'امانت'؟" ایاز نے اطمینان سے چائے کا گھونٹ بھرا اور سر ہلا کر کہا، "فکر نہ کرو، تمہاری امانت بالکل تیار اور محفوظ ہے۔" میں نے ناشتے سے ہاتھ روکا اور سنجیدگی سے کہا، "ٹھیک ہے، تو پھر میں اب نکلنے کی تیاری کرتا ہوں، سفر طویل ہے۔" میری بات سن کر ایاز کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی، جو شاید میری جلد بازی پر تھی۔ اس نے رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا، "نہیں۔۔۔ تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، "آپ بھی ساتھ جائیں گے؟" "ہاں،" اس نے کرسی پیچھے کی اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولا، "تمہیں معلوم ہے کہ کوئٹہ سے نکلتے ہی جگہ جگہ چیک پوسٹیں اور کڑی نگرانی ہے۔ اگر تم اکیلے کسی پبلک ٹرانسپورٹ یا ٹیکسی میں گئے تو نہ صرف تمہاری تھکن تمہیں نڈھال کر دے گی بلکہ بار بار کی تلاشی تمہارے لیے بڑی پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔ ہم میری گاڑی میں روہڑی تک جائیں گے۔ وہاں سے پنجاب اور پھر لاہور کے لیے نکلنا تمہارے لیے بہت آسان اور محفوظ ہوگا۔ میرے ساتھ تم جلدی بھی پہنچ جاؤ گے اور کسی قسم کے خطرے کا اندیشہ بھی کم ہوگا۔" اس کی دلیل میں وزن تھا، میں نے سر ہلا کر حامی بھر لی، "ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ نہیں، جیسے تم بہتر سمجھو۔" ناشتہ ختم کرنے کے بعد ایاز اٹھا اور ایک الماری کے خفیہ خانے سے وہ مخصوص پیکٹ نکال لایا۔ اس نے وہ کٹ میرے حوالے کی۔ میں نے اسے کھول کر ایک ایک چیز کا بغور معائنہ کیا۔ نیا موبائل فون، وہ حساس دستاویزات اور ضرورت کی دیگر اشیاء—سب کچھ مکمل تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور بیگ کو مضبوطی سے اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔ ہم گھر کے پچھلے حصے میں موجود چھوٹے سے گیراج کی طرف بڑھے۔ وہاں ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی جو اپنی مضبوطی اور عام سی دکھنے والی وضع قطع کی وجہ سے ایسے مشنوں کے لیے بہترین تھی کیونکہ یہ سڑک پر موجود سینکڑوں گاڑیوں میں گھل مل جاتی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے نو بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ ایاز نے گیراج کا بھاری لوہے کا گیٹ کھولا، جس کی چرچراہٹ خاموش گلی میں گونجی۔ ہم گاڑی میں بیٹھے، اس نے چابی گھمائی تو انجن ایک دبی ہوئی آواز کے ساتھ جاگ اٹھا۔ ایاز نے مہارت سے گاڑی ریورس کی، میں نے کھڑکی سے اس سیف ہاؤس کو آخری بار دیکھا جس نے مجھے تھوڑی دیر کی پناہ دی تھی، اور پھر ایاز نے اتر کر گیٹ بند کیا اور دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ باہر شدید سردی تھی، کوئٹہ کی وہ مشہور یخ بستہ ہوا جو ہڈیوں تک میں اتر جاتی ہے۔ ایاز نے گاڑی کا ہیٹر آن کر دیا تھا، جس کی دھیمی سی گرمائش اب بند شیشوں کے اندر ایک سکون کا احساس دلا رہی تھی ہمارا سفر اب باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ ہم سیٹلائٹ ٹاؤن کی پرسکون گلیوں سے نکل کر سریاب روڈ پر آ گئے، جہاں ٹریفک کا اژدھام تھا۔ ایاز بہت نپے تلے انداز میں گاڑی چلا رہا تھا، نہ بہت تیز کہ شک ہو اور نہ ہی بہت آہستہ۔ کوئٹہ شہر کے شور و غل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم لکھ پاس (Lak Pass) کی طرف بڑھنے لگے۔ لکھ پاس وہ مقام تھا جہاں سے راستہ قلات اور سبی کی سمت میں تقسیم ہو جاتا ہے

باہر کہیں کہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی ہلکی ہلکی برف دھوپ میں چمک رہی تھی، لیکن اس دھوپ میں تپش بالکل نہیں

تھی۔ جیسے جیسے ہم کولپور اور پھر مچھ کے دشوار گزار راستوں سے گزر رہے تھے، سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے بنجر اور ہیبت ناک پہاڑ ہماری خاموشی کے گواہ تھے۔ایاز نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور جیکٹ کی زپ ٹھیک کرتے ہوئے بولا، ''سردی ابھی اور بڑھے گی جب ہم ان پہاڑوں کے بیچ سے گزریں گے۔ اپنا بیگ اور وہ کٹ ذرا سنبھال کر رکھو، آگے تلاشی کا عمل سخت ہو سکتا ہے۔

''میں نے سر ہلایا اور کھڑکی کے شیشے پر جمی ہلکی سی دھند کو صاف کر کے باہر دیکھنے لگا۔راستے میں کہیں کہیں کوئلے سے لدے ہوئے بڑے بڑے ٹرک گزرتے، جن کے پیچھے لکھے ہوئے اشعار اور رنگ برنگے نقش و نگار اس کٹھن سفر میں ایک الگ ہی رنگ بھر رہے تھے۔گاڑی درہ بولان کی سنگلاخ گھاٹیوں سے گزر رہی تھی جہاں موبائل سگنل بار بار غائب ہو رہے تھے، اس لیے ایاز نے ریڈیو آن کر دیا۔ بی بی سی اردو کی لہریں تھرتھراہٹ کے ساتھ گونجیں: 'مشرقِ وسطیٰ میں تناؤ شدت اختیار کر گیا ہے۔ امریکہ نے ایران کو ڈیڈ لائن دے دی ہے کہ اگر مذاکرات کامیاب نہ ہوئے تو فوجی کارروائی کا آپشن کھلا ہے۔ تہران نے بھی کسی بھی مہم جوئی کا منہ توڑ جواب دینے کی دھمکی دی ہے...'ایاز نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کی اور بولا، 'ذیشان، ہر طرف حملوں کی افواہیں گرم ہیں اور ان دھمکیوں نے ہماری ایجنسیوں کو بھی الرٹ کر دیا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر وہاں کچھ ہوا تو اس کا براہِ راست اثر ہماری ان سرحدوں پر پڑے گا، اسی لیے کوئٹہ سے نکلتے ہی قدم قدم پر سختی نظر آرہی ہے۔'میں نے اس کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا، 'میں جانتا ہوں ایاز۔ اسی لیے تو مشہد سے کوئٹہ تک کا ایک ایک قدم میں نے کانٹوں پر رکھا ہے۔ لیکن یہ بتاؤ، کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ دھمکیاں واقعی حقیقت کا روپ لیں گی؟'ایاز نے گاڑی کی رفتار تھوڑی کم کی اور تلخی سے مسکرایا۔ 'سیاست میں دھمکیاں صرف ڈرانے کے لیے نہیں، بلکہ میدان تیار کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اسرائیل کی ضد اور ایران کی انا کے بیچ پورا خطہ پس جائے گا۔'''میں نے ایاز کی بات پر ایک لمحہ غور کیا اور پھر کھڑکی سے باہر ان خشک پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، ''اگر پورا خطہ اس آگ کی لپیٹ میں آنے والا ہے، تو کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ہم ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں؟ کیا یہ چند کاغذات جو اپنے مجھے دیےاُس آنے والے طوفان کو روک سکیں گے؟''ایاز نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کی اور میری طرف دیکھے بغیر بولا: ''جنگیں صرف میدان میں نہیں، معلومات کے بل بوتے پر جیتی جاتی ہیں ذیشان۔ تمہارے بیگ میں موجود یہ کٹ اس شطرنج کی بساط کا وہ مہرہ ہے جو وقت آنے پر شہ مات دے سکتا ہے۔

میں نے تھوڑا سنجیدگی سے کہاایاز، تمہیں پتہ ہے کہ میں اکیلے سفر کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار ان راستوں سے گزر چکا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ تلاشی کے دوران کیسے نکلنا ہے۔ آخر میں بھی تو اپنے ملک کے دفاع کے لیے ہی کام کر رہا ہوں، میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لیکن اب جبکہ ہر طرف جنگ کی دستک ہے اور سیکیورٹی اتنی سخت ہو چکی ہے، تو کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ ہم ان پہاڑوں کو پار کر پائیں گے؟ کیا تلاشی کے دوران یہ 'امانت' اب چھپائی جا سکے گی؟''ایاز نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیامجھے پتہ تھا تم یہی کہو گے۔ تمہاری

تربیت اور اکیلے نکل جانے کی مہارت پر مجھے شک نہیں، لیکن یہ عام حالات نہیں ہیں ذیشان ایک طرف سیکیورٹی فورسز کی کڑی نگرانی ہے تو دوسری طرف دیگر شدت پسند تنظیموں کی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ تمہارا تعلق پنجاب سے ہے، اور ان سنگلاخ پہاڑوں میں تمہارا لہجہ اور حلیہ کسی بھی وقت تمہیں دشمن کی نظروں میں لا سکتا ہے۔ ان دہشت گردوں کے لیے تم ایک آسان ہدف ثابت ہو سکتے ہو۔"اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بات جاری رکھی: دوسری اور سب سے اہم بات وقت کی ہے۔ اگر تم اپنے روایتی طریقے سے اکیلے نکلتے تو تمہیں اپنی شناخت چھپاتے اور تلاشیوں سے بچتے بچتے روہڑی پہنچنے میں کئی دن لگ سکتے تھے۔ ہمارے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے، یہ معلومات ہر صورت جلد سے جلد لاہور پہنچنی ہیں

"اسی لیے میرا تمہارے ساتھ روہڑی تک ہونا ضروری ہے۔ میں یہاں کا مقامی ہوں، میرا حلیہ اور بلوچ لہجہ ہمیں ان علاقوں میں ایک ڈھال فراہم کرے گا جہاں تم شاید اجنبی محسوس کیے جاتے۔ میرے پاس وہ سرکاری کلیئرنس اور کارڈ بھی ہے جو ہمیں ایف سی کی چیک پوسٹوں سے باآسانی نکال لے جائے گا جہاں عام مسافروں کا سامان ادھیڑ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ میں تمہیں اس 'ایکسپریس وے' پر رکھوں گا جہاں سے تم وقت ضائع کیے بغیر اپنی منزل تک پہنچ سکو۔"میں نے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ نہ صرف سیکیورٹی فورسز بلکہ وقت کی اس سنگین قلت مقامی خطرات اور دشمن تنظیموں کے طریقہ واردات کو بھی مجھ سے کہیں زیادہ بہتر سمجھ رہا ہے ہماری گفتگو جاری تھی کہ گاڑی درہ بولان کی آخری حدود کو پار کر کے ڈھاڈر کے میدانی علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں پہاڑوں کا ہیبت ناک سایہ پیچھے رہ گیا تھا اور فضا میں وہ یخ بستہ خنکی بھی اب کم ہو رہی تھی جو کوئٹہ سے ہمارے ساتھ آئی تھی۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے جب ہم سبی شہر کے بائی پاس سے گزرے۔ سبی اپنی تپش کی وجہ سے مشہور ہے، اور ان سردیوں کے دنوں میں بھی یہاں کی دوپہر کی دھوپ میں ایک تیزی محسوس ہو رہی تھی۔ ایاز نے گاڑی کی رفتار برقرار رکھی۔ سبی سے نکلتے ہی سڑک سیدھی اور کشادہ ہو گئی، جسے این-65 (N-65) ہائی وے کہا جاتا ہے۔

اب ہم بلوچستان کے ضلع کچھی کے وسیع و عریض میدانوں سے گزر رہے تھے۔"اب ہم سندھ کی سرحد کے قریب پہنچ رہے ہیں،" ایاز نے سامنے پھیلی طویل سڑک پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔راستے میں چھوٹے چھوٹے قصبے بختیار آباد اور ڈیرہ مراد جمالی آئے۔ سڑک کے دونوں طرف اب بنجر پہاڑوں کی جگہ سرسبز کھیتوں اور نہروں نے لے لی تھی، جو اس بات کی علامت تھی کہ ہم اب سندھ کے زرخیز علاقوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ ایاز نے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر پڑے اپنے سرکاری کارڈ کو ایک بار پھر درست کیا کیونکہ اب ڈیرہ اللہ یار کی وہ بڑی چیک پوسٹ آنے والی تھی جو بلوچستان اور سندھ کو ملاتی ہے۔دوپہر کے پونے تین بجے ہم نے سندھ کی حدود میں قدم رکھا۔ جیسے ہی ہم جیکب آباد کے قریب پہنچے، ٹریفک کا دباؤ بڑھ گیا۔ رکشوں، موٹر سائیکلوں اور گنے سے لدی ٹرالیوں نے ہماری رفتار تھوڑی کم کر دی، لیکن ایاز بڑی مہارت سے راستہ بناتا رہا۔شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے جب دور سے سکھر بیراج کی عظیم الشان عمارت اور اس کے ساتھ ہی روہڑی کی پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ سورج اب ڈھلنے کے قریب تھا اور اس کی سنہری روشنی دریائے سندھ

کے پانیوں پر رقص کر رہی تھی۔ ایاز نے گاڑی روہڑی کے بس اڈے کی طرف موڑ دی اور پھر گاڑی اڈے کے ایک نسبتاً پرسکون کونے میں روکی اور انجن بند کر دیا۔اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مڑ کر اطمینان سے بولا: "لو بھائی ذیشان، ہم وقت پر پہنچ گئے۔ تمہاری لاہور والی بس ٹھیک ساڑھے پانچ بجے یہاں سے روانہ ہو گی۔ میں نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا، "ٹھیک ہے، تو پھر میں جا کر ٹکٹ وغیرہ خرید لیتا ہوں اور کچھ کھانے کا بندوبست کرتا ہوں، بھوک بھی کافی لگی ہے۔"

ایاز نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ روکا اور نفی میں سر ہلایا۔ "ٹکٹ کی فکر تم بالکل چھوڑ دو، وہ میں نے پہلے ہی فون کر کے بک کروالی ہے۔ تمہاری سیٹ نمبر سات کنفرم ہے۔ بس کا عملہ میرا واقف ہے، تمہیں بس کے اندر ہی ٹکٹ مل جائے گا۔ اب رہ گئی بات کھانے کی، تو آؤ پہلے کسی اچھے ڈھابے پر بیٹھ کر سکون سے کھانا کھاتے ہیں، تمہیں آگے ایک طویل سفر طے کرنا ہے۔" ایاز کی اس منصوبہ بندی نے میرے سفر کو بہت آسان بنا دیا تھا۔ ہم گاڑی سے اتر کر اڈے کے قریب ہی ایک پرہجوم لیکن صاف ستھرے ڈھابے پر بیٹھ گئے۔ہم نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور چائے کی پیالیوں کے ساتھ وقت گزارا، تاکہ ہجوم میں نمایاں نہ ہوں۔جب گھڑی نے سوا پانچ بجائے، تو ایاز نے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ "چلو ذیشان، گاڑی اب اپنی مقررہ جگہ پر لگ چکی ہو گی۔"

ہم دونوں کرسیوں سے اٹھے اور ہجوم کو چیرتے ہوئے بسوں کی قطاروں کی طرف بڑھنے لگے۔ اڈے پر شور، دھول اور مسافروں کی بھاگ دوڑ کا ایک عجیب سماں تھا۔ ایاز نے ایک مخصوص بس کی طرف اشارہ کیا جس کے سامنے 'لاہور' کا بورڈ چمک رہا تھا۔ہم بس کے قریب پہنچے تو ایاز نے رک کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی نظروں میں ایک ان کہی دعا اور الوداعی پیغام تھا۔ "اپنا خیال رکھنا جوان۔ یہاں سے آگے کا راستہ تمہیں خود طے کرنا ہے،" اس نے دبی آواز میں کہا اور پھر ایک گرمجوشی سے الوداعی مصافحہ کر کے اپنی سفید کرولا کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اسے بھیڑ میں اوجھل ہوتے دیکھا اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بس کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔میں نے ڈرائیور کی سیٹ کے پاس کھڑے ایک شخص سے رابطہ کیا، جو شاید کنڈکٹر یا بکنگ انچارج تھا۔ "بھائی، میرا نام ذیشان

سات نمبر سیٹ بک ہے؟" میں نے مختصر کہا۔اس نے اپنے پاس موجود لسٹ پر ایک نظر ڈالی، پھر میری طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "جی بھائی فون آ گیا تھا۔ آپ کی سیٹ نمبر سات کنفرم ہے۔ آپ اندر جا کر بیٹھ جایئے، گاڑی بس نکلنے ہی والی ہے میں نے اپنا بیگ مضبوطی سے تھاما اور بس کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ اندر کی فضا میں پرانے قالینوں اور ڈیزل کی ایک ملی جلی بو رچی ہوئی تھی۔ میں نے ڈرائیور کے پیچھے والی دوسری قطار میں اپنی سیٹ نمبر سات تلاش کی اور کھڑکی والی جگہ پر بیٹھ گیا۔بس کے اندر مسافروں کا شور تھا، کوئی سامان رکھ رہا تھا تو کوئی اپنے پیاروں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ بس کے بھاری انجن کی تھرتھراہٹ میرے جسم میں ایک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے سرکی، اڈے کی ناہموار زمین پر جھٹکے کھاتی ہوئی وہ مین گیٹ کی طرف بڑھی اور پھر ایک لمبے ہارن کے ساتھ روہڑی کے پرشور اڈے کو پیچھے چھوڑ کر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی نیشنل ہائی وے پر گامزن

ہو گئی۔ جیسے ہی بس نے رفتار پکڑی، میں نے کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا دیا اور باہر تیزی سے پیچھے چھٹتے ہوئے درختوں اور بجلی کے کھمبوں کو دیکھنے لگا۔ میرا ذہن اب یادوں کی اس لمبی پگڈنڈی پر دوڑ رہا تھا جو وزیر آباد سے شروع ہوئی تھی۔ لاہور سے کوئٹہ، پھر نوشکی، آواران اور تفتان کے سنگلاخ راستوں سے ہوتے ہوئے ایران کی سرحد پار کرنا—زہدان، اصفہان، تہران اور پھر مشہد کی وہ خفیہ ملاقاتیں۔ میرا اصل مشن تو سرحد پار کی معلومات اکٹھی کرنا تھا، لیکن حالات کی اچانک تبدیلی نے مجھے ایک 'قاصد' کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔ جب میں مشہد سے نکل رہا تھا تو مجھے ایک خفیہ پیغام موصول ہوا تھا۔ اس میں کوئی لمبی چوڑی تفصیل نہیں تھی، بس ایک مختصر ہدایت تھی: "واپسی پر کوئٹہ سے ایک 'آپریشنل کٹ' وصول کرو اور اسے بحفاظت لاہور پہنچاؤ۔

ایاز یا اس کے نیٹ ورک کا کوئی دوسرا بندہ بھی تو یہ کام کر سکتا تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ لوگ خود ایک مخصوص 'زون' کے اندر مقید تھے۔ ایاز جیسے تربیت یافتہ مہرے سرکاری فائلوں اور ڈیجیٹل ریڈار پر اس طرح نقش ہو چکے تھے کہ ان کی ذرا سی غیر معمولی حرکت بھی خطرے کی گھنٹی بجا سکتی تھی۔ انٹیلی جنس اداروں کے اندر بھی اپنی ایک الگ سیاست ہوتی ہے؛ وہاں صرف بیرونی دشمن سے نہیں، بلکہ اپنے ہی نظام کے اندر موجود ان 'کالی بھیڑوں' سے بھی بچنا پڑتا ہے جو مخالف گروپوں کے لیے کام کر رہی ہوتی ہیں۔ 'ماسٹر مائنڈز' کو مجھ پر حد درجہ بھروسہ تھا، انہیں معلوم تھا کہ میں نہ صرف معلومات نکالنا جانتا ہوں بلکہ انہیں سینے سے لگا کر دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر منزل تک پہنچانے کا فن بھی جانتا ہوں۔

ایاز کا گروہ جانتا تھا کہ اگر وہ خود اس کٹ کو لے کر پنجاب کی حدود میں داخل ہوئے، تو ان کے اپنے ہی ادارے کے حریف گروپ یا 'اندرونی مخبر' انہیں مشکوک بنا کر پورا آپریشن سبوتاژ کر سکتے تھے۔ اسی لیے انہیں ایک ایسے 'آزاد مہرے' کی ضرورت تھی جو ان کے باقاعدہ تنظیمی ڈھانچے سے باہر ہو، جس کا کوئی ریکارڈ ان فائلوں میں نہ ہو جہاں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کی جاسوسی کر رہا ہوتا ہے۔

ان لوگوں نے مجھ پر بھروسہ کیوں کیا؟ اس کی وجہ کوئی پرانی دوستی نہیں، بلکہ وہ 'پروفائل' تھی جو میں نے ایران کے سفر کے دوران بنائی تھی۔ میرا ان کے ساتھ لنک اس وقت بنا جب انہیں احساس ہوا کہ جس راستے سے میں واپس جا رہا ہوں، وہ اس وقت سب سے محفوظ ترین راستہ ہے اور میری 'شناخت' ایسی ہے کہ کوئی ایجنسی مجھے اس 'کٹ' کے ساتھ جوڑ نہیں پائے گی۔ انہوں نے مجھ پر یہ جوا کھیلا تھا کہ ایک آزاد ایجنٹ (Free Agent) سرکاری مہروں سے زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے۔

اب میرا کام صرف اتنا تھا کہ میں کسی بھی طرح بحفاظت لاہور پہنچوں، وہاں انکے رابطے کے بندے سے ملوں اور وہ مخصوص خفیہ کوڈ ادا کر کے یہ امانت اس کے حوالے کر دوں۔ اس آپریشنل کٹ کے ساتھ ساتھ میرے پاس وہ خاص معلومات (Intel) بھی تھی جو میں مشہد اور تہران کی گلیوں سے اپنی جان پر کھیل کر سمیٹ لایا تھا۔ یہ معلومات اور یہ کٹ، دونوں مل کر ہی اس بڑے کھیل کا رخ بدل سکتی تھیں۔ میرا اس عارضی مشن میں کردار صرف ایک پُل کا تھا؛ جیسے

ہی میں یہ امانتیں صحیح ہاتھوں میں پہنچاتا اور وہ مخصوص کوڈ ورڈز کا تبادلہ مکمل ہوتا، میری یہ اضافی ذمہ داری ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد میں دوبارہ آزاد تھا کہ اپنے اس اصل مشن کی طرف لوٹ جاؤں جس کے لیے میں نے وزیر آباد سے ایران تک کا سفر کیا تھا۔بس اب پنجاب کی ہموار سڑکوں پر رات کی تاریکی کو چیرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ کھڑکی کے باہر گھپ اندھیرا تھا، لیکن بس کے اندر کی مدھم روشنیاں اور مسافروں کے خراٹوں کی آوازیں ایک عجیب سی بے چینی پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں، مگر نیند کوسوں دور تھی۔ رات کے مختلف پہروں میں بس صادق آباد، رحیم یار خان اور پھر بہاولپور کے بائی پاسوں سے گزرتی رہی۔ جیسے جیسے ہم پنجاب کے دل کی طرف بڑھ رہے تھے، سڑک کے کنارے لگی دھند سرد ہواؤں کے ساتھ مل کر شیشوں پر جمنے لگی تھی۔ ساہیوال اور اوکاڑہ گزرنے کے بعد اب فجر کا وقت قریب تھا۔ رات بھر کا سفر اور وہ بھاری ذمہ داری جو میرے بیگ میں چھپی تھی، مجھے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہونے دے رہی تھی۔ صبح کے ٹھیک چھ بجے تھے جب دور سے لاہور کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ بس اب ٹھوکر نیاز بیگ کے بڑے فلائی اوور کی طرف مڑ رہی تھی۔ باہر پو پھٹ رہی تھی اور لاہور کی مخصوص صبح کی خنکی بس کے دروازے کھلتے ہی اندر داخل ہوئی جیسے ہی ڈرائیور نے بریک لگائی اور بس ٹھوکر کے اڈے پر رکی، میرے اندر ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہوا۔میں نے اپنا بیگ مضبوطی سے تھاما، جیکٹ کی زپ اوپر تک بند کی اور سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ ٹھوکر نیاز بیگ کا وہ روایتی ہجوم، رکشہ والوں کی آوازیں اور مسافروں کی بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی میں نے ایک گہرا سانس لیا، اپنےارد گرد کے ماحول کا تیزی سے جائزہ لیا اور ہجوم کا حصہ بن گیا۔

اب مجھے اس مخصوص پتے کی طرف بڑھنا تھا جہاں وہ کوڈ ورڈ میرا منتظر تھا، جس کے بعد یہ 'امانت' میری ذمہ داری نہیں رہنی تھی۔میں نے زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھا اور سڑک کنارے کھڑے ایک رکشے کو اشارہ کیا"علی ٹاؤن چلو گے؟" میں نے پوچھا۔ رکشے والے نے اثبات میں سر ہلایا اور میں پیچھے بیٹھ گیا۔ رائے ونڈ روڈ کی مخصوص ٹریفک اور دھول میں سے راستہ بناتے ہوئے رکشہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے ہی اورنج لائن کا آخری اسٹیشن قریب آیا، میں نے رکشہ رکوا لیا۔ یہاں سے اب مجھے اپنی منزل کی طرف پیدل نکلنا تھا تاکہ کسی قسم کے تعاقب کا خدشہ نہ رہے۔میں بڑی شاہراہ کو چھوڑ کر اندرونی آبادی کی گلیوں میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک گنجان بسا ہوا علاقہ تھا جہاں ہر گلی دوسری گلی میں کھلتی تھی۔ میں نے ایک جگہ رک کر جیب سے موبائل نکالا اور اس مخصوص مقام کا نقشہ ایک آخری بار دیکھ کر ذہن میں تازہ کیا جس کی تصویر کوئٹہ میں مجھے ایاز نے دکھائی تھی۔دو تین گلیاں عبور کرنے کے بعد، سامنے وہی نیلا سا بورڈ نظر آیا جس کی تلاش تھی۔ ایک پرانا فوٹو اسٹوڈیو، جس کے شیشوں پر لگی تصویریں وقت کے ساتھ دھندلا چکی تھیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دکان کے اندر قدم رکھا۔ اندر کی فضا میں کیمیکلز اور پرانے کاغذوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص، جس کی عمر تقریباً 40 سال کے لگ بھگ تھی، کسی پرانی تصویر کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھا۔اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کی نظروں میں ایک پیشہ ورانہ سختی اور چوکنا پن تھا۔

میں نے کاؤنٹر کے قریب جا کر دبی آواز میں وہ مخصوص کوڈ ادا کیا: "بھائی، مجھے ایک 'پاسپورٹ سائز' تصویر چاہیے،

ہجرت کے لیے۔" وہ شخص ایک لمحے کے لیے رکا، اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر جواب میں کوڈ کا دوسرا حصہ مکمل کیا: "تصویر تو تیار ہے، بس اس پر آخری مہر لگنا باقی ہے۔" اعتبار کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا، "میں ذیشان ہوں۔" اس نے جواب میں اپنا نام حسن بتایا۔ ہم دونوں کے درمیان اب مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تیزی سے اپنے بیگ کی خفیہ زپ کھولی اور وہ آپریشنل کٹ نکال کر کاؤنٹر کے نیچے اس کے حوالے کر دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے کچھ حساس معلومات (Intel) بھی زبانی بتائیں۔

حسن نے وہ امانت سنبھالی اور میری بتائی ہوئی تفصیلات کو بڑی توجہ سے سنا۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری سمجھ بوجھ تھی۔ اس نے دبی آواز میں کہا، "یہ معلومات اور یہ کٹ اب میری ذمہ داری ہیں۔ یہ آج رات ہی 'ہیڈ کوارٹر' کے محفوظ چینل کے ذریعے آگے منتقل کر دی جائیں گی۔ تم یہاں ایک لمحہ بھی نہ رکو، باہر نکل کر ہجوم میں غائب ہو جاؤ۔" میں نے ایک بڑا بوجھ اترنے کا احساس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ میرا یہ عارضی مشن، جو مشہد میں اچانک مجھے سونپا گیا تھا، اب کامیابی سے حسن کے سپرد ہو چکا تھا۔ اب میرے کندھوں پر لدی اضافی ذمہ داری ختم ہو چکی تھی اور میں دوبارہ اپنے اس اصل مقصد کی طرف لوٹ سکتا تھا جس کے لیے میں نے وزیر آباد سے تہران تک کا کٹھن سفر کیا تھا۔ میں اسٹوڈیو کے اندھیرے سے نکل کر دوبارہ لاہور کی تیز روشنی اور ہجوم کا حصہ بن گیا۔ اب میری منزل وہ مقام تھا جہاں میرا اپنا 'ماسٹر مائنڈ' میرا منتظر تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس پہنچنے سے پہلے مجھے اپنی تمام یادوں اور اثرات کو صاف کرنا ہوگا تاکہ میرا اصل مشن کسی بھی موڑ پر متاثر نہ ہو۔ میں نے ایک پرسکون کونے میں کھڑے ہو کر اپنا فون نکالا اور وہ مخصوص نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے آواز مدھم لیکن جانی پہچانی تھی۔ میں نے مختصر اطلاع دی کہ 'امانت' پہنچا دی گئی ہے۔ اس نے کسی جذبات کے بغیر جواب دیا: بہت خوب! اب اگلا مرحلہ اہم ہے۔ آج رات 8 بجے ڈی ایچ اے فیز 4 کے ایک سیف ہاؤس میں ملاقات ہوگی۔ تم ابھی تھکے ہوئے ہو گے، جا کر آرام کرو۔ رات آٹھ بجے کے قریب ٹھوکر کے مین چوک پر پہنچ جانا، وہاں سے تمہیں ریسیو کر لیا جائے گا۔ فون بند ہوا تو مجھے اپنی ہڈیوں میں اترتی تھکن کا احساس ہوا۔ کوئٹہ سے روہڑی اور پھر لاہور تک کے مسلسل سفر نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے علی ٹاؤن سے ایک رکشہ لیا اور واپس ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف آگیا، کیونکہ وہاں رکنے اور چھپنے کے لیے ہوٹلوں کے زیادہ بہتر آپشنز موجود تھے۔ میں نے ایک مناسب سے ہوٹل میں کمرہ لیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ مقفل کیا اور جوتے اتارتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے شام چھ بجے کا الارم لگایا اور ذہن کو تمام سوچوں سے آزاد کر کے گہری نیند کی وادی میں اتر گیا۔ ٹھیک چھ بجے الارم کی آواز نے مجھے بیدار کیا۔ میں نے غسل کیا، تازہ دم ہوا اور مغرب کی نماز پڑھی۔ اب جسم میں کچھ توانائی محسوس ہو رہی تھی، لیکن پیٹ کا خالی پن یاد دلا رہا تھا کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میں اپنا بیگ سنبھال کر نیچے ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں آگیا تاکہ روانگی سے پہلے کچھ کھا سکوں۔ وہاں لوگوں کا خاصا رش تھا اور فضا میں تلے ہوئے کھانوں اور مصالحوں کی ملی جلی بو رچی ہوئی تھی۔ میں نے کونے کی ایک میز سنبھالی جہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک تھکا ہوا سا ویٹر قریب آیا تو میں نے اسے مختصر سا آرڈر دیا: "ایک دال ماش اور دو روٹیاں، جلدی لانا بھائی۔ کھانا

آنے تک میں باہر سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر میں ویٹر بھاپ اڑتی دال اور گرم روٹیاں لے آیا۔ میں نے خاموشی سے کھانا شروع کیا۔ ہر لقمے کے ساتھ مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو رہا تھامیں نے کھانا ختم کیا اور کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کرنے ہی والا تھا کہ ٹھیک سات بجے کے قریب موبائل کی سکرین روشن ہوئی ایک مختصر مگر واضح میسج تھا: سفید رنگ کی کرولا، نمبر LEA-4567، ٹھوکر چوک کے بائیں جانب کھڑی ہے۔
خاموشی سے آ کر پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ ڈرائیور تمہاری پہچان جانتا ہے۔" میسج پڑھتے ہی میرے اندر ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے جلدی سے بل ادا کیا، اپنا بیگ کندھے پر درست کیا اور ہوٹل کے روشن ہال سے نکل کر باہر کی ٹھنڈی ہوا اور شور میں قدم رکھا۔ ٹھوکر نیاز بیگ کا وہ روایتی ہجوم اور گاڑیوں کا اژدھام اب اپنے عروج پر تھا، لیکن میری نظریں صرف اس سفید گاڑی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جیسے ہی میں چوک کے بائیں جانب پہنچا، وہ سفید کرولا سڑک کے کنارے کھڑی نظر آئی۔ اس کی ہیڈلائٹس مدھم تھیں، جیسے وہ بھی ہجوم میں اپنی پہچان چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے ارد گرد کا ایک سرسری جائزہ لیا اور پھر بلا تامل پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا، بس آئینے میں ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں جھانکا، جیسے وہ کسی پرانی نشانی کی تصدیق کر رہا ہو۔ اگلے ہی لمحے گاڑی کی کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھ گیا، باہر کا شور دم توڑ گیا اور گاڑی کینال روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اب میرا رخ ڈی ایچ اے فیز 4 کی ان پُرسکون گلیوں کی طرف تھا جہاں مشن کا آخری مرحلہ میرا منتظر تھا۔
نہر کے کنارے لگے درخت رات کی روشنی میں ہیبت ناک سائے بنا رہے تھے۔ لاہور کی ٹھنڈی ہوا اور نہر کے پانی کی مخصوص بو بند شیشوں کے پار بھی محسوس ہو رہی تھی۔
ہم کینال روڈ پر مسلم ٹاؤن اور فیروز پور روڈ کے انڈر پاسز عبور کرتے ہوئے والٹن روڈ کی طرف مڑ گئے۔ ٹریفک اب کسی حد تک کم ہو چکی تھی اور گاڑی کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ ٹھوکر سے ڈی ایچ اے فیز 4 تک پہنچنے میں ہمیں تقریباً 35 سے 40 منٹ لگے۔ جیسے ہی گاڑی فیز 4 کے رہائشی بلاک میں داخل ہوئی، سڑکیں چوڑی اور گلیاں پُرسکون ہو گئیں۔ یہاں کی خاموشی میں گاڑی کے ٹائروں کی آواز بھی نمایاں ہو رہی تھی بالآخر گاڑی ایک پروقار مگر سادہ سی کوٹھی کے سامنے رکی۔ یہ وہ سیف ہاؤس تھا جس کا ذکر صبح فون پر ہوا تھا۔ گھر کی بیرونی دیواروں پر لگی بیلیں اور نیم تاریک گلی اسے ایک پراسرار تحفظ فراہم کر رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بیگ سنبھالا اور پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ جیسے ہی میں نے قدم زمین پر رکھے، ڈرائیور نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیا؛ اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور لمحوں میں گلی کے اگلے موڑ پر اوجھل ہو گیا، جیسے وہ کبھی وہاں تھا ہی نہیں۔
میں اب اس بھاری لوہے کے گیٹ کے سامنے اکیلا کھڑا تھا۔ میں نے مخصوص ترتیب سے گیٹ کے چھوٹے حصے (Wicket Gate) پر دستک دی: تین بار ٹھک ٹھک، پھر ایک وقفہ، اور پھر دو بار تیزی سے۔
چند لمحوں کے بعد گیٹ ایک دبی ہوئی آواز کے ساتھ کھلا۔ اندر سے روشنی کی ایک باریک لکیر باہر آئی۔ ایک سایہ نما شخص نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی میں دہلیز پار کر کے اندر داخل ہوا، گیٹ کی بھاری کنڈی واپس اپنی جگہ پر

بیٹھ گئی۔ میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا؛ اب میں اس شخص کے روبرو ہونے والا تھا جس کے اشارے پر یہ پورا مشن وزیر آباد سے شروع ہو کر ایران کی سرحدوں تک پھیلا تھا—میرا ماسٹر مائنڈ۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس شخص نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک تھی جو میں نے پہلی بار وزیر آباد کے گودام میں دیکھی تھی۔ وہ میرے لیے صرف ایک 'ماسٹر مائنڈ' نہیں تھا، جس کے اشاروں پر میں نے سرحد پار کے تپتے صحراؤں اور سنگلاخ پہاڑوں کا سفر کیا تھا، بلکہ وہ میرا ایک ایسا دوست اور ساتھی بھی تھا جس پر میں آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا تھا۔ ہماری رفاقت مشن کی فائلوں سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے، شاید وہ بھی میری طرح کسی مشن میں کئی راتیں جاگ کر گزار چکا تھا۔

جیسے ہی ہماری نظریں ٹکرائیں، اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی، اطمینان بھری مسکراہٹ آئی—یہ وہ مسکراہٹ تھی جو ایک کمانڈر اپنے بہترین سپاہی اور ایک دوست اپنے بھائی کے لیے محفوظ رکھتا ہے۔خوش آمدید ذیشان،" اس نے اپنی دھیمی مگر پروقار آواز میں کہا۔اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم ان تمام رکاوٹوں کو عبور کر لو گے۔ تمہارے بغیر یہ بساط ادھوری تھی۔"اس کی آواز میں موجود اپنائیت نے میرے جسم کی تمام تھکن کو جیسے ایک لمحے میں دھو ڈالا۔ میں نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "سفر کٹھن تھا، لیکن منزل کی کشش نے مجھے رکنے نہیں دیا۔"اب ہم دونوں کے درمیان وہ خفیہ فائل اور نقشے تھے، لیکن اس سے پہلے ہم دونوں کے درمیان وہ خاموش مکالمہ تھا جو صرف دو پرانے اور وفادار ساتھی ہی سمجھ سکتے تھے۔ اس نے چائے کے دو مگ بھرے اور ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا، "آؤ، اب آرام سے بیٹھو اور مجھے وہ سب بتاؤ جو تم سرحد کے اس پار دیکھ کر آئے ہو۔"لاہور کے اس سیف ہاؤس کی خاموشی میں، چائے کی پیالیوں سے اٹھتا دھواں ہمارے درمیان موجود تناؤ کو تھوڑا کم کر رہا تھا، لیکن جو باتیں ہو رہی تھیں وہ عالم اسلام کے دشمنوں کے نقشے کو بدلنے کی طاقت رکھتی تھیں۔

ماسٹر مائنڈ نے میز پر پڑی اس ضخیم فائل پر ہاتھ رکھا

اس کی آنکھوں میں کوئی ہیجان نہیں تھا، بلکہ ایک خاص قسم کا سکون تھا جو تب آتا ہے جب بساط کے سارے مہرے اپنی صحیح جگہ پر آ جائیں۔ذیشان،" اس نے دھیمی اور نپی تلی آواز میں بات شروع کی۔ "تم نے جو معلومات (Intel) ایران کے مختلف شہروں سے اکٹھی کی ہیں، انہوں نے ان خالی جگہوں کو بھر دیا ہے جہاں ہم اب تک صرف اندازے لگا رہے تھے۔ تمہاری دی ہوئی تفصیلات اور ہمارے 'ٹیکنکل ونگ' کی حالیہ رپورٹس کو جب ہم نے ایک جگہ جمع کیا، تو اب ایک ایسی جامع ماسٹر فائل تیار ہو چکی ہے جس میں دشمن کی نقل و حرکت کا ایک ایک منٹ درج ہے۔"میں نے کرسی پر اپنی پوزیشن درست کی اور اسے غور سے سننے لگا۔دیکھو،" اس نے ایک نقشے کی طرف اشارہ کیا جس پر مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے نشانات لگے تھے۔ "معاملہ اب صرف ایران یا اسرائیل کا نہیں رہا۔ تمہاری رپورٹ سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ یورپ کے کچھ مخصوص حلقے اور انڈیا کا انٹیلی جنس نیٹ ورک اس وقت ایک ہی 'فریکوئنسی' پر کام کر رہے ہیں۔

ان کا مقصد مشرقِ وسطیٰ میں لگی اس آگ کو ہماری سرحدوں تک لانا ہے۔ لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے۔ تمہاری لائی ہوئی انٹیل نے ہمیں ان کے وہ 'سلیپر سیلز' (Sleeper Cells) اور رابطے کے وہ ذرائع بتا دیے ہیں جنہیں وہ اب تک محفوظ سمجھ رہے تھے۔" ہمیں اب بیک وقت اپنے تمام دشمنوں کی چالوں کا پتہ ہے۔ چاہے وہ یورپ کے خفیہ کمروں میں بننے والے منصوبے ہوں، انڈیا کی سرحدوں پر بڑھتی ہوئی خاموش نقل و حرکت ہو، یا مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کا ایران پر حملے کا جنون یہ فائل ثابت کرے گی کہ ہم ایک ہی وقت میں اپنے تمام دشمنوں کا قلع قمع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" اس نے چشمہ صاف کر کے دوبارہ لگایا اور سنجیدگی سے جاری رکھا، "اب ہمیں ان کے 'وار' کرنے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس اب ان کے نیٹ ورکس، ان کے محفوظ ٹھکانوں اور ان کے اگلے ممکنہ اہداف کی وہ تفصیل ہے جو شاید ان کے اپنے نچلے درجے کے افسران کو بھی معلوم نہیں ہو گی۔ ہم نے ایران کے دفاع کے لیے جو 'پلان' ترتیب دیا ہے، وہ اب اتنا مضبوط ہے کہ ان کے کسی بھی ایڈونچر سے پہلے ہی ان کے سپلائی لائن اور کمیونیکیشن کو مفلوج کیا جا سکتا ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی جذباتی دعویٰ نہیں تھا، بلکہ ایک خالص حسابی (Calculated) بات تھی۔ "تو، اس کا مطلب ہے کہ ہمارا نیٹ ورک اب مکمل طور پر 'ایکٹو' (Active) ہے؟" "ہاں،" اس نے سر ہلا کر تصدیق کی۔ "لاہور سے لے کر مشہد تک، اور سرحد کے دوسری طرف کے اہم مراکز تک، ہمارے لوگ اب صرف 'واچ' (Watch) پر نہیں ہیں، بلکہ وہ 'پوزیشن' لے چکے ہیں۔ تمہاری یہ محنت ضائع نہیں جائے گی۔ اب ہم صرف دفاع نہیں کر رہے، بلکہ ہم نے دشمن کو ایک ایسی جگہ لا کھڑا کیا ہے جہاں اس کا ہر قدم خود اس کے لیے جال بن جائے گا۔" میں نے مگ میز پر رکھتے ہوئے سامنے بیٹھے اپنے اس ساتھی اور ماسٹر مائنڈ کی آنکھوں میں دیکھا۔ "اور کہا، اسرائیل اور امریکہ کی تیاریاں تو پوری ہیں، لیکن کیا آپ کو لگتا ہے کہ وہ واقعی براہِ راست ایران پر حملے کی ہمت کریں گے؟" اس نے ایک طنزیہ مگر پراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "وہ حملہ کریں گے ذیشان، بالکل کریں گے! وہ اب رکنے والے نہیں ہیں

لیکن ہم نے بساط ایسی بچھائی ہے تمہاری اور میرے کچھ اور ساتھیوں کی لائی ہوئی معلومات نے ہمیں وہ مہرے دے دیے ہیں کہ ہم انہیں ایسی جگہ پھنسائیں گے جہاں انکی نسلیں بھی یاد رکھیں گی ان کا غرور ان کے گلے کا پھندا بننے والا ہے۔

میں نے میز پر پڑی اس ضخیم فائل پر اپنا ہاتھ رکھا، جس کے سرورق پر سرخ رنگ کی ایک پٹی لگی تھی — جس کا مطلب تھا 'انتہائی حساس'۔ یہ وہی فائل تھی جو کچھ عرصہ پہلے وزیر آباد کے خاموش گودام میں، چائے کے دھوئیں اور گھمبیر سرگوشیوں کے درمیان میرے حوالے کی گئی تھی۔ تب یہ فائل صرف چند سوالات اور ادھورے نقشوں پر مشتمل تھی، لیکن آج یہ دشمن کے ناپاک عزائم کی مکمل دستاویز بن چکی تھی۔ میں نے اپنی جیب سے وہ مخصوص سیاہ مارکر نکالا اور فائل کے بالکل نیچے ایک عجیب سا ہندسہ لکھا اور اس کے گرد دائرہ لگا کر اپنے دستخط کر دیے۔ یہ دستخط نہیں تھے، یہ اس بات کی تصدیق تھی کہ اس فائل کے اندر موجود ہر حرف میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے قدموں نے ناپا ہے۔ میں نے فائل کو ماسٹر مائنڈ کی طرف دھکیلتے ہوئے وہ حتمی کوڈ ورڈ ادا کیا جو کسی بھی مشن کی باقاعدہ 'ہینڈ اوور'

(Handover) کے لیے استعمال ہوتا ہے: "ریڈ لائن کراس... اب صرف ہدف باقی ہے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا، فائل کو اٹھا کر اپنے سامنے موجود فولڈر میں رکھا اور اسے ایک مخصوص سیل (Seal) سے بند کر دیا۔
اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر میری آنکھوں میں جھانک کر بولا: ، یہ امانت اب میری ہے۔ اگلے چند گھنٹوں کے اندر یہ 'ہیڈ کوارٹر' کے میز پر ہو گی اور وہاں سے یہ معلومات براہِ راست ان ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی جو اس ملک کے دفاع کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تم نے اپنا فرض نبھا دیا ہے، اب تم اس بوجھ سے آفیشلی (Officially) آزاد ہو۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ایک دوستانہ مگر سنجیدہ لہجے میں پوچھا: "لیکن ایک بات بتاؤ ذیشان... تم نے کوئٹہ سے لے کر تہران کے ان تنگ و تاریک گلیوں تک جو آگ کا دریا پار کیا ہے، اس کی قیمت کیا ہے؟ بولو، اس جان لیوا مسافت کے بدلے تمہیں کیا چاہیے؟ کوئی صلہ، کوئی انعام؟" میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی ان ہتھیلیوں کو دیکھا جن پر ایران کی سرحدوں اور بلوچستان کی مٹی کا رنگ اب بھی رچا ہوا تھا۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا: جس راستے کا میں مسافر ہوں، وہاں صلے کی تمنا کرنا مجھے گناہ لگتا ہے۔ یہ سفر، یہ زخم اور یہ ہڈیاں توڑ دینے والی تھکن... یہ سب تو اس مٹی کا قرض تھا جو میں اتارنے نکلا تھا۔ میں نے یہ سودا کسی دنیاوی عہدے، تمغے یا مراعات کے لیے نہیں کیا، میرا سودا تو اس 'ذات' سے ہے جو نیتوں کے حال جانتی ہے اور جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔"
میں ایک لمحے کے لیے رکا، میرے ذہن میں مشہد کی وہ ٹھنڈی راتیں اور بلوچستان کے تپتے صحرا لہرائے۔ میں نے بات جاری رکھی: "مجھے کچھ نہیں چاہیے ! میری کل کائنات۔۔۔ تو بس یہ اطمینان ہے کہ جب کبھی اس ملک کی سرحدوں پر کوئی دشمن میلی آنکھ سے دیکھے، تو اسے یہ احساس ہو جائے کہ یہاں گوشت پوست کے انسان نہیں بلکہ وہ 'گمنام سائے' پہرا دے رہے ہیں جنہیں موت ڈرا نہیں سکتی اور جنہیں دنیا خرید نہیں سکتی۔ ہم وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں نہیں، بلکہ عرش والے کے فیصلوں میں ہوتا ہے۔" میری آواز میں اب ایک عجیب سی روحانی سرشاری تھی: "میرا اجر تو اس لمحے میں چھپا ہے جب میرے وطن کی مٹی پر کوئی بچہ نڈر ہو کر ہنستا ہے، یا جب کوئی ماں سکون کی نیند سوتی ہے۔ میں نے اپنا حصہ ڈال دیا، اب اس امانت کو ہیڈ کوارٹر تک پہنچانا تمہارا کام ہے۔ میں ایک گمنام سپاہی بن کر نکلا تھا اور اسی گمنامی کی چادر اوڑھ کر واپس جا رہا ہوں۔ دعا کیجیے گا کہ جب دوبارہ پکارا جاؤں، تو میرا ضمیر اور میرا ایمان اسی طرح سلامت ہو۔" وہ بالکل ساکت تھا، جیسے اس کے سامنے کوئی انسان نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت کھڑی ہو۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک کر اس فائل پر گرا، جو شاید ان تمام ثبوتوں سے زیادہ قیمتی گواہی تھی۔ اس کے پاس ان جذبوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے بس عقیدت سے اپنا سر جھکا لیا۔ اس نے فائل کو ایک طرف رکھا اور کرسی پر ذرا آگے جھک کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے لہجے میں ایک گہری فکر اور اپنائیت تھی: ذیشان! یہ مشن تو ختم ہوا، لیکن اب آگے کا کیا پلان ہے؟ تم اب کہاں جاؤ گے؟ کیا ہمارے ساتھ کام کرنا چاہو گے؟ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک پر سکون مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ جس مسافر کے پاؤں میں وطن کی مٹی کی زنجیر ہو، وہ کسی ایک کمرے یا عہدے میں قید نہیں ہو سکتا۔ میرا کام فائلیں جمع کرنا نہیں، بلکہ ان سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے جن پر دشمن گدھ کی

طرح نظریں جمائے بیٹھا ہے۔

تم میرے لیے فکر نہ کرو، میں اب دوبارہ وہیں جا رہا ہوں جہاں سے میرا خون پکار رہا ہے—بلوچستان کی ان سنگلاخ وادیوں اور تپتے صحراؤں کی طرف، جہاں اب بھی بہت سے 'سانپ' سر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے اپنی جیکٹ سنبھالی اور کھڑا ہو گیا۔ میرا لہجہ اب کسی چٹان کی طرح مضبوط تھا: "میں اب اپنے طور پر کام کروں گا۔ میں کسی ریکارڈ یا کسی فائل میں نظر نہیں آؤں گا، لیکن میں وہیں ہوں گا جہاں مائیں اپنی بیٹیوں کی عزت کے لیے ڈرتی ہیں، جہاں غریب کو انصاف نہیں ملتا، اور جہاں دشمن ہمارے بھائیوں کو ورغلا رہا ہے۔ میں ایک گمنام سایہ بن کر ان کا تعاقب کروں گا اور انہیں وہیں مٹی میں بھینچ کر رکھ دوں گا۔ تم بس اپنا کام جاری رکھو، مجھے جب بھی ضرورت محسوس ہوئی، میں خود تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔ اسکی آنکھوں میں ایک عجیب سا جلال اور فخر چمکا اور پھر اسنے بھاری آواز میں کہا: "ذیشان! اگر کبھی ہمیں دوبارہ تمہاری ضرورت پڑی، تو کیا ہم تمہیں پکار سکتے ہیں؟" میں نے دبی اواز میں جواب دیا جس دن اس مٹی پر کوئی آنچ آئے گی، تم مجھے پکارنے سے پہلے اپنے سامنے کھڑا پاؤ گے۔ میرا اجر میرا اللہ ہے، اور میرا مسکن میری زمین ہے۔

حرفِ آخر

تاریخ گواہ رہے کہ جب جب اس پاک سرزمین کی سرحدوں پر باطل کے سیاہ بادل منڈلائے، اس مٹی نے ایسے گمنام اور جری سپاہی پیدا کیے جنہوں نے اپنے وجود کو وطن کی بقا کے لیے وقف کر دیا۔ ایسے کردار کسی دنیاوی تمغے، سستی شہرت یا نام کے محتاج نہیں ہوتے۔ ان کا اصل اعزاز، ان کا سب سے بڑا انعام وہ 'اطمینانِ قلب' ہے جو ایک محفوظ قوم کی مسکراہٹ اور ایک بے فکر بچپن کی ہنسی میں چھپا ہوتا ہے۔ یہ سفر، جس کا عنوان "سرحد کے پار" تھا،

محض ایک انٹیلی جنس مشن کی داستان نہیں تھی، بلکہ یہ اس 'عہدِ وفا' کی تجدید تھی جو ایک بندۂ مومن اپنے رب اور اپنی زمین سے کرتا ہے۔ تہران کی یخ بستہ راتیں ہوں، مشہد کا تقدس ہو یا بلوچستان کی تپتی ریت پر نقش ہوتے قدم... یہ سب اس بات کی گواہی ہیں کہ دشمن جتنا بھی مکار اور طاقتور کیوں نہ ہو، جب مقابلہ جذبۂ حسینیؑ کے صبر اور حیدریؑ جلال کی ضرب سے ہو، تو شکستِ فاش غنیم کا مقدر بن جاتی ہے۔ ہم دعاگو ہیں کہ یہ مٹی ہمیشہ ایسے ہی جانثاروں کے لہو سے مہکتی رہے جو صلے کی تمنا سے بے نیاز ہو کر، صرف اللہ کی رضا اور وطن کی حرمت کے لیے مٹنا جانتے ہیں۔ دشمن یاد رکھے! چاہے وہ پیرس اور اسرائیل کے خفیہ ٹھکانے ہوں، دہلی کے سازشی کمرے ہوں یا تہران و مشہد کی پُراسرار گلیاں... اس مٹی کے محافظ ہر جگہ موجود ہیں۔ ہم وہ 'گمنام سائے' ہیں جو تمہاری آہٹ سے پہلے تمہاری گردنوں تک پہنچنا جانتے ہیں۔ ہم تمہیں وہیں تمہاری اپنی ہی مٹی میں بھینچ کر رکھ دیں گے جہاں تم نے اس پاک سرزمین کے خلاف سازش کا پہلا بیج بویا ہوگا۔ یاد رکھیے! کچھ سفر محض منزل پانے کے لیے نہیں، بلکہ نسلوں کی بقا اور ایمان کی حفاظت کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ہم تھے، ہم ہیں اور ہم رہیں گے—ایک ان دیکھی تلوار کی طرح۔ مشن جاری ہے... کیونکہ گمنام سائے کبھی سوتے نہیں!

یہ کہانی یہاں ختم ضرور ہوتی ہے، مگر اس کا سفر ابھی باقی ہے۔

ذیشان واپس جا چکا ہے—نہ کسی ریکارڈ میں، نہ کسی شناخت میں... بلکہ انہی سنسان وادیوں اور اندھیری سرحدوں میں، جہاں خطرہ اب بھی سانس لے رہا ہے۔ دشمن نے شاید ایک قدم پیچھے ہٹایا ہو... مگر اس کے عزائم ابھی زندہ ہیں۔ اور جب تک یہ عزائم زندہ ہیں، تب تک وہ "گمنام سائے" بھی زندہ رہیں گے جو ہر اندھیرے میں جاگتے ہیں۔

کہانی آگے بڑھے گی... نئے چہروں، نئے رازوں اور نئے معرکوں کے ساتھ۔ کیونکہ کچھ جنگیں ختم نہیں ہوتیں...

وہ صرف اگلے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ذیشان تھا تو فقط ایک نام زمانے میں،
اب گونج ہے اس کی ہر خفیہ فسانے میں۔
وہ نکلا تھا اکیلا "مشن" کی قسم لے کر—
اب سایہ بن گیا ہے ہر دشمن کے ٹھکانے میں۔
یہ مٹی گواہ ہے اُس کے ہر ایک ارادے کی،
اسلام پہ جان لٹا دینا ہے روایت اُس کے وعدے کی۔
وہ جھکتا نہیں باطل کے کسی دربار میں—
وہ ڈٹ کے کھڑا ہے ہر مظلوم کی حمایت میں۔

مناجاتِ گمنام!

اے باری تعالیٰ! اے ارض و سما کے مالک! تُو نیتوں کے حال جانتا ہے اور تو ہی جذبوں کو ثبات عطا کرنے والا ہے۔ الٰہی! اس تحریر کو، جو تیرے ایک گمنام بندے نے وطن کی محبت اور دین کی سربلندی کے لیے لکھی ہے، اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرما۔ اے ربِ ذوالجلال! اس کتاب کے ہر حرف کو ان گمنام مجاہدوں کے لیے خراجِ تحسین بنا دے جنہوں نے تیری رضا کے لیے اپنی جانیں مٹی کے سپرد کر دیں۔ اس تڑپ اور اس اخلاص کو، جو "سرحد کے پار" کے ہر صفحے میں چھپا ہے، ہماری آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنا۔ اے پاک پروردگار! ہمارے اس پیارے وطن کی سرحدوں کو ہر اندرونی و بیرونی سازش سے محفوظ رکھ۔ دشمن جتنا بھی مکار ہو، تو ابابیلوں کے ذریعے ہاتھیوں کو پامال کرنے والا ہے، ہمارے گمنام سائے کو دشمن کے لیے عذاب اور اپنوں کے لیے رحمت بنا دے۔ یا اللہ! مصنف کی اس محنت کو ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنا۔ ان کے قلم میں وہ تاثیر پیدا کر کہ جو بھی اسے پڑھے، اس کے دل میں وطن کی حرمت اور ایمان کی تڑپ بیدار ہو جائے۔ انہیں ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھ اور ان کے قدموں کو صراطِ مستقیم پر استقامت عطا فرما۔ اے ہمارے مالک! ہمیں وہ دن دکھا جب باطل کا ہر سر نگوں ہو اور حق کا پرچم پوری دنیا میں سربلند ہو۔ ہمیں ان گمناموں کی صف میں شامل رکھ جن کا سودا تجھ سے ہے اور جن کا اجر تیرے ہی پاس ہے۔ آمین یا رب العالمین!